زیرو پوائنٹ 4
جاوید چودھری

کسی گناہ گار نے اللہ تعالیٰ سے جنت اور دوزخ دیکھنے کی درخواست کی اللہ تعالیٰ نے اسے فرشتوں کے حوالے کر دیا فرشتے اسے دوزخ میں لے گئے دوزخ ایک بہت بڑا ڈائننگ ہال تھا جس میں شاندار کرسیاں لگی تھیں اور ان کرسیوں پر انتہائی لاغر، کمزور اور مدقوق لوگ بیٹھے تھے ان لوگوں کے سامنے سوپ کے بڑے بڑے پیالے رکھے تھے اور ان کے ہاتھوں میں لمبے لمبے چمچ تھے گناہ گار نے دیکھا ان لوگوں کی کہنیاں نہیں ہیں اور یہ لوگ اپنے بازو تہہ نہیں کر سکتے چنانچہ یہ لوگ پیالے سے چمچ بھرتے ہیں چمچ کو منہ تک لانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن سوپ ہونٹوں تک پہنچنے سے پہلے ان کے گریبان پر گر جاتا ہے وہ صدیوں سے سوپ پینے کی کوشش کر رہے تھے لیکن چمچ ان کے ہونٹوں تک نہیں پہنچ پا رہے تھے فرشتے اسے وہاں سے جنت میں لے گئے یہ بھی ایک بہت بڑا ڈائننگ ہال تھا اس ہال میں بھی لوگ بیٹھے تھے اور ان کے سامنے بھی سوپ کے پیالے پڑے تھے لیکن یہ لوگ انتہائی صحت مند، خوبصورت اور مطمئن تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہنس کھیل رہے تھے گناہ گار نے فرشتوں سے جنت اور دوزخ کا فرق پوچھا تو فرشتے بولے ان لوگوں کے بازوؤں میں بھی کہنیاں نہیں ہیں لیکن انہوں نے اس کا بڑا دلچسپ حل نکال لیا ہے یہ پیالے سے چمچ بھرتے ہیں اور یہ چمچ اپنے ہمسائے کے منہ میں ڈال دیتے ہیں اور ہمسایہ اپنا چمچ ان کے منہ میں چنانچہ دونوں کی بھوک مٹ جاتی ہے۔

وہ گناہ گار واپس آیا اور اس نے اس دنیا کو بتایا جنت اور دوزخ میں صرف عمل کا فرق ہوتا ہے دوزخ کے لوگ اپنا چمچ اپنے منہ میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ جنتی اپنے پیالے سے چمچ بھرتے ہیں اور دوسرے کے منہ میں ڈال دیتے ہیں میں نے گناہ گار کی بات سنی تو مجھے اس وقت معلوم ہوا وہ جنت جسے ہم آسمانوں میں تلاش کرتے رہتے ہیں وہ جنت زندگی بھر ہماری ڈائننگ ٹیبل پر پڑی رہتی ہے ہم نے بس ایک چمچ بھرنا ہے یہ چمچ اپنی بغل میں بیٹھے شخص کے منہ میں ڈالنا ہے اور اللہ کا قرب پا جانا ہے بس اتنی سی بات ہے لیکن ہم اتنی سی بات کیلئے عمر بھر مارے مارے پھرتے ہیں ہم بغل کے بچے کو ہزاروں میل لمبے میلے میں تلاش کرتے رہتے ہیں۔

ہم کتنے بے وقوف ہیں۔

جاوید چوہدری کی دیگر کتب

Rs. 500/-

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40- اردو بازار، لاہور۔
فون: 7352332، 7232336 فیکس: 7223584
Design by FAZEEL KIANI

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زیرو پوائنٹ 4

زیرو پوائنٹ 4

جاوید چودھری

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور
فون: 7352332-7232336

نام کتاب .... زیرو پوائنٹ 4

مصنف .... جاوید چوہدری

ناشر .... گل فراز احمد

علم و عرفان پبلشرز، لاہور

مطبع .... زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور

پروف ریڈنگ .... محمد نواز صابر

کمپوزنگ .... ظفر اقبال

اشاعت اوّل .... ستمبر 2007ء

اشاعت دوم .... اپریل 2010ء

تعداد 1100

قیمت .... =/500 روپے

.......ملنے کے پتے.......

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور

فون:7352332-7232336

کتاب گھر

اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

اشرف بک ایجنسی

اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

خزینہ علم و ادب

الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

ویلکم بک پورٹ

اُردو بازار، کراچی

ادارہ علم و عرفان پبلشرز کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ طباعت تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو از راہ کرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائے گا۔ (ناشر)

انتساب!

اپنے بیٹے

فائز جاوید

اور

شماعیل جاوید کے نام

کاشف آزاد

ترتیب

سارے طالبان دہشت گرد نہیں ہیں

ہم لوگ ریاض سے مدینہ شریف جا رہے تھے' انیق احمد اور میری سسٹر ساتھ ساتھ تھیں' انیق احمد پاکستان کے ان چند اینکر پرسنز میں شمار ہوتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے علم' عاجزی اور اخلاق سے نوازہ ہے' انیق صاحب جہاں علامہ اقبال کے حافظ ہیں وہاں وہ دنیا کے تمام قدیم اور جدید دانشوروں' مفکروں اور علماء کرام کے بھی نباض ہیں' ان کا تعلق ایک دینی گھرانے کے ساتھ تھا' ان کے والد ایک معروف عالم دین تھے اور انیق صاحب نے قرآن مجید' فقہ اور احادیث کی بحثوں کے درمیان آنکھ کھولی تھی لہٰذا اس دینی اور علمی فضا کی جھلک انیق صاحب کی گفتگو میں دکھائی دیتی ہے' علم' دولت' شہرت اور اقتدار کے بارے میں کہا جاتا ہے یہ 99 فیصد لوگوں کا دماغ خراب کر دیتا ہے' یہ چند دنوں کا اقتدار' کاغذ کی بنی عارضی دولت' مصنوعی روشنیوں سے ادھار لی ہوئی شہرت اور چند کتابوں اور چند ڈگریوں کا علم بھی عجیب چیز ہے' یہ عموماً بالشت بھر کے انسان کو فرعون بنا دیتا ہے اور 99 فیصد لوگوں کا بھی المیہ ہے لیکن وہ ایک فیصد لوگ جو اقتدار' دولت' شہرت اور علم کے باوجود انسان رہتے ہیں' جن کی گردن اور کندھے جھکے رہتے ہیں اور جو تعریف کے ہر لفظ کے بعد ممنونیت کے اظہار کے لیے آسمان کی طرف دیکھتے' وہ جینوئن لوگ اللہ کے کرم کے اصل حق دار ہوتے ہیں اور انیق احمد کا شمار ان ایک فیصد لوگوں میں ہوتا ہے' انیق احمد کو اللہ تعالیٰ نے علم کے ساتھ عاجزی دی ہے' انیق احمد کی زندگی کا زیادہ تر حصہ اردو زبان کے مشہور شاعر اور دانشور جون ایلیا کے ساتھ گزرا' یہ جون ایلیا کے شاگرد بھی تھے اور دوست بھی' جون ایلیا ایک درویش صفت بلکہ فقیر منش شاعر تھے' جون صاحب ساری رات جاگتے تھے' شعر سنتے اور شعر کہتے تھے اور مشروب مغرب سے لطف اندوز ہوتے تھے' صبح کے وقت سو جاتے تھے اور پھر دن کے ایک بجے جاگتے تھے' انیق احمد رات اس وقت تک ان کے ساتھ رہتے تھے جب تک جون ایلیا انہیں پہچانتے تھے مجھے انیق صاحب اور جون ایلیا کے تعلق کا علم تھا چنانچہ میں نے دوران سفر ان سے جون ایلیا کی زندگی کے دلچسپ واقعات سنانے کی درخواست کی' انیق احمد نے بے شمار واقعات سنائے لیکن ان میں ایک واقعہ انتہائی دلچسپ تھا' انیق احمد کا کہنا تھا جون ایلیا دن ایک بجے تک سوتے تھے لیکن مجھے یہ سہولت حاصل تھی میں انہیں ایمرجنسی میں کسی بھی وقت جگا سکتا تھا' میں نے ایک دن ٹیلی ویژن آن کیا'

ان دنوں پاکستان میں ایک ہی غیر ملکی چینل دکھایا جاتا تھا اور وہ سی این این تھا' میں نے سی این این پر سوویت یونین کو ٹوٹتے ہوئے دیکھا' یہ منظر میرے لئے حیران کن تھا کیونکہ جون ایلیا بائیں بازو کے دانشور تھے اور ان کا دعویٰ تھا اشتراکیت کسی نہ کسی دن پوری دنیا پر غلبہ پائے گی' یہ دن کے گیارہ بجے تھے' میں نے ٹیلی فون کر کے انہیں جگا دیا' وہ نیند کے عالم میں ٹیلی فون پر آ گئے' میں نے انہیں بتایا ''جون صاحب سوویت یونین ٹوٹ گیا'' انہوں نے غنودگی کے عالم میں جواب دیا ''یہ مذاق کا وقت نہیں'' میں نے عرض کیا ''جون صاحب میں ٹیلی ویژن پر دیکھ رہا ہوں لوگ لینن کا مجسمہ گرا رہے ہیں' ماسکو میں فوجی ٹینک پھر رہے ہیں اور فوج رائفلیں اور توپیں لے کر شہر میں گھوم رہی ہے'' جون ایلیا یہ سن کر تھوڑی دیر خاموش رہے اور اس کے بعد خود کلامی کے انداز میں بولے ''کیا فوج رائفلیں لے کر ماسکو میں گھوم رہی ہے'' میں نے کہا ''ہاں'' وہ بولے ''کیا فوج ماسکو میں توپوں اور ٹینکوں کے ساتھ پھر رہی ہے'' میں نے کہا ''ہاں'' جون ایلیا نے قہقہہ لگایا اور بولے ''پھر ایک بات طے ہو گئی'' میں نے پوچھا ''وہ کیا جون صاحب'' جون ایلیا بولے ''پھر فوج کسی بھی ملک کی ہو وہ ہوتی پنجابی فوج ہی ہے''۔

میں نے اور انیق صاحب نے قہقہہ لگایا' انیق صاحب اس کے بعد خاموش ہو گئے اور میں جون ایلیا کے فقرے کی لذت لینے لگا' ہم میں بحیثیت پاکستانی ایک بڑا دلچسپ فالٹ ہے' ہم لوگوں' اداروں اور چیزوں کو ان کی کارکردگی' ان کی خوبیوں اور ان کی خامیوں کی بنیاد پر الگ الگ نہیں کرتے' ہم سب کو ایک ہی پلڑے میں تولتے ہیں مثلاً ہم ہر امریکی کو اپنا دشمن کہتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے بھول جاتے ہیں امریکہ کے 55 فیصد لوگ وائٹ ہاؤس کی ''وار آن ٹیرر پالیسی'' کے خلاف ہیں اور یہ لوگ واشنگٹن میں عراق' افغانستان اور پاکستان کے قبائلی علاقوں کے عوام پر امریکی حملوں کے خلاف جلوس نکالتے ہیں اور بش کو ہزاروں معصوم لوگوں کا قاتل قرار دیتے ہیں' ہم ہر یہودی اور ہر اسرائیلی کو عالم اسلام کا دشمن کہتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے بھول جاتے ہیں تیسری دنیا کو حفاظتی ٹیکوں کی ویکسین بھی مختلف یہودی فراہم کر رہے ہیں اور ایڈز' ہیپاٹائٹس' ٹی بی اور کانگو فیور جیسی مہلک بیماریوں کا علاج بھی یہودی ہی دریافت کر رہے ہیں اور یہ لوگ یہ علاج انسانیت کو مفت دیں گے' ہم بھارت کو بھی گالی دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی بھول جاتے ہیں بھارت میں 20 کروڑ مسلمان اور 40 کروڑ دلت بھی آباد ہیں اور بھارتی پالیسیوں میں ان بے چاروں کا کوئی قصور نہیں اور یہ لوگ بھی بھارتی حکومت اور بھارتی شدت پسندوں کے ہاتھوں اتنے ہی تنگ ہیں جتنا ہم لوگ' اسی طرح ہمارے بلوچی' سندھی اور پشتون بھائی بھی پنجاب کو اپنے تمام مسائل کی وجہ قرار دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں پنجاب کا عام شہری' عام کسان' عام مزدور اور عام ہاری سندھیوں' بلوچیوں اور پشتونوں سے کہیں زیادہ خوفناک اور قابل رحم زندگی گزار رہا ہے' یہ بھول جاتے ہیں پنجاب میں پورے ملک کے مقابلے میں سب سے زیادہ بے روزگاری ہے' پنجاب میں سب سے زیادہ جرائم ہوتے ہیں' پنجاب میں تعلیم کا معیار دوسرے صوبوں کے مقابلے میں کہیں پست ہے' پنجاب کی زیادہ آبادی خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہی ہے اور پنجاب میں دوسرے صوبوں کے مقابلے میں صحت کے زیادہ مسائل ہیں لیکن ہمارے بلوچی' سندھی اور

پشتون بھائیوں نے پنجاب کے ہر شہری' ہر باسی کو میاں نواز شریف' میاں شہباز شریف اور جنرل کیانی سمجھ لیا ہے اور یہ لوگ پورے پنجاب کو ماڈل ٹاؤن' رائے ونڈ یا ڈیفنس سمجھ رہے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے آپ لاہور کی مال روڈ سے پانچ کلومیٹر نیچے اتر جائیں تو بلوچستان' سندھ' سرحد اور پنجاب میں کوئی فرق نہیں رہتا' ہم نے اسی طرح ایوب خان' یحییٰ خان' ضیاء الحق اور پرویز مشرف کو پاک فوج سمجھ لیا ہے' ہم جنرل محمود' جنرل فضل حق' جنرل پیرزادہ اور جنرل ملک کو فوج سمجھتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں پاکستان کی اصل فوج میجر عزیز بھٹی شہید' حوالدار لالک جان شہید' کیپٹن کرنل شیر خان شہید' لانس نائیک محمد محفوظ شہید' سوار محمد حسین شہید' میجر شبیر شہید' میجر محمد اکرم شہید' میجر محمد طفیل شہید' کیپٹن محمد سرور شہید اور پائلٹ آفیسر راشد منہاس شہید ہے' پاکستان کی اصل فوج وہ ہے جو چمن' طورخم' چولستان اور نیلم ویلی میں ملک کی حفاظت کر رہی ہے اور اس میں لاڑکانہ سے لے کر ڈیرہ بگٹی اور جہلم سے لے کر جنوبی وزیرستان تک پاکستان کے ہر علاقے اور ہر خطے کے جوان موجود ہیں۔

یہ حقیقت ہے ہم چیزوں کو بلیک دیکھتے ہیں یا وائیٹ' ہم ان کے درمیان موجود گرے ایریا کو ہمیشہ فراموش کر دیتے ہیں آپ طالبان کو لے لیجئے' ہم نے آج کل ہر داڑھی والے کو طالبان کہنا شروع کر دیا ہے' ہم علم حاصل کرنے' نماز روزے کی پابندی کرنے اور شریعت کا علم پھیلانے والے طالبان اور پاکستانی فوج' پاکستانی حکومت اور پاکستانی معاشرے سے لڑنے والے طالبان میں فرق ہی نہیں کرتے' ہماری نظر میں ہر داڑھی والا شخص طالبان ہے اور ہم اس کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں' ہماری یہ اپروچ سو فیصد غلط ہے' ہم مسلمان ہیں' پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے اور ہم پر بحیثیت مسلمان شریعت کی پابندی کرنے والے ہر مسلمان کا احترام فرض ہے' ہمیں قطعاً یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم شریعت کی پابندی کرنے والوں کے خلاف نفرت کا اظہار کریں' ہم اگر شدت پسندوں کے خلاف ہیں اور اپنی مخصوص شریعت کو رائفل کی نوک پر نافذ کرنے والوں کو ملک دشمن قرار دیتے ہیں تو ہمیں امن پسند طالبان سے نفرت کا بھی کوئی حق حاصل نہیں چنانچہ جس طرح ساری فوج پنجابی' سارے سیاستدان شوکت عزیز' سارے پنجابی غاصب' ساری حکومت امریکہ نواز اور ساری بیورو کریسی کرپٹ نہیں ہوتی بالکل اسی طرح سارے داڑھی والے لوگ طالبان نہیں ہوتے اور سارے طالبان دہشت گرد نہیں ہوتے لہٰذا ہمیں دونوں کے درمیان ایک لکیر ضرور کھینچنا ہوگی۔

ورنہ یہ لوگ ہم پر ہنسیں گے

''کیا تمہاری چیف جسٹس افتخار محمد چودھری صاحب سے ملاقات ہوئی'' میرے دوست کے سوال میں یقین تھا' میں نے انکار میں سر ہلا دیا' اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا' میں نے عرض کیا ''میں مبارک باد دینے کے لیے ان کے گھر گیا تھا لیکن وہاں رش تھا چنانچہ میں واپس آ گیا'' دوست نے مجھے بے یقینی کے عالم میں دیکھا اور دوبارہ بولا ''کیا بحال ہونے والے دوسرے ججوں کے ساتھ بھی تمہارا رابطہ نہیں ہوا'' میں نے جواب دیا ''صرف دو کے ساتھ ہوا' جسٹس خواجہ شریف میرے پرانے کرم فرما ہیں' میں نے انہیں مبارک باد کے لیے فون کیا تھا جبکہ جسٹس جاوید اقبال نے مجھے فون کر کے مبارک باد دی' جسٹس جاوید اقبال کا خیال تھا میڈیا نے عدلیہ کی بحالی میں بنیادی کردار ادا کیا جبکہ میں نے عرض کیا' جج اور وکلاء اگر استقامت نہ دکھاتے تو میڈیا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا' یہ معزول ججوں کی استقامت تھی جس کی وجہ سے ہم ان کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گئے''۔ میرے دوست نے فوراً پوچھا ''کیا تم ان ججوں کو مبارک باد کے فون نہیں کرو گے' کیا تم ان سے ملاقات کے لیے بھی نہیں جاؤ گے'' میں نے عرض کیا ''مجھے اور میرے دوسرے صحافی دوستوں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے بلکہ میرا خیال ہے بار کونسلوں کے اراکین' چودھری اعتزاز احسن' علی احمد کرد' منیر اے ملک اور اطہر من اللہ سمیت تمام سینئر وکلاء' سول سوسائٹی کے نمائندوں اور سیاسی جماعتوں کی قیادت کو بھی اب ججوں سے ملاقاتیں بند کر دینی چاہئیں اور آج کے بعد ان تمام لوگوں کو ججوں سے الگ ہو جانا چاہیے جنہوں نے عدلیہ کی بحالی میں کوئی کردار ادا کیا تھا تاکہ یہ جج آج سے اپنا کام شروع کر سکیں'' میرے دوست کے چہرے پر حیرت گہری ہو گئی اور اس نے سنسناتی آواز میں پوچھا ''مگر کیوں؟'' میں نے عرض کیا ''ہم نے اگر معزول ججوں کی بحالی کی تحریک اخلاص کے ساتھ چلائی تھی اور ہم لوگ اگر واقعی عدلیہ کی آزادی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں اب خود کو ججوں سے ''ڈی لنک'' کرنا ہو گا۔ میں اگر بھی افتخار محمد چودھری صاحب کے ساتھیوں اور دشمنوں کو مشورہ دینے کی پوزیشن میں ہوتا تو میں چودھری اعتزاز احسن سمیت چیف جسٹس تمام مہربانوں کو مشورہ دیتا یہ اب سپریم کورٹ کی وکالت سے تائب ہو جائیں۔ اسی طرح شریف الدین پیرزادہ' عبدالحفیظ پیرزادہ' فاروق ایچ نائیک' لطیف کھوسہ اور بابر اعوان سے بھی عرض کرتا کہ آپ لوگ کیونکہ معزول ججوں کی بحالی کے خلاف تھے چنانچہ آپ کو بھی اب پریکٹس چھوڑ دینی چاہیے تاکہ انصاف کے

دامن پر کوئی دھبہ نہ لگے کیونکہ یہ حقیقت ہے جب بیرسٹر اعتزاز احسن' علی احمد کرد یا منیر اے ملک سپریم کورٹ میں پیش ہوں گے اور دوسری طرف سے نعیم بخاری' بابر اعوان' لطیف کھوسہ یا پیرزادہ صاحب عدالت میں آئیں گے تو ججوں پر بڑی آسانی سے جانبداری کا الزام لگایا جا سکے گا اور اس سے وہ سارا کاز برباد ہو جائے گا جس کے لیے پوری قوم نے دو سال تک سڑکوں پر دھکے کھائے تھے اور ان دھکوں کے نتیجے میں تاریخ میں پہلی بار جج عدالتوں سے فارغ ہونے کے بعد دوبارہ اپنے عہدوں پر فائز ہوئے تھے' میڈیا کے ان تمام لوگوں کو بھی اب سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کا رخ نہیں کرنا چاہیے جنہوں نے دو سال تک سول سوسائٹی اور وکلاء کے کندھے سے کندھا جوڑے رکھا کیونکہ اب ہم سب کو مل کر انصاف کے لیے کام کرنا چاہیے اور انصاف کے لیے ہمیں آج سے وہی کردار ادا کرنا چاہیے جو ہم نے صدر پرویز مشرف اور صدر آصف علی زرداری کے خلاف ادا کیا تھا'' میں خاموش ہو گیا۔

میرے دوست کی آنکھوں میں حیرت گہری ہو گئی۔ میں نے عرض کیا ''ہم لوگ جب عدلیہ کی آزادی کے لئے سڑکوں پر تھے تو معزول ججوں کے مخالف ہم پر الزام لگاتے تھے ہم انصاف کے لیے نہیں بلکہ فرد واحد کے لیے لڑ رہے ہیں۔ ہم اس کے جواب میں کہتے تھے انصاف کا عمل اسی فرد واحد سے شروع ہو گا' ہمیں اب یہ دعویٰ بچ ثابت کرنا ہے' ہم نے ثابت کرنا ہے ہم نے صرف 60 ججوں اور افتخار محمد چودھری کی ملازمت کے لیے یہ تحریک نہیں چلائی تھی بلکہ ہم اس ملک کے ان تمام مظلوموں کو انصاف فراہم کرنے کے لیے سڑکوں پر آئے تھے جن کے حقوق معاشرے کے کسی نہ کسی زور آور نے اپنے جوتے تلے دبا رکھے ہیں۔ ہم ان لوگوں کے لیے لڑتے رہے ہیں جن کا انصاف یاجوج ماجوج کی دیوار کے پیچھے چھپا ہے اور یہ لوگ عمر بھر یہ دیوار چاٹتے رہتے ہیں لیکن دیوار میں اتنی درز پیدا نہیں ہوتی کہ ان کی آواز ہی انصاف کے کانوں تک پہنچ سکے۔ مجسٹریٹ کی عدالت سے سپریم کورٹ کے در و دیوار تک ہمارا انصاف کا سارا نظام بے انصافی' لوٹ کھسوٹ' سیاسی دباؤ' سفارشوں' تاخیر اور کرپشن میں لتھڑا ہے اور اس میں انصاف صرف اسی شخص کو ملتا ہے جو انصاف خرید سکتا ہو' انصاف کو دبا سکتا ہو یا پھر قانون اور آئین کی دھجیاں بکھیر سکتا ہو۔ اس ملک میں عام شہری کیلئے سزا جبکہ بڑے لوگوں کے لیے این آر او ہوتے ہیں چنانچہ ہم نے ثابت کرنا ہے ہم نے یہ تحریک عام شہری کو انصاف کی دہلیز تک پہنچانے یا انصاف کو عام شہری کی چوکھٹ تک لانے کے لیے شروع کی تھی چنانچہ آج سے ہمیں ججوں کا احتساب شروع کرنا چاہیے۔ ہمیں اس ملک کے ہر اس مظلوم کی آواز عدلیہ کے ایوانوں تک پہنچانی چاہیے جس کے حقوق پر کسی نہ کسی زور آور کا گھٹنا رکھا ہے اور سول جج سے لے کر مسٹر جسٹس تک جو جج یہ آواز نہ سنے اس کے خلاف بھی ہمیں اتنی ہی بڑی تحریک چلانی چاہیے جتنی ہم نے صدر پرویز مشرف اور صدر آصف علی زرداری کے خلاف چلائی تھی''۔ میرے دوست نے حیرت سے پوچھا ''کیا تم ملک میں بغاوت پھیلانا چاہتے ہو'' میں نے انکار میں سر ہلایا اور عرض کیا ''نہیں' انصاف۔ یہ ظلم ہو گا ہم صدر پرویز مشرف اور صدر آصف علی زرداری کی آمریت اور انا کا قلعہ توڑ کر ملک کے اندر جوڈیشل ڈکٹیٹر شپ کا ایک نیا قلعہ کھڑا کر دیں' یہ ظلم بھی ہو گا اور زیادتی بھی۔ قدرت نے ہمیں نرم انقلاب کا ایک موقع فراہم کیا ہے تو ہمیں

اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ہمیں ان تمام ججوں کے ہاتھ مضبوط کرنے چاہئیں جو انصاف قائم کرنے کی کوشش کریں اور ان تمام ججوں کا راستہ روکنا چاہیے جو جوڈیشل ڈکٹیٹر شپ کی کوشش کریں اور وہ جج خواہ کوئی بھی ہو ہمیں چاہیے ہم حکومت پر ججوں کے درست فیصلوں پر عملدرآمد کے لیے دباؤ ڈالیں اور ججوں کے غلط فیصلوں کی حوصلہ افزائی نہ کریں کیونکہ اسی سے ملک آگے بڑھ سکے گا"۔

میرے دوست نے بے چینی سے کرسی پر کروٹ بدلی اور جلدی سے بولا "لیکن یہ فیصلہ کون کرے گا کہ کون سا فیصلہ درست ہے اور کون سا غلط۔" میں نے فوراً جواب دیا "درست اور غلط فیصلے کا فیصلہ قانون' آئین یا دلائل نہیں کرتے' انسانی ضمیر کرتا ہے' پاکستان کے تمام قانون دان کہتے تھے آئین اور قانون کی روشنی میں معزول جج بحال نہیں ہو سکتے لیکن عوامی ضمیر کی عدالت نے آئین اور قانون کے خلاف فیصلہ دے دیا اور حکومت کو اس فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا چنانچہ آج کے بعد ججوں کے فیصلوں کی درستی اور غلطی کا فیصلہ عوام کا ضمیر کیا کرے گا' عوام چند سیکنڈ میں ججوں کے فیصلوں کا فیصلہ کر دیا کریں گے اور جس دن کسی جج نے کسی سمجھوتے' دباؤ یا ترغیب میں آ کر فیصلہ دیا اسی دن اس کا ڈی ڈے بھی شروع ہو جائے گا۔ عوام باشعور ہو چکے ہیں اور یہ لوگ اب کسی قیمت پر یہ شعور سرینڈر نہیں کریں گے چنانچہ افتخار محمد چودھری کو چاہیے وہ آج سے سول کورٹس سے لے کر سپریم کورٹ تک انصاف کے سارے نظام کو شفاف' فوری اور سستا بنا دیں' تمام مقدموں کے فیصلوں کی مدت طے کر دیں' کوئی کیس چھ ماہ سے اوپر نہ جائے' عدالتیں غریب اور بے بس لوگوں کے مقدمے مفت ہینڈل کریں' ڈسٹرکٹ سے لے کر صوبے تک اور صوبے سے لے کر سپریم کورٹ تک جوڈیشل کونسلیں بنا دی جائیں جن میں کوئی بھی شخص کرپٹ ججوں کے خلاف درخواست دے سکے' یہ کونسلیں ججوں کے خلاف انکوائری کریں اور جس جج کے خلاف کرپشن' اقربا پروری' فیورٹ ازم یا قانون سے تجاوز کا الزام ثابت ہو جائے اسے اسی وقت فارغ کر دیا جائے۔ جھوٹے مقدمے قائم کرنے والوں کو سنگین سزائیں دی جائیں' صدر سے لے کر عام شہری تک سب لوگ عدالت کے سامنے جواب دہ ہوں' حکومت کے ساتھ مل کر ججوں کی تنخواہوں اور مراعات میں پانچ سو فیصد اضافہ کر دیا جائے تا کہ جج کرپشن سے بچ سکیں اور جیلوں میں خصوصی ٹریبونل بھجوا کر معمولی جرائم میں قید مجرموں' قابل ضمانت جرائم کے شکار ملزمان اور وہ لوگ جو سزا پوری کر چکے ہیں ان کی رہائی کا بندوبست کرا دیں اور مظلوم کی صرف ایک درخواست زنجیر عدل کا کام کرے تا کہ ہم اپنی کوشش' اپنی سٹرگل پر فخر کر سکیں کیونکہ اگر ایسا نہ ہوا تو وہ تمام لوگ جو ہماری جدوجہد کو فرد واحد کے لیے کوشش قرار دے رہے تھے وہ ہم پر ہنسیں گے' وہ ہمارا مذاق اڑائیں گے"۔

یہ 29 لاکھ لوگ

ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان پاپولیشن ویلفیئر کی وفاقی وزیر ہیں' ڈاکٹر صاحبہ سیالکوٹ سے تعلق رکھتی ہیں اور سابق سپیکر چودھری امیر حسین کو شکست دے کر قومی اسمبلی پہنچی تھیں' ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان گزشتہ ہفتے امدادی سامان لے کر متاثرین کے کیمپوں میں گئیں' یہ سامان وزارت کے ملازمین کی ایک دن کی تنخواہ سے خریدا گیا تھا اور یہ سامان اس لحاظ سے مختلف تھا کہ ڈاکٹر صاحبہ پہلی بار زنانہ استعمال کی مخصوص اشیاء ساتھ لے کر گئی تھیں۔ متاثرین کے کیمپس میں سات لاکھ خواتین ہیں' ان میں 70 ہزار خواتین حاملہ ہیں' یہ تمام خواتین فطری عوامل سے بھی گزرتی ہیں چنانچہ کیمپس میں بڑے پیمانے پر ایسے سامان کی ضرورت ہے جو صرف خواتین کے لیے مخصوص ہے لیکن بدقسمتی سے امداد فراہم کرنے والے اداروں' این جی اوز اور انفرادی لوگوں کو یہ ''ضرورت'' یاد نہیں رہی چنانچہ کیمپوں میں پچھلے ایک ماہ سے بحرانی صورتحال تھی۔ ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان خاتون ہیں چنانچہ انہوں نے اس ضرورت کو ''انڈرسٹینڈ'' کیا' انہوں نے ایک ڈونر ایجنسی کی مدد سے خواتین کے لیے پچاس ہزار بیگ بنوائے اور یہ بیگ مختلف کیمپوں میں تقسیم کر دیئے۔ ڈاکٹر صاحبہ کا کہنا تھا یہ بیگ خواتین کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھے چنانچہ انہوں نے ان سب کی آنکھوں میں ممنونیت کے گہرے جذبات دیکھے۔ ڈاکٹر صاحبہ کا کہنا تھا یہ پچاس ہزار بیگ بہت کم ہیں چنانچہ امدادی سامان بھجوانے والے اداروں اور افراد کو خواتین کی اس ضرورت کا احساس کرنا چاہیے اور کیمپوں میں ایسے زیادہ سے زیادہ بیگ بھجوانے چاہئیں جن میں خواتین کی ضرورت کا سامان موجود ہو۔

ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان جب دورے کے لیے روانہ ہونے لگیں تو انہیں سیکورٹی کے نام پر ڈرانے کی کوشش بھی کی گئی لیکن وہ اس کے باوجود کیمپوں کے دورے پر نکل گئیں' پاکستان کے چند ادارے جان بوجھ کر ایسی اطلاعات پھیلا رہے ہیں جن کے نتیجے میں وفاقی وزراء' این جی اوز کے سربراہ' غیر ملکی ڈونر ایجنسیوں کے باس اور ملک کے بڑے تاجر اور صنعت کار کیمپوں میں جانے سے پرہیز کر رہے ہیں' اس سے جہاں متاثرین کے دل میں وفاق کے خلاف نفرت پیدا ہو رہی ہے وہاں کیمپوں کے اندر بھی کرپشن کا دور دورہ ہے۔ وفاقی حکومت اگر ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان کو مثال بنا کر دوسرے وزراء کو بھی کیمپوں کے دورے کا حکم دے اور یہ لوگ بھی روز کسی نہ

کسی کیمپ کا دورہ کریں تو حکومت کو کیمپوں میں موجود لوگوں کی حالت زار کا اندازہ بھی ہو جائے گا اور متاثرین کی ڈھارس بھی بندھے گی' یہ کیمپ حقیقتاً کسی بڑے انسانی المیے سے کم نہیں ہیں۔ ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان کو وہاں ایک اور تجربہ بھی ہوا' وہ جلالہ کیمپ کے متاثرین میں امدادی سامان تقسیم کر رہی تھیں' ان کے سامنے قطار لگی تھی اور اس قطار میں بے شمار لوگ کھڑے تھے' ان لوگوں میں ایک بزرگ خاتون بھی شامل تھی' اتنے میں وہاں ایک بزرگ آئے' انہوں نے اس خاتون کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹنا شروع کر دیا' وہ بزرگ اس خاتون کو پشتو میں گالیاں دے رہے تھے۔ ڈاکٹر فردوس عاشق نے اپنے عملے سے پوچھا "یہ بابا جی اس خاتون کو کیا کہہ رہے ہیں" ڈاکٹر صاحبہ کے عملے نے بتایا' بابا جی اس خاتون کے شوہر ہیں' وہ اسے قطار میں کھڑا دیکھ کر ناراض ہو رہے ہیں اور اسے گھسیٹ کر واپس لے جا رہے ہیں' امدادی سامان تقسیم کرنے کے بعد ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان اس بوڑھے جوڑے کے ٹینٹ میں چلی گئیں اور ان سے اس نفرت کی وجہ پوچھی' وہ بزرگ ڈاکٹر صاحبہ پر برس پڑے' ان کا کہنا تھا وہ جب سوات میں تھے تو طالبان انہیں امریکیوں کا ایجنٹ قرار دے کر مارتے تھے' جب فوج آئی تو انہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا' یہ لوگ وہاں سے نقل مکانی کر کے کیمپ میں آ گئے لیکن ان کے خاندان کے دوسرے افراد علاقے میں رہ گئے' ان کے بارہ جوان بیٹے' بھتیجے اور بھانجے پک اپ میں سوار ہوئے اور علاقے سے نکلنے لگے' اس دوران ایک مارٹر گولا اس پک اپ پر آ گرا اور ان کے خاندان کے بارہ جوان اسی جگہ شہید ہو گئے۔ اس بزرگ کا کہنا تھا ہماری نظر میں طالبان اور سیکورٹی فورسز میں کوئی فرق نہیں' وہ بھی ہم کو مارتے تھے اور یہ بھی ہمیں ہی نشانہ بنا رہے ہیں چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا ہم بھوکے مر جائیں گے لیکن حکومت کی طرف سے بھجوایا ہوا سامان نہیں لیں گے۔ ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان کو وہاں جا کر معلوم ہوا دونوں میاں بیوی نے آج تک کوئی امدادی سامان نہیں لیا تھا' ڈاکٹر صاحبہ نے جب سامان تقسیم کرنا شروع کیا تو خاتون بھوک سے مجبور ہو کر قطار میں کھڑی ہو گئی لیکن اس کا خاوند اسے گھسیٹ کر واپس لے آیا' ڈاکٹر فردوس عاشق نے ان کے ساتھ ان کے بیٹوں' بھتیجوں اور بھانجوں کی تعزیت کی اور حکومت کی طرف سے ان سے معافی مانگی۔ ڈاکٹر صاحبہ نے بزرگ جوڑے سے کہا "میں آپ کی بیٹی ہوں اور پختون اپنی بیٹیوں سے ناراض نہیں ہوتے" اس بات پر دونوں میاں بیوی قائل ہو گئے چنانچہ ڈاکٹر صاحبہ ان دونوں کو اپنے کیمپ میں لے کر آئیں' انہیں کھانا کھلایا' ان کا طبی معائنہ کرایا اور انہیں امدادی سامان دیا' اس سلوک پر وہ خاتون وفاقی وزیر کے گلے لگ کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

یہ صرف ایک کہانی نہیں بلکہ کیمپوں میں موجود ہر خاندان کے پاس ایک ایسی ہی خوفناک کہانی موجود ہے' یہ سب لوگ اپنے اپنے دل میں اپنے کسی عزیز رشتے دار کی نعش چھپا کر بیٹھے ہیں' یہ سب لوگ اپنے بھرے بھرائے گھر چھوڑ کر آئے ہیں' ان لوگوں کے اپنے گھر تھے' ان کی اپنی دکانیں تھیں' ان کی اپنی گاڑیاں تھیں' ان کے اپنے کھیت تھے اور ان کے اپنے باغ تھے' ان لوگوں کی فصلیں تک تیار تھیں' سوات سے ہر سال ایک ارب روپے کا فروٹ پنجاب اور سندھ آتا تھا' ان کے باغ پک چکے ہیں اور پھل درختوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہیں لیکن یہ

لوگ اپنے باغوں‘ اپنی زمینوں سے سینکڑوں میل دور دوسروں کے ٹکڑوں پر پڑے ہیں۔ آپ ان لوگوں کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا اندازہ لگائیے‘ نقل مکانی موت سے بدتر عذاب ہوتا ہے کیونکہ موت کے بعد انسان پرسکون ہو جاتا ہے لیکن نقل مکانی ایک ایسی موت ہوتی ہے جس کا ذائقہ انسان ہر سانس کے ساتھ جھیلتا ہے‘ یہ حقیقت ہے انسان جب اپنے گھر سے نکل کر دربدر ہوتا ہے تو اس کی ساری نفسیات بدل جاتی ہے اور وہ اگر واپس بھی آ جائے تو بھی اس کے جذبات کو اپنی جگہ پر واپس آنے میں کئی دہائیاں لگ جاتی ہیں‘ یہ لوگ بھی اس وقت اسی قسم کی کیفیت سے گزر رہے ہیں اور ہم نے اگر اس وقت ان لوگوں کو محبت نہ دی‘ ہم نے ان کے زخموں پر مرہم نہ رکھا‘ ہم نے ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان کی طرح ان لوگوں کو سینے سے لگا کر ان کے درد کو باہر نکالنے کا راستہ نہ دیا‘ ہماری حکومت نے انہیں پیار اور کیئر نہ دی اور پورے ملک نے اپنا سینہ ان کے لیے نہ کھولا تو یہ لوگ ان طالبان کو اپنا لیڈر مان کر واپس جائیں گے جن سے نفرت کی وجہ سے ان لوگوں نے سیٹلڈ ایریاز کا رخ کیا تھا لہٰذا ہم سب لوگوں کو فوری طور پر ان پر شک بند کر دینا چاہیے‘ یہ سب لوگ ہمارے بہن اور بھائی ہیں اور ان کے ساتھ بہنوں اور بھائیوں جیسا سلوک ہونا چاہیے۔ حکومت کو چاہیے یہ اپنے 92 وزراء کے مختلف گروپ بنائے اور یہ وزراء آٹھ آٹھ کے گروپ میں کیمپوں میں جائیں اور تین تین‘ چار چار دن کیمپوں میں گزار کر آئیں۔ صدر‘ وزیراعظم‘ چیئرمین سینٹ اور سپیکر صاحب بھی ہر ہفتے کیمپس کا دورہ کریں اور لوگوں سے فرداً فرداً مل کر ان کے مسائل سنیں۔ یہ لوگ اگر سندھ‘ پنجاب اور بلوچستان میں اپنے عزیزوں کے پاس جانا چاہتے ہیں تو ان کی رجسٹریشن کریں اور انہیں ریل کا مفت ٹکٹ دے کر وہاں پہنچا دیں تاکہ یہ لوگ عزت کے ساتھ یہ گرمیاں گزار سکیں اور فوج نے جو علاقے کلیئر کر دیے ہیں وہاں کی زمین اور باغ مالکان کے حوالے کر دیے جائیں تاکہ یہ لوگ اپنا پھل اور فصلیں سمیٹ سکیں اور ان کی فروخت سے اپنے نان نفقے کا بندوبست کر سکیں۔ حکومت فضائی بمباری اور شیلنگ بھی روک دے اور زمینی دستوں کو آگے بڑھائے اس سے اجتماعی نقصان بھی کم سے کم ہوگا‘ لوگوں کی املاک بھی محفوظ رہیں گی اور یہ لوگ کل کلاں اپنے گھروں میں دوبارہ آباد بھی ہو سکیں گے۔

یہ ایک نازک گھڑی ہے اگر ہم نے اس گھڑی میں احتیاط سے کام نہ لیا تو ان 29 لاکھ مہمانوں کو طالبان بنتے دیر نہیں لگے گی‘ یہ لوگ دلوں میں دشمنی کا بیج لے کر واپس جائیں گے اور یہ اس ملک کی بقاء کے لیے انتہائی خطرناک ہوگا۔

یس وی کین

لانگ مارچ سے دو دن پہلے ایک سینئر سیاستدان میرے ساتھ شرط لگانے کے لیے تیار تھے ان کا کہنا تھا ''یہ لانگ مارچ کامیاب نہیں ہوگا'' میں نے وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا ''اگر یہ لانگ مارچ کامیاب ہو گیا تو عوام کو اپنی طاقت کا اندازہ ہو جائے گا اور اس کے بعد ملک میں مارشل لاء لگانا ممکن نہیں رہے گا'' میں نے حیرت سے پوچھا ''لانگ مارچ کا مارشل لاء کے ساتھ کیا تعلق ہے؟'' سینئر سیاستدان نے قہقہہ لگایا اور جواب دیا ''تم اگر تاریخ کا مطالعہ کرو تو تمہیں معلوم ہوگا جس ملک کے عوام کو اپنی طاقت کا اندازہ ہو جاتا ہے' جنہیں لانگ مارچ کا ڈھنگ آ جاتا ہے اور جو اپنے حقوق کے لیے سڑکوں پر آ جاتے ہیں اس ملک میں مارشل لاء نہیں لگ سکتا'' میں خاموشی سے سنتا رہا' وہ بولے ''عوام پاکستان کی تاریخ میں 9 مارچ 2007ء کے بعد پہلی بار چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے لیے سڑکوں پر آئے اور اس وقت تک سڑکوں سے واپس نہیں گئے جب تک جنرل پرویز مشرف جیسا آمر پسپا نہیں ہوا''۔ میں ان کی بات سنتا رہا' وہ بولے ''یہ لانگ مارچ نظام کے خلاف عوام کی تیسری بغاوت ہے' پہلی بغاوت مارچ 2007ء کو شروع ہوئی تھی جس کے نتیجے میں سپریم کورٹ کے 17 جج افتخار محمد چودھری کو 20 جولائی 2007ء کو بحال کرنے پر مجبور ہوئے' جنرل پرویز مشرف نے یونیفارم اتاری' محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف کو پاکستان آنے کی اجازت دی' الیکشن کرائے اور اقتدار پاکستان پیپلز پارٹی کے حوالے کیا۔ دوسری بغاوت 13 جون 2008ء کے لانگ مارچ کی صورت میں سامنے آئی اور وہ بغاوت صدر پرویز مشرف کو تاریخ کے ریلے میں بہا لے گئی اور اب یہ عوام کی تیسری بغاوت ہے۔ اگر یہ بغاوت بھی کامیاب ہو گئی' اگر اس لانگ مارچ کے نتیجے میں افتخار محمد چودھری بحال ہو گئے تو عوام کو یقین ہو جائے گا وہ اکیلے بڑے بڑے بتوں کو پاش پاش کر سکتے ہیں چنانچہ اس کے بعد فوج اقتدار پر قبضہ کر سکے گی اور نہ ہی حکومت کا کوئی عہدیدار عوامی وعدوں سے پھر سکے گا اور یہ وہ روایت ہے جس کی اجازت اسٹیبلشمنٹ کبھی نہیں دے گی کیونکہ اس کے بعد جب بھی فوج بارکوں سے باہر آئے گی عوام سینہ کھول کر اس کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے اور فوج کو صدر پرویز مشرف کی طرح پسپائی اختیار کرنا پڑے گی''۔

میرے سینئر سیاستدان دوست خاموش ہوئے تو میں پوری طرح قائل ہو گیا چنانچہ میرا خیال تھا یہ لانگ مارچ کامیاب نہیں ہو گا' عوام سڑکوں پر نکلیں گے اور گورنر پنجاب سلمان تاثیر پولیس کے ذریعے ان کے سارے خواب کچل دیں گے اور اگر کسی نہ کسی طرح لانگ مارچ کے پانچ' دس ہزار شرکاء اسلام آباد پہنچنے میں کامیاب بھی ہو گئے تو رحمان ملک ان کی خواہشوں پر کوئی کنٹینر گرا دیں گے یوں یہ تحریک ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی لیکن 15 مارچ کا سورج ایک نئی تاریخ لے کر طلوع ہوا' میں نے سب سے پہلے مال روڈ لاہور سے پولیس کو پسپا ہوتے دیکھا' عوام نے پولیس کی ساری رکاوٹیں اٹھا کر دور پھینک دیں اور مال روڈ پر عوام کی حکومت قائم ہو گئی۔ اس کے بعد میاں نواز شریف کا قافلہ چلا تو رکاوٹیں ہٹتی چلی گئیں اور پولیس' انتظامیہ اور کنٹینرز پسپا ہوتے چلے گئے جس کے بعد ٹیلی ویژن سکرینوں پر عوام کا سیلاب ہی سیلاب دکھائی دینے لگا' یہ سیلاب اسلام آباد کی طرف بڑھا تو میں نے پہلی بار اسٹیبلشمنٹ کے ماتھے پر پسینہ دیکھا' حکومت کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس نے اس سیلاب کو روکنے کے لیے وہ تمام ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیئے جو اس ملک میں پچھلے 60 سال سے استعمال ہو رہے ہیں' پولیس بھی استعمال ہوئی' میڈیا کو دبانے کی کوشش بھی کی گئی' لفافوں اور بریف کیسوں کا بندوبست بھی کیا گیا اور سیاسی عہدوں کی آفرز بھی کی گئیں لیکن یہ تمام ہتھکنڈے ناکام ہو گئے اور حکومت اپنے اپنے ''کنٹینرز'' میں سمٹتی چلی گئی اور یہ وہ مرحلہ تھا جب طاقت کے سارے ستون ایک جگہ جمع ہوئے اور انہوں نے رات گئے معطل چیف جسٹس افتخار محمد چودھری' وکلاء تحریک کے راہنما چودھری اعتزاز احسن' میاں شہباز شریف اور میاں نواز شریف کو بھی ''لوپ'' میں لیا اور یوں اس مسئلے کا ایک پرامن حل تلاش کر لیا گیا۔ وزیراعظم صاحب نے تہجد کے وقت چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی بحالی کا اعلان کر دیا۔ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری بحال ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک خدشات موجود ہیں کیونکہ آپ اگر آصف علی زرداری کے ماضی کا تجزیہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا وہ زیادہ دیر تک دوسروں کے دباؤ میں نہیں رہتے اور یہ حقیقت ہے یہ فیصلہ ان سے زبردستی کرایا گیا تھا لہٰذا سوال یہ ہے کیا یہ کوئی نیا راستہ نہیں نکال لیں گے؟ صدر آصف علی زرداری نے ابھی تک عوام کے سامنے آ کر اس فیصلے کی تصدیق نہیں کی' صدر نے اس فیصلے کو دل سے تسلیم نہیں کیا چنانچہ آنے والے دنوں میں ایوان صدر اور سپریم کورٹ ایک بار دوبارہ ایک دوسرے کے سامنے ضرور آئیں گے۔

آپ اب دوسری صورتحال بھی ملاحظہ کیجئے' پاکستان میں عوام کو پہلی بار اپنی طاقت کا اندازہ ہوا' ماؤزے تنگ نے 1934ء میں کہا تھا'' جب تک کمزور لوگ اپنی کمزوری کو طاقت نہیں بناتے اس وقت تک انقلاب نہیں آتا''۔ یہ لانگ مارچ دیکھ کر محسوس ہوتا ہے عوام نے اپنی کمزوری کو اپنی طاقت بنا لیا ہے چنانچہ پہلی بار اسٹیبلشمنٹ کو پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ اگر عوام کے یہ جذبات' یہ اتحاد اور اپنے طاقتور ہونے کا یہ احساس اسی طرح آگے بڑھتا رہا تو مجھے یقین ہے کوئی طاقت پاکستان کو ترقی سے نہیں روک سکے گی۔ اگر لانگ مارچ کی یہ سپرٹ اسی طرح قائم رہی تو آج کے بعد پاکستان میں کوئی حکومت عوامی وعدوں سے مکر نہیں سکے گی' کوئی سیاستدان لوٹا نہیں بن سکے گا' کوئی

سیاسی جماعت ہارس ٹریڈنگ نہیں کر سکے گی' کوئی سلمان تاثیر اور کوئی رحمان ملک پولیس کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کر سکے گا' کوئی شوکت عزیز کراچی سٹیل ملز کا سودا نہیں کر سکے گا' کوئی حکمران امریکہ کو ڈرون حملوں کی اجازت نہیں دے سکے گا اور کوئی وزیر سرکاری خزانہ نہیں لوٹ سکے گا۔ عوام نے اسٹیبلشمنٹ کا ایک بت توڑ دیا ہے اگر عوام نے اپنے اس جذبے کو قائم رکھا تو ملک سے امریکی اثر و رسوخ بھی ختم ہو جائے گا' عوام دہشت گردی کا خاتمہ بھی کر سکیں گے اور یہ لوگ لانگ مارچ کی سپرٹ سے ملک سے بے انصافی' غربت' بدامنی' بے روزگاری اور بیماری بھی ختم کر سکیں گے۔ امریکہ کے موجودہ صدر باراک حسین اوباما نے اپنی الیکشن مہم کے دوران چینج یعنی تبدیلی کا نعرہ لگایا تھا' وہ اپنی ہر تقریر کے آخر میں کہتے تھے ''یس وی کین'' یعنی ہم لوگ ملک کے موجودہ حالات تبدیل کر سکتے ہیں۔ اوباما کا نعرہ سچ ثابت ہوا اور امریکہ کی تاریخ میں بھی پہلی بار سیاہ فام شخص طاقت کے سفید محل میں داخل ہو گیا۔ 9 مارچ 2007ء کو پاکستان کے عوام نے بھی افتخار محمد چودھری کا ساتھ دے کر ''یس وی کین'' کا نعرہ لگایا تھا' اس نعرے پر اس وقت پاکستان کے ہر طاقتور شخص نے قہقہہ لگایا تھا' یہ لوگ 15 مارچ 2009ء کی شام تک قہقہے لگاتے رہے تھے لیکن پھر رات ڈھلتے ہی پاکستانی عوام نے ثابت کر دیا ''یس وی کین''۔ جس کے بعد طاقتور لوگوں کے مکروہ قہقہے شرمندہ ہو گئے۔ میری دعا ہے ''یس وی کین'' کا یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہے اور طاقتور لوگوں کو عوام کی کمزوری پر دوبارہ قہقہے لگانے کی جرأت نہ ہو کیونکہ اب صرف کمزور لوگ ہی اس ملک کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ یہ ہم چیونٹیاں ہیں جنہوں نے حالات اور نظام کے ہاتھیوں کو شکست دینی ہے چنانچہ اس ملک کے کمزور لوگو! خدا کے لیے اب ''یس وی کین'' کا علم نیچے نہ ہونے دینا' آگے بڑھو منزل اب دور نہیں۔

آٹھ بجے

''میں بتاتا ہوں سچی محبت کیا ہوتی ہے'' ڈاکٹر نے مسکرا کر ہماری طرف دیکھا اور کافی کے مگ سے کھیلنے لگا' ہم غور سے اس کی بات سننے لگے' وہ گویا ہوا ''میں ایک دن کلینک میں بیٹھا تھا' یہ صبح کے ساڑھے سات بجے تھے' ایک بوڑھا مریض بھاگتا ہوا کلینک میں داخل ہوا' اس کے ماتھے پر پسینہ تھا' سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اور وہ بار بار دل پر ہاتھ رکھتا تھا' میرا اسٹاف تیزی سے اس کی طرف بڑھا' بوڑھے کی عمر اسی برس سے زائد تھی لیکن وہ اس کے باوجود چلنے پھرنے کی پوزیشن میں تھا' وہ نرس اور وارڈ بوائے سے بحث کرنے لگا' میں دفتر کے شیشے سے انہیں الجھتے ہوئے دیکھنے لگا' ذرا دیر بعد وارڈ بوائے میرے پاس آیا' میں اس وقت اخبار پڑھ رہا تھا' میں نے اخبار ایک طرف رکھا اور استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا' وارڈ بوائے نے بتایا بابا جی کے انگوٹھے پر چوٹ لگی تھی' ہم نے تین ہفتے پہلے ان کے ٹانکے لگا دیے تھے' وہ ٹانکے کھلوانے آئے ہیں' میں نے گھڑی کی طرف دیکھا اور وارڈ بوائے سے کہا' بابا جی سے کہو' میں آٹھ بجے کام شروع کروں گا' وہ آدھ گھنٹہ انتظار کر لیں' میں سب سے پہلے ان کے ٹانکے کھولوں گا' وارڈ بوائے گیا اور فوراً واپس آ گیا' میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا' وہ گھبرا کر بولا' بابا جی کو بہت جلدی ہے' انہوں نے آٹھ بجے کہیں پہنچنا ہے' وہ ہماری منت کر رہے ہیں' مجھے بابا جی اور وارڈ بوائے دونوں پر غصہ آ گیا' میں نے اخبار میز پر پٹخا اور شیشے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا' بابا جی دروازے کے بالکل سامنے کھڑے تھے' ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہے تھے' میں نے انہیں ڈانٹنے کی کوشش کی لیکن پھر ان کی حالت دیکھ کر ضبط کر گیا' میں نے انہیں بتایا کلینک کا وقت آٹھ بجے شروع ہوتا ہے' میں صرف اخبار پڑھنے کیلئے آدھ گھنٹہ پہلے آ جاتا ہوں' آپ اطمینان سے بیٹھ جائیں جوں ہی آٹھ بجیں گے' میں سب سے پہلے آپ کو دیکھوں گا' بابا جی نے گھڑی کی طرف دیکھا اور لجاجت بھری آواز میں بولے' بیٹا جی میں نے آٹھ بجے دوسرے ہسپتال پہنچنا ہے' میں لیٹ ہو رہا ہوں اگر میں پانچ منٹ میں یہاں سے نہ نکلا تو میں وقت پر وہاں نہیں پہنچ سکوں گا اور اس سے میرا بہت بڑا نقصان ہو جائے گا' پلیز میرے اوپر مہربانی کریں' بابا جی نے اس کے ساتھ ہی میری ٹھوڑی پکڑ لی' میرا غصہ چھت کو چھونے لگا لیکن میں بابا جی کی عمر دیکھ کر چپ ہو گیا' میں انہیں کلینک

میں لے آیا' ٹرے منگوائی اور احتیاط سے ان کے ٹانکے کھولنے لگا' بابا جی اس سارے عمل کے دوران بار بار گھڑی دیکھتے رہے"۔

ڈاکٹر رکا' اس نے لمبا سانس بھرا اور دوبارہ بولا "میں نے ٹانکے کھولتے ہوئے بابا جی سے پوچھا' آپ نے کہاں جانا ہے' بابا جی نے بتایا' فلاں ہسپتال میں ان کی بیوی داخل ہے اور وہ ہر صورت آٹھ بجے اس کے پاس پہنچنا چاہتے ہیں' میں نے پوچھا خدانخواستہ آپ کی بیگم کا آپریشن تو نہیں' بابا جی نے جواب دیا' نہیں میں روز صبح آٹھ بجے ہسپتال پہنچ کر اسے ناشتہ کراتا ہوں' مجھے ان کے جواب نے حیران کر دیا' میں نے پوچھا' کیوں' بابا جی بولے' وہ پانچ سال سے ہسپتال میں ہے اور میں پچھلے پانچ سال سے روز آٹھ بجے اس کے ہسپتال پہنچتا ہوں اور اسے اپنے ہاتھ سے ناشتہ کراتا ہوں' میں نے حیرت سے پوچھا' پانچ سال میں آپ کبھی لیٹ نہیں ہوئے' بابا جی نے انکار میں سر ہلا کر جواب دیا' جی نہیں آندھی ہو' طوفان ہو' سیلاب ہو' بارش ہو' سردی ہو یا گرمی' میں کبھی لیٹ نہیں ہوا' میں نے پوچھا لیکن کیوں؟ بابا جی مسکرائے' میں اس کا قرض ادا کر رہا ہوں' ہم نے پچاس برس اکٹھے گزارے ہیں' ان پچاس برسوں میں اس نے مجھے روزانہ آٹھ بجے ناشتہ کرایا تھا' ہمارے گھر میں نوکروں اور خادموں کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن سردی ہو' گرمی ہو' بارش ہو' سیلاب ہو' طوفان ہو یا آندھی وہ ہمیشہ ساڑھے چھ بجے جاگتی تھی' اپنے ہاتھوں سے ناشتہ بناتی تھی اور ٹھیک آٹھ بجے جب میں اوپر سے نیچے آتا تھا تو وہ میز پر ناشتہ لگا کر میرا انتظار کرتی تھی' ہم دونوں ہمیشہ اکٹھے ناشتہ کرتے تھے' اس نے پچاس برسوں میں کبھی اس معمول میں تعطل نہیں آنے دیا' وہ میرے ناشتے کی وجہ سے کبھی میکے نہیں گئی' پانچ برس پہلے وہ ہسپتال میں داخل ہوئی تو یہ ڈیوٹی میں نے سنبھال لی' اب میں روزانہ ساڑھے چھ بجے جاگتا ہوں اور آٹھ بجے سے پہلے اس کے کمرے میں پہنچ جاتا ہوں' میں ناشتہ بناتا ہوں اور پھر ہم دونوں اکٹھے ناشتہ کرتے ہیں' میری حیرت پریشانی میں داخل ہو گئی اور میں نے بابا جی سے پوچھا' آپ کی بیگم کو کیا بیماری ہے' بابا جی نے حسرت سے میری طرف دیکھا اور سسکی لے کر بولے' ان کی یادداشت ختم ہو گئی ہے' وہ اپنا ماضی' حال اور مستقبل بھول گئی ہیں' انہیں اپنا نام تک یاد نہیں' وہ دنیا کے کسی شخص کو نہیں پہچانتی' وہ بولنا تک چھوڑ چکی ہیں' انہیں پچھلے ایک سال سے کسی زبان کا کوئی لفظ یاد نہیں' ڈاکٹر انہیں جیلی پرسن کہتے ہیں"

ڈاکٹر رکا' اس نے لمبی سانس لی اور دوبارہ گویا ہوا "میں نے بابا جی سے کہا اس کا مطلب ہے آپ کی بیگم کو الزائمیر ہے!" بابا جی نے سر ہلا کر تصدیق کر دی' میں نے بابا جی سے پوچھا "کیا وہ آپ کو پہچانتی ہیں" بابا جی نے فوراً انکار میں سر ہلایا اور دکھی آواز میں بولے "وہ پانچ سال سے مجھے نہیں پہچان رہی' وہ یہ جانتی ہی نہیں' میں کون ہوں اور روز صبح آٹھ بجے اس کے پاس کیوں آ جاتا ہوں" ڈاکٹر نے رک کر ہماری طرف دیکھا اور اس نے کہانی کے سرے جوڑتے ہوئے بتایا "بابا جی کے ٹانکے اتر چکے تھے' میں نے سپرٹ سے ان کا زخم صاف کیا' اس پر پاؤڈر چھڑکا اور ان سے عرض کیا' آپ ہماری طرف سے فارغ ہیں' آپ جا سکتے ہیں' بابا جی نے اپنی چھڑی اٹھائی اور باہر کی طرف چل پڑے' میں ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا جب وہ باہر کے

دروازے کے پاس پہنچے تو میں نے ان سے آخری سوال پوچھا' میں نے ان سے پوچھا جب آپ کی بیگم آپ کو پہچانتی ہی نہیں' جب ان کی نظر میں وارڈ بوائے اور آپ میں کوئی فرق نہیں تو آپ روز آٹھ بجے یہ تکلیف کیوں کرتے ہیں' بابا جی نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولے' لیکن میں تو اسے پہچانتا ہوں' میں تو یہ جانتا ہوں وہ کون ہے اور میری زندگی میں اس کی کیا اہمیت' اس کی کیا حیثیت ہے' وہ رکے اور دوبارہ بولے یادداشت اس کی ختم ہوئی ہے میری نہیں لہٰذا وہ آخری سانس تک میری بیوی ہے اور میں اسی طرح اس کی خدمت کرتا رہوں گا' بابا جی رکے اور دوبارہ بولے محبت کا تعلق یادداشت سے نہیں ہوتا' اس کا جسم اور دماغ سے بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا' یہ دل میں پیدا ہوتی ہے اور دل کی آخری دھڑکن تک قائم رہتی ہے لہٰذا اگر آپ کا ساتھی آپ کو نہیں پہچانتا تو آپ کے دل میں اس کی محبت کم نہیں ہونی چاہیے' وہ رکے' انہوں نے سانس لیا اور دوبارہ بولے' میں کبھی کبھی سوچتا ہوں اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو کیا وہ مجھے فراموش کر دیتی؟ نہیں وہ مجھے کبھی فراموش نہ کرتی' وہ ٹھیک آٹھ بجے ناشتے کی ٹرے لے کر روز میرے سرہانے کھڑی ہو جاتی لہٰذا میں سوچتا ہوں اگر میری یادداشت جانے سے اس کی محبت کم نہیں ہو سکتی تو میری محبت کیسے کم ہو سکتی ہے' بابا جی کلینک کی سیڑھیاں اترے' باہر ٹیکسی کھڑی تھی' وہ ٹیکسی کی اگلی سیٹ پر بیٹھے' انہوں نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر مجھے ''وش'' کیا اور وہاں سے روانہ ہو گئے لیکن میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور مجھے اس لمحے محسوس ہوا سچی محبت کیا ہوتی ہے!''

ڈاکٹر رکا' اس نے آنسو پونچھے اور ہماری طرف دیکھ کر بولا'' اس کے بعد وہ بابا جی مجھے کبھی نہیں ملے لیکن جوں ہی آٹھ بجتے ہیں تو وہ مجھے فوراً یاد آ جاتے ہیں اور میں محبت کے تصور میں گم ہو جاتا ہوں' میری زندگی میں آٹھ بجے کا لمحہ ہمیشہ محبت لے کر آتا ہے اور میں اپنے ساتھ عہد کرتا ہوں میری بیوی مجھ سے جتنی محبت کرتی ہے' میں اس محبت کا قرض چکائے بغیر اس دنیا سے نہیں جاؤں گا'' ڈاکٹر خاموش ہوا تو ہم سب کی آنکھیں بولنے لگیں اور ہم انہیں خاموش کرنے کیلئے ٹشو تلاش کرنے لگے۔

پچاس پینی کا سکہ

میں نے سکہ ہوا میں اچھال دیا' سکہ اوپر اٹھا' چند سیکنڈ ہوا میں قلابازیاں کھائیں اور پھر بڑی تیزی سے نیچے آنے لگا' میں نے اپنی ہتھیلی آگے کر دی' اندازہ ذرا سا غلط ثابت ہوا' سکہ میرے انگوٹھے سے ٹکرایا اور فٹ پاتھ پر گر گیا' میں سکہ اٹھانے کیلئے جھکا لیکن سکے نے میرے آگے آگے دوڑ لگا دی' وہ فٹ پاتھ سے سڑک پر گرا اور دوڑتا ہوا سڑک کے درمیان میں پہنچ گیا' عین اس وقت وہاں سے ٹیکسی گزری' سکہ ٹیکسی کے پہیے سے ٹکرایا اور میری نظروں سے اوجھل ہو گیا' ہنری غور سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا' میں سکے سے مایوس ہو کر آگے چل پڑا' میں نے چند قدموں کے بعد واپس مڑ کر دیکھا تو ہنری سڑک کے درمیان کھڑا تھا اور گاڑیاں پوری رفتار سے اس کے دائیں بائیں سے گزر رہی تھیں' میں واپس آ گیا' ہنری سڑک پر جھک کر سکہ تلاش کر رہا تھا' وہ اس وقت بہت مضحکہ خیز لگ رہا تھا' ہوا تیز تھی' ہنری نے ایک ہاتھ سے وگ تھام رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ سے وہ کوٹ کے پھڑپھڑاتے دامن پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ شتر مرغ کی طرح جھک کر سکہ تلاش کر رہا تھا اور میں لندن کی سردی میں فٹ پاتھ پر کھڑا اسے دیکھ رہا تھا اور پریشان ہو رہا تھا' وہ سڑک کے عین درمیان بیٹھ گیا' اس نے ٹائی کی پین نکالی اور سڑک کی درزیں کھرچنے لگا' وہ چند منٹوں تک اس کام میں مصروف رہا اور بالآخر سکہ نکالنے میں کامیاب ہو گیا' اس نے فخر سے مجھے سکہ دکھایا اور گاڑیوں سے بچتا بچاتا واپس فٹ پاتھ پر آ گیا' اس کی ہتھیلی پر پچاس پینی کا سکہ تھا۔

دنیا میں ہر شخص کی کوئی نہ کوئی کمزوری' کوئی نہ کوئی شوق ہوتا ہے' میرا شوق اور میری کمزوری ''کامیابی'' ہے' مجھے کامیاب لوگوں سے ملنے کا بے انتہا شوق ہے' میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں وہ کون سا ہنر' وہ کون سا فارمولا ہے جو ایک عام سادہ سے شخص کو زمین سے اٹھا کر کامیابی کے آسمان پر پہنچا دیتا ہے' میں اس شوق کی تکمیل کیلئے آدھی دنیا پھر چکا ہوں اور اب تک بل گیٹس سے لے کر کوکا کولا کے سی آئی او تک درجنوں کامیاب لوگوں سے مل چکا ہوں لیکن مجھے ابھی تک کامیابی کی اصل وجہ معلوم نہیں ہو سکی' میں کامیابی کا کوئی کیپسول فارمولا دریافت نہیں کر سکا' ہنری بھی ان کامیاب لوگوں میں سے ایک تھا' ہنری کا شمار لندن کے سو امیر ترین لوگوں میں ہوتا تھا' وہ ''کیش اینڈ کیری'' کے

بزنس سے وابستہ تھا اور لوگ حقیقتاً اس کی کامیابی پر حیران تھے' اس نے یہ تمام تر کامیابی صرف پانچ برسوں میں حاصل کی تھی' میرا ایک دوست ہنری کا پارٹنر تھا' اس نے مجھے ہنری کی کہانی سنائی تو میں ''موٹی ویٹ'' ہو گیا' میرے دوست نے ہنری کے ساتھ میری ملاقات طے کر دی' میں لندن گیا' ہنری سے ملا' اس کے ساتھ کامیابی پر گپ شپ کی لیکن مجھے اس میں کوئی خاص بات محسوس نہ ہوئی' ہنری ایک عام درمیانے درجے کا گورا تھا' جس کی کوئی لمبی چوڑی فلاسفی نہیں تھی' اس کا کہنا تھا بس انسان کو دن رات محنت کرنی چاہیے اور وہ کبھی نہ کبھی ضرور کامیاب ہو جائے گا' اس کی بات میرے بنیادی خیال سے مختلف تھی' میرا خیال ہے محنت دنیا کا ہر شخص کرتا ہے لیکن کامیاب صرف چند لوگ ہوتے ہیں' ان چند لوگوں اور باقی لوگوں کی محنت میں کیا فرق ہے؟ یہ فرق بنیادی طور پر کامیابی کا فارمولا ہے لیکن ہنری یہ فرق واضح کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا' بات چیت کے دوران اس نے مجھے لنچ کی دعوت دی' میں نے اس کی دعوت قبول کر لی' وہ مجھے آکسفورڈ سٹریٹ کے ایک اطالوی ریستوران میں لے گیا' ہم نے کھانا کھایا اور پیدل اس کے دفتر کی طرف چل پڑے' میری جیب میں پچاس پینی کا سکہ تھا' میں نے یہ سکہ نکالا اور ہوا میں اچھالنا شروع کر دیا' سکہ ہوا میں اٹھتا' نیچے آتا اور میں اسے کیچ کر لیتا' سکے کی اسی اچھل کود کے دوران کہانی کا دوسرا حصہ شروع ہو گیا۔

ہنری کی ہتھیلی پر پچاس پینی کا سکہ تھا' اس نے مجھے سکہ دکھایا اور مسکرا کر بولا ''میری کامیابی کا آغاز پچاس پینی کے سکے سے ہوا تھا' لہٰذا میں دھات کے اس معمولی سکے کی قدر و قیمت سے واقف ہوں'' میں غور سے اس کی بات سننے لگا' وہ بولا ''مجھے جوئے کی لت تھی' میرے دن کا آغاز کسی نہ کسی کسینو سے ہوتا تھا اور جب تک اس کسینو کی ساری بتیاں اور سارے دروازے بند نہیں ہو جاتے تھے' میں جوا کھیلتا رہتا تھا' ایک رات میں اپنا سب کچھ ہار گیا' میرا مکان' میری گاڑی' میرا کوٹ' میری گھڑی حتیٰ کہ میری عینک تک جوئے میں چلی گئی' میں مایوس ہو کر جوئے کی میز سے اٹھنے لگا تو جیتتے ہوئے جواری نے جیب سے پچاس پینی کا سکہ نکالا اور میری طرف اچھال کر بولا' میری طرف سے پہلی خیرات قبول کرو' میں نے ہوا میں اچھلا ہوا سکہ دبوچ لیا اور چپ چاپ کسینو سے باہر آ گیا' میں بھکاری بن چکا تھا' میں آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر چلنے لگا'' ہنری رکا' اس نے لمبا سانس لیا اور اداس لہجے میں بولا ''دنیا میں بے شمار قسم کی ناکامیاں' شکستیں اور محرومیاں ہوتی ہیں' ہر ناکامی کا اپنا ایک دکھ ہوتا ہے لیکن تم ہارے ہوئے جواری کی ناکامی اور اس ناکامی کے دکھ کی گہرائی کا اندازہ نہیں لگا سکتے' یہ دکھ انسان کی آخری نس آخری سرے تک جاتا ہے' میں اس وقت اسی دکھ میں مبتلا تھا اور فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ چل رہا تھا' راستے میں مجھے پیشاب آ گیا' میں نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن جب بے بس ہو گیا تو میں نے ٹوائلٹ کی تلاش شروع کر دی' سڑک کے کونے میں ایک موبائل ٹوائلٹ تھا' یہ سکوں سے کھلنے والے ٹوائلٹ ہوتے ہیں' آپ ان میں سکہ ڈالتے ہیں تو ان کا دروازہ کھل جاتا ہے' میری جیب میں پچاس پینی کا وہ سکہ تھا جو مجھے میرے جواری دوست نے بھیک میں دیا تھا' میں نے سکہ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور ٹوائلٹ کے سامنے کھڑا ہو گیا' اتنے میں ٹوائلٹ کا دروازہ کھلا' اندر سے ایک ایشیائی باشندہ نکلا' وہ دروازہ پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور مسکرا کر بولا' میں دروازہ پکڑ کر کھڑا ہوتا ہوں' تم اندر

داخل ہو جاؤ' اس سے تمہارا سکہ بچ جائے گا' میں نے قہقہہ لگایا' سکہ واپس جیب میں ڈالا اور شکریہ ادا کر کے اندر داخل ہو گیا' میرا سکہ بچ گیا' مجھے آدھے گھنٹے میں دوسری بار خیرات ملی تھی' میں ٹوائلٹ سے نکلا تو سامنے ایک چھوٹی سے دکان تھی' اس دکان میں جوئے کی مشین لگی تھی' میں اس مشین کے سامنے رکا' جیب سے سکہ نکالا اور یہ سکہ مشین میں ڈال دیا' پھر وہاں ایک معجزہ ہوا اور مشین سے دھڑا دھڑ سکے نکلنے لگے' میں نے پچاس پنی سے ایک ہزار پاؤنڈ جیت لئے' میں نے وہ ہزار پاؤنڈ لئے اور بھاگ کر واپس کسینو پہنچ گیا' یہاں سے مجھ پر خوش قسمتی کے دروازے کھلتے ہیں' میں نے اس رات پانچ لاکھ پاؤنڈ جیت لئے' میں نے پانچ لاکھ پاؤنڈ کا چیک جیب میں ڈالا اور جوئے کو ہمیشہ ہمیشہ خیر باد کہہ دیا' مجھے یقین ہو گیا میں خوش قسمتی کے اس دور میں داخل ہو چکا ہوں جس میں مٹی سونا بن جاتی ہے' میں نے اگلے دن اس ایشیائی باشندے کی تلاش شروع کر دی جس نے ٹوائلٹ کا دروازہ پکڑ کر میرا پچاس پنی کا سکہ بچایا تھا' وہ مجھے دو ہفتے کی تلاش کے بعد ملا' وہ کیپ ڈرائیور تھا' میں نے اسے اپنے ساتھ شامل کر لیا' ہم نے کمپنی بنائی اور کیش اینڈ کیری کا بزنس شروع کر دیا' ہمارا کام چل نکلا' آج صرف پانچ سال بعد میرا شمار لندن کے امیر ترین لوگوں میں ہوتا ہے''۔

وہ سانس لینے کیلئے رکا' اس کی کہانی حقیقتاً حیران کن تھی' اس نے لمبا سانس بھرا اور مسکرا کر بولا ''آپ کو زندگی میں بے شمار سکے' بے شمار نوٹ ملتے ہیں' ان نوٹوں' ان سکوں میں آپ کے مقدر کا وہ سکہ بھی ہوتا ہے جو آپ کیلئے کامیابی کے سارے دروازے کھول دیتا ہے لیکن ہم لوگ اپنی بے وقوفی اور اپنے غرور کے باعث اپنے مقدر کا وہ سکہ کسی فٹ پاتھ پر پھینک دیتے ہیں' کسی جواری کی جیب میں ڈال دیتے ہیں یا پھر اپنے بیڈروم کے کسی کونے میں اچھال دیتے ہیں اور اس کے بعد اپنی محرومیوں اور اپنی ناکامیوں کا شکوہ کرتے ہوئے پوری زندگی گزار دیتے ہیں' یہ سکے' یہ چند نوٹ وہ چابیاں ہوتے ہیں جن سے مقدر کے دروازے کھلتے ہیں لیکن ہم ان چابیوں سے واقف نہیں ہوتے' تم بل گیٹس سے وارن بفٹ تک کسی کامیاب شخص کا پروفائل نکال کر دیکھ لو تمہیں اس کی ہتھیلی پر اسی قسم کا کوئی سکہ' کوئی نوٹ ملے گا'' وہ رکا اور ہنس کر بولا ''تمہیں معلوم ہے وہ شخص کون تھا جس نے ٹوائلٹ کا دروازہ پکڑ کر میرا پچاس پنی کا سکہ بچایا تھا'' میں خاموشی سے اس کی شکل دیکھتا رہا' وہ مسکرایا ''وہ تمہارا وہی پاکستانی دوست ہے جو تمہیں میرے پاس چھوڑ کر گیا ہے'' حیرت سے میرا منہ کھل گیا' ہنری نے قہقہہ لگایا' میرا ہاتھ کھولا' پچاس پنی کا سکہ میری ہتھیلی پر رکھا' شفقت سے میرا گال تھپتھپایا اور مجھے فٹ پاتھ پر چھوڑ کر اپنے دفتر میں داخل ہو گیا' میں نے سکے کو غور سے دیکھا' اس میں ہنری کی ہتھیلی کی گرمائش ابھی تک موجود تھی' میں مسکرایا اور سکہ اپنی جیب میں ڈال لیا۔

قدرت کا ہاتھ

میں نے زندگی میں اتنی بڑی گاڑی نہیں دیکھی تھی' گاڑی کی چمک دمک' سج دھج بتاتی تھی وہ ابھی ابھی کارخانے سے نکلی ہے' میرا اندازہ بڑی حد تک درست نکلا کیونکہ گاڑی کے سامنے ''اپلائیڈ فار'' لکھا تھا اور سیٹوں کے اوپر پلاسٹک کے کور چڑھے تھے' گاڑی رکی' پہلے باوردی شوفر باہر نکلا' اس نے جلدی سے پچھلا دروازہ کھولا اور اندر سے ایک خوبصورت نوجوان برآمد ہوا' نوجوان نے شاندار اطالوی سوٹ پہن رکھا تھا' اس کے جسم سے قیمتی خوشبو آرہی تھی اور اس کے چہرے پر امارت کی چمک تھی' وہ میرے قریب آیا' میں نے مرعوب ہو کر فوراً اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا' اس نے میرا ہاتھ پرے دھکیلا اور آگے بڑھ کر میرے ساتھ بغل گیر ہو گیا۔ اس کے معانقے میں بڑی گرم جوشی اور محبت تھی' میں اسے اندر لے آیا' وہ میرے سامنے بیٹھ گیا' میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے بعد تشریف آوری کی وجہ دریافت کی۔

وہ مسکرایا ''سر آپ نے مجھے یقیناً نہیں پہچانا ہو گا'' مجھے اس کا چہرہ جانا پہچانا لگ رہا تھا لیکن وہ مجھے پوری طرح یاد نہیں آ رہا تھا' اس نے بتایا ''سر میں پانچ برس پہلے آپ کے پاس نوکری کیلئے آیا تھا' آپ نے بے شمار دفتروں میں ٹیلی فون کئے تھے لیکن مجھے نوکری نہیں ملی تھی' مجھے اب وہ ذرا ذرا سا یاد آنے لگا' اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا ''سر میں نے مایوس ہو کر ایک پرائیویٹ دفتر میں نوکری کر لی' میں سات ماہ اس دفتر میں رہا لیکن پھر انہوں نے مجھے نکال دیا' اس کے بعد میں نے کاروبار شروع کر دیا' اللہ نے کرم کیا اور آج میں پاکستان کے بڑے تاجروں میں شمار ہوتا ہوں'' میرے لئے اس کی بات حیران کن تھی' میں نے اس سے پوچھا ''صرف چار پانچ برسوں میں اتنی بڑی تبدیلی'' وہ مسکرایا ''سر میں آپ کے ساتھ اپنی کامیابی ہی ڈسکس کرنے آیا ہوں' مجھے جو بھی دیکھتا ہے وہ میری کامیابی کے بارے میں مشکوک ہو جاتا ہے لیکن سر میرے ساتھ ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا' مجھے یقین ہے آپ بھی جب یہ واقعہ سنیں گے تو آپ بھی حیران ہو جائیں گے' سر یہ میری زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ تھا'' مجھے نوجوان کے حالات میں دلچسپی محسوس ہونے لگی' اس نے بتایا ''سر یہ آج سے ٹھیک چار برس پہلے کی بات ہے' رات کے نو بجے تھے' اسلام آباد میں شدید سردی تھی' میرے ایک دوست کی والدہ بیمار تھیں' میں ان کی عیادت

کیلئے ہسپتال گیا' مجھے مریضہ کا کمرہ معلوم نہیں تھا لہٰذا میں پرائیویٹ وارڈ کے مختلف کمروں کا جائزہ لیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا' میں نے ایک کمرے کے دروازے پر دستک دی' اندر سے کسی خاتون کی آواز آئی' کم اِن' میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا' اندر بیڈ پر ایک بزرگ لیٹے تھے' ان کی ناک پر آکسیجن کا ماسک چڑھا تھا' وہ ناف تک برہنہ تھے اور ان کی چھاتی پر بے شمار تاریں' پائپ اور ٹونٹیاں لگی تھیں' ان کے بیڈ کے گرد مختلف قسم کی سکرینیں تھیں اور ان سکرینوں پر لہریں سی چل رہی تھیں' باباجی کے سرہانے درمیانی عمر کی ایک نرس کھڑی تھی' میں جونہی اندر داخل ہوا وہ تیزی سے میری طرف مڑی اور تلخ آواز میں بولی' آپ اب آئے ہیں' ہم لوگ دو دن سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں' شرم آنی چاہیے آپ کو' میں گھبرا گیا' وہ واپس باباجی کی طرف مڑی' ان کے کان پر جھکی اور آہستہ آواز میں بولی' باباجی آپ کا بیٹا آ گیا' باباجی نے آہستہ آہستہ پلکیں اٹھائیں' دھندلی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ مجھے محسوس ہوا وہ نیند کی دواؤں کے زیر اثر ہیں' میں نے کچھ بولنا چاہا لیکن نرس نے مجھے گھور کر دیکھا اور اسی تلخ آواز میں بولی' "اب آپ وہاں کیوں کھڑے ہیں' آگے آئیں" میں آگے آ گیا' اس نے میرا ہاتھ باباجی کے ہاتھ میں دیا اور ان کے کان پر جھک کر بولی' باباجی انہیں پکڑ لیں' اب انہیں جانے نہ دیجئے گا' باباجی نے میرا ہاتھ گرفت میں لے لیا' ان کے کھردرے ہاتھ میں بڑی حدت تھی' نرس نے گھڑی کی طرف دیکھا' ہاتھ ہلایا اور باہر چلی گئی۔

میں باباجی کے قریب سٹول پر بیٹھ گیا' باباجی بڑے پیار سے میرا ہاتھ سہلانے لگے' وہ کبھی میری انگلیاں پکڑتے' کبھی انگوٹھے کو گرفت میں لیتے اور کبھی کلائی پکڑ لیتے' میں نے محسوس کیا وہ میرے ہاتھ کو اپنے حافظے میں محفوظ کر رہے ہیں' میں نے یہ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی لیکن باباجی میرا ہاتھ چھوڑنے کیلئے تیار نہیں تھے چنانچہ میں وہاں ٹک کر بیٹھ گیا اور ساری رات ان کے قریب بیٹھا رہا' میری پشت پر کھڑکی تھی' اس کھڑکی کی کسی درز سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی' یہ ہوا سیدھی میری پشت سے ٹکراتی تھی' جس کے نتیجے میں میری ریڑھ کی ہڈی برف ہو گئی' میں نے آدھی رات کے قریب سوچا میں اٹھ کر کھڑکی بند کر دیتا ہوں' میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن باباجی نے میرے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کر دی لہٰذا میں دوبارہ بیٹھ گیا' اسی عالم میں بیٹھے بیٹھے صبح ہو گئی' صبح کے وقت باباجی کا ہاتھ ٹھنڈا ہونے لگا' مشینوں کی لکیروں کی فارمیشن بدلنے لگی اور وہ مشکل مشکل سانس لینے لگے' میں ہسپتال کے عملے کو بلانے کیلئے اٹھنے لگا تو انہوں نے میرا ہاتھ دبا لیا' میں دوبارہ بیٹھ گیا' میں عجیب کشمکش کا شکار تھا' میں ڈاکٹروں کو بلانا چاہتا تھا لیکن باباجی میرا ہاتھ چھوڑنے کیلئے تیار نہیں تھے' اسی کشمکش کے دوران باباجی کی سانسیں بند ہو گئیں' مشینوں کی لکیریں سیدھی ہوئیں اور آکسیجن کے پمپ نے سکڑنا پھیلنا بند کر دیا۔ میں نے آہستگی سے اپنا ہاتھ نکالا اور ڈاکٹر کو بلانے کیلئے بھاگ کھڑا ہوا' ڈاکٹر آئے' انہوں نے انہیں شاک دیئے لیکن باباجی دنیا سے گزر چکے تھے۔ وہ سب دکھی سے ہو کر میری طرف پلٹے' انہوں نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے' باباجی کے منہ پر چادر ڈالی اور باہر نکل گئے میں بھی ان کے پیچھے چلتا ہوا ڈاکٹر کے دفتر آ گیا۔ میں نے بڑے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا' یہ بزرگ کون تھے'

انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور دکھی آواز میں بولے "کیا یہ آپ کے والد صاحب نہیں تھے؟ میں نے شرمندہ سا ہو کر جواب دیا "نہیں سر میں نے تو انہیں زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا ہے" ڈاکٹر صاحب مزید حیران ہو گئے "یہ کیسے ہو سکتا ہے! ہم تو آپ کو ان کا بیٹا سمجھ رہے تھے۔ میں نے اس کے بعد انہیں ساری کہانی سنا دی جس کے بعد انہوں نے مجھے بابا جی کی کہانی سنائی' ان کا کہنا تھا بابا جی کراچی کے رہنے والے تھے' کسی کام کے سلسلے میں اسلام آباد آئے تھے لیکن انہیں ہارٹ اٹیک ہو گیا' دنیا میں ان کا صرف ایک بیٹا تھا' بیٹا لندن میں تھا' انہوں نے ہمیں اس کا نمبر دیا' ہم نے بیٹے سے رابطہ کیا' اس کا موبائل بند تھا' ہم نے اس کے موبائل میں پیغام ریکارڈ کرا دیا' ہم بار بار فون کرتے رہے' پیغام ریکارڈ کراتے رہے مگر اس سے رابطہ نہ ہو سکا' اسی دوران آپ آ گئے تو نرس آپ کو ان کا بیٹا سمجھ کر ان کے پاس بٹھا کر چلی گئی' ڈاکٹر صاحب نے اس کے بعد مجھ سے پوچھا "لیکن آپ نے اس وقت کیوں نہ بتایا" میں نے جواب دیا ڈاکٹر صاحب جب انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا تو مجھے محسوس ہوا میرا ہاتھ ان کی آخری امید ہے' مجھ میں یہ امید توڑنے کا حوصلہ نہیں تھا چنانچہ میں ساری رات چپ چاپ ان کے پاس بیٹھا رہا' ڈاکٹر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' میری پلکیں بھی گیلی ہو گئیں اور میں روندھے ہوئے گلے کے ساتھ باہر آ گیا اور اس کے بعد کبھی اس ہسپتال کی طرف نہیں گیا۔

وہ خاموش ہو گیا' اس کی پلکوں پر موتی چمک رہے تھے' کمرے میں بڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی' میں نے توقف کے بعد پوچھا "لیکن اس واقعے کا آپ کی کامیابی کے ساتھ کیا تعلق" وہ مسکرایا "پتہ نہیں سر لیکن میرا خیال ہے میری کامیابی اور یہ واقعہ کسی نہ کسی سطح پر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں" میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا' وہ گویا ہوا "سر وہ دن ہے اور آج کا دن ہے میں نے مٹی کو ہاتھ لگایا تو وہ سونا ہو گئی' میں نے جیب سے ایک روپیہ نکالا تو وہ ایک کروڑ بن کر واپس آ گیا' آپ میری قسمت کا اندازہ لگائیے میں نے ستمبر میں مظفر آباد میں ایک پلازہ خریدا تھا' 8 اکتوبر 2005ء کو زلزلہ آیا' اس پلازے کے آگے پیچھے' دائیں بائیں تمام عمارتیں گر گئی تھیں لیکن اس عمارت کو خراش تک نہ آئی۔ میں جس بینک میں اکاؤنٹ کھول دیتا ہوں یقین کریں اس بینک کے ریونیو میں اضافہ ہو جاتا ہے اور میں جس کاغذ پر دستخط کر دیتا ہوں یقین کریں کاغذ کا وہ ٹکڑا دو چار کروڑ روپے کا ہو جاتا ہے چنانچہ مجھے محسوس ہوتا ہے میں نے جب اس بابا جی کو اپنا ہاتھ پکڑایا تھا تو قدرت نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا" وہ خاموش ہو گیا' میں نے اس سے پوچھا "وہ کون سا ہاتھ تھا" اس نے اپنا دائیاں ہاتھ آگے بڑھا دیا' میں اپنی کرسی سے اٹھا' میں نے وہ ہاتھ پکڑا اور اپنی گیلی آنکھیں اس کی ہتھیلی پر رکھ دیں' یہ میری زندگی کا پہلا جنتی ہاتھ تھا۔

دس ڈالر کا نوٹ

میں نے پچھلے دنوں ایک بزنس میگزین میں "لی آئیا کوکا" کا ایک انٹرویو دیکھا تو میں چونک اٹھا' میں 1984ء سے "لی آئیا کوکا" کا فین ہوں' میں اس وقت آٹھویں کلاس کا طالب علم تھا جب میں نے اخبار میں پڑھا امریکہ کی ایک کارساز کمپنی کرسلر دیوالیہ ہوگئی ہے اور صدر ریگن نے اسے بچانے کیلئے نہ صرف اپنا جاپان کا دورہ منسوخ کر دیا ہے بلکہ صدر نے اپنا دفتر بھی کرسلر کمپنی کے ہیڈ کوارٹر میں منتقل کر دیا ہے' انہی دنوں میں نے اخبار میں صدر ریگن کی ایک تصویر دیکھی جس میں وہ ایک سفید فام شخص کے کندھے پر ہاتھ رکھے مسکرا رہے تھے' تصویر کے نیچے کیپشن تھا "امریکی صدر کرسلر کے نئے چیف ایگزیکٹو لی آئیا کوکا کے ساتھ" میرے لئے یہ نام بہت دلچسپ اور انوکھا تھا لہٰذا یہ نام میرے دماغ سے چپک گیا' انہی دنوں میں نے خبر پڑھی "لی آئیا کوکا" نے امریکہ کی تاریخ میں پہلی بار کانگریس سے بینک گارنٹی لے لی' بہرحال ان دنوں میں عمر کے جس حصے میں تھا اس میں ان تمام باتوں کا ادراک نہیں ہوتا۔ مجھے بھی یہ ساری باتیں سمجھ نہ آئیں۔ بس لی آئیا کوکا اپنے نام کی انفرادیت کی وجہ سے میرے ذہن میں رہ گیا' 1991ء میں میں یونیورسٹی میں تھا تو میں پہلی بار تفصیل کے ساتھ "لی آئیا کوکا" سے متعارف ہوا' ہمارے ایک استاد تازہ تازہ امریکہ سے لوٹے تھے اور وہ وہاں سے لی آئیا کوکا کی آٹو بائیو گرافی "لی آئیا کوکا...... این آٹو بائیو گرافی" لائے تھے' یہ کتاب ولیم نوواک اور لی آئیا کوکا نے مل کر لکھی تھی' میں نے یہ کتاب ان سے لی اور پڑھنا شروع کر دی' میں جوں جوں یہ کتاب پڑھتا گیا میں توں توں لی آئیا کوکا کی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہوتا چلا گیا اور میرے اوپر حیرتوں کے نئے باب کھلتے چلے گئے۔

لی آئیا کوکا 15 اکتوبر 1924ء کو پنسلوینیا کے ایک چھوٹے سے قصبے ایلن ٹاؤن میں پیدا ہوا' اس کے والدین اٹلی سے نقل مکانی کر کے امریکہ پہنچے تھے' اس کے والدین نے اس کا نام لیڈو انتھونی آئیا کوکا رکھا تھا' والدین غریب تھے' آئیا کوکا کو پڑھنے کا شوق تھا لہٰذا اس نے جوں توں یونیورسٹی سے انڈسٹریل انجینئرنگ میں گریجوایشن کی اور کارساز کمپنی فورڈ میں انجینئر بھرتی ہو گیا' اس نے دو سال یہ کام کیا' پھر اسے محسوس ہوا وہ اس کام کیلئے نہیں بنا' وہ فیکٹری کے جنرل منیجر سے ملا اور موجودہ تنخواہ سے آدھے معاوضے پر سیلز ڈیپارٹمنٹ میں چلا گیا' وہاں جا کر اس کی ترقی کو پر لگ گئے' اسے گاہکوں کے چہرے پڑھنے کا ملکہ حاصل تھا اور وہ بہت جلد مارکیٹ

کا رخ بھانپ لیتا تھا چنانچہ اس نے سیلز کے ساتھ ساتھ کمپنی کو گاڑیوں کے نئے ڈیزائن بنا کر دینے شروع کر دیئے فورڈ کی مشہور گاڑی MUSTANG بھی لی آیا کوکا ہی کی تخلیق تھی اس کے بنائے ماڈلوں نے کمپنی کے کاروبار میں کئی گنا اضافہ کر دیا اور لی آیا کوکا ترقی کرتا چلا گیا یہاں تک کہ وہ فورڈ کمپنی کا صدر بن گیا' 1975ء میں جب اس کی عمر محض پچاس برس تھی تو لوگ اسے آٹو موبائل کا آئین سٹائن کہتے تھے' 1978ء میں اس نے فورڈ کو دو نئے ڈیزائن دیئے' ایک چھوٹی کار تھی اور دوسری منی وین یا فیملی کار' اس وقت تک امریکہ میں اس قسم کا کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا' امریکی لوگ بڑی اور مضبوط گاڑیوں کے عادی تھے' یہ ڈیزائن جب بورڈ آف گورنرز کے سامنے پیش ہوئے تو کمپنی کے چیف ایگزیکٹو ہنری فورڈ تو نے دونوں ڈیزائن مسترد کر دیئے' لی آیا کوکا اور فورڈ میں اختلافات پیدا ہوئے اور اس نے استعفیٰ دے دیا۔ ان دنوں کرائسلر کمپنی دم توڑ رہی تھی' کرائسلر کبھی امریکہ کی سب سے بڑی آٹو موبائل کارپوریشن ہوتی تھی لیکن پے در پے نقصانات کے باعث وہ دیوالیہ ہو رہی تھی۔ اس وقت کمپنی کے ڈائریکٹروں نے سوچا اگر کسی طرح لی آیا کوکا کرائسلر کے ساتھ وابستہ ہو جائے تو کمپنی ایک بار پھر اپنے قدموں پر کھڑی ہو جائیگی' لی آیا کوکا نے یہ چیلنج قبول کر لیا۔ اس نے ہڈ حرام ملازم فارغ کئے' کمپنی کی یورپی ڈویژن فروخت کر دی اور فورڈ کے بعض اچھے ورکرز کو کرائسلر میں لے آیا لیکن کمپنی میں جان پیدا نہ ہوئی' اسے محسوس ہوا اگر کمپنی کو کہیں سے دو بلین ڈالر مل جائیں تو کمپنی دوبارہ زندہ ہو سکتی ہے مگر کوئی بینک کرائسلر کو قرضہ دینے کیلئے تیار نہیں تھا' اس نے یورپ کے ایک بینک سے مذاکرات کئے' بینک قرضہ دینے کیلئے تیار ہو گیا لیکن اس نے ایک عجیب و غریب شرط رکھ دی' بینک نے کہا اگر امریکی حکومت گارنٹی دے تو ہم کمپنی کو ڈیڑھ بلین ڈالر دینے کیلئے تیار ہیں' یہ ایک ناقابل عمل شرط تھی لیکن لی آیا کوکا نے کوشش کا فیصلہ کیا' اس نے ریگن سے بات کی اور ریگن نے اس کا کیس کانگریس کے سامنے رکھ دیا' کانگریس نے اسے طلب کر لیا' لی آیا کوکا نے کانگریس میں جس خوبصورتی سے اپنا موقف پیش کیا وہ بذات خود ایک تاریخ ہے' اس نے کہا اگر کرائسلر بند ہو گئی تو یہ امریکہ جیسی سپر پاور کی شکست ہو گی' دنیا یہ کہے گی جو امریکہ ایک کارساز کمپنی نہیں چلا سکتا وہ دنیا پر خاک حکمرانی کرے گا' اس نے بتایا اگر کرائسلر بند ہو گئی تو 2 لاکھ امریکی بے روزگار ہو جائیں گے' امریکی کاریں دنیا میں اپنی حیثیت کھو بیٹھیں گی اور ہم لوگ شرمندگی سے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے وغیرہ۔ قصہ مختصر لی آیا کوکا نے کانگریس کو قائل کر لیا' کانگریس نے بینک کو گارنٹی دے دی' کرائسلر کو ڈیڑھ بلین ڈالر مل گئے۔

لی آیا کوکا نے فوری طور پر وہ دونوں ماڈل بنوائے جن کی وجہ سے اسے فورڈ چھوڑنا پڑی تھی ''کے کار'' کرائسلر کی ایک چھوٹی کار تھی' جس وقت یہ گاڑی مارکیٹ میں آئی اس وقت امریکہ میں تیل کا بحران پیدا ہو چکا تھا' یہ ایک ہلکی پھلکی گاڑی تھی جو کم پٹرول استعمال کرتی تھی' یہ امریکہ کی پہلی چھوٹی کار تھی لہٰذا دیکھتے ہی دیکھتے ''کے کار'' پوری امریکی مارکیٹ پر چھا گئی' منی وین کرائسلر کی دوسری بڑی پراڈکٹ تھی' یہ گاڑی بے شمار مقاصد پورے کرتی تھی' اس میں پورا خاندان آ سکتا تھا' اسے لوگ ٹرانسپورٹیشن کے لئے بھی استعمال کر سکتے تھے' یہ گھر' فیکٹری' دکان اور مارکیٹ ہر جگہ استعمال ہو سکتی تھی' اس گاڑی نے بھی کمال کر دیا' کرائسلر کمپنی نے اپنی صرف ان دو

پراڈکٹس کے ذریعے وقت سے کہیں پہلے سارا قرضہ ادا کر دیا' 80ء کی دہائی کے آخر میں لی آئیاکوکا نے اے ایم سی اور جیپ کے نام سے مزید دو گاڑیاں متعارف کرائیں ان گاڑیوں نے بھی اچھا بزنس کیا' ریگن لی آئیاکوکا کے بہت بڑے فین تھے' وہ کہا کرتے تھے " لی آئیاکوکا کو اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو متاثر کرنے کی بے پناہ صلاحیتیں دے رکھی ہیں" شاید یہی وجہ تھی صدر ریگن نے 1982ء میں لی آئیاکوکا کو مجسمہ آزادی فاؤنڈیشن کا سربراہ بنا دیا' لی آئیاکوکا نے عوام سے اپیل کی "ہم مجسمہ آزادی کی تزئین و آرائش کرنا چاہتے ہیں' یہ مجسمہ پوری امریکی قوم کا مشترکہ اثاثہ ہے' میری خواہش ہے تمام امریکی اس قومی خدمت میں ہمارا ساتھ دیں' اس کے الفاظ نے جادو کر دیا اور چند ہی دنوں میں 540 ملین ڈالر جمع ہو گئے۔

میں 2002ء میں امریکہ گیا تو میں اس کے دفتر چلا گیا' میں نے اس کے سیکرٹری سے 10 منٹ کا وقت لیا تھا' ٹھیک دس منٹ بعد یہ ملاقات ختم ہو گئی لیکن ایک بڑے انسان کی صحبت میں گزارے یہ دس منٹ میری زندگی کا اثاثہ تھے' اس ملاقات کے دوران میں نے اس سے صرف ایک سوال پوچھا' میں نے پوچھا " آپ کی کامیابی کا کیا راز ہے!" اس نے قہقہہ لگایا " میرا والد"۔ میں حیران ہو گیا۔ اس نے بتایا " میرا والد ہفتے میں ایک دن مجھے ڈنر کیلئے کسی اچھے ریسٹورنٹ میں لے کر جاتا تھا' وہ کرسی پر بیٹھتے ہی بیرے کے ہاتھ پر دس ڈالر رکھ دیتا تھا اور اس سے کہتا تھا' یہ تمہاری ٹپ ہے' ہم ڈنر کے لئے آئے ہیں اور اب ہمارا ڈنر خراب نہیں ہونا چاہئے' اس کے بعد وہ ویٹر تمام گاہکوں کو چھوڑ کر ہماری خدمت میں جت جاتا تھا' میں نے والد کی اس عادت سے سیکھا اگر آپ کسی سے کام لینا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اسے اس کا حصہ دے دیں' میں نے اسے اپنی زندگی کا اصول بنا لیا' پوری دنیا میں لوگ اپنے ورکروں کو سال کے آخر میں بونس دیتے ہیں لیکن میں ہمیشہ سال کے شروع میں اپنے ورکروں کو اکٹھا کرتا ہوں' ان سے کہتا ہوں' تم لوگ تخمینہ لگاؤ ہم سال کے آخر میں کتنا منافع کمائیں گے' وہ تخمینہ لگاتے ہیں' میں اس تخمینے کے مطابق انہیں سال کے شروع میں بونس دے دیتا ہوں اور اس کے بعد ان سے کہتا ہوں اب مجھے ٹارگٹ کے مطابق پیسہ کما کر دیں اور اس کے بعد ورکر کمال کر دیتے ہیں' میرے اس فارمولے کے باعث مجھے آج تک کوئی نقصان نہیں پہنچا' رہی کارپوریٹ لائف کی بات تو اس کیلئے چار اصول ہیں۔ سب سے پہلے آپ یہ فیصلہ کریں آپ نے کرنا کیا ہے' دوسرا اس کام کیلئے دنیا کے بہترین لوگ منتخب کریں' تیسرا اپنی ترجیحات طے کریں اور چوتھا چاہے ایک انچ ہی سہی اپنے ٹارگٹ کی طرف روزانہ تھوڑی تھوڑی پیش رفت کریں آپ کبھی ناکام نہیں ہوں گے" میٹنگ ختم ہو گئی' میں باہر آ گیا' لفٹ سے نیچے اترتے ہوئے میں نے سوچا اگر انسان چاہے تو وہ دس ڈالر کے نوٹ سے بھی زندگی کا سب سے بڑا اصول وضع کر سکتا ہے اور وہ دس ڈالر کے نوٹ سے بھی دنیا کا بہت بڑا بزنس مین بن سکتا ہے۔

ایک بڑی فورس

یہ آج سے پانچ برس پرانی بات ہے۔ ہم چار دوست اکٹھے رہتے تھے، ہمارے گھر قریب قریب تھے، ہم صبح، دوپہر اور شام کو ایک دوسرے سے ملتے تھے‘ ہم سب ایک جیسے حالات سے دو چار تھے‘ ہم سب کی زندگیوں میں بے ترتیبی، بے سکونی اور بے چینی تھی۔ ہم ایک مشکل سے نکلتے تھے تو دوسری میں پھنس جاتے تھے، ہماری ایک پریشانی ختم ہوتی تھی تو دوسری کندھوں پر آ بیٹھتی تھی‘ ہم میں سے تین عام دنیا دار قسم کے لوگ تھے لیکن ہمارا چوتھا ساتھی دین دار، تہجد گزار اور صوفی منش شخص تھا، وہ چوبیس گھنٹے باوضو رہتا تھا، اس کے ہونٹوں پر ہر وقت ذکر چلتا رہتا تھا مگر اس عبادت اور ریاضت کے باوجود اس کی زندگی بھی ہماری طرح بے سکونی اور عدم استحکام کا شکار تھی۔ وہ بھی ہماری طرح ہر وقت پریشان اور بے چین رہتا تھا۔ ایک دن ہم چاروں ایک درویش کے پاس حاضر ہو گئے۔

درویش ایک دلچسپ شخص تھا، وہ بیک وقت ایک کامیاب تاجر، ایک باعمل عالم، ایک تارک الدنیا صوفی اور ایک سخت مزاج منتظم تھا۔ وہ ہم سب کا مشترکہ دوست تھا، ہم سب اس کے محل میں اس کے سامنے بیٹھ گئے، وہ اڑھائی ایکڑ کے ایک بڑے محل میں رہتا تھا لیکن اس کا کمرہ بہت سادہ بلکہ بہت غریبانہ تھا، پورے کمرے کی واحد قیمتی چیز گکھڑ منڈی کی دس بائی آٹھ فٹ کی بوسیدہ سی دری تھی، درویش کے پاس کپڑوں کے صرف دو جوڑے تھے، وہ چوبیس گھنٹے میں صرف ایک بار کھانا کھاتا تھا اور ہفتے میں پانچ دن روزے رکھتا تھا۔ اس نے ہماری پریشانیاں سن کر قہقہہ لگایا اور ہنستے ہنستے بولا ”تم لوگ غلط انداز سے زندگی گزار رہے ہو، تمہاری زندگی کی ترتیب غلط ہے لہٰذا تمہاری زندگیوں میں سکون اور آرام کیسے آ سکتا ہے، تمہاری پریشانیاں کیسے کم ہو سکتی ہیں!“ ہم نے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا، اس نے مسکرا کر چائے کے کپ ہمارے ہاتھوں میں تھما دیئے۔ ”دیکھو اگر تم زندگی کا سلیقہ جاننا چاہتے ہو تو تمہیں وہ سیرت نبویؐ میں ملے گا، سکون اور اطمینان تک پہنچنے کے سارے فارمولے رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں پوشیدہ ہیں“۔ وہ رکا، اس نے غور سے ہمارے چہرے دیکھے اور پھر گویا ہوا ”اسلامی ریاست کے چار ستون تھے، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ، ان چاروں حضرات نے اسلام کی کامیابی میں بڑا مرکزی کردار ادا کیا‘ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اللہ کا پیغام دنیا کے کونے کونے میں پھیلا دیا، تم

لوگ میری اس بات سے اتفاق کرتے ہو" اس نے رک کر ہم سے پوچھا، ہم نے ہاں میں گردن ہلا دی، وہ اپنے مخصوص انداز سے مسکرایا اور آہستہ اور میٹھے لہجے میں بولا "یہ اصحابؓ کون تھے، کیا تم لوگوں نے کبھی سوچا، یقیناً تم لوگوں نے انہیں اس زاویے سے کبھی نہیں دیکھا ہوگا، یہ اصحابؓ، یہ حضراتؓ ایک مخصوص طرز زندگی تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ فقر اور غنا کا دوسرا نام تھے، آپ محبت رسول ﷺ میں سب کچھ لٹا دیتے تھے۔ حضرت عثمانؓ ایک مکمل اور مضبوط معیشت کی علامت تھے، ان کا شمار عرب کے بڑے تاجروں میں ہوتا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب حضرت عثمانؓ کا آخری اونٹ شام سے نکلتا تھا تو پہلا مدینہ پہنچ چکا ہوتا تھا۔ عرب میں کہا جاتا تھا تجارت سیکھنی ہو تو عثمانؓ سے سیکھو، وہ کبھی گھاٹے میں نہیں رہتے، حضرت عمرؓ منتظم تھے، وہ ایک مکمل روٹین، ایک شاندار ایڈمنسٹریشن کا نام تھے، وہ قوت ارادی اور اٹل پن کی علامت تھے، تم لوگ خود سوچو جس شخص کے ایمان کا آغاز ہی اس فقرے سے ہو کہ وہ گھروں میں چھپے مسلمانوں کو ساتھ لے، انہیں خانہ کعبہ لائے اور پھر کہے تم لوگ سب کے سامنے نماز پڑھو، عمرؓ کی تلوار تمہاری حفاظت کرے گی۔ اس شخص کی قوت ارادی کی کیا سطح ہو گی، وہ کس قدر مضبوط فیصلے کا مالک ہو گا اور آخر میں حضرت علیؓ" درویش رکا، اس نے لمبی سانس لی اور اسی رواں لہجے میں بولا "حضرت علیؓ اس دور کے سب سے بڑے عالم تھے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا، میں علم کا شہر ہوں تو علیؓ اس کا دروازہ ہیں، یہ چار حضرات رسول اللہ ﷺ کے اولین ساتھی تھے۔ ان حضرات کا ساتھ ثابت کرتا ہے اسلام جیسے مذہب کو بھی اپنے اظہار کیلئے فقر، معیشت، انتظامی مہارت اور علم کی ضرورت ہوتی ہے۔"

وہ رکا تو میں نے بے چین ہو کر پوچھا "یار درویش تمہارے اس فلسفے کا ہمارے مسئلے سے کیا تعلق، ہم اپنی بات کر رہے اور تم ہمارے گرد اسلام کا دائرہ کھینچ رہے ہو"۔ درویش نے قہقہہ لگایا "بیوقوفو! میں تمہیں تمہارے مسئلے کا حل بتا رہا ہوں، یہ چاروں حضراتؓ ثابت کرتے ہیں اسلام جیسے آفاقی نظریے کو بھی عملی تفسیر کیلئے ایک فقیر، ایک منتظم، ایک معیشت دان اور ایک عالم کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا معاشرہ ہو یا فرد جس بندے کے پاس علم نہیں، جس کے پاس ضروریات زندگی کیلئے مناسب رقم نہیں، جس کی زندگی میں نظم وضبط نہیں اور جس کی ذات میں حضرت ابوبکرؓ جیسا فقر نہیں وہ ایک اچھی اور پرسکون زندگی نہیں گزار سکتا، تم لوگوں کا یہی مسئلہ ہے" درویش رکا اور اس نے ہم میں سے ایک کے چہرے پر نظریں گاڑھیں اور بولا "مثلاً تم، تمہارے پاس روپیہ، پیسہ تو ہے، تم کروڑ پتی ہو لیکن تمہارے اندر کا فقیر مر چکا ہے، تمہارا علم اخبار بینی تک محدود ہے اور تمہاری انتظامی صلاحیتیں ختم ہو چکی ہیں لہٰذا تم بے سکون ہو اور تم" وہ مولوی صاحب کی طرف مڑا "تم نے پوری زندگی رکوع وسجود میں لگا دی، تمہارے بچے روز بھوکے پیٹ سکول جاتے ہیں، خود تم اپنی بھوک کو روزے کی شکل دینے کی کوشش کرتے رہتے ہو اور تم" وہ میری طرف مڑا "تم کتابوں کے پہاڑ سے کود کر خودکشی کر رہے ہو اور تم" وہ ہمارے چوتھے ساتھی کی طرف مڑا "تم اپنے گھر والوں کی ساری ضرورتوں، ساری خواہشوں کو ڈسپلن تلے کچل رہے ہو، تم اپنی ایڈمنسٹریشن کے ذریعے زندگی کو سیدھا اور ہموار بنانا چاہتے ہو لیکن یاد رکھو، انتظام اچھی چیز ہوتا ہے لیکن وہ ایک روپے کو پچاس روپے نہیں بنا سکتا"

درویش نے ٹانگیں سیدھی کیں اور ہنس کر بولا "بے وقوفو! صرف عام شخص نہیں' دنیا میں صرف وہ ملک ترقی کی معراج تک پہنچتے ہیں جن کے پاس یہ چاروں چیزیں اکٹھی موجود ہوتی ہیں اور وہ تمام ملک پیچھے رہ جاتے ہیں جو ایک ستون پر پوری عمارت کھڑی کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بے وقوفو! اگر صرف فتح سے ملک چل سکتے تو طالبان کا افغانستان اس وقت دنیا کا ترقی یافتہ ترین ملک ہوتا، اگر ایڈمنسٹریشن ہی سب کچھ ہوتی تو سوویت یونین کبھی نہ ٹوٹتا' اگر تعلیم سے ملک ترقی کر سکتے تو سری لنکا جنوبی ایشیا کا سب سے بڑا ملک ہوتا اور اگر دولت ہی کافی ہوتی تو سعودی عرب اس وقت دنیا کی سپر پاور ہوتا" وہ رکا اور ہنس کر بولا "لیکن ایسا نہیں ہوا، دنیا کی کوئی عمارت صرف ایک ستون پر کھڑی نہیں رہ سکتی، اسے استحکام کیلئے بیک وقت چار ستون درکار ہوتے ہیں، تم لوگ بھی اپنی زندگی میں ایسی ترتیب پیدا کرلو تو تمہیں یہ دنیا جنت لگنے لگے گی اور حکومت کو بھی بتاؤ وہ صرف معیشت پر توجہ نہ دے، وہ معیشت کے ساتھ ساتھ ملک میں درویشوں، عالموں اور منتظمین کی ایک بڑی فورس بھی پیدا کرے، تب کہیں جا کر ملک ترقی کرے گا"

تین وجوہات

لی کوآن یو کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی، انہوں نے حاضرین کو غور سے دیکھا اور سر جھکا لیا، یہ منظر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے میرے ذہن میں ریکارڈ ہو گیا اور جب بھی میں کسی شخص سے عالم اسلام کے زوال اور پاکستان کی پسماندگی کے بارے میں سنتا ہوں تو میرے دماغ میں وہ سارا منظر روشن ہو جاتا ہے' لی کوآن یو اس وقت سنگاپور کے وزیر اعظم ہاؤس کے ایک پر تکلف ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے، ان کے صوفے کے پیچھے کھڑکی تھی اور کھڑکی کے شیشے پر بیل چڑھی تھی' لی کوآن یو کے ساتھ اس وقت کے وزیر اعظم نواز شریف بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ ہمایوں اختر بیٹھے تھے، ان سے ذرا فاصلے پر سنگاپور میں پاکستان کے سفیر براجمان تھے اور سامنے کرسیوں پر دوسرے احباب تشریف رکھتے تھے' یہ ایک غیر رسمی ملاقات تھی جس میں ایک جونیئر وزیر اعظم ایک سینئر وزیر اعظم سے حکمت اور دانائی حاصل کرنے آیا تھا۔ لی کوآن یو اس وقت تک ریٹائرمنٹ لے چکے تھے' لیکن اس کے باوجود سنگاپور کے لوگ انہیں اقتدار میں دیکھنا چاہتے تھے چنانچہ وہ سینئر وزیر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے تھے' ان کے پاس کوئی باقاعدہ وزارت نہیں تھی' ان کا رول بڑی حد تک مانیٹر اور استاد کا تھا، وہ کابینہ کے اجلاس میں بیٹھتے تھے، جونیئر وزراء کو مختلف معاملات میں مشورے دیتے تھے اور مختلف وزارتوں کی کارکردگی کا جائزہ لیتے تھے، انہیں جہاں کسی غلطی کا احساس ہوتا تھا وہ فوراً غلطی کی نشاندہی کرتے تھے اور متعلقہ افسر اور سیاستدان کو ازالے کے بارے میں سمجھاتے تھے، پورا سنگاپور لی کوآن یو کا احترام کرتا تھا، وہ 30 برس تک سنگاپور کے وزیر اعظم رہے تھے اور انہوں نے ان 30 برسوں میں اس بدبودار دلدلی جزیرے کو دنیا کی نویں بڑی معیشت بنا دیا تھا، سنگاپور ایک معجزہ تھا اور اس معجزے کے تخلیق کار لی کوآن یو تھے۔

سنگاپور کی کہانی انتہائی دلچسپ تھی، یہ 640 مربع کلومیٹر کا ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا' اس جزیرے پر انیسویں صدی تک ہولناک جنگل تھے اور ان جنگلوں میں خونخوار درندوں، شیروں اور مگرمچھوں کا راج تھا' اس جزیرے میں خطے کی سب سے بڑی دلدل بھی تھی بعد ازاں بحری قزاقوں نے اسے اپنا مسکن بنا لیا تھا چنانچہ دنیا کا کوئی شخص اس کی طرف رخ نہیں کرتا تھا۔ انیسویں صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ جزیرہ خرید لیا، پہلی جنگ عظیم

میں برطانیہ نے اسے بحری اڈہ بنایا جبکہ دوسری جنگ عظیم میں اس پر جاپان نے قبضہ کرلیا۔ سنگاپور 1963ء میں ملائشیا کو واپس مل گیا لیکن 1965ء میں ملائشیا نے اسے بوجھ سمجھ کر اپنے سر سے اتار دیا۔ سنگاپور کو آزادی دے دی گئی۔ اس وقت لی کوآن یو سنگاپور کے وزیراعظم تھے، وہ 1959ء میں پہلی بار سنگاپور کے وزیراعظم منتخب ہوئے تھے' کوآن یو نے اس بدبودار جزیرے کو دنیا کا شاندار ملک بنانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے پورے ملک سے ایماندار لوگوں کو چن کر جج بنایا اور ان ججوں کو مکمل خودمختاری دی۔ یہ جج صدر اور وزیراعظم سے لے کر چپڑاسی تک تمام سرکاری اہلکاروں کو کسی بھی وقت عدالت میں طلب کرسکتے تھے اور ان کی کھلے عام گوشمالی کرسکتے تھے، عدل کے بعد انہوں نے سنگاپور کے خوشحال طبقے سے انتہائی پڑھے لکھے، مہذب اور ایماندار لوگ چنے اور انہیں اپنی کابینہ میں بھرتی کرلیا' انہوں نے کابینہ کیلئے احتساب کا ایک کڑا نظام بھی تشکیل دیا اور اس نظام سے کوئی شخص مبرا نہیں تھا' اس کے بعد انہوں نے پوری دنیا میں بکھرے سنگاپور کے پڑھے لکھے اور ہنرمند نوجوانوں سے رابطہ کیا اور انہیں بھاری معاوضے پر سرکاری ملازمتوں کی پیش کش کی' آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی سنگاپور دنیا کا واحد ملک تھا اور ہے جس میں سرکاری ملازموں کی تنخواہیں کارپوریٹ سیکٹر کے برابر ہیں' سنگاپور میں اگر ایک ایم بی اے نوجوان پرائیویٹ بینک سے دو لاکھ روپے تنخواہ لیتا ہے تو حکومت بھی اس کوالیفکیشن کے نوجوان کو دو لاکھ روپے تنخواہ دیتی ہے' لی کوآن یو نے سنگاپور کے قانون کو دنیا کا سخت ترین قانون بنا دیا تھا مثلاً سنگاپور میں چیونگم چبا کر سڑک یا گلی میں پھینکنے کا جرمانہ دو ہزار ڈالر تھا' کسی دیوار یا عوامی جگہ پر گالی لکھنے کی سزا موت تھی اور سنگاپور میں اگر کوئی وزیر یا مشیر کرپشن میں ملوث پایا جاتا تھا تو لی کوآن یو اسے خودکشی یا احتساب میں سے کسی ایک آپشن کے انتخاب کا موقع دیتا تھا' وزراء عموماً اس لمحے خودکشی کو ترجیح دیتے تھے چنانچہ لی کوآن یو کی ان اصلاحات کے نتیجے میں صرف تیس برسوں میں سنگاپور دنیا کا نواں امیر ترین ملک بن گیا' لی کوآن یو تیس برس بعد 1990ء میں مستعفی ہوگئے اور انہوں نے اپنے لیے نگران کا کردار منتخب کرلیا۔

میاں نواز شریف 1999ء میں سنگاپور کے دورے پر گئے' میں بھی وزیراعظم کے وفد میں شامل تھا' نواز شریف نے سرکاری مصروفیات کے بعد لی کوآن یو سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی' وہ لی کوآن یو سے لیڈر شپ اور ترقی کی ''ٹپس'' لینا چاہتے تھے۔ سنگاپور کے وزیراعظم نے لی کوآن یو کے ساتھ ان کی ملاقات طے کردی۔ نواز شریف نے چند لوگوں کا انتخاب کیا اور اس شام لی کوآن یو کے پاس حاضر ہوگئے۔ یہ ملاقات وزیراعظم ہاؤس میں وقوع پذیر ہوئی۔ گفتگو کے آغاز میں لی کوآن یو نے انکشاف کیا وہ مختلف حیثیتوں سے 8 مرتبہ پاکستان کا دورہ کرچکے ہیں لہٰذا وہ پاکستان کے جغرافیے، رسم و رواج اور لوگوں سے پوری طرح آگاہ ہیں' نواز شریف نے بڑے ادب سے ان سے پوچھا ''کیا آپ اپنے تجربے کی بنیاد پر یہ سمجھتے ہیں پاکستان کبھی سنگاپور جتنی ترقی کرے گا'' لی کوآن نے ذرا دیر سوچا اور انکار میں سر ہلا دیا' ان کا ردعمل انتہائی سفاک، کھرا اور غیر سفارتی تھا' حاضرین پریشان ہوگئے' لی کوآن یو ذرا دیر بعد بولے ''اس کی تین بڑی وجوہات ہیں، پہلی وجہ آئیڈیالوجی ہے، آپ اور ہم میں ایک بنیادی

فرق ہے' آپ اس دنیا کو عارضی سمجھتے ہیں اور آپ کا خیال ہے آپ کی اصل زندگی مرنے کے بعد شروع ہوگی چنانچہ آپ لوگ اس عارضی دنیا پر توجہ نہیں دیتے، آپ سڑک، عمارت، سیوریج سسٹم، ٹریفک اور قانون کو سنجیدہ نہیں لیتے جبکہ ہم لوگ اسی دنیا کو سب کچھ سمجھتے ہیں لہٰذا ہم اس دنیا کو خوبصورت سے خوبصورت تر بنا رہے ہیں" وہ رکے اور ذرا دیر بعد بولے "خود سوچئے جو لوگ اس دنیا پر یقین نہیں رکھتے' وہ اسے خوبصورت کیوں بنائیں گے، دوسری وجہ آپ لوگوں کی اپروچ ہے، میں پیشے کے لحاظ سے وکیل ہوں، ہندوستان کی تقسیم سے پہلے میں اس علاقے میں پریکٹس کرتا تھا' کلکتہ سے کراچی تک میرے موکل پھیلے تھے' میں نے ان دنوں ہندو اور مسلمان کی نفسیات میں بڑا فرق دیکھا' میرے پاس جب کوئی ہندو کلائنٹ آتا تھا اور میں اس کے کیس کے جائزے کے بعد اسے بتاتا تھا تمہارے کیس میں جان نہیں اگر تم عدالت میں گئے تو تم یہ کیس ہار جاؤ گے تو وہ میرا شکریہ ادا کرتا تھا اور مجھ سے کہتا تھا' آپ مہربانی فرما کر میری دوسری پارٹی سے صلح کرا دیں' میں اس کی صلح کرا دیتا تھا اور یوں مسئلہ ختم ہو جاتا تھا جبکہ اس کے برعکس جب کوئی مسلمان کلائنٹ میرے پاس آتا تھا اور میں اسے صلح کا مشورہ دیتا تھا تو اس کا جواب بڑا دلچسپ ہوتا تھا' وہ کہتا تھا وکیل صاحب آپ کیس دائر کریں میں پوری زندگی مقدمہ لڑوں گا۔ میرے بعد میرے بچے لڑیں گے اور اس کے بعد ان کے بچے لڑیں گے" لی کوآن یو رکے اور مسکرا کر بولے "میرا تجربہ ہے جو قومیں اپنے خاندانوں اور اپنی نسلوں کو ورثے میں مقدمے اور مسئلے دیتی ہوں وہ ترقی نہیں کرتیں اور تیسری اور بڑی وجہ فوج ہے' آپ کے ملک میں فوج سیاست کا حصہ بن چکی ہے اور مجھے پوری دنیا میں آج تک کوئی ایسا ملک نہیں ملا جس نے فوجی اثر میں رہ کر ترقی کی ہو"

وہ رکے اور دوبارہ بولے "فوجی اور سیاستدان کی سوچ اور ٹریننگ میں بڑا فرق ہوتا ہے' فوجی ہمیشہ مسئلہ پیدا کرتا ہے جبکہ سیاستدان مسئلے حل کرتے ہیں، فوجی کی زندگی کا صرف ایک اصول ہوتا ہے' میں خود جیوں گا اور نہ کسی کو جینے دونگا جبکہ سیاستدان جیو اور جینے دو کے فلسفے پر کاربند ہوتے ہیں، فوجی کو زندگی میں مر جاؤ یا مار دو کی ٹریننگ دی جاتی ہے جبکہ سیاستدان کو صلح، مذاکرات اور نرمی کی تربیت دی جاتی ہے چنانچہ میرا تجربہ ہے جس ملک میں حکومت اور سیاست فوج کے پاس ہوتی ہے' وہ ملک کبھی ترقی نہیں کرتا" لی کوآن یو نے مسکرا کر سب کی طرف دیکھا، گھڑی پر نظر ڈالی اور ہاتھ رگڑ کر بولا "میں نے واک کیلئے جانا ہے، اگر آپ لوگ میرا ساتھ دے سکتے ہیں تو چلیے واک کرتے ہیں" وہاں موجود تمام لوگوں نے اپنے پاؤں دیکھے اور اس کے بعد لی کوآن یو کے قدموں کی طرف دیکھا اور چہرے پر معذرت سجا کر ان کی طرف دیکھنے لگے' لی کوآن یو نے سب کے ساتھ ہاتھ ملایا اور باہر نکل گئے۔
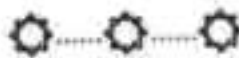
حشر کو ابھی بہت دن باقی ہیں

میں ضیاء شاہد صاحب کا بچپن سے ''فین تھا'' وہ بیس سال پہلے میگزین میں ''جمعہ بخیر'' کے نام سے ایک طویل کالم لکھا کرتے تھے' یہ ایک سوشل کالم ہوتا تھا جس کی تحریر میں صوفیانہ کشش اور ادبی مٹھاس ہوتی تھی' ضیاء صاحب کے ساتھ ساتھ یہ کالم مختلف اخبارات کا سفر کرتا رہا' میں بھی بطور قاری ان کے ساتھ اخبارات تبدیل کرتا رہا' قارئین اور ''فینز'' کی ایک عجیب سائیکالوجی ہوتی ہے' یہ لوگ اپنے پسندیدہ لکھاری' مصور' اداکار اور کھلاڑی سے متعلق تمام معلومات جمع کرنے لگتے ہیں' میں بھی اس شوق میں مبتلا ہو گیا چنانچہ میں ضیاء شاہد صاحب کے پس منظر' ان کے خاندان اور بچوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگا' ان دنوں مجھے معلوم ہوا ضیاء صاحب کے بڑے بیٹے کا نام عدنان ہے اور وہ میرا ہم عمر ہے' ضیاء صاحب اپنے کالموں اور تحریروں میں اس کا ذکر کرتے رہتے تھے' میں نے 1992ء میں لاہور سے صحافت شروع کی' میں اس شعبے کا ایک نالائق کارکن تھا چنانچہ میں ''رولنگ سٹون'' بن گیا اور مختلف اخباروں میں دھکے کھاتا ہوا روزنامہ خبریں تک جا پہنچا' میں نے 1997ء میں محترم خلیل ملک کی سفارش پر خبریں میں کالم لکھنا شروع کیا' مجھے خوشنود علی خان نے خبریں سے وابستہ کیا تھا لیکن میرے تیسرے کالم کے بعد ضیاء صاحب کے ساتھ میرا تعلق قائم ہو گیا اور 1998ء کے آخر میں عدنان شاہد کے ساتھ میری ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ 1998ء ہی وہ سال تھا جب ایک چھوٹی سی غلط فہمی کی وجہ سے ضیاء شاہد صاحب نے مجھے ایک خط لکھا اور خبریں کے ساتھ میرا تعلق ختم ہو گیا' میں روزنامہ جنگ سے منسلک ہو گیا' ضیاء شاہد صاحب مجھ سے دور ہو گئے لیکن عدنان شاہد قریب آ گیا' وہ مجھ سے مسلسل ملتا بھی رہا اور اس کے ساتھ میری ٹیلی فون پر گفتگو بھی جاری رہی لیکن میں نے اصل عدنان شاہد کو 2001ء میں ''ڈسکور'' کیا۔

2001ء میں پاکستانی صحافیوں کا ایک گروپ انٹرنیشنل وزیٹرز پروگرام پر امریکہ گیا' اس گروپ میں عدنان شاہد' رحیم اللہ یوسفزئی' سلیم صافی اور میں بھی شامل تھا' ہم لوگ امریکہ میں 21 دن اکٹھے رہے' ان 21 دنوں نے ہمارے درمیان بے تکلفی' دوستی اور تعلق کا ایک ایسا رشتہ قائم کر دیا جو عدنان شاہد کے انتقال تک جاری رہا' میں نے امریکہ میں ایک ایسا عدنان شاہد ڈسکور کیا جو نہ صرف زندگی کے رنگوں سے بھرپور تھا بلکہ وہ انسانیت'

خدمت اور محبت سے بھی لبریز تھا' وہ اس وقت بھی خبریں کا ایڈیٹر تھا اور ہم سب لوگ اخبارات میں معمولی کارکن تھے لیکن وہ ہمارے بیگ تک اٹھا لیتا تھا' اگر ہمیں کسی وجہ سے ہوٹل کے ایک کمرے میں اکٹھا رہنا پڑ گیا تو عدنان شاہد دوسروں کو بیڈ پر سلاتا تھا اور خود فرش پر سوتا تھا' ہم لوگ اکٹھے کھانا کھاتے تھے' کھانا کھانے کی یہ روایت ''امریکن سسٹم'' کہلاتی ہے' اس سسٹم میں دو یا دو سے زائد لوگ اکٹھا کھانا منگواتے ہیں اور آخر میں بل آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں' ہم لوگ امریکہ میں تھے لہٰذا ہم لوگ امریکن سسٹم کے تحت بل دیتے تھے لیکن کھانے کے آخر میں ''ٹپ'' ہمیشہ عدنان شاہد دیتا تھا' عدنان نے پورے امریکہ کی ٹپ اپنے ذمے لے لی تھی' بس کا ڈرائیور ہو یا کنڈیکٹر' ہوٹل کے دربان ہوں، ویٹر ہوں یا بیل بوائے' ریستورانوں کی ویٹریس ہوں یا پھر امریکی بھکاری، ان کی ٹرے' ہیٹ اور ہاتھ پر ہمیشہ عدنان شاہد ٹپ رکھتا تھا' وہ کہتا تھا ''امریکہ 55 برس سے پاکستان کو ٹپ دے رہا ہے آج میں اس ٹپ کا بدلہ لے رہا ہوں'' ہمارے ساتھ ہفت روزہ تکبیر کے ایڈیٹر فاروق عادل بھی تھے' فاروق عادل نے ایک مرتبہ غلطی سے پانچ ڈالر زائد دے دیئے' ویٹرس پیسے لے کر واپس آئی تو فاروق عادل نے وہ پانچ ڈالر اسے بخش دیئے اور ہماری طرف دیکھ کر بولا ''لو آج سے میں بھی عدنان شاہد ہو گیا ہوں'' اس دورے کے دوران ہم نے ایک دلچسپ ''کوڈ'' بھی تخلیق کیا' یہ کوڈ ''مصنف'' تھا' ہم لوگ مختلف لکھاریوں کی نفسیات پر گپ شپ کر رہے تھے' میں نے اسے بتایا بعض لکھاری مصنف کہلانے کے خبط میں مبتلا ہوتے ہیں' یہ لوگ اپنے سفرناموں یا سوانح عمریوں میں کچھ اس طرح لکھتے ہیں ''جب مصنف ٹوبہ ٹیک سنگھ میں داخل ہوا تو بارش شروع ہو چکی تھی'' یہ لوگ اپنی تصویروں کے نیچے ہمیشہ مصنف صدر ایوب خان کے ساتھ یا مصنف ماسکو میں سٹالن کے مقبرے کے سامنے یا مصنف جنرل ضیاء الحق کو اس کی مجلس شوریٰ کی خامیاں بتاتے ہوئے قسم کے کیپشن لکھتے ہیں، اس نے قہقہہ لگایا، میں نے اسے بتایا' مجھے پچھلے دنوں کسی صاحب نے اپنا سفرنامہ بھجوایا تھا۔ اس سفرنامے میں مصنف کی بیشمار تصویریں چھپی تھیں، ایک تصویر میں انہوں نے پانچ برس کے ایک بچے کو گود میں اٹھا رکھا تھا اور اس تصویر کے نیچے لکھا تھا ''مصنف آسٹریا کے سفر پر روانہ ہونے سے دو دن قبل اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ'' عدنان شاہد نے ایک طویل قہقہہ لگایا اور اس کے بعد ہم جب بھی تصویر کھچوانے لگتے تو عدنان شاہد کہتا ''دو مصنف ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی چھت پر کھڑے ہیں'' اور ہم سب قہقہہ لگاتے، ایک روز ہم میکڈونلڈ سے نکلے تو اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر کہا ''میں یہاں تصویر کھنچوانا چاہتا ہوں، میں یہ تصویر اپنی سوانح عمری میں شائع کراؤں گا اور اس کے نیچے یہ کیپشن لکھواؤں گا، مصنف دو فش برگر کھانے کے بعد میکڈونلڈ کے سامنے ہشاش بشاش کھڑا ہے'' اس کے بعد مصنف'' ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہمارا کوڈ ورڈ ہو گیا، میں جب بھی اسے فون کرتا، وہ فون اٹھاتا تو میں اس سے پوچھتا ''مصنف کیا کر رہا ہے'' اس کا جواب عموماً اس قسم کا ہوتا ''مصنف اپنے بیٹے کو قلفی کھلا رہا ہے یا مصنف اپنی بیوی کے سینڈل تبدیل کرانے لبرٹی جا رہا ہے یا مصنف اس وقت ریگل سینما کے سامنے کھڑا ہے وغیرہ'' اسی طرح وہ جب بھی مجھے فون کرتا تھا تو اس کا پہلا فقرہ کچھ یوں ہوتا تھا'' کیا ایک مصنف دوسرے مصنف سے گفتگو کر سکتا ہے''

اور میں مغل بادشاہوں کی طرح جواب دیتا تھا ''ہاں اجازت ہے'' ایک بار اس کا فون آیا ''کیا مصنف ایک بھوکے کو کھانا کھلا سکتا ہے'' مصنف نے فوراً حامی بھرلی، وہ شام اس نے میرے ساتھ گزاری' وہ ان دنوں ''دی پوسٹ'' شروع کر رہا تھا۔ وہ ضیاء شاہد صاحب سے ہٹ کر اپنی الگ پہچان بنانا چاہتا تھا، اس کی خواہش تھی وہ کوئی چھوٹا سا پراجیکٹ شروع کرے اور اپنی محنت سے اس بیج کو درخت بنائے۔ وہ ایک ایسا اخبار نکالنا چاہتا تھا جو صرف عدنان شاہد کا اخبار ہو وہ دی پوسٹ کو عدنان شاہد کا پراجیکٹ سمجھتا تھا، اس نے مجھ سے پوچھا ''کیا مصنف انگریزی میں کالم لکھے گا'' میں نے انکار میں سر ہلا کر جواب دیا ''مصنف نے آج تک انگریزی میں خط نہیں لکھا'' وہ مسکرا کر بولا ''اگر ہم مصنف کا اردو کالم انگریزی میں ترجمہ کرلیں تو مصنف کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا'' میں نے مسکرا کر جواب دیا ''مصنف کو تو نہیں ہوگا لیکن مصنف کے اخبار کو ضرور ہوگا'' میں جب ''ایکسپریس'' میں آیا تو ''خبریں'' میں ہمارے خلاف مضامین شائع ہونے لگے، اس نے مجھے فون کیا، میں نے اس سے پوچھا ''تم لوگوں نے مصنف کے خلاف جہاد شروع کردیا ہے''۔ اس نے قہقہہ لگایا اور ہنستے ہنستے بولا ''لیکن میں مصنف کے ساتھ ہوں'' اس نے مجھ سے اس تبدیلی کی وجہ پوچھی تو میں نے دیگر وجوہات کے علاوہ اسے بتایا ''اگر خدانخواستہ تمہیں کچھ ہوجائے تو میں جنگ اخبار میں تمہارے لئے کالم نہیں لکھ سکتا تھا، میں اپنے دوستوں کے تعزیتی کالم لکھنے کیلئے ایکسپریس آیا ہوں'' اس نے قہقہہ لگایا۔

مجھے 10 فروری 2007ء کو عدنان شاہد کے انتقال کی خبر ملی اور 12 فروری کو میں نے اس پر خصوصی ایڈیشن دیکھا، اس خصوصی ایڈیشن میں اس کی تصویریں چھپی تھیں۔ وہ ہر اس تصویر میں مسکرا رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں نے اس کی تصویروں سے کہا ''عدنان تمہارے لیے مصنف اداس ہے، تم واپس آجاؤ'' لیکن عدنان شاہد واپس نہیں آیا' وہ کبھی واپس نہیں آئے گا، زندگی کی ہر سڑک ہر راستے میں ایک یوٹرن ضرور ہوتا ہے لیکن موت ایک ایسا راستہ ہے جس پر کوئی یوٹرن نہیں اور بدقسمتی سے عدنان شاہد اس موٹروے پر چڑھ گیا ہے' میں جب یہ کالم لکھ رہا تھا تو میں نے لکھتے لکھتے بے اختیار اس کے موبائل پر فون کردیا' دوسری طرف سے آواز آئی ''آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے آپ تھوڑی دیر بعد کوشش کیجئے گا'' میں نے سوچا یہ ''تھوڑی دیر'' کتنی ہوگی؟ معلوم ہوا یہ تھوڑی دیر سینکڑوں، ہزاروں سال پر محیط ہے کیونکہ دنیا میں بچھڑنے والے لوگ صرف حشر کے دن مل سکتے ہیں اور حشر کو ابھی بہت دن باقی ہیں۔

کیا ہم ڈاکٹر عبدالقدیر کیلئے اتنا نہیں کر سکتے

نوجوان کا سوال بہت دلچسپ تھا' اس کا کہنا تھا ''ہم کیا کر سکتے ہیں'' میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا' وہ بولا ''میں ایک طالب علم ہوں' میرے والد صاحب مڈل سکول کے استاد ہیں' میری چھ بہنیں اور ایک بھائی ہے' میں ٹیوشن پڑھاتا ہوں اور اس سے اپنی تعلیم کے اخراجات پورے کرتا ہوں' اگر میں آپ کی باتوں پر عمل شروع کر دوں تو میں یونیورسٹی سے فارغ ہو جاؤں' میں مارا جاؤں' غائب کر دیا جاؤں یا پھر جیل میں پھینک دیا جاؤں اور اس کے بعد میرا پورا خاندان در بدر ہو جائے' میری بہنیں گلیوں میں خوار ہو جائیں' ماں صدمے سے پاگل ہو جائے اور باپ کو ہارٹ اٹیک ہو جائے' ہم سب مارے جائیں'' وہ رکا' اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور جذبات سے کپکپاتی آواز میں بولا ''ڈاکٹر عبدالقدیر ہمارے محسن ہیں' وہ ہمارے ہیرو بھی ہیں' اگر وہ نہ ہوتے' اگر وہ پاکستان نہ آتے' تو آج ہم یوں سینہ تان کر نہ کھڑے ہوتے' آپ کی بات درست ہے ان کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے' حکومت کو انہیں گرفتار نہیں کرنا چاہیے تھا' ان سے ٹیلی ویژن پر معافی نہیں منگوانا چاہیے تھی اور انہیں ہاؤس اریسٹ نہیں کرنا چاہیے تھا' یہ محسن کشی اور ظلم ہے'' وہ رکا اس نے دم لیا اور دوبارہ گویا ہوا ''مجھے اپوزیشن کی باتوں میں بھی صداقت محسوس ہوتی ہے' میں نے آج اخبارات میں پڑھا ڈاکٹر عبدالقدیر کو سلو پائزننگ دی جا رہی ہے' انہیں آہستہ آہستہ زہر دیا جا رہا ہے تا کہ وہ چپ چاپ انتقال کر جائیں اور ان کے انتقال سے بے شمار لوگوں کو زندگی مل جائے، وہ لوگ جو نیوکلیئر پروگرام کی خرید و فروخت میں ملوث تھے ان کے ناموں اور کارناموں پر پردہ پڑ جائے، کل ہماری یونیورسٹی میں کوئی صاحب بات کر رہے تھے' اگر ڈاکٹر عبدالقدیر زندہ رہتے ہیں تو انہیں امریکی حکومت لے جائے گی یا پھر انہیں وعدہ معاف گواہ بنا کر جنرل مرزا اسلم بیگ سے لے کر جنرل جہانگیر کرامت اور جنرل کرامت سے جنرل ذوالفقار تک بے شمار ریٹائرڈ فوجی افسروں کو عالمی عدالت میں گھسیٹ لیا جائے گا اور ڈاکٹر صاحب سے جھوٹے سچے بیان منسوب کر کے ہمارے جوہری پروگرام، ہمارے سیاستدانوں اور ہماری فوج کو بدنام کیا جائے گا، وہ صاحب بتا رہے تھے ڈاکٹر عبدالقدیر کی زندگی بے شمار لوگوں کیلئے موت ثابت ہو گی لہٰذا ڈاکٹر صاحب اس وقت وسیع تر قومی مفاد کیلئے انتہائی خطرناک شخص ہیں، وہ بڑی تیزی سے نظریہ ضرورت کی زد

نہیں آ رہے ہیں اور ملک وقوم کو ان کی قربانی کی اشد ضرورت ہے" وہ رکا، اس کی آنکھوں سے پانی کی لکیریں نکل رہی تھیں، اس نے آنکھوں پر ٹشو پیپر رکھا اور کھانس کر بولا "میں ڈاکٹر صاحب سے شدید محبت کرتا ہوں، میں پانچویں جماعت میں تھا جب میرے والد نے ڈاکٹر صاحب کی تصویر میرے کمرے میں لگائی تھی، میں اس وقت سے انہیں اپنا آئیڈیل مانتا آ رہا ہوں، میں پچھلے 18 برسوں سے ہر نماز کے بعد اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا کرتا ہوں' وہ مجھے ڈاکٹر صاحب کی طرح ملک وقوم کی خدمت کرنے کی توفیق دے' وہ مجھے ڈاکٹر عبدالقدیر بنا دے" وہ رکا' دم لیا اور زہریلے انداز سے بولا "سر صرف میں نہیں اس ملک کا ہر نوجوان ڈاکٹر عبدالقدیر کو اپنا آئیڈیل سمجھتا اور مانتا ہے' وہ ڈاکٹر عبدالقدیر بننا چاہتا ہے' سر ڈاکٹر صاحب کے انجام کا سوچ کر ہر نوجوان کا دل دھڑکنا بند ہو جاتا ہے' اس کے جسم پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے لیکن سر ہم بے بس لوگ ہیں اور ہم مجبور' لاچار اور بے بس لوگ دعا کے سوا کیا کر سکتے ہیں' ہم اگر سڑکوں پر آ گئے' ہم لوگوں نے اگر آپ جیسے دانشوروں کی باتیں مان لیں تو ہم بے بسی کی موت مارے جائیں گے اور ہمارے خاندان بکھر جائیں گے" وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور عرض کیا "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں' ایک اکیلی ابابیل کچھ نہیں کر سکتی لیکن اگر دس ہزار ابابیلیں اکٹھی ہو جائیں' وہ سب کسی ایک ہاتھی کو ٹارگٹ کر لیں اور ایک زاویے پر ایک ہی وقت میں ایک ایک کنکری پھینک دیں تو کیا ہو گا؟؟" وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا' میں نے کہا "ہاتھی مر جائے گا یا پسپائی پر مجبور ہو جائے گا" وہ مسکرایا اور آگے جھک کر بولا "لیکن سر ہم ابابیلیں نہیں ہیں' ہم انسان ہیں اور انسان بھی ایسے جو غیر منظم' غیر متفق اور اپنے اپنے مفاد کی دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں' سر ہم لوگ ہاتھیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے" میں مسکرایا "لیکن ہم اس کے باوجود ڈاکٹر عبدالقدیر کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں' ہم اپنی عاجزی' اپنے انکسار' اپنی کمزوری اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اپنی محبت کو ایک نئی شکل دے سکتے ہیں' ہم دنیا میں احتجاج کا ایک نیا طریقہ متعارف کر سکتے ہیں' ہم پوری دنیا کی توجہ حاصل کر سکتے ہیں" وہ میری طرف دیکھتا رہا' میں نے عرض کیا "ہم میں سے ہر شخص ایک گلدستہ لے' ایک چھوٹا سا کارڈ خریدے' اس کارڈ پر سرخ سیاہی سے "وی آر پراؤڈ آف یو ڈاکٹر صاحب" لکھیں' یہ کارڈ گلدستے کے ساتھ لگائے' چپ چاپ ڈاکٹر صاحب کے گھر کے سامنے جائے اور یہ گلدستہ ان کے گیٹ پر چھوڑ کر آ جائے' آپ ذرا سوچو اگر صرف دس لاکھ لوگ روزانہ ایک ایک گلدستہ ڈاکٹر صاحب کے گیٹ پر رکھ دیں تو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ مجھے خیال ہے ڈاکٹر صاحب کے گھر جانے والی ساری سڑک بھر جائے گی' پوری سڑک پر پھول ہی پھول' گلدستے ہی گلدستے ہوں گے اور اس کے بعد کیا ہو گا؟ پوری دنیا کا میڈیا یہ انوکھا احتجاج کور کرے گا یوں پاکستان کے کمزور لوگوں کی محبت انٹرنیشنل میڈیا کی ہیڈ لائن بن جائے گی اور شاید یہ ہیڈ لائنیں' ہماری محبت اور عقیدت کے یہ گلدستے ڈاکٹر صاحب کو صحت اور سلامتی دے دیں' شاید ہماری یہ محبت ان کی آخری ساعتوں کو ٹھنڈا کر دے' ان کے دل کا ملال دھل جائے' وہ ہمارے ساتھ راضی ہو جائیں یا ان کی جان بچ جائے" میں ایک لمحے کے لئے رکا اور اس کے بعد عرض کیا "کیا ہم لوگ اپنے اس محسن کو ایک گلدستہ

نہیں دے سکتے جس نے ہمارے لئے اپنی جان داؤ پر لگا دی تھی' کیا ہم اپنے آئیڈیل' اپنے ہیرو کے لئے ایک کارڈ' ایک گلدستے کی قربانی نہیں دے سکتے' اس ملک میں چار ہزار سیاسی جماعتیں ہیں' اس ملک میں عمران خان اور قاضی حسین احمد ہیں' اس ملک میں تحریک انصاف' جماعت اسلامی' مسلم لیگ ن اور پیپلز پارٹی ہے' کیا ان جماعتوں' ان رہنماؤں میں سے کوئی شخص اس گلدستہ تحریک کی قیادت نہیں کر سکتا' کیا طالب علموں کی کوئی یونین' کیا کوئی تعلیمی ادارہ' کوئی یونیورسٹی یہ تحریک شروع نہیں کر سکتی؟ کیا ہم اپنے ہیرو کے لئے اتنا نہیں کر سکتے؟'' نوجوان اٹھا' اس نے میری میز پر پڑا گلدستہ اٹھایا اور چپ چاپ باہر نکل گیا۔

✲......✲......✲

خودکش

شاہد خاندان کا پہلا فرد تھا جو کرکٹ کھیلنے کیلئے گراؤنڈ میں اترا' یہ ایک نیم دیہی خاندان تھا' ان کے والد ملک محمد اختر گوجر خان کے ایک پسماندہ گاؤں جلیاری معظم شاہ کے رہنے والے تھے' وہ پڑھے لکھے تھے لہٰذا انہیں ریلوے میں جونیئر افسر کی ملازمت مل گئی اور وہ اپنے خاندان کے ساتھ راولپنڈی شفٹ ہو گئے' ملک محمد اختر کو اللہ تعالیٰ نے چار بیٹے دیئے لیکن بدقسمتی سے ان کے تین بیٹے ہڈیوں کی ایک مہلک بیماری کا شکار نکلے' اس بیماری کو طبی زبان میں "ہائپر ایکسٹینسو جوائنٹس" کہا جاتا ہے' اس بیماری میں مریض کے جوڑ پھیل جاتے ہیں اور اس کے جسمانی اعضاء بے ڈھنگے ہو جاتے ہیں' بڑے بیٹے شاہد کو اس بیماری کے باوجود سپورٹس کا شوق ہوا اور اس نے مورگاہ کے گراؤنڈ میں فٹ بال اور کرکٹ کھیلنا شروع کر دی' وہ بہت اچھا کھلاڑی تھا' اس نے اپنی ٹیم بھی بنائی لیکن وہ رہنمائی کی کمی کے باعث آگے نہ بڑھ سکا' طاہر اختر خاندان کا دوسرا لڑکا تھا جس نے بڑے بھائی کی پیروی میں میدان میں قدم رکھا لیکن وہ بھی کھیل میں زیادہ دیر نہ جم سکا' اس نے ملازمت اختیار کر لی' تیسرا بھائی عبید اختر بھی کرکٹ کی طرف آیا لیکن وہ پڑھائی میں اچھا تھا چنانچہ اس نے کرکٹ کو پڑھائی پر قربان کر دیا' پیچھے رہ گیا شعیب' تو شعیب سب سے چھوٹا بھائی تھا۔

شعیب اختر کھلاڑی نہیں بن سکتا تھا' اس کے جسم میں چار بڑے نقائص تھے' اس کے پاؤں ہموار تھے' ہموار پاؤں کے لوگوں کو انگریزی میں "فلیٹ فٹڈ" کہا جاتا ہے' یہ لوگ بھاگنے' دوڑنے' دیوار پر چڑھنے اور پھلانگنے کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں لہٰذا آج تک دنیا میں کوئی "فلیٹ فٹڈ" شخص کھلاڑی نہیں بن سکا' شعیب کا دوسرا نقص "ہائپر ایکسٹینسو جوائنٹس" تھے' وہ اس بیماری کا انتہائی مریض تھا لہٰذا اس کے بازو اور اس کی ٹانگیں لٹک جاتی تھیں' اس نے پانچ سال کی عمر میں چلنا شروع کیا تھا' اس کا تیسرا نقص دمہ تھا' اسے بچپن میں کالی کھانسی ہوئی اور یہ کھانسی اس کے پھیپھڑوں پر اثر چھوڑ گئی تھی اور اس کا چوتھا نقص اس کا مزاج تھا' وہ اپنے رویوں میں نارمل نہیں تھا' وہ انتہا پر جا کر سوچتا تھا لہٰذا اس کے والدین' اس کے بہن بھائیوں اور اس کے دوست احباب اس کے مستقبل کے بارے میں زیادہ پرامید نہیں تھے' وہ پڑھائی میں بھی اچھا نہیں تھا لیکن پھر ایک عجیب معجزہ ہوا' اس بچے نے ایک دن

بیٹ پکڑا اور ساری ٹیم کو حیران کر دیا، وہ قدرتی طور پر کرکٹر نکلا، اس میں باؤلنگ، بیٹنگ اور فیلڈنگ تینوں خوبیاں موجود تھیں چنانچہ اس نے ایک برس میں ٹیم میں اپنا مقام پیدا کر لیا' وہ سب سے پہلے اٹک آئل کمپنی آفیسر ٹیم کا حصہ بنا، وہاں سے وہ جی ایچ کیو کی ٹیم میں گیا اور وہاں سے وہ راولپنڈی ڈویژنل کرکٹ ایسوسی ایشن تک جا پہنچا، 1994-95ء میں کرکٹ کے لیجنڈ کھلاڑی ماجد خان نے اسے اٹھایا اور اسے قومی سطح تک متعارف کرا دیا۔

1995-96ء میں نیوزی لینڈ کی ٹیم راولپنڈی آئی، شعیب اختر راولپنڈی کی طرف سے میدان میں اترا اور اس نے نیوزی لینڈ کے دس کھلاڑی آؤٹ کر دیئے، وہ گولی کی طرح تیز بال کراتا تھا، نیوزی لینڈ ٹیم کا منیجر جان رائٹ تھا، جان نے اس نوجوان کو دیکھا تو پیش گوئی کی "یہ لڑکا بہت جلد پوری دنیا میں مشہور ہو جائے گا" جان رائٹ کی اس پیش گوئی نے شعیب کے خلاف سازشوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا، یہاں سے شعیب اختر کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا سلسلہ بیک وقت شروع ہوتا ہے۔

شعیب اختر کا کھلاڑی بننا اور پھر کرکٹ کی دنیا میں سب سے تیز بال پھینکنے کا اعزاز حاصل کرنا معجزہ تھا، یہ کھیلوں کی تاریخ کا پہلا کھلاڑی تھا جس کے پاؤں بھی ہموار تھے اور جو "ہائپر ایکسٹینسو جوائنٹس" کا مریض بھی تھا لیکن اس معذوری کے باوجود اس نے پوری دنیا کو حیران کر دیا، یہ معجزہ کیسے ہوا؟ یہ بات بھی کسی معجزے سے کم نہیں تھی' اس معجزے کی بنیاد اس کا رویہ تھا، شعیب اختر بنیادی طور پر انتہا پسند شخص ہے، اس کے مزاج میں خودکشی کی حد تک ایڈونچر پایا جاتا ہے' وہ چیلنج قبول کرتا ہے اور اس چیلنج کو بعد ازاں زندگی اور موت کا مسئلہ بنا لیتا ہے، اس نے آٹھ نو سال کی عمر میں موٹر سائیکل چلانا سیکھی اور راولپنڈی میں موٹر سائیکل کے کرتب شروع کر دیئے، وہ کئی بار اس کھیل میں مرتے مرتے بچا لیکن وہ باز نہ آیا' ڈاکٹروں نے اسے بھاگنے سے منع کیا تھا لیکن اس نے فاسٹ بالر بننے کا اعلان کر دیا، ڈاکٹروں نے اسے جوڑوں پر دباؤ ڈالنے سے روکا لیکن اس نے دنیا کی تیز ترین بال پھینکنے کا فیصلہ کر لیا، میڈیکل سائنس شعیب کی اس شدت کو حماقت سمجھتی ہے لیکن وقت نے ثابت کیا اس کی یہی شدت پسندی اس کی کامیابی کی واحد وجہ بنی' اس نے اپنی شدت پسندی کے ذریعے اپنی پیدائشی معذوری اور اپنی بیماری کو شکست دے دی اور وہ کھلاڑیوں کی صفیں چیرتا ہوا وہاں جا پہنچا جہاں عزت اور شہرت اس کے پاؤں میں پڑی تھی۔

مجھ سے شعیب اختر کا تعارف ہمارے ایک سینئر صحافی نے کرایا تھا' اس سینئر صحافی کو لوگ "استاد بوتل" کہتے ہیں' استاد بظاہر ایک مذہبی شخصیت ہیں' ان کی تحریروں میں بھی ایمان اور اسلام کا تذکرہ ملتا ہے لیکن بدقسمتی سے ان کی ذاتی زندگی ان کی تحریروں سے یکسر مختلف ہے' وہ قول اور فعل کے شدید بحران کا شکار ہیں' وہ چوبیس گھنٹے کے حاسد ہیں اور حسد میں وہ بعض اوقات کفر تک چلے جاتے ہیں' ہمارے ایک دوست نے استاد بوتل کے بارے میں بڑا تاریخی فقرہ کہا تھا' اس نے کہا تھا' "اگر استاد بوتل کے منہ سے الکوحل کی بو نہ آتی تو وہ پکے ولی ہوتے" بہر حال شعیب اختر سے میرا تعارف استاد بوتل نے کرایا تھا' میں نے استاد کے کہنے پر شعیب کا کھیل دیکھنا شروع کیا اور میں اس کے سحر میں گرفتار ہوتا چلا گیا' شعیب کے دو بھائی میرے دوست ہیں جبکہ اس کی والدہ میں مجھے اپنی ماں کی

جھلک نظر آتی ہے وہ محبت شفقت اور رواداری کی چلتی پھرتی تصویر ہیں میرا خیال ہے یہ شعیب کی ماں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے وہ طبی لحاظ سے ان فٹ ہونے کے باوجود دنیا کا تیز ترین باؤلر بھی بنا اور اس نے میڈیکل سائنس اور سپورٹس کی دنیا کو بھی حیران کر دیا۔ شعیب اختر 1997ء میں قومی ٹیم میں منتخب ہوا، اس وقت کے ایک چڑچڑی کپتان اسے ٹیم میں نہیں لینا چاہتے تھے، اس کی وجہ شعیب کا رویہ تھا، شعیب فاصلے پر رہنے والا اکھڑ مزاج نوجوان تھا جبکہ کپتان پاکستانی مزاج کا شخص تھا وہ کھلاڑیوں سے جی حضوری اور تابعداری کا خواہاں تھا لہٰذا شعیب اختر اس کے کرائی ٹیریا پر پورا نہیں اترتا تھا لیکن ماجد خان اور سلیم الطاف کی مہربانی سے شعیب اختر کو سلیکٹ کر لیا گیا اس نے ویسٹ انڈیز کے خلاف میچ کھیلا اور اس میچ میں اس نے دو کھلاڑی آؤٹ کر دیے۔ یہاں سے شعیب کا انٹرنیشنل کیریئر شروع ہو گیا۔

شعیب اختر کا مزاج اور جسم دو بڑے مسائل کا شکار ہیں۔ شعیب مزاج کے لحاظ سے خودکش ہے، اس نے نیوزی لینڈ میں دس ہزار میٹر کی بلندی سے چھلانگ لگا دی تھی اور وہ دنیا گراقال سے تیرتا ہوا نیچے آیا اور یہ حرکت کوئی نارمل شخص نہیں کر سکتا وہ ایڈونچر کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا، یہ شدت بنیادی طور پر اس کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ اگر آپ اسے بھاگتے ہوئے اور بال پھینکتے ہوئے دیکھیں آپ کو اس کے چہرے پر ایک عجیب طرح کی وحشت غصہ اور تفاخر دکھائی دے گا اس وقت آپ کو اس کے انگ انگ میں ایک ''ابنارملٹی'' نظر آئے گی یہ وہ ابنارملٹی یہ وہ وحشت اور یہ وہ غصہ ہے جس کی وجہ سے وہ سو میل کی رفتار سے بال پھینکتا ہے، اگر شعیب میں یہ غصہ اور یہ شدت نہ ہوتی تو وہ کبھی اپنے ہموار پاؤں اور ''ہائپر ایکسٹینسو جوائنٹس'' کے ساتھ دنیا کا صف اول کا کھلاڑی نہ بن پاتا وہ کبھی اس مقام تک نہ پہنچتا شعیب کو ہر میچ میں اپنے حوصلے فیصلے اور جرأت کا تاوان ادا کرنا پڑتا ہے ہر میچ میں اس کا جسم ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ ان فٹ ہو جاتا ہے۔ یہ ''ان فٹ نس'' اس کی شدت میں اضافہ کر دیتی ہے اور وہ اپنے قرب و جوار سے الجھنا شروع کر دیتا ہے اور یہ الجھن اس کے کیریئر کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ یہ رکاوٹ بھی دور کر لیتا تھا لیکن پھر استاد بوتل جیسے لوگ آڑے آ گئے شعیب کی زندگی کی سب سے بڑی بدقسمتی استاد بوتل جیسے لوگ ہیں ان لوگوں نے آج تک اسے اور اس کے مسئلوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی شعیب نے آج تک پاکستان کو بہت کچھ دیا لیکن ہم پاکستانیوں نے اسے افسوس اور تکلیف کے سوا کچھ نہیں دیا۔

شعیب اختر ان حالات تک کیسے پہنچا اور کن کن لوگوں نے اس کے خلاف کیا کچھ کیا یہ میں آپ کو کل بتاؤں گا۔

ہم ایک بے وفا قوم ہیں

شعیب اختر کے کیریئر میں تین چیزیں نمایاں ہیں، ایک اس کی جسمانی ساخت وہ فلیٹ فٹڈ اور ہائپر ایکسٹینسو جوائنٹس کا شکار ہے، دوسری اس کی معجزاتی کامیابیاں اور تیسری اس کے خلاف سازشیں، میں نے کل عرض کیا تھا شعیب نے اپنی شدت اور حوصلے سے اپنی جسمانی خامیوں پر قابو پالیا اور وہ دنوں میں کرکٹ کی دنیا میں اس مقام پر جا پہنچا جس کی ہزاروں لاکھوں کرکٹرز زندگی بھر خواہش کرتے رہتے ہیں۔ شعیب اختر نے اپنی ہمت سے نہ صرف اپنا وجود منوایا بلکہ وہ پاکستانی ٹیم کی کامیابی کا بنیادی عنصر بھی بن گیا اور دنیا بھر کے کرکٹرز اور ماہرین نے کہنا شروع کر دیا "جس ٹیم میں شعیب اختر نہ ہو وہ ٹیم میچ نہیں جیت سکتی" پاکستانی عوام کی بھی یہی رائے تھی۔ عوام کی یہ رائے اور ماہرین کے خیالات پاکستان کرکٹ بورڈ کی قیادت کے دل میں شعیب اختر کے خلاف بغض پیدا کرتے رہے اور اس کے حاسدین کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا' شعیب اختر پبلک ریلیشنگ کا بندہ نہیں تھا' وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا شخص تھا، وہ لوگوں سے فاصلے پر رہتا تھا لہٰذا وہ پاکستان کرکٹ بورڈ' ریٹائرڈ کھلاڑیوں اور کرکٹ کے ماہرین سے پبلک ریلیشنگ نہ کر سکا چنانچہ اس کے خلاف حسد اور نفرت کا لاوا جمع ہوتا چلا گیا' یہ لاوا 15 اکتوبر 2006ء کو پھٹا اور پاکستان کرکٹ کی سنہری روایات کو جڑوں سے جلا گیا اور پاکستان اور پاکستان کے کھلاڑی پوری دنیا میں بدنام ہو گئے۔

15 اکتوبر 2006ء اچانک طلوع نہیں ہوا' یہ سازشوں کا ایک تسلسل ہے جو پچھلے دس برس سے شعیب کے خلاف جاری تھا، شعیب اختر اپنی طبی خامیوں کے باعث اکثر جسمانی ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہتا تھا وہ 1999ء سے 2006ء تک 8 مرتبہ شدید جسمانی عارضوں کا شکار ہوا، 1999ء میں اس کا بایاں کندھا زخمی ہو گیا، 2000ء میں اس کے گھٹنے کے پیچھے 4 انچ لمبا زخم آ گیا، اسی سال اس کی گیارھویں اور بارھویں پسلی ٹوٹ گئی، 2001ء میں اس کے کندھے کا جوڑ کھل گیا، 2002ء میں اسے شدید زخم آئے، 2005ء میں اس کا بازو فریکچر ہو گیا، 2006ء کے شروع میں اس کے ہاتھ کے مسلز پھٹ گئے اور 2006ء کے درمیان اس کی کمر کے نچلے حصے میں درد رہنے لگا' اس کی ہر بیماری اس کے خلاف سازشوں اور افواہوں کا طوفان لے کر طلوع ہوتی تھی اور کرکٹ بورڈ کی قیادت اس کے خلاف میڈیا ٹرائل شروع کر دیتی تھی لیکن اللہ کے کرم سے وہ اس بحران سے بچ نکلتا تھا، شعیب کے موجودہ بحران کا آغاز نومبر 2005ء میں ہوا تھا' 12 نومبر 2005ء کو برطانیہ کی ٹیم پاکستان کے دورے پر آئی اور اس نے 21 دسمبر 2005ء تک پاکستان میں میچ کھیلے' شعیب اختر نے تین ٹیسٹ میچوں میں

17 وکٹیں حاصل کیں اور وہ پاکستان کی کامیابی کا باعث بنا‘ اس سیریز کے دوران وہ زخمی ہوگیا‘ شعیب اختر کے کیریئر کا دوسرا بحران جنوری 2006ء میں شروع ہوا‘ ان دنوں بھارت کے ساتھ پاکستان کا نیا نیا سفارتی رومانس شروع ہوا تھا‘ پاکستان نے بھارت کے ساتھ بس‘ ٹرک اور ٹرین ڈپلومیسی کے ساتھ کرکٹ ڈپلومیسی کا بھی فیصلہ کیا تھا‘ بھارت کی ٹیم پاکستان کے دورے پر آئی اور پاکستان نے بھارت کو خوش کرنے کیلئے فلیٹ پچز بنائیں‘ شعیب کو زخمی حالت میں کھیلنے پر مجبور کیا گیا‘ شعیب نے کوشش کی لیکن اس کوشش کے دوران اس کے زخموں میں اضافہ ہوگیا اور وہ مکمل طور پر ان فٹ ہوگیا‘ اس کی انجری اس کے گھٹنے تک چلی گئی اور وہ چلنے تک سے معذور ہوگیا، اس دوران ایک بار پھر اس کے خلاف میڈیا ٹرائل شروع ہوگیا اور پاکستان کرکٹ بورڈ کے بعض سینئر لوگوں نے شعیب کے کیریئر کے خاتمے کی خبریں اڑانا شروع کر دیں۔ شعیب 28 فروری 2006ء کو گھٹنے کے علاج کیلئے آسٹریلیا چلا گیا‘ آسٹریلیا کے سرجن ڈیوڈ ینگ نے شعیب اختر کے گھٹنے کی آرتھوسکوپک سرجری کی، یہ سرجری کامیاب ہوگئی اور شعیب بڑی تیزی سے روبہ صحت ہونے لگا‘ شعیب اختر جب ڈاکٹر ڈیوڈ ینگ کے پاس زیر علاج تھا تو اس کی جلد صحت مندی کے لیے اسے ”ہائی پوٹینسی“ دوائیں دی گئی تھیں، یہ دوائیں کیا تھیں، شعیب ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا، اگست 2006ء میں پاکستان کی ٹیم برطانیہ کے دورے پر گئی، اس وقت پاکستان کے تینوں باؤلر شعیب اختر‘ محمد آصف اور رانا نوید الحسن ان فٹ تھے‘ یہ تینوں کھلاڑی پاکستانی ٹیم کی بیک بون تھے۔ ان تینوں کی غیر موجودگی کے باعث پاکستان ٹیسٹ میچ ہار گیا، یہ پاکستان کرکٹ بورڈ کے لیے انتہائی خطرناک صورتحال تھی، حکام کو محسوس ہوا اگر ان کے تینوں باؤلر جلد تندرست نہ ہوئے تو وہ 2006ء کے تمام میچ بھی ہار جائیں گے اور 2007ء کا ورلڈ کپ بھی کھٹائی میں پڑ جائے گا چنانچہ اعلیٰ حکام نے ڈاکٹروں کو حکم دیا ”ان کھلاڑیوں کو ہر قیمت پر جلد سے جلد فٹ کیا جائے“ اس حکم کے تحت ڈاکٹروں نے شعیب اختر اور محمد آصف کو طاقت کے ٹیکے لگانا شروع کر دیئے اور ان ٹیکوں کی ”برکت“ سے دونوں کھلاڑی ستمبر کے شروع میں اپنے قدموں پر کھڑے ہوگئے، محمد آصف نے اینٹی ڈوپنگ کمیشن کے سامنے اپنے بیان میں ان ٹیکوں کا ذکر بھی کیا تھا‘ اس کا کہنا تھا اسے برطانیہ کے دورے کے دوران تین ٹیکے دیئے گئے تھے جبکہ شعیب اختر کو ایک خفیہ سرکاری ذریعے نے ایسا بیان دینے سے روک دیا۔

اکتوبر 2006ء میں پاکستان نے میچ کھیلنے کیلئے بھارت جانا تھا‘ پاکستان کرکٹ بورڈ کے ارباب بست و کشاد محمد آصف اور شعیب اختر کو لگائے جانے والے ٹیکوں سے واقف تھے لہٰذا 25 ستمبر سے 12 اکتوبر 2006ء تک تمام کھلاڑیوں کے خون کے نمونے لیے گئے اور یہ نمونے ڈوپنگ ٹیسٹ کے لیے ملائشیا بھجوا دیئے گئے۔ 12 اکتوبر 2006ء کو ٹیسٹوں کی رپورٹ آگئی‘ اس رپورٹ میں محمد آصف اور شعیب اختر کے خون میں ممنوعہ عنصر ”نینڈرولون“ نکل آیا۔ اس وقت پاکستان کی ٹیم بھارت پہنچ چکی تھی، خون کی یہ رپورٹ خطرناک تھی، اگر ہم فرض کر لیں اس معاملے میں محمد آصف اور شعیب اختر قصوروار ہیں اور کرکٹ بورڈ ممنوع ادویات کے استعمال سے واقف نہیں تھا تو بھی عقل کا تقاضا تھا پاکستان کرکٹ بورڈ یہ رپورٹ تصدیق کے لیے روک لیتا اور محمد آصف اور شعیب اختر کو کسی بہانے واپس پاکستان بلا لیتا‘ اس سے پاکستان اور پاکستان کرکٹ بورڈ کی عزت بھی بچ جاتی اور ہمارے قومی ہیروز کا کیریئر بھی محفوظ رہتا لیکن بورڈ نے خاموشی کے بجائے اس خبر کو عالمی شکل دے دی، دونوں

کھلاڑیوں کو معطل کیا اور انہیں بے عزت کر کے پاکستان واپس بلا لیا، حکومت نے اس کے بعد اینٹی ڈوپنگ کمیشن بنایا، شاہد حامد، انتخاب عالم اور ڈاکٹر وقار احمد کو اس کا ممبر بنایا، کمیشن نے 27 '28 اکتوبر اور یکم نومبر کو "ملزمان" کے بیانات سنے اور ان دونوں کھلاڑیوں کے خلاف فیصلہ دے دیا، شعیب اختر پر دو سال اور محمد آصف پر ایک سال کے لیے انٹرنیشنل کرکٹ کھیلنے پر پابندی لگا دی گئی جس کے بعد پورے ملک اور پوری دنیا میں "کرکٹ لورز" کے دل ٹوٹ گئے۔

ہم اب آتے ہیں اس فیصلے کے پس منظر کی طرف، جب کمیشن کی کارروائی چل رہی تھی تو شعیب کو باقاعدہ ٹریپ کیا گیا، اس سے کہا گیا وہ یہ بیان دے کہ وہ حکیموں کی دوائیں استعمال کرتا رہا تھا' اسے کہا گیا دنیا میں یونانی ادویات کی پڑتال کا کوئی نظام موجود نہیں لہٰذا اسے شک کی بنیاد پر معاف کر دیا جائے گا، شعیب اس ٹریپ میں آ گیا اور اس نے یونانی ادویات کے استعمال کا اعتراف کر لیا، اس کے بعد اسے گرین سگنل دے دیا گیا اور اس نے باقاعدہ پریکٹس بھی شروع کر دی لیکن بعدازاں اس کے خلاف فیصلہ دے دیا گیا، اس فیصلے کے بارے میں تین قسم کی افواہیں پائی جاتی ہیں' پہلی افواہ کے مطابق جن دنوں کمیشن کی کارروائی چل رہی تھی ان دنوں باجوڑ کا واقعہ پیش آ گیا، اس واقعے میں باجوڑ کے 83 طالب علم جاں بحق ہو گئے، حکومت نے اس واقعے کی ذمہ داری قبول کر لی جس کے نتیجے میں حکومت کے خلاف عوامی احتجاج شروع ہو گیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے حکومت کو باجوڑ کے واقعے سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے کسی بڑے ایشو کی ضرورت تھی لہٰذا اس وقت محمد آصف اور شعیب اختر کی قربانی دینے کا فیصلہ ہوا، ان دونوں کی خبر شائع ہوئی اور لوگوں کی توجہ باجوڑ سے ہٹ گئی، دوسری افواہ پاکستان کرکٹ بورڈ کے نئے چیئرمین ڈاکٹر نسیم اشرف تھے، ڈاکٹر نسیم اشرف 18 اکتوبر 2006ء کو بورڈ کے چیئرمین بنے تھے اور انہیں عالمی میڈیا میں جگہ پانے اور بڑے بڑے انٹرویوز دینے کے لیے کسی ایشو کی ضرورت تھی لہٰذا شعیب اختر اور محمد آصف کو ڈاکٹر صاحب کی "انٹری" بنا دیا گیا، اینٹی ڈوپنگ کمیشن کا فیصلہ آیا اور ڈاکٹر نسیم اشرف پوری دنیا میں مشہور ہو گئے، تیسری افواہ جوا ہے' کرکٹ کے بعض جغادری ماہرین کا کہنا ہے اس معاملے میں جوئے کے عنصر کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، مارچ 2007ء میں ورلڈ کپ شروع ہو رہا ہے اور دنیا جانتی ہے ہماری ٹیم سردست ان دونوں کھلاڑیوں کے بغیر ورلڈ کپ نہیں جیت سکتی لہٰذا دونوں کھلاڑیوں پر جوا شروع ہو گیا اور اس جوئے کے نتیجے میں دونوں کھلاڑی سیاست کی وکٹ پر آؤٹ ہو گئے، سرِ دست یہ تینوں افواہیں محض سرگوشیاں اور خدشات ہیں اور ان میں کون سی بات درست ہے؟ یہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے یا اس سازش کے جولاہے لیکن ایک بات سچ ہے وہ شعیب اختر جس نے ان تھک محنت اور اپنے اٹل ارادے سے اپنی معذوری کو شکست دے دی تھی، وہ شعیب اختر اور اس کا ٹیلنٹ سازش کے ہاتھوں کلین بولڈ ہو گیا۔

میں جب بھی شعیب اختر کی تصویر دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے ہم ایک بے وفا اور احسان فراموش قوم بنتے جا رہے ہیں، ہمارے پاس ڈاکٹر عبدالقدیر ہوں یا پھر شعیب اختر ہم اپنے ہر ہیرو کو بے توقیر اور رسوا کر دیتے ہیں' ہم اپنے ملک میں پیدا ہونے والے ہر قد آور شخص کے پاؤں کاٹ دیتے ہیں' ہم اپنے ہر محسن کو حسد اور انا کی صلیب پر چڑھا دیتے ہیں۔

⚙......⚙......⚙

شاید کوئی نہیں

یہ دو انتہائیں ہیں' ایک انتہا پر دیر لوئر کی سکینہ کھڑی ہے اور دوسری انتہا پر ہمارے محبوب وزیر اعظم جناب شوکت عزیز مسکرا رہے ہیں اور ہم سب لوگ ان دو انتہاؤں کے درمیان کھڑے ہیں اور کبھی سکینہ کی طرف دیکھتے ہیں اور کبھی جناب شوکت عزیز کی زیارت کرتے ہیں اور پھر سوچتے ہیں ہم سکینہ ہیں یا پھر شوکت عزیز کے خوشحال اور ترقی یافتہ پاکستان کے باشندے!

سکینہ لوئر دیر کے ایک زخمی اور کٹے پھٹے گاؤں ''اچ'' کی باسی ہے۔ اس کے سات بچے ہیں' سکینہ کا خاوند محنت مزدوری کرتا ہے' اگر اسے مزدوری مل جائے تو گھر کے آدھے افراد کی روزی کا بندوبست ہو جاتا ہے بصورت دیگر سب لوگ مل کر ''روزہ'' رکھ لیتے ہیں' آج سے دو سال پہلے سکینہ کے بیٹے عمر کو یرقان ہوا' اس کا پورا جسم پیلا پڑ گیا' سکینہ نے شروع میں دیسی ٹوٹکوں کا سہارا لیا لیکن عمر کو افاقہ نہ ہوا' سکینہ اسے دیر لے گئی وہاں جا کر پتہ چلا عمر کو ''ہیپاٹائٹس سی'' ہے اور اگر وہ بیٹے کی زندگی چاہتی ہے تو اسے پچاس ساٹھ ہزار روپے کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ سکینہ کے پلو میں صرف دو سو روپے بندھے تھے' اس نے پلو کھولا' یہ دو سو روپے ڈاکٹر کے سامنے رکھے اور بیٹے کو لے کر چپ چاپ واپس آ گئی' گھر پہنچی تو پتہ چلا اس کی تیرہ سالہ بیٹی روزینہ کا چہرہ بھی پیلا ہو چکا ہے' وہ دوسرے دن روزینہ کو بھی شہر لے گئی' ڈاکٹر نے بتایا روزینہ بھی عمر کی طرح ہیپاٹائٹس کی مریض ہے' وہ اسے بھی لے کر واپس آ گئی' دوسرے ہفتے عابدہ کا چہرہ پیلا ہوا' تیسرے ہفتے رابعہ کی آنکھیں چڑھنا شروع ہوئیں اور اس سے اگلے مہینے سلمان کو بھی ہیپاٹائٹس سی ہو گیا' اب سکینہ کے گھر میں تین چارپائیاں اور پانچ مریض تھے' اس نے ایک ایک چارپائی پر دو دو مریض لٹائے اور خود ان کے سرہانے بیٹھ کر روتی رہتی لیکن اگر رونے سے مسائل حل ہوتے تو دنیا میں کوئی شخص دکھی نہ رہتا' سکینہ کے مسائل بھی بڑھتے چلے گئے' پورے گاؤں نے اس کی تھوڑی تھوڑی مدد کرنا شروع کر دی' لوگ اپنا پیٹ کاٹ کر اسے ادھار دینے لگے' سکینہ نے جیسے تیسے کر کے اپنے بچوں کو پچاس ہزار روپے کی دوائیں لا دیں لیکن مریض چارپائیوں سے نہ اٹھ سکے' اسی دوران کسی نے بتایا اگر وہ ایک لاکھ روپے کا بندوبست کر لے تو اس کے بچوں کا علاج ہو سکتا ہے' سکینہ کو حوصلہ ہوا لیکن اس نے زندگی میں کبھی اتنی بڑی رقم نہیں

دیکھی تھی' وہ سوچنے لگی اس کے پاس اتنی رقم کہاں سے آئے گی؟ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا' کہا جاتا ہے جب انسان کسی مشکل میں پھنستا ہے تو وہ اپنی قیمتی چیزیں بیچنے لگتا ہے سکینہ کے مسئلے کا بھی یہی حل تھا' سکینہ نے آگے پیچھے دیکھا' اس کے گھر میں صرف ایک ہی قیمتی چیز تھی اور یہ قیمتی چیز اس کی سولہ برس کی جوان بیٹی روبینہ تھی' سکینہ نے روبینہ کو بیچنے کا فیصلہ کر لیا' اس نے جوہری بلوائے' جوہریوں نے لڑکی دیکھی اور اس کی ایک لاکھ روپے قیمت لگا دی' سکینہ نے بیعانہ لے لیا لیکن اس شام روبینہ کا چہرہ بھی پیلا ہو گیا' جب جوہریوں کو پتہ چلا روبینہ بھی ہیپاٹائٹس کی مریض ہے تو وہ آئے اور بیعانہ لے کر واپس چلے گئے' اس دن سے سکینہ اس ملک کے حکمرانوں سے ایک درخواست کر رہی ہے' وہ ان سے کہہ رہی ہے ''آپ لوگ صرف روبینہ کا علاج کرا دیں میں اسے بیچ کر باقی بچوں کا علاج کرا لوں گی۔'' یہ ایک انتہا ہے۔

دوسری انتہا ہمارے وزیراعظم جناب شوکت عزیز ہیں' حکومت نے 5 جون 2006ء کو قومی اسمبلی میں بجٹ کی جو دستاویزات دی تھیں ان دستاویزات سے انکشاف ہوا' حکومت نے 06-2005ء کے دوران قومی اسمبلی کے 342 ارکان اور ایک سو سینیٹروں کو تنخواہوں اور الاؤنسز کی مد میں 662 ملین روپے ادا کئے تھے جبکہ وزیراعظم جناب شوکت عزیز نے ایک سال میں غیر ملکی دوروں پر 750 ملین روپے خرچ کئے' اگر ہم اس رقم کو کروڑوں میں دیکھیں تو یہ 75 کروڑ روپے بنتے ہیں' حکومتی دستاویزات کے مطابق 06-2005ء میں قومی اسمبلی کے سپیکر' ڈپٹی سپیکر' چیئرمین سینٹ' دونوں ایوانوں کی سٹینڈنگ کمیٹیوں کے چیئرمینوں' پارلیمانی سیکرٹریوں' وفاقی وزراء' وزراء مملکت اور تمام ارکان اسمبلی اور سینیٹروں پر ایک ارب روپے خرچ ہوئے جبکہ وزیراعظم نے صرف' جی ہاں صرف غیر ملکی دوروں پر 75 کروڑ روپے خرچ کر دیئے' اگر ہم وزیراعظم کے دوروں میں صدر جنرل پرویز مشرف کے دورے بھی شامل کر لیں تو سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ان دوروں پر ایک ارب روپے خرچ ہوئے تھے گویا پوری پارلیمنٹ اور کابینہ کے اخراجات ایک طرف اور وزیراعظم اور صدر کے غیر ملکی دورے دوسری طرف۔

ہم ان دوروں کے خلاف نہیں ہیں' یہ دورے خیر سگالی اور خارجہ تعلقات کے لئے ضروری ہوتے ہیں' ان دوروں کے دوران قومیں Give اور Take کرتی ہیں اور ان دوروں کے دوران سربراہان اپنے عالمی مسائل حل کرتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ایک ارب کے ان دوروں سے پاکستان کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا' وزیراعظم کے شاہانہ دوروں کے باوجود امریکہ اور پاکستان کا باہمی فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے' افغانستان اور بھارت اپنے جوتے ہمارے سر پر رکھ رہے ہیں' ایران کی نظر میں پاکستان اور امریکہ دونوں ایک ہیں' یورپ ہمیں دہشت گرد اور بنیاد پرست سمجھتا ہے' سعودی عرب نے ہمارے لئے عمرے کی شرائط سخت کر دی ہیں' مڈل ایسٹ میں پاکستانیوں کو مزدوری نہیں مل رہی' تیل پیدا کرنے والے تمام ممالک ہمیں پوری دنیا سے مہنگا پٹرول دے رہے ہیں اور ہمارے وزراء تک جوتے اتار کر امریکہ میں داخل ہوتے ہیں لہٰذا اس صورتحال میں ہمارے غیر ملکی دورے سیاحت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے لیکن اس کے باوجود ہمارے وزیراعظم دورے پر دورہ فرماتے جا رہے ہیں اور ان کے ہر

دورے میں کم از کم دو اڑھائی سو لوگ ہوتے ہیں' یہ انتہا ہے اور لوگ اس انتہا کو دیکھ کر یہ سوچنے پر مجبور ہیں اگر ہمارے محبوب وزیراعظم صرف ایک دورہ منسوخ کر دیں اور اس دورے کے پیسے سکینہ جیسے لوگوں کو دے دیں تو کتنی سکیناؤں کی بیٹیاں بکنے سے بچ جائیں' کتنی روبیناؤں کی عزت' ناموس اور ایمان بچ جائے اور ہیپاٹائٹس اور کینسر کے شکار کتنے مریضوں کو زندگی مل جائے لیکن شاید اس فیصلے کے لئے دل میں درد اور سینے میں ضمیر ہونا ضروری ہے اور یہ وہ قیمتی اثاثے ہیں جن سے ہماری حکومتیں اور ہمارے حکمران محروم ہیں' یہ لوگ ایسی مشینیں ہیں جن کے سینے میں دل ہوتا ہے اور نہ ہی درد' جنہوں نے اپنے اپنے ضمیر کا بائی پاس کرا رکھا ہے اور جنہیں سکیناؤں اور روبیناؤں کی تکلیف سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ مجھے ان لوگوں سے کوئی توقع نہیں لہٰذا میں سکینہ اور روبینہ کا کیس عوام کی عدالت میں رکھتا ہوں اور عوام سے درخواست کرتا ہوں کیا اس ملک میں کوئی ایک ایسا شخص موجود ہے جو ہیپاٹائٹس کے شکار پانچ بچوں کا علاج کرا سکے' جو اللہ کے لئے چل کر ان بچوں کے گھر جا سکے' جو اللہ کی رضا کیلئے 16 سال کی ایک بچی کو بکنے سے بچا سکے' کوئی ہے...... میرا خیال ہے کوئی نہیں۔

خدا کیلئے کچھ کریں

ہم نے بلیو ایریا سے تلاش شروع کی۔ ایوان صدر سے پمس (پی آئی ایم ایس) تک ادویات کی تیرہ دکانیں ہیں۔ ہم جس دکان پر گئے ہمیں انکار ہوا ہم وہاں سے سپر مارکیٹ آ گئے یہاں دواؤں کے چار بڑے سٹور ہیں وہاں سے بھی ہمیں نفی میں جواب ملا۔ ہم راولپنڈی مری روڈ پر آ گئے۔ ایک سرے سے کوشش شروع کی اور دوسرے سرے تک پہنچ گئے لیکن کسی کیمسٹ میڈیکل سٹور کے کسی ملازم اور کسی دکان کے کسی کمپوڈر نے ہمیں مثبت جواب نہ دیا۔ شیخ صاحب کی طبیعت خراب ہو رہی تھی ان کی کنپٹیاں سوجھ چکی تھیں سانس چڑھ گیا تھا اور ان کے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ میں انہیں لے کر واپس آ گیا انہیں گھر چھوڑا اور ایک بار پھر تلاش میں نکل کھڑا ہوا اس بار میں نے درمیانے اور چھوٹے سٹوروں کا رخ کیا میں عام گلی محلوں میں گھس گیا یہ ترکیب کامیاب رہی اور مجھے وارث خان کے ایک چھوٹے سے سٹور سے دس گولیوں کا ایک پتہ مل گیا۔ میں گھر واپس آیا تو شیخ صاحب باہر گلی میں ٹہل رہے تھے۔ مجھے خوش دیکھ کر ان کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

شیخ صاحب ہمارے بزرگ ہیں وسطی پنجاب کے رہنے والے ہیں کبھی کبھار سال چھ مہینے میں ایک آدھ دن کیلئے میرے پاس اسلام آباد آ جاتے ہیں۔ ڈیپریشن کے مریض ہیں۔ رات رات بھر جاگتے رہتے ہیں۔ وہ کھانے کے بغیر رہ سکتے ہیں لیکن سکون آور گولیوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ وہ چند روز پہلے میرے پاس آئے تو ان کی گولیاں ختم ہو گئیں۔ ہم دونوں گولیوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ہم دو گھنٹے پھرتے رہے اسلام آباد کے زیادہ تر سٹور کھنگال لئے راولپنڈی پھر کر دیکھ لیا لیکن شیخ صاحب کی گولیاں نہیں ملیں۔ میرا خیال تھا شاید مہنگی ہونے کے باعث دکاندار یہ گولیاں نہیں رکھتے ہوں گے لیکن جب ملیں تو معلوم ہوا دس گولیوں کی قیمت صرف نو روپے تھی مجھے حیرت ہوئی دوسرے دن میں نے اپنے ایک دوست سے تذکرہ کیا تو اس نے بتایا صرف ڈیپریشن نہیں پاکستان میں ٹینشن اعصابی دردوں بلڈ پریشر اور امراض قلب کی دوائیں تک ناپید ہو چکی ہیں۔ یہ میرے لئے انکشاف تھا میں نے اپنے دوست سے پوچھا "کیا یہ دوائیں ذخیرہ ہو جاتی ہیں" اس نے مسکرا کر جواب دیا "نہیں تم غلط سوچ رہے ہو یہ دوائیں کم نہیں ہوئیں ذخیرہ اندوزی والا معاملہ بھی نہیں سپلائی میں بھی کوئی تعطل نہیں آیا ملک میں دراصل ڈیپریشن افسردگی اور مالیخولیا کے مریض بڑھ چکے ہیں ان کی تعداد میں چار گنا

اضافہ ہو چکا ہے اور ہر آنے والے دن ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے" میں نے انکار میں سر ہلا دیا لیکن میرے دوست نے کہا "ابھی چند سال پہلے کی بات ہے ملک میں ذہنی امراض کے ماہر نہ ہونے کے برابر تھے۔ پاگل خانوں تک میں عام میڈیکل پریکٹیشنر سے کام چلایا جاتا تھا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے نہ صرف سرکاری ہسپتالوں میں نفسیاتی امراض کے شعبے کھل گئے بلکہ جگہ جگہ ماہر نفسیات' ماہر ذہنی امراض' سائیکالوجسٹ اور سائیکاٹرسٹ کے بورڈ دکھائی دینے لگے اور اب یہ عالم ہے تمام بڑے سرکاری ہسپتالوں میں ایسے سینکڑوں لوگ آتے ہیں جو کسی نہ کسی دماغی عارضے کا شکار ہیں جبکہ بڑے سائیکاٹرسٹ' سائیکالوجسٹوں اور نیورالوجسٹوں سے دس دس پندرہ پندرہ دن پہلے سے وقت لینا پڑتا ہے۔ یہ ہے ایک صورتحال! اس کے علاوہ بھی ایک صورتحال ہے جو بہت الارمنگ" ہے میں خاموشی سے سنتا رہا' وہ بولا "یہ تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو کسی شدید عارضے کے باعث ڈاکٹر کے پاس پہنچ جاتے ہیں جبکہ ملک میں ایسے مریضوں کی تعداد بھی کسی طرح دس بارہ کروڑ سے کم نہیں' جو دماغی امراض کی ابتدائی سٹیج پر ہیں۔ آپ کسی سڑک پر کھڑے ہو جائیں اور اپنے اردگرد نظر دوڑائیں آپ کو ہر گزرتے چہرے پر ایک وحشت نظر آئے گی۔ آپ دیکھیں گے لوگ خود اپنے آپ سے باتیں کرتے جا رہے ہیں' سر جھکا کر کسی گہری سوچ میں غلطاں ہیں' ڈرائیور اشارے پر رک کر چلنا بھول گیا' موٹر سائیکل سوار اشارہ توڑ کر نکل گیا' ہمسایہ ہمسائے کی چھت پر پتھر مار رہا ہے' گاہک دکاندار سے الجھ رہا ہے' دو دکاندار سیلز مین سے لڑ رہا ہے' افسر ماتحت کو ڈانٹ رہا ہے' ماتحت افسر کو گالیاں دے رہا ہے' نئی ٹائی لگانے سے دو سو حاسدین پیدا ہو جاتے ہیں' امتحان میں نمبر کم آنے پر طالب علم زہر پی رہے ہیں' مرضی کی شادی نہ ہونے پر نوجوان دریا میں کود رہے ہیں' بچوں کی معمولی لڑائی پر پورے کا پورا محلہ پلاسی کا میدان بن جاتا ہے' اذانیں دینے' استنجا خانے استعمال کرنے اور نعتیں پڑھنے پر مسجدوں میں لڑائیاں ہو رہی ہیں' رکشہ گزرنے' جہاز اڑنے' ٹرین آنے یا ریڈیو ٹی وی کی ذرا سی اونچی آواز سے ہزاروں لوگوں کے اعصاب جھنجھلا جاتے ہیں اور جب بھی کوئی بات کرتا ہے تو اس کی زبان پر شکوے اور شکایت کے سوا کوئی لفظ' کوئی حرف نہیں ہوتا اور سوسائٹی سے شکر' مہربانی اور فضل جیسے لفظ اڑ چکے ہیں"

وہ خاموش ہو گیا' میرا دوست بولا "تم مہربانی کر کے حکومت سے کہو لوگ مایوس ہو چکے ہیں خدا کیلئے کہیں سے ان لوگوں کیلئے امید کا کوئی چراغ لائیں' کوئی ایک آدھ ایسا سورج کاشت کریں جس کی روشنی چند لمحوں کیلئے ہی سہی ان لوگوں کے ذہنوں میں نور بھر دے' کہیں سے ہوا کا کوئی جھونکا ادھار لے آئیں' کچھ تو کریں' ان لوگوں کیلئے کچھ تو کریں ایسا نہ ہو آپ ایک جیتے جاگتے ملک کے حکمران کی بجائے پاگل خانے کے سپرنٹنڈنٹ بن کر رہ جائیں اور آپ کو انسانوں کی جگہ مریضوں پر حکومت کرنا پڑ جائے' ان سے کہو کچھ کریں' خدا کیلئے کچھ کریں"

پستول کی عدالت

ڈاکٹر طارق مسعود راولپنڈی میڈیکل کالج میں سینئر لیکچرار تھے' انہوں نے گلشن آباد ہاؤسنگ سوسائٹی میں گھر خریدا' مکان کے بیس منٹ میں پانی جمع ہو جاتا تھا' ڈاکٹر صاحب نے سوسائٹی کی انتظامیہ سے تدارک کی درخواست کی' انتظامیہ سستی کا مظاہرہ کرنے لگی' اسی دوران میڈیکل کالج سے ان کا تبادلہ ہو گیا' وہ تبادلے کی وجہ سے پریشان تھے' وہ 23 دسمبر کی صبح اٹھے تو بیس منٹ پانی سے بھر چکا تھا' ڈاکٹر صاحب طیش میں آ گئے' انہوں نے پستول لیا اور سوسائٹی کے دفتر چلے گئے' دفتر میں سوسائٹی کے سیکرٹری طارق محمود اطہر اور ممبر تنویر عالم بیٹھے تھے' ڈاکٹر صاحب کی ان دونوں کے ساتھ تو تکار ہو گئی' ڈاکٹر صاحب نے پستول نکالا اور فائر کھول دیا' طارق محمود اطہر موقع پر جاں بحق اور تنویر عالم شدید زخمی ہو گئے' ڈاکٹر صاحب نے اس کے بعد پستول اپنی کنپٹی پر رکھا اور گولی چلا دی' چوتھا دھماکہ ہوا اور ڈاکٹر صاحب بھی وہیں ڈھیر ہو گئے' آدھ گھنٹے میں سوسائٹی کے دفتر میں دو نعشیں اور ایک زخمی پڑا تھا۔

اگر دیکھا جائے تو بیس منٹ میں پانی بھرنا یا تبادلہ ہو جانا اتنا سنگین مسئلہ نہیں جس سے مجبور ہو کر ایک استاد ڈاکٹر دو زندہ انسانوں پر گولیاں برسا دے اور آخر میں خودکشی کر لے' دنیا کے نوے فیصد بیس منٹس میں سیم آتی ہے اور دنیا کے تمام سرکاری ملازمین کے تبادلے ہوتے ہیں لیکن کرہ ارض کے کسی کونے میں کوئی شخص خودکشی کرتا ہے اور نہ ہی دوسرے کو گولی مارتا ہے لہٰذا پھر سوال پیدا ہوتا ہے' وہ کون سے عوامل تھے جن کے باعث ایک سینئر میڈیکل آفیسر انتہائی اقدام پر مجبور ہو گیا۔ یہ آج کا بنیادی سوال ہے' آپ ذرا دائیں بائیں اور آگے پیچھے جھانک کر دیکھیں آپ کو محسوس ہو گا ہمارے زیادہ تر لوگ ڈاکٹر طارق مسعود کی کیفیت سے گزر رہے ہیں' ہم لوگوں میں برداشت اور تحمل ختم ہو چکا ہے' لوگ اب نہایت معمولی اختلاف پر پستول نکال لیتے ہیں' آپ اپنے گردوپیش پر نظر دوڑا کر دیکھ لیں' آپ کو پاکستان کا ہر شخص دوسرے سے الجھتا ہوا نظر آئے گا' آپ کو ہر شخص کے چہرے پر ناراضی' نفرت اور شکوے کے تاثرات ملیں گے' آپ کو کوئی مسکراتا ہوا شخص نظر نہیں آئے گا' بچہ بچے کے ساتھ دست و گریبان ہو گا' بیٹا باپ سے الجھ رہا ہو گا' بیوی خاوند اور خاوند بیوی سے تو تکار کر رہا ہو گا' ڈرائیور کنڈیکٹر کو گالی دے رہا ہو گا اور کنڈیکٹر مسافروں کے ساتھ بدتمیزی کر رہا ہو گا' گاہک دکاندار کو گھور رہا ہو گا اور دکاندار گاہک کو نفرت

سے دیکھ رہا ہوگا' طالب علم کا سینہ استاد کے خلاف ابل رہا ہوگا اور استاد شاگردوں کے خلاف سازش کر رہا ہوگا' آپ غور کیجئے ان تمام لوگوں کا اختلاف محض اختلاف نہیں یہ دشمنی ہے' اس معاشرے کا ہر شخص دوسرے شخص کی جان لینا چاہتا ہے۔ پاکستان کا شمار دنیا کے ان پانچ ممالک میں ہوتا ہے جن میں جرائم کی شرح انتہا کو چھو رہی ہے' آپ کسی دن کا اخبار اٹھا کر دیکھ لیں آپ کو اس میں آبروریزی' ڈاکے اور قتل کی پانچ چھ لرزہ خیز خبریں ملیں گی' دنیا میں اس وقت قتل کے سب سے زیادہ مجرم پاکستان میں ہیں' ہماری جیلوں میں اس وقت 55 ہزار قاتل بند ہیں جبکہ اس سے کہیں زیادہ تعداد باہر پھر رہی ہے' ہم میں سے ہر شخص روزانہ کسی کو قتل کرنے کی دھمکی دیتا ہے یا پھر خودکشی کا ارادہ کرتا ہے' ہم لوگ گیس' بجلی اور ٹیلی فون کا کنکشن تک حاصل کرنے کے لئے خودسوزی یا خودکش حملے کی دھمکی دے دیتے ہیں' ہمارے لوگ تیل کی بوتل لے کر عدالت اور پارلیمنٹ ہاؤس پہنچ جاتے ہیں' لوگ بیس منٹ میں پانی بھر جانے یا کھڑکی پر گیند لگنے کے "جرم" میں پانچ پانچ لوگوں کو قتل کر دیتے ہیں اور ہمارے ملک میں لوگ ماچس نہ ملنے یا امتحان میں نمبر کم آنے پر خودکشی کر لیتے ہیں' آپ غور کریں تو اس وقت اس معاشرے میں غصے' شور' توڑ پھوڑ' نفرت' شکوے اور اختلاف کے سوا کچھ نہیں بچا' اس وقت دنیا میں پاکستان کے سوا شاید ہی کوئی دوسرا ملک ہو جس میں موت کی اتنی خواہش' ذکر یا کوشش کی جاتی ہو' ایک اندازے کے مطابق ہمارے ملک میں ہر شخص روزانہ دس مرتبہ موت کا ذکر کرتا ہے اور اس میں سات مرتبہ قتل اور خودکشی کے لفظ استعمال ہوتے ہیں۔

ہمارے دانشور' مدبر اور پالیسی ساز اس کی مختلف توجیہات بیان کرتے ہیں' یہ لوگ مہنگائی' بے روزگاری' ڈپریشن' ماحولیاتی آلودگی' شور اور مارشل لاء کو اس کی وجہ قرار دیتے ہیں لیکن میرا خیال ہے اس کی ذمہ داری صرف اور صرف ہمارے عدالتی نظام پر استوار ہوتی ہے' ہم میں سے ہر شخص انصاف سے مایوس ہو چکا ہے لہٰذا اس نے اپنا انصاف اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص سمجھتا ہے پولیس اس کی بات سنے گی اور نہ ہی عدالت لہٰذا اسے دو ہزار روپے کا پستول خریدنا چاہئے' ظالم کو دہلیز پر ڈھیر کر دینا چاہئے اور اپنی کنپٹی پر پستول رکھ کر دنیا کے دکھوں سے آزاد ہو جانا چاہئے' ہم لوگوں نے پستول کو ہر ظلم' ہر زیادتی کا حل تسلیم کر لیا ہے لہٰذا آج اس معاشرے میں جس کو دوا چاہئے وہ پستول لے کر گھر سے نکل کھڑا ہوتا ہے' جس کو روزگار درکار ہے وہ جیب میں پستول ڈال کر سڑک پر آ جاتا ہے' جسے انصاف اور عزت چاہئے وہ بھی ایک آدھ رائفل بردار کا بندوبست کرتا ہے اور عزت اور انصاف لے کر گھر چلا جاتا ہے۔ یہ سب ہمارے عدالتی نظام کی کمزوری اور خامیوں کا نتیجہ ہے' میرا خیال ہے اگر ڈاکٹر طارق مسعود کو یقین ہوتا کہ وہ عدالت جائے گا اور عدالت اگلے ہی دن ہاؤسنگ سوسائٹی اور میڈیکل کالج کی انتظامیہ کو طلب کر لے گی اور اس کے ساتھ سو فیصد انصاف ہوگا تو ڈاکٹر طارق مسعود پستول لے کر سوسائٹی کے دفتر جانے کی بجائے سیدھا عدالت جاتا' وہ دو لوگوں کو گولی مارنے اور خودکشی کرنے کی بجائے وکیل کا بندوبست کرتا لیکن کیونکہ وہ جانتا تھا وہ پوری عمر کھپا کر بھی عدالت سے انصاف نہیں لے سکے گا لہٰذا اس نے اپنا فیصلہ خود کرنے کا فیصلہ کیا' اس نے پستول کی عدالت سجائی' اس نے اپنے مجرم کو گولی ماری اور خود بھی زندگی کے عذاب سے آزاد ہو

گیا۔اس وقت پاکستان کے زیادہ تر لوگ ڈاکٹر طارق مسعود کی کیفیت اور صورتحال سے گزر رہے ہیں؟ یہ لوگ اسی طرح سوچ رہے ہیں۔ہم لوگ اگر عدالتی نظام کی خامیوں پر غور کریں تو اس کی بڑی وجہ ہماری غیر قانونی حکومتیں ہیں۔یہ حقیقت ہے دنیا کی غیر قانونی حکومتیں ہمیشہ عدالت اور قانون کے گملوں میں پروان چڑھتی ہیں اور انہیں اپنے دوام کیلئے ججوں کی ضرورت پڑتی ہے' ہم لوگ پچھلے 40 برسوں سے غیر قانونی اور کرپٹ حکومتیں کاشت کر رہے ہیں چنانچہ یہ حکومتیں اس ملک کے عدالتی نظام کو ٹھیک نہیں ہونے دیتیں' یہ حکومتیں جانتی ہیں جس دن عدالتی نظام طاقتور ہو جائے گا اس دن گریڈ 22 کا کوئی جرنیل صدر نہیں بن سکے گا' اس وقت ملک میں کوئی باوردی جمہوریت جنم نہیں لے گی چنانچہ یہ لوگ اپنے مفادات کیلئے انصاف اور قانون کو اپنی مٹھی سے باہر نہیں نکلنے دے رہے' ہماری حکومتوں کی اس سفا کی کا نتیجہ ڈاکٹر طارق مسعود جیسے لوگ بھگت رہے' اس کی سزا پورے معاشرے کو مل رہی ہے' اس کے ردعمل میں ہمارے پورے معاشرے کی قوت برداشت جواب دے گئی ہے۔

اگر ہم اپنی پالیسی میں تھوڑی سی ترمیم کر لیں تو میرا دعویٰ ہے ہمارے حکمران بھی محفوظ رہ سکتے ہیں اور پورا معاشرہ بھی' ہم آج اپنے تین بڑے عہدیداروں صدر' وزیراعظم اور چیف آف آرمی سٹاف کو ہر قسم کی عدالتی کارروائیوں سے پاک قرار دے دیں' ہم یہ قانون بنالیں آج کے بعد ان تینوں شخصیات کے کسی ذاتی فعل کو عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکے گا لیکن ان کے علاوہ پاکستان کا ہر عہدیدار اور ہر ادارہ قابل احتساب ہوگا' ہماری عدالتیں ہر شخص کو طلب کریں گی اور صرف 24 گھنٹوں میں ان کے خلاف فیصلہ دے دیں گی تو میرا خیال ہے ہم لوگ قتل اور خودکشی سے بچ جائیں گے' ہماری عدالتیں فیصلہ کر لیں پاکستان میں کوئی کیس ایک ہفتے سے آگے نہیں جائے گا اور بیس منٹ میں پانی بھرنے سے لے کر تبادلے تک ہر کیس کا فیصلہ میرٹ پر اور فوری ہوگا تو مجھے یقین ہے پاکستان میں پستول کی کوئی عدالت لگے گی اور نہ ہی کوئی شخص اپنا فیصلہ خود کرے گا' اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو یقین کیجئے یہ آگ کسی نہ کسی دن ایوان صدر تک پہنچ جائے گی اور اس کے بعد ملک میں کوئی عہدہ بچے گا اور نہ ہی عہدیدار۔

بے عزت

شیخ صاحب غمزدہ تھے' ان کی آواز میں تھرتھراہٹ اور آنکھوں میں آنسو تھے' وہ بار بار افسوس سے گردن ہلاتے تھے اور ان کے منہ سے سرد آہیں نکلتی تھیں' ان کا خیال تھا امریکہ نے عید کے دن صدام حسین کو پھانسی دے کر پورے عالم اسلام کی بے عزتی کی' ان کا کہنا تھا یہ پھانسی محض پھانسی نہیں' یہ مسلمانوں کی غیرت پر حملہ ہے اور ہمیں اس حملے کا بھرپور جواب دینا چاہئے' میں نے ان سے عرض کیا "صدام حسین سلطان صلاح الدین ایوبی' محمد بن قاسم یا محمود غزنوی نہیں تھا' وہ ایک آمر تھا اور اس نے 25 برس تک عراق میں امریکی مفادات کی کاشتکاری کی تھی' اس نے اپنے ہاتھوں سے ہزاروں' لاکھوں مسلمانوں کے حقوق کا گلہ گھونٹا تھا اور اس نے ملک میں بیسیوں اجتماعی قبریں بنائی تھیں" شیخ صاحب کو مجھ سے اختلاف تھا' ان کا فرمانا تھا "صدام حسین کتنا ہی ظالم اور جابر سہی مگر وہ عالم اسلام کا ہیرو تھا' صدام حسین سے 58 اسلامی ممالک کے کروڑوں لوگوں کی ہمدردیاں وابستہ تھیں لہٰذا امریکہ کو اس سے رعایت برتنی چاہئے تھی' اگر یہ ممکن نہیں تھا تو بھی صدام حسین کو کم از کم اس دن پھانسی نہ دی جاتی جس دن پچاس لاکھ مسلمان حج ادا کر رہے تھے اور ایک ارب 46 کروڑ مسلمان عید الاضحیٰ منا رہے تھے"

میں نے ان سے پوچھا "امریکہ ہماری توہین کر چکا ہے لہٰذا ہمیں اب کیا کرنا چاہئے" شیخ صاحب نے میز پر مکہ مارا اور اونچی آواز میں بولے "ہمیں اس اقدام کے خلاف پوری دنیا میں احتجاج کرنا چاہئے' ہمیں امریکہ مردہ باد کے نعرے لگانے چاہئیں اور ہمیں جلوس نکالنے چاہئیں" میں نے ان کی اس معصومانہ خواہش پر قہقہہ لگایا' انہوں نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا' میں نے فائل میں سے اخبار کا ایک صفحہ نکالا اور وہ صفحہ ان کے سامنے پھیلا دیا' اخبار کے عین درمیان میں پانچ چھ تصاویر چھپی تھیں' ایک تصویر میں پولیس کانسٹیبل کے سامنے پانچ چھ سال کی ایک بچی ہاتھ جوڑ کر کھڑی تھی' بچی کی آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر بے چارگی تھی' دوسری تصویر میں سات آٹھ پولیس کانسٹیبل پندرہ سولہ سال کے ایک بچے پر ڈنڈے برسا رہے تھے' بچے کی شلوار اتر کر اس کے جوتوں پر پڑی تھی' اس کی قمیص پھٹ چکی تھی اور وہ سرِ عام الف ننگا کھڑا تھا' تیسری تصویر میں لیڈی کانسٹیبلز بے شمار خواتین کو ہانک کر لے جا رہی تھیں اور چوتھی تصویر میں پولیس بے شمار بچوں' خواتین اور مردوں کو سڑک پر گھسیٹ رہی تھی' میں نے ان تصویروں پر انگلی رکھی اور شیخ صاحب سے پوچھا "آپ جانتے ہیں یہ کس ملک کے منظر ہیں"

انہوں نے انکار میں سر ہلا دیا' میں نے عرض کیا" یہ پاکستان کی راولپنڈی کا مال روڈ ہے' یہ 28 دسمبر 2006ء کا دن تھا اور یہ حج اکبر سے صرف ایک دن پہلے کے منظر ہیں" شیخ صاحب حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے' میں نے عرض کیا" کیا آپ جانتے ہیں' یہ کون لوگ ہیں" شیخ صاحب نے دوبارہ انکار میں سر ہلا دیا' میں نے عرض کیا " یہ پاکستان کے انتہائی مظلوم لوگ ہیں یہ وہ 106 خاندان ہیں جن کے مرد پچھلے تین چار برسوں سے غائب ہیں' یہ بچی جو ہاتھ باندھ کر پولیس کانسٹیبل کے سامنے کھڑی ہے اس کا والد تین برس سے غائب ہے' یہ بچہ جس کی شلوار اس کے جوتوں پر پڑی ہے اس کا والد مسعود خواجہ اڑھائی سال سے غائب ہے اور یہ خاتون جسے لیڈی کانسٹیبل ہانک کر لے جا رہی ہیں اس کا خاوند پچھلے تین سال سے گھر نہیں آیا"

شیخ صاحب خاموشی سے سنتے رہے' میں نے عرض کیا" سر ان 106 خاندانوں کا خیال ہے ان کے خاوند' بھائی اور والد ایجنسیوں کی حراست میں ہیں' انہیں خفیہ والوں نے اٹھایا اور کسی سیف ہاؤس میں پھینک دیا' یہ لوگ پچھلے تین چار برسوں سے اپنے پیاروں کی راہ دیکھ رہے ہیں' ان لوگوں نے پولیس سے لے کر عدالت تک ہر دروازے پر دستک دی لیکن انہیں کسی دروازے سے انصاف نہیں ملا' پاکستان کے کسی ادارے اور کسی شخصیت نے ان کے سر پر ہاتھ نہیں رکھا' کسی نے ان کے آنسو نہیں پونچھے لہٰذا ان لوگوں نے جمعرات 28 دسمبر کو جی ایچ کیو کے سامنے مظاہرہ کرنے کا فیصلہ کیا' یہ لوگ مری روڈ پر فلیش مین ہوٹل کے چوک پر پہنچے تو پولیس نے ان کا راستہ روک لیا' انہوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور پولیس نے ان پر لاٹھی چارج شروع کر دیا' اس لاٹھی چارج کے دوران محمد بن مسعود کی شلوار اتر گئی جبکہ لاٹھی چارج اور دھکم پیل میں ایک بچی اور ایک خاتون بے ہوش ہو گئی، خواتین کے سروں سے سر عام چادریں گریں اور ان کی بے پردگی ہوئی" شیخ صاحب خاموش رہے، میں نے عرض کیا" آپ جانتے ہیں گھروں سے غائب ہونے والے یہ لوگ کون ہیں اور ان کا جرم کیا تھا" وہ چپ چاپ سنتے رہے، میں نے عرض کیا" یہ لوگ باریش اور صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے اور صدر بش کو ان کے ارادوں سے خطرے کی بو آتی تھی لہٰذا یہ لوگ گھروں سے غائب ہوئے اور اس کے بعد کسی کو ان کی خبر نہ ملی، ان کے گھر والے ان کی یاد میں روز جیتے اور روز مرتے ہیں۔ یہ لوگ جب عدالتوں کے دروازے بجا بجا کر تھک گئے تو انہوں نے پر امن احتجاج کا راستہ چنا اور آپ اس راستے کا انجام ان تصویروں سے دیکھ لیجئے" شیخ صاحب نے ہاں میں گردن ہلائی اور شرمندہ شرمندہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے" لیکن ان کا صدام حسین کی پھانسی کے ساتھ کیا تعلق" میں نے اخبار لپیٹ کر ایک طرف رکھا اور سیدھا ہو کر جواب دیا" ان لوگوں کا صدام حسین کی پھانسی کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے، امریکہ عالم اسلام کا دشمن ہے، ہم صدام حسین کی غیر اخلاقی پھانسی پر امریکہ کے سامنے احتجاج کرنا چاہتے ہیں' ہم کہتے ہیں امریکہ کو عید کے دن صدام حسین کو پھانسی نہیں دینی چاہیے تھی۔ درست، لیکن سوال پیدا ہوتا ہے ہم غیر مسلم امریکہ کے غیر اخلاقی اقدام کی مذمت کرنا چاہتے ہیں مگر ہمارے اپنے اسلامی ملک کی اخلاقی اقدار کی کیا حالت ہے؟ ہمارے اسلامی ملک سے 106 لوگ داڑھی رکھنے، نماز پڑھنے اور اسلامی نشاۃ ثانیہ کے خواب دیکھنے کے جرم

میں اٹھا لیے گئے اور ہم تین چار برس بعد بھی ان کے اہل خانہ کو احتجاج کا حق نہیں دے رہے۔ ہم سڑک پر ان کے بچوں کی شلواریں اتار رہے ہیں، ان کی ٹانگوں، ان کی پنڈلیوں پر ڈنڈے برسا رہے ہیں اور پورے ملک میں خاموشی ہے"

وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ میں نے عرض کیا "جس ملک میں 106 لوگ چپ چاپ اٹھا لیے گئے ہوں اور ان لوگوں کے لواحقین کو کسی عدالت، کسی ادارے سے انصاف نہ ملا ہو اس ملک کے لوگوں کو صدام حسین کی پھانسی پر احتجاج کا کوئی حق حاصل نہیں۔ جس ملک میں سرے عام مظلوموں کی شلواریں اترتی ہوں اور جس میں انصاف کے لیے سڑکوں پر نکلنے والے خاندانوں کو ڈنڈے اور گالیاں ملتی ہوں اس ملک کے لوگوں کو صدام حسین کی پھانسی پر احتجاج کا کوئی حق نہیں اور جس ملک میں آپ جیسے باضمیر لوگ 106 خاندانوں پر ہونے والے ظلم پر خاموش ہوں اس ملک کے لوگوں کو سمندر پار پھانسی پانے والے صدام حسین کا غم منانے کا کوئی حق نہیں" شیخ صاحب خاموش رہے۔ میں نے عرض کیا "جناب صرف انصاف دینے والوں کو انصاف طلب کرنا چاہیے، گھر میں احتجاج کرنے والوں کو گھر سے باہر احتجاج کرنا چاہیے اور گھر میں زیادتی کے خلاف ہاتھ اٹھانے والوں کو باہر کی زیادتی پر آواز بلند کرنی چاہیے، ہمیں یہ تو نظر آ رہا ہے امریکہ نے عیدالاضحی کے دن صدام حسین کو پھانسی دے کر شعائر اسلام کی توہین کی لیکن ہمیں اپنی سڑکوں پر مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمان عورتوں، بچوں اور بزرگوں کی توہین اور ذلت دکھائی نہیں دیتی، ہمیں صدام حسین تو نظر آتا ہے لیکن ہمیں محمد بن مسعود، عائشہ مسعود اور آمنہ مسعود پر ہونے والا ظلم دکھائی نہیں دیتا، ہمیں عراق کے آنسو رات بھر سونے نہیں دیتے لیکن ہمیں وہ مسعود جنجوعہ نظر نہیں آتا جو دو اڑھائی برس پہلے گھر سے نکلا تھا اور اس کے بعد واپس نہیں آیا" میں جذباتی ہو گیا، شیخ صاحب خاموشی سے سنتے رہے، میں نے عرض کیا "یقین کیجئے جب تک ہم آمنہ مسعود جیسی مظلوم عورتوں کو انصاف نہیں دیں گے ہم اس وقت تک عالمی سطح پر انصاف نہیں پائیں گے۔ ہم جب تک خود حج اور عیدالاضحی کا احترام نہیں کریں گے باہر کی دنیا اس وقت تک ہماری عیدوں اور ہمارے حجوں کی عزت نہیں کرے گی اور جب تک ہم محمد بن مسعود کی عزت کو پھانسی گھاٹ سے نہیں اتاریں گے اس وقت تک ہمارے صدام حسین اسی طرح پھانسیوں پر لٹکتے رہیں گے، ہم اسی طرح پوری دنیا میں بے عزت ہوتے رہیں گے۔"

☼......☼......☼

مرجانا اور ماردینا

وحید ظفر کے والد اس کے بچپن میں فوت ہو گئے' اس کی والدہ نے لوگوں کے کپڑے اور برتن دھو کر پانچ بچوں کی پرورش کی' وحید ذہین بچہ تھا' وہ سرکاری سکول سے میٹرک کر گیا' وہ کالج میں داخلہ لینا چاہتا تھا لیکن وسائل کی کمی آڑے آئی لہٰذا اس نے والدہ کا ہاتھ بٹانے کا فیصلہ کیا' وہ نوکری کی تلاش میں نکلا' آج 5 برس ہو چکے ہیں لیکن اسے کسی جگہ نوکری نہیں ملی' اس دوران اس نے مزدوروں کے ساتھ مزدوری' پینٹروں کے ساتھ پینٹ اور ویٹروں کے ساتھ ویٹری کی لیکن وہ کسی جگہ ٹک نہیں سکا' کوئی نوکری اس کی طبیعت سے میل نہیں کھاتی تھی' کسی جگہ وہ جسمانی لحاظ سے کمزور تھا اور کسی کام میں اس کا ہاتھ نہیں بیٹھتا تھا چنانچہ وہ بے روزگار کا بے روزگار رہا۔ وہ چند روز قبل میرے پاس آیا اور اس نے مجھ سے پوچھا "میں کیا کروں؟" میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں خاموش رہا' ذرا دیر رک کر بولا "میرا دل چاہتا ہے' میں بم باندھ کر باہر نکلوں' خود بھی مر جاؤں اور دوسروں کو بھی ماردوں" میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا' میں نے اسے سمجھا بجھا کر بھجوا دیا لیکن میں سوچتا رہا "کیا وحید ظفر اکیلا ہے" مجھے محسوس ہوا نہیں وہ اس سوچ میں اکیلا نہیں' اس وقت پاکستان کے بے شمار نوجوان اسی طرح سوچ رہے ہیں"

پاکستان میں اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ نوجوان ہیں' پاکستان کی 35 فیصد آبادی کی عمر 16 سے 22 سال ہے' آپ اس کا تقابل چین' امریکہ اور یورپ سے کیجئے' چین کی 17 فیصد آبادی نوجوانوں پر مشتمل ہے' امریکہ میں 15 فیصد لوگ نوجوان ہیں جبکہ پورے یورپ میں صرف 21 فیصد نوجوان پائے جاتے ہیں لہٰذا پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جس میں چھ کروڑ نوجوان ہیں اور ان میں زیادہ تر نوجوان وحید ظفر جیسے لوگ ہیں اور آج ان سب کی زبانوں پر یہی سوال ہے "میں کیا کروں" یہ نوجوان جذبے' صلاحیت اور آگے بڑھنے کی امنگ سے لبریز ہیں لیکن بدقسمتی ہے اس ملک میں ان کے لئے کوئی راستہ' کوئی منزل نہیں' یہ لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں اور نہ ہی ملک میں ان کے لئے جابز ہیں چنانچہ یہ لوگ گھروں میں چارپائیاں توڑتے ہیں' گلیوں اور بازاروں میں آوارہ پھرتے ہیں یا پھر شدت کی اس وادی میں نکل جاتے ہیں جس کے آخر میں موت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ پاکستان میں اس وقت ایک کروڑ 45 لاکھ تعلیم یافتہ بے روزگار موجود ہیں اور عالمی اندازوں کے مطابق جس ملک

میں 50 لاکھ ذہین' اعلیٰ تعلیم یافتہ اور متحرک نوجوان بے روزگار ہوں اس ملک کا لاء اینڈ آرڈر خطرے کا شکار ہو جاتا ہے' کمپیوٹر ماہرین کا کہنا ہے جب کسی کمپیوٹر ایکسپرٹ کو نوکری نہیں ملتی تو وہ کمپیوٹر "ہیکر" بن جاتا ہے' وہ ایسے وائرس ایجاد کرتا ہے جو پوری دنیا کے کمپیوٹرز تباہ کر سکتے ہیں' امریکہ کی ایک سافٹ ویئر کمپنی صرف ہیکرز کو نوکری دیتی ہے' اس کمپنی کا کہنا ہے ایک ہیکر سو سافٹ ویئر انجینئرز کے برابر ہوتا ہے' نوجوانوں کو ہم ڈیمانڈ اینڈ سپلائی کے پیمانے سے بھی دیکھ سکتے ہیں' پوری دنیا میں ڈیمانڈ اینڈ سپلائی کا خیال رکھا جاتا ہے' امریکہ میں اگر مارکیٹ کو دو نوجوانوں کی ضرورت ہے تو وہ تیسرے نوجوان کو مارکیٹ میں نہیں آنے دیتے کیونکہ وہ جانتے ہیں' یہ تیسرا نوجوان پوری مارکیٹ کی نفسیات خراب کر دے گا' 1960ء تک یورپ میں بھی پاکستان جیسا تعلیمی نظام تھا' وہاں بھی سیکنڈری بورڈز ہوتے تھے اور یہ بورڈز ہر سال لاکھوں بچوں کو میٹرک کی سند دے کر معاشرے میں پھینک دیتے تھے' ان میں سے نصف نوجوان فیکٹریوں میں چلے جاتے تھے اور نصف کالجوں کا رخ کرتے تھے' کالجوں سے فارغ ہونے والے بچوں میں سے چند یونیورسٹیوں میں پہنچتے تھے اور باقی عملی زندگی شروع کر دیتے تھے لیکن پھر انہیں معاشرتی مسائل کا سامنا کرنا پڑا' یورپ میں لاء اینڈ آرڈر اور بے روزگاری کا مسئلہ پیدا ہو گیا چنانچہ یورپ نے اپنا نظام بدل دیا' یورپ نے سکول کی تعلیم کو کالج تک پھیلا دیا اور کالج کو یونیورسٹی میں ضم کر دیا' انہوں نے یونیورسٹیوں کو حالات حاضرہ کے مطابق اپنا سلیبس تبدیل کرنے اور تعلیم کا دورانیہ طے کرنے کا اختیار بھی دے دیا' انہوں نے عملی تربیت کو تعلیم کا حصہ بنا دیا' اس کے دو نتائج نکلے یونیورسٹیاں مارکیٹ کی ڈیمانڈ دیکھ کر سلیبس میں تبدیلیاں کرنے لگیں' اگر مارکیٹ میں گنجائش موجود ہے تو یورپ کی یونیورسٹیاں کورس کا دورانیہ کم کر دیتی ہیں اور اگر مارکیٹ میں گنجائش کم ہو رہی ہے تو وہ ڈگری کے عمل کو لمبا کر دیتی ہیں اور دوسرا وہاں کے طالب علم ریسرچ اور انٹرن شپ کے نام پر تعلیم کے دوران مختلف کمپنیوں اور اداروں کے ساتھ کام شروع کر دیتے ہیں' یہ انٹرن شپ بعد ازاں ان کا تجربہ سمجھی جاتی ہے' اس سسٹم سے طالب علموں کو اپنی صلاحیتوں اور کمپنیوں کو طالب علموں کے معیار کا پتہ چلتا رہتا ہے چنانچہ وہاں کوئی طالب علم یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد فارغ نہیں رہتا جبکہ پاکستان میں اس سے بالکل الٹ ہے' ہمارا تعلیمی نظام تین حصوں میں تقسیم ہے' سکول' کالج اور یونیورسٹی' ان تینوں حصوں کا نظام اس قدر تیز اور آسان ہے کہ اس میں ایک طرف سے بچہ ڈالا جاتا ہے اور وہ دوسری سے ڈگری لے کر باہر آ جاتا ہے۔ جب وہ مارکیٹ میں آتا ہے تو اس کے پاس علم ہوتا ہے اور نہ ہی تجربہ لہٰذا کوئی کمپنی اسے نوکری دینے کے لئے تیار نہیں ہوتی' آج سے دس برس پہلے تک گورنمنٹ سیکٹر نوکری کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتا تھا لیکن اب یہ سیکٹر سکڑتا چلا جا رہا ہے' سرکاری اداروں میں نوکریاں کم ہوتی چلی جا رہی ہیں' دس دس سال تک کسی محکمے میں کوئی آسامی نہیں نکلتی اور اگر نکلتی ہے تو ایک نشست کیلئے ایک ایک لاکھ درخواستیں آ جاتی ہیں، پچھلے سال پشاور شہر میں خاکروبوں کی آسامیاں نکلی تھیں۔ اس کے لیے 42 ہزار درخواستیں جمع ہوئیں اور ان میں بی اے اور ایم اے نوجوان تک شامل تھے، موٹر وے پولیس کیلئے آسامیاں نکلیں تو ان کے لیے ایم اے، ایل ایل بی اور ایم بی اے نوجوانوں نے

درخواستیں دیں، اسی طرح سی ایس ایس اور پی سی ایس کے امتحانات میں ڈاکٹرز اور انجینئرز اپلائی کرتے ہیں اور یہ لوگ امتحان پاس کر کے غیر متعلقہ شعبوں میں نوکریاں کرتے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے ہمارے ملک میں کالجوں، یونیورسٹیوں اور سرکاری ملازمتوں تک پہنچنے والے خوش نصیبوں کی تعداد کتنی ہوتی ہے؟ صرف پانچ فیصد! جی ہاں ہماری آبادی کے صرف پانچ فیصد لوگ اعلیٰ تعلیم اور سرکاری نوکریوں تک پہنچ پاتے ہیں' اب سوال پیدا ہوتا ہے باقی 95 فیصد لوگ اور 30 فیصد نوجوان کیا کرتے ہیں؟ یہ وہ حقیقت ہے جس کے بطن سے ہمارے مسائل پیدا ہوتے ہیں، جس کی کوکھ سے لاکھوں حقیقتیں جنم لیتی ہیں۔ اس وقت اس ملک کی 35 فیصد آبادی وحید ظفر جیسے لوگوں پر مشتمل ہے جن کی زندگی کی ٹنل کے آخر میں کوئی روشنی نہیں، جن کی زندگی کا کوئی مقصد، کوئی نظریہ نہیں لہٰذا یہ لوگ خودکش حملہ آور بن رہے ہیں، نشے کی لت میں مبتلا ہو رہے ہیں' ماڈرن ازم کی سیڑھیاں چڑھتے جا رہے ہیں، ڈکیتیوں، اغواء برائے تاوان اور چوریوں میں ملوث ہو رہے ہیں یا پھر مذہب کی اس حد کو چھو رہے ہیں جس پر پہنچنے والے لوگ اپنے نظریے، اپنے خیال اور اپنے مکتبہ فکر کو لازوال سچ جبکہ دوسروں کے مکتبہ فکر، دوسروں کے خیال اور دوسروں کے نظریات کو باطل عظیم سمجھتے ہیں' جس پر پہنچنے والوں کی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے، مر جانا اور مار دینا۔ یہ حقیقت ہے ہم معاشرتی توازن کھو چکے ہیں، ہم لوگ انتہا پسندی میں مبتلا ہو چکے ہیں، ہم میں سے کچھ لوگ انتہا درجے کے لبرل ہیں اور کچھ لوگ جنون کی حد تک فرقہ پرست لیکن دونوں میں برداشت نہیں' ہمارے لبرل لوگ مذہبی طبقے کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور ہمارا مذہبی طبقہ لبرل لوگوں کا وجود تسلیم کرنے پر راضی نہیں، اس انتہا پسندی کا یہ نتیجہ نکل رہا ہے آج پورا معاشرہ خوف کا شکار ہے، ہم میں سے ہر شخص خطرے کا شکار ہو چکا ہے، مجھے بعض اوقات محسوس ہوتا ہے ہم خودکش معاشرہ بن چکے ہیں۔

ہم اس بخار سے کیسے نکل سکتے ہیں، یہ میں آپ کو کل بتاؤں گا۔

''ہوٹل اور مسجد''

پاکستان میں اس وقت چھ کروڑ نوجوان ہیں' یہ چھ کروڑ نوجوان چلتے پھرتے بم ہیں' جوانی ایک توانائی کا نام ہوتا ہے اور توانائی ہمیشہ بے لگام ہوتی ہے' اس کو رخ' منزل اور لگام حکومتیں' معاشرے اور لوگ دیا کرتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ہم نے آج تک ان نوجوانوں کی توانائیوں کو کوئی رخ دینے یا ان سے کوئی اجتماعی کام لینے کی کوشش نہیں کی چنانچہ یہ توانائی اب اپنا راستہ خود تلاش کر رہی ہے' ہمارے نوجوانوں میں سے کچھ سیدھا راستہ اختیار کر لیتے ہیں اور وہ ترقی' خوشحالی اور امن کی پٹڑی پر آ جاتے ہیں جبکہ باقی نوجوان نشے کی دلدل میں دھنس جاتے ہیں' وہ جرائم کا راستہ منتخب کرتے ہیں یا پھر فرقہ واریت کو اپنا مذہب بنا لیتے ہیں۔

پوری دنیا کے ماہرین متفق ہیں' انسان میں 16 سال کی عمر سے لے کر 25 سال تک موت کا خوف انتہائی کم ہوتا ہے' اس عمر میں انسان ننگے پاؤں ماؤنٹ ایوریسٹ پر چڑھ جاتا ہے اور ہزار دو ہزار میٹر کی بلندی سے سمندر میں چھلانگ لگا دیتا ہے لیکن جوں ہی انسان 25 سال کی حد عبور کرتا ہے تو موت کا خوف اس کے دروازے پر دستک دینے لگتا ہے اور وہ سر پر ٹوپی اور گلے پر مفلر لپیٹے بغیر باہر نہیں نکلتا' شاید یہی وجہ ہے پوری دنیا میں صرف ان فوجیوں کو محاذ پر بھجوایا جاتا ہے جن کی عمریں 25 سال سے کم ہوتی ہیں' فوج میں انسان جوں جوں سینئر ہوتا جاتا ہے وہ محاذ سے پیچھے ہٹتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ جرنیل بن جاتا ہے' جرنیلوں کے بارے میں کہا جاتا ہے یہ لوگ جنگ لڑا سکتے ہیں' لڑ نہیں سکتے' اسی طرح آپ مہلک نشوں کو لے لیجئے مہلک نشوں کے شکار 90 فیصد لوگوں کی عمریں 25 سال سے کم ہوتی ہیں' یہی صورتحال خودکش حملہ آوروں کی ہے' دنیا میں خودکش حملہ آوروں کا پہلا سکواڈ جاپان نے بنایا تھا' یہ لوگ ''کامی کازی'' کہلاتے تھے' یہ جسم پر بم باندھ کر امریکہ کے بحری جہازوں کی چمنیوں میں کود جاتے تھے' ان تمام لوگوں کی عمریں 17 سے 21 برس کے درمیان تھیں' اس تجربے کی بنا پر ثابت ہوا خودکش حملوں کیلئے آئیڈیل عمر 16 سے 22 سال ہوتی ہے لہٰذا آج دنیا میں جہاں بھی خودکش حملہ ہوتا ہے اس میں استعمال ہونے والے 98 فیصد نوجوانوں کی عمریں 22 سال سے کم ہوتی ہیں۔ پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جس کی 35 فیصد آبادی خودکش عمر اور خودکش دور سے گزر رہی ہے' ہمارے ملک میں 6 کروڑ نوجوان ہیں اور یہ نوجوان

وحید ظفر کی طرح اندر سے ابل رہے ہیں' یہ روز ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں "میں کیا کروں" اور انہیں اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا' ان نوجوانوں میں سے نصف کو ورغلانہ انتہائی آسان ہے چنانچہ یہ لوگ کسی بھی وقت بہت بڑا بحران پیدا کر سکتے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے' کیا دنیا میں ہم پہلی قوم ہیں جو اس مسئلہ کا شکار ہوئی؟ اس کا جواب یقیناً نہیں ہوگا' دوسرا سوال یہ ہے' دنیا کے دیگر ممالک نے اپنے آپ کو اس صورتحال سے کیسے بچایا تھا؟ یہ ایک دلچسپ سٹڈی ہے' دنیا کی دس ہزار سالہ سماجی تاریخ کا متفقہ فیصلہ ہے جو معاشرے اور جو ملک اپنے بچوں' اپنے نوجوانوں کیلئے سرگرمیاں تخلیق نہیں کرتے وہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتے' انسان کی دس ہزار سالہ تاریخ یہ فیصلہ بھی دے چکی ہے کہ انسان کو جسمانی' ذہنی اور روحانی تین قسم کی سرگرمیاں درکار ہوتی ہیں اور جن معاشروں میں بیک وقت ان تینوں سرگرمیوں پر توجہ نہیں دی جاتی وہ معاشرے بھی اپنا توازن کھو بیٹھتے ہیں' یورپ' امریکہ اور مشرق بعید کے تمام ترقی یافتہ ممالک نے انسانی تاریخ اور تجربے سے فائدہ اٹھایا اور انسانی سرگرمیوں کو تین شعبوں میں تقسیم کر دیا' یہ سرگرمیاں سپورٹس' مطالعہ اور آرٹ تھیں' ان لوگوں نے سپورٹس کو جسمانی' مطالعہ کو ذہنی اور موسیقی' آرٹ' ڈرامہ' تھیٹر اور فلم کو روحانی سرگرمی قرار دیا اور ان تینوں شعبوں کو بچوں اور بالخصوص نوجوانوں کی زندگی کا حصہ بنا دیا' یورپ اور امریکہ میں اس وقت کوئی ایسا تعلیمی ادارہ نہیں جس میں کھیل کا میدان' لائبریری اور آڈیٹوریم نہ ہو' یہ تینوں چیزیں یورپ' امریکہ اور مشرق بعید کے بچوں کے سلیبس کا باقاعدہ حصہ ہیں' وہاں کا ہر بچہ کوئی نہ کوئی کھیل ضرور کھیلتا ہے' وہ روزانہ لائبریری ضرور جاتا ہے اور وہ آرٹ کی کسی نہ کسی صنف میں ضرور دلچسپی رکھتا ہے' اسی طرح یورپ اور امریکہ کے کسی شہر یا قصبے کو اس وقت تک ٹاؤن کی حیثیت حاصل نہیں ہوتی جب تک اس میں آبادی کے مطابق کھیل کے میدان' پارکس' لائبریریاں اور تھیٹر ہال نہ ہوں' امریکہ میں پانچ لاکھ سے کم تعداد میں کتاب شائع نہیں ہوتی' اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ میں چھوٹی بڑی پانچ لاکھ لائبریریاں ہیں اور امریکہ میں چھپنے والی تمام کتابیں ان تمام لائبریریوں تک ضرور پہنچتی ہیں' امریکہ کے شہری اوسطاً چھ ہزار صفحات سالانہ پڑھتے ہیں' اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ اخبارات اور رسائل امریکہ میں شائع ہوتے ہیں اور یہ تمام رسائل اور اخبارات خریدے اور پڑھے جاتے ہیں' امریکہ اور یورپ کے تمام سکولوں میں لائبریری کا پیریڈ ہوتا ہے' اس پیریڈ میں ہر طالب علم لائبریری جاتا ہے اور اپنی پسند کی کتاب پڑھتا ہے' امریکہ میں طالب علموں کیلئے لائبریری سے کتاب ایشو کرانا ضروری ہوتا ہے' اگر کوئی طالب علم کتاب جاری نہ کرائے تو اس کے نمبر کٹ جاتے ہیں' امریکہ اور یورپ کے سکولوں اور یونیورسٹیوں میں سپورٹس بھی لازمی ہیں' وہاں اس طالب علم کو ادھورا اور بیمار سمجھا جاتا ہے جس کے پاس ٹریک سوٹ اور جاگرز نہ ہوں اور جس کی صبح یا شام کا آغاز کھیل سے نہ ہو' امریکہ کی تمام چھوٹی بڑی کمپنیوں نے دفتروں میں جم بنا رکھے ہیں' کمپنیوں کے ورکرز ان "جمز" میں روزانہ ورزش کرتے ہیں' تمام تعلیمی اداروں میں تھیٹرز اور آڈیٹوریم ہوتے ہیں اور ان میں ڈرامے' موسیقی کے پروگرام اور مباحثے ہوتے ہیں اور وہاں معیاری

فلمیں دکھائی جاتی ہیں، امریکہ اور یورپ کے تمام شہروں میں سینما گھر اور تھیٹر ہال بھی ہیں اور زیادہ تر لوگ وہاں ضرور جاتے ہیں، اگر ہم پاکستان کا تقابل امریکہ اور یورپ سے کریں تو خود بتائیے' ہمارے ملک میں کتنے تعلیمی ادارے ہیں جن میں یہ سہولتیں موجود ہیں؟ حقیقت یہ ہے ہماری نصف یونیورسٹیوں میں سپورٹس کمپلیکس اور آڈیٹوریم نہیں ہیں، ہمارے 95 فیصد ہائی سکولوں میں کھیل کے میدان اور لائبریریاں نہیں ہیں جبکہ گورنمنٹ کالج کے سوا کسی تعلیمی ادارے میں ڈرامیٹک سوسائٹی یا آرٹ اینڈ کلچر کی کوئی باڈی نہیں، ہمارے 95 فیصد طالب علم سلیبس کے سوا کوئی کتاب نہیں پڑھتے اور ہمارے 98 فیصد بچے زندگی میں کوئی کھیل نہیں کھیلتے، پاکستان کے صرف 9 شہروں میں تھیٹر ہیں اور ان تھیٹروں میں بھی انتہائی اخلاق باختہ ڈرامے دکھائے جاتے ہیں، پاکستان کے کسی شہر میں آبادی کے مطابق کھیل کے میدان اور لائبریریاں نہیں ہیں، پاکستان کا شمار دنیا کے ان پانچ ملکوں میں ہوتا ہے جن میں اخبارات، رسائل اور کتابوں کا بزنس زوال کا شکار ہے اور جن میں سینماؤں کی جگہ پلازے اور ریستوران بن رہے ہیں اور اسلام آباد دنیا کا دوسرا دارالحکومت ہے جس میں کوئی سینما نہیں لہٰذا پھر سوال پیدا ہوتا ہے پاکستان کے یہ چھ کروڑ نوجوان کیا کریں؟ خود سوچئے اگر یہ لوگ خودکش حملہ آور نہیں بنیں گے تو ان کے جذبے، ان کی امنگیں اور ان کی ذہانتیں کس کام آئیں گی، اس میں کوئی شک نہیں ہم ایک اسلامی ملک ہیں، ہم تعلیمی اداروں میں آرٹ اینڈ کلچر اور سینما کی اجازت نہیں دے سکتے لیکن کیا اسلام لائبریریوں، ورزش اور کھیل سے بھی منع کرتا ہے! کیا وہ آڈیٹوریم، مباحثے اور تقریری مقابلوں سے بھی روکتا ہے۔ کیا ہمارے پاس اتنا بھی وقت نہیں کہ ہم سپورٹس اور مطالعے کو تعلیم کا لازمی جزو بنا سکیں، ہم پاکستان کے تمام شہروں میں کھیل کے میدان اور لائبریریاں بنا سکیں اور ہماری ضلعی حکومتیں جنگی بنیادوں پر کھیل اور مطالعے کی ترویج شروع کر سکیں کیا ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ ہم ہر تحصیل آفس میں ہال بنائیں اور اس ہال میں ہر ہفتے کوئی نہ کوئی معیاری پروگرام کیا جائے، اس میں سیمینار، نمائشیں اور کھیل دکھائے جائیں۔ کیا ہمارے پاس اس ملک کے چھ کروڑ نوجوانوں کیلئے اتنا وقت اور اتنے وسائل نہیں ہیں! میرا خیال ہے اگر ہم نے اس طرف توجہ نہ دی تو جلد وہ وقت آ جائے گا جب ''میں کیا کروں'' جیسے سوال پوچھنے والے تمام نوجوان اپنے جسم سے بم باندھ لیں گے اور وہ ہر برسر روزگار اور خوشحال شخص کو اپنا دشمن سمجھنے لگیں گے خواہ وہ خوشحال شخص اس کا بھائی یا والد ہی کیوں نہ ہو' اگر ہم نے وقت سے پہلے بند نہ باندھا تو اس ملک میں ایک ایسی جنگ شروع ہو جائے گی جس کے آخر میں کوئی مولانا بچے گا اور نہ ہی مسٹر' جس میں کوئی ہوٹل سلامت رہے گا اور نہ ہی مسجد۔

ہم دنیا کی طرح کب سوچیں گے

وہ ٹاؤن شپ لاہور میں گارمنٹس کا کاروبار کرتا تھا' وہ سوموار کے دن اپنے بھائی احمد علی کے ساتھ موٹر سائیکل پر گھر سے نکلا' گھر سے تھوڑی دور پٹرول ختم ہوگیا' وہ غازی آباد کے ایک پٹرول پمپ پر رک گیا' اس نے پٹرول ڈلوایا' بل دینے کا وقت آیا تو ''پٹرول بوائے'' کے ساتھ اس کی تلخ کلامی ہوگئی' محمد علی کا خیال تھا وہ زیادہ پیسے طلب کر رہا ہے جبکہ پٹرول بوائے کا کہنا تھا ارات کو پٹرول دو روپے لیٹر مہنگا ہو گیا ہے' ان دونوں کی توں تکار سن کر پٹرول پمپ کے دوسرے ملازمین بھی جمع ہو گئے یوں یہ معمولی جھگڑا ہاتھا پائی اور لڑائی میں تبدیل ہو گیا' اس دوران پمپ کا گارڈ آگے بڑھا' اس نے محمد علی کو گریبان سے پکڑ لیا' معاملہ مزید بگڑ گیا' اس بگاڑ کے دوران سکیورٹی گارڈ نے محمد علی کو گولی ماردی' 23 برس کا یہ خوبصورت نوجوان فرش پر گرا اور اس نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔

محمد علی مہنگائی کی تازہ ترین لہر کا پہلا شہید ہے' اس ملک میں پچھلے دس برسوں میں مہنگائی میں 4 گنا اضافہ ہوا جبکہ لوگوں کی قوت خرید میں آٹھ گنا کمی واقع ہوئی' اس ملک میں پندرہ سے سولہ کروڑ لوگ بستے ہیں' ان سولہ کروڑ لوگوں میں کوئی ایسا شخص نہیں جو مہنگائی سے براہ راست متاثر نہ ہوا ہو' اس ملک میں آٹے سے دوا تک ضرورت کی ہر چیز عوام کے ہاتھ سے نکل چکی ہے' مرغی گوشت کا سستا ترین ذریعہ تھی لیکن برڈ فلو کی وجہ سے یہ سستا ترین ذریعہ بھی اب عوام کے پاس نہیں رہا' مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے حکومت عنقریب پولٹری کی صنعت کو بچانے کے لئے شادی بیاہ پر ون ڈش کی اجازت دے دے گی' یقیناً اس اجازت سے پولٹری کی دم توڑتی صنعت کو سہارا ملے گا لیکن صرف گوشت تو سب کچھ نہیں ہوتا' انسانی زندگی کے اور بھی سینکڑوں ہزاروں تقاضے ہوتے ہیں اور یہ سارے تقاضے بازار سے مول ملتے ہیں اور اس وقت بازار سے ملنے والی ہر چیز مہنگی ہو چکی ہے' مہنگائی کا یہ عالم ہے آج ہزار روپے کا نوٹ چھوٹا ہو گیا ہے اور حکومت پانچ ہزار کا نوٹ ''لانچ'' کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے' اگر یہ صورتحال اسی طرح جاری رہی تو شاید آنے والے والے برسوں میں حکومت کو ایک لاکھ روپے کا نوٹ بھی متعارف کرانا پڑ جائے' لوگ تھیلوں میں نوٹ بھر کر بازار جائیں اور اس کے بدلے ایک کلو آلو لے کر واپس آ گئیں۔

معیشت دانوں کا خیال ہے آج کے دور میں پٹرول مہنگائی کی ماں ہے' اگر کسی ملک میں پٹرول مہنگا ہو جائے تو اس ملک میں پانی کے ریٹس بھی بڑھ جاتے ہیں' ہماری آج کی زندگی کا 80 فیصد دارومدار پٹرول پر ہے'

پٹرول نہ ہو تو آٹے سے کپڑے تک ہر چیز شہریوں کی زندگی سے خارج ہو جاتی ہے' یورپ اور امریکہ کو 1972ء میں اس حقیقت کا ادراک ہو گیا تھا' وہ جان گئے تھے آنے والے وقت میں صرف وہی ملک سپر پاور رہیں گے جن کے قبضے میں تیل ہو گا' جو تیل کی قیمتیں طے کرنے کے قابل ہوں گے' مجھے پچھلے دنوں سوویت یونین کے زوال کے بارے میں ایک تحقیقی مقالہ پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا' اس مضمون میں محقق نے انکشاف کیا تھا سوویت یونین دنیا کا واحد خطہ تھا جس کے پاس پٹرول کی مارکیٹ نہیں تھی جبکہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے پاس آئل کمپنیاں بھی تھیں اور آئل کی سٹاک ایکسچینج بھی لہٰذا روس کی اس کمی کے باعث سوویت یونین ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا' تیل کتنی بڑی اور حساس ضرورت ہے یہ جاننے کیلئے آپ امریکہ اور یورپ میں تیل کی قیمتوں کا تجزیہ کیجئے' آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی' یورپ اور امریکہ پٹرول کی قیمتیں کبھی عوام کی قوت خرید سے باہر نہیں ہونے دیتے' کل میرے ایک ''سرکاری'' دوست نے فرمایا ''یورپ میں پٹرول کی قیمت ایک یورو سے زیادہ ہے' پاکستان میں اس کے مقابلے میں سستا پٹرول مل رہا ہے'' میں نے اس سے عرض کیا ''یورپ میں پست ترین آمدنی ہزار یورو ماہانہ ہے چنانچہ وہاں ایک ہزار یورو لینے والا شخص بڑی آسانی سے ایک یورو فی لیٹر پٹرول افورڈ کر لیتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں پاکستان کے چالیس فیصد لوگ خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں اور 40 فیصد لوگ تین ہزار روپے ماہانہ سے کم کماتے ہیں' تم بتاؤ کیا تین ہزار روپے کمانے والا شخص 60 روپے لیٹر پٹرول افورڈ کر سکتا ہے'' میرے سرکاری دوست کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

پٹرول آج کی ایک بڑی سچائی ہے' پاکستان میں پٹرول عوام کی قوت خرید سے نکل چکا ہے' پٹرول کی قیمت میں مزید اضافہ ہو گا' یہ دوسری بڑی سچائی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے دنیا کے دوسرے ممالک اس مسئلے سے کیسے نمٹ رہے ہیں' پٹرول وہاں کے عام شہری کی زندگی پر اثر انداز کیوں نہیں ہوتا؟ اس سوال کا جواب بہت دلچسپ ہے' دنیا نے پبلک ٹرانسپورٹ کے شعبے کو ترقی دے کر پٹرول کا مسئلہ حل کر لیا ہے' اس وقت پوری ''فرسٹ ورلڈ'' میں ریل کا زیر زمین نظام موجود ہے' شہروں کے درمیان ریل اور بسوں کا انتہائی شاندار سسٹم کام کر رہا ہے' امریکہ' یورپ' جاپان' مشرق وسطیٰ اور چین میں لوگ ذاتی کار کی بجائے میٹرو' ریل اور بس پر سفر کرتے ہیں' وہاں ہر وقت پبلک ٹرانسپورٹ دستیاب ہوتی ہے یہ ٹرانسپورٹ ذاتی گاڑیوں سے کہیں زیادہ آرام دہ اور محفوظ ہوتی ہے' برطانیہ میں ایسے بے شمار سیاستدان' وزراء' بیوروکریٹس اور ارب پتی بزنس مین ہیں جنہوں نے پوری زندگی گاڑی نہیں خریدی' یہ لوگ ہمیشہ ٹرین اور بس پر سفر کرتے ہیں' اس سفر سے ان کا وقت بھی بچتا ہے اور یہ رش اور پارکنگ کی کوفت سے بھی محفوظ رہتے ہیں لہٰذا دنیا نے اس شعبے کو ترقی دے کر پٹرول کے مسئلے سے جان چھڑا لی' جس دن ہم نے پاکستان میں پٹرول کی قیمت میں اضافہ کیا تھا اس دن چین نے مقناطیسی قوت سے چلنے والی ٹرین کا تجربہ کیا تھا یہ 18 میٹرک ٹن کی ٹرین تھی جو 160 کلومیٹر کی رفتار سے چل سکتی ہے اور اس میں 60 مسافر بیٹھ سکتے ہیں' یہ ٹرین چنگ ڈو شہر میں 425 کلومیٹر لمبی ریلوے لائن پر چلائی گئی تھی' اسی طرح میں نے کسی جگہ پڑھا تھا بھارتی حکومت نے کسی غیر ملکی فرم کو دہلی شہر میں زیر زمین ٹرین سسٹم بچھانے کا ٹھیکہ دے دیا ہے' یہ کمپنی پورے شہر کے نیچے پٹڑی بچھائے گی اور اس پر میٹرو چلائے گی' سفر کا یہ ذریعہ سستا بھی ہو گا' آرام دہ بھی اور اس سے پٹرول کی بچت بھی ہو گی

لہٰذا کہنے کا مطلب ہے اگر دنیا اس ذریعے سے اپنے پٹرول کا بجٹ کم کر سکتی ہے تو ہم کیوں نہیں کر سکتے ؟ حکومت ہر سال نعرے لگاتی ہے اسے پٹرول کی سبسڈی کی مد میں 64 ارب کا نقصان ہو رہا ہے اور اس کا نقصان دو ارب ڈالر سے بڑھ چکا ہے وغیرہ وغیرہ لیکن سوال یہ ہے اگر حکومت یہ رقم زیرزمین ریلوے سسٹم پر لگا دے تو کیا پاکستان کی پٹرول کی ضرورت میں پچاس فیصد کمی نہیں آ جائے گی اور حکومت کا خسارہ بھی کم نہیں ہو جائے گا اس کے بعد پٹرول خواہ دو سو روپے لیٹر ہو جائے عوام کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا' اسی طرح اگر حکومت ریلوے کا نظام بہتر بنا کر کارگو ٹرانسپورٹ اس پر شفٹ کر دے' اگر حکومت کارگو ٹرینیں اور کارگو جہاز چلائے تو اس سے بھی پٹرول کی لاگت میں کمی آئے گی' کرائے بھی کم ہوں گے اور چیزیں بھی سستی ہو جائیں گی۔ اسی طرح اگر حکومت شہروں کے اردگرد موجود زرعی زمینوں کی حفاظت کا قانون پاس کر دے' اگر حکومت وہاں ہاؤسنگ سکیمیں نہ بننے دے' اگر وہ وہاں کے کسانوں کو قرضے اور سہولتیں دے تو انتظامیہ کو شہروں کے لئے خورد و نوش کی اشیاء دور سے نہیں منگوانی پڑیں گی جس کے نتیجے میں شہروں میں کھانے کی اشیاء سستی ہو جائیں گی یوں مہنگائی کنٹرول ہو جائے گی' اس وقت لوگوں کو ہزار ہزار کلو میٹر کے فاصلے سے ترکاریاں منگوانا پڑتی ہیں جس کی وجہ سے ان کی قیمت میں دس دس گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ جناب شیخ رشید ریلوے کے وفاقی وزیر بن چکے ہیں' وہ ایک ہنرمند اور ذہین شخص ہیں وہ جس وزارت میں جاتے ہیں وہاں اپنی گنجائش نکال لیتے ہیں' شیخ صاحب اگر جدید تقاضوں کو سامنے رکھ کر ریلوے کے نظام کی اصلاح کریں' وہ اگر چار بڑے شہروں میں زیرزمین میٹرو بچھا دیں' وہ اگر کارگو ٹرینوں میں اضافہ کر دیں اور لوگوں کو ٹرین استعمال کرنے کی ترغیب دیں تو بھی ملک کے زیادہ تر مسائل حل ہو جائیں۔ ہم پچھلے دنوں چین گئے تھے وہاں سنکیانگ کے گورنر نے انکشاف کیا تھا چین نے شاہراہ ریشم کے ساتھ ساتھ کاشغر سے اسلام آباد تک ٹرین کی پٹڑی بچھانے کا فیصلہ کیا ہے' انہوں نے بتایا تھا' یہ پٹڑی چین کی مجبوری ہے اگر کوئی شخص کاشغر سے ارچی آتا ہے تو اسے 15 گھنٹے لگتے ہیں جبکہ وہ شخص دس گھنٹوں میں اسلام آباد پہنچ سکتا ہے' انہوں نے بتایا چین کی قریب ترین بندرگاہ ارچی سے 4500 کلو میٹر دور ہے جبکہ گوادر ہم سے محض 2500 کلو میٹر کے فاصلے پر ہے لہٰذا اگر ہم سنکیانگ کو ریل کے ذریعے پاکستان سے جوڑ دیں تو ہمیں اربوں ڈالر کا فائدہ ہوگا۔

دنیا اس وقت اس طرح سوچ رہی ہے لیکن ہم دنیا سے مخالف سمت میں بھاگ رہے ہیں' ہم 21 ویں صدی میں ریل کو چھوڑ کر کاروں میں اضافہ کر رہے ہیں' اس وقت اسلام آباد میں دو سو نئی گاڑیاں روزانہ رجسٹر ہوتی ہیں' یہ دو سو گاڑیاں اس ملک میں پٹرول کی قیمتوں میں اضافہ کر رہی ہیں لہٰذا اگر ہم پبلک ٹرانسپورٹ کو بہتر بنا لیں تو لوگ گاڑیاں خریدنا بند کر دیں گے اور اس کے نتیجے میں پاکستان میں پٹرول کا مسئلہ حل ہو جائے گا' اس وقت دنیا میں پبلک ٹرانسپورٹ ملکوں کی ترقی ماپنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے' لوگ ٹرین' بسوں اور ٹیکسیوں کے نظام سے ملکوں کی ترقی ماپتے ہیں لیکن افسوس ہم لوگوں نے کاروں اور پٹرول کے زیاں کو اپنا معیار بنا لیا ہے لہٰذا اس کا یہ نتیجہ نکل رہا ہے محمد علی جیسے نوجوان پٹرول کی قیمت میں اضافے کے بعد پٹرول پمپ کے فرش پر تڑپ تڑپ کر جان دے دیتے ہیں' پتہ نہیں ہم ہمالیہ کو موم بتی کے ساتھ پگھلانے کا سلسلہ کب بند کریں گے' ہم دنیا کی طرح کب سوچنا شروع کریں گے۔

بم ایڈیشن

شوکت علی کا تعلق میاں چنوں کے بودلہ ٹاؤن سے تھا، وہ ایک برس پہلے تک بکری کا مالک تھا لیکن اس پر مشکل وقت آیا اور وہ پیسے پیسے کیلئے محتاج ہوگیا، اس نے اس محتاجی کا عجیب حل نکالا، اس نے 12 فروری 2007ء کو اپنے تین بچے فروخت کرنے کا اعلان کردیا۔ اس نے میاں چنوں بازار میں بچوں کی فروخت کا بورڈ لگوایا اور خود اس بورڈ کے نیچے بیٹھ گیا۔ یہ بورڈ دیکھ کر شہر کے لوگ جمع ہوگئے، میڈیا کو علم ہوا تو شوکت علی کو صحافیوں نے گھیر لیا۔ شوکت علی کی خبر اخبارات تک پہنچی، اخبارات سے ٹیلی ویژن چینلز پر آئی اور وہاں سے عالمی شکل اختیار کر گئی یوں شوکت علی ایک ہی رات میں بین الاقوامی شخصیت بن گیا۔ شوکت علی کے حالات کی خبر میڈیا سے ہوتی ہوئی ہماری حکومت تک پہنچی اور حکومت فوراً حرکت میں آگئی۔ وزیراعظم شوکت عزیز نے شوکت علی کو میاں چنوں کے ایک بینک میں سکیورٹی گارڈ کی ملازمت کی پیش کش کردی، ضلعی ناظم نے اسے مالی مدد دے دی، پولیس افسروں نے اسے موبائل لے دیا اور مخیر شہریوں نے اس کا اکاؤنٹ کھلوادیا۔ اسلام آباد اور لاہور کے این جی اوز کا ضمیر بیدار ہوا۔ وہ اس کی مدد کے لیے میاں چنوں روانہ ہوگئیں۔ ملک سے باہر موجود پاکستانیوں نے شوکت علی سے رابطہ کیا اور یوں شوکت علی کے مسائل حل ہونے لگے۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق اب تک شوکت علی کے پاس اتنی رقم جمع ہو چکی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے جیسے دس بیس لوگوں کی مدد کرسکتا ہے بلکہ اس نے دوسری شادی اور نوکری کی جگہ کاروبار کرنے کا فیصلہ بھی کرلیا ہے۔ ہم سب پاکستانی شوکت علی کی اس کامیابی پر خوش ہیں مگر یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے اگر شوکت علی میاں چنوں کے بازار میں اپنے بچوں کی فروخت کا بورڈ نہ لگاتا۔ اگر شہر کے لوگ اس بورڈ کے اردگرد جمع نہ ہوتے، اگر یہ واقعہ مقامی صحافیوں کے نوٹس میں نہ آتا، اگر صحافی یہ خبر اخبارات کو نہ بھجواتے، اگر نیوز ایڈیٹر اس خبر کو اہمیت نہ دیتے، اگر یہ خبر اخبارات کے صفحہ اول پر شائع نہ ہوتی، اگر ٹیلی ویژن چینلز کو اس میں "کیمرہ بیوٹی" نظر نہ آتی، اگر شوکت علی کا مسئلہ ٹی وی سکرین تک نہ پہنچتا اور اگر اس دن وزیراعظم ملک میں نہ ہوتے، اگر وزیراعظم کا سٹاف انہیں اس خبر کی "کٹنگ" فراہم نہ کرتا، اگر وزیراعظم اس ایشو کو سنجیدہ نہ لیتے، اگر وزیراعظم اپنے عملے کو ہدایات جاری نہ کرتے اور اگر بیوروکریسی فوری طور پر حرکت میں نہ آتی تو شوکت

علی کا کیا بنتا؟ اس کے مسائل کیسے حل ہوتے؟ سوال پیدا ہوتا ہے اگر اس دن بارش ہو جاتی، اگر اس دن میاں چنوں میں کوئی سیاسی جلسہ ہوتا، اس دن ڈی آئی جی یا آئی جی صاحب شہر کے دورے پر ہوتے، اس دن شہر کے سارے لوگ اور سارے صحافی بڑے صاحب کی تقریر سننے میں مصروف ہوتے۔ اگر اس دن اخبارات کی چھٹی ہوتی، اگر اس دن کوئی بڑا حادثہ ہو جاتا، اگر اس دن کوئی بڑا ''بم بلاسٹ'' ہو جاتا، اگر اس دن ہماری حکومت صدر بش، وزیر اعظم ٹونی بلیئر یا شاہ عبداللہ کے استقبال میں مصروف ہوتی یا اس دن بسنت، ویلنٹائن ڈے یا نیو ایئر نائٹ ہوتی اور اس دن ہماری حکومت ''ڈے اینڈ نائٹ'' تقریبات میں مصروف ہوتی تو شوکت علی کا کیا بنتا؟ اس کے بچوں کو روٹی اور آسرا کون دیتا؟ سوال پیدا ہوتا ہے اگر شوکت علی کے ذہن میں توجہ حاصل کرنے کا یہ اچھوتا خیال نہ آتا، اگر شوکت علی عین موقع پر شرما جاتا، اگر وہ بورڈ نہ لکھواتا، اگر اس کے عزیز، رشتے دار اور دوست اسے سمجھا بجھا لیتے، اگر اس کی بیوی اور اس کے بچے اس ''نیک کام'' میں اس کی مدد نہ کرتے، اگر شہر کا کوئی شخص اس کا بورڈ لکھنے پر راضی نہ ہوتا، اگر لوگ اسے بورڈ لگانے کی اجازت نہ دیتے اور اگر شہر کے لوگ یہ بورڈ پڑھنے کے لیے وہاں کھڑے نہ ہوتے تو شوکت علی کا کیا بنتا؟

یہ سارے اگر، یہ سارے سوال بھی شوکت علی اور اس کی کہانی جتنے سفاک اور خوفناک ہیں اور یہ وہ ''سوال'' اور وہ ''اگر'' ہیں جن کے نیچے اس ملک کا مقدر دفن ہے۔ جس کے پیچھے شوکت علی جیسے بے شمار لوگوں کا نصیب چھپا ہے لیکن ہم اس نصیب، اس مقدر پر گفتگو سے پہلے اگر چند مزید سوالوں پر غور کر لیں، اگر ہم چند مزید ''اگروں'' کی گرد جھاڑ لیں تو ہم اس مسئلے کی گہرائی تک پہنچ سکتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے اس ملک میں اس وقت ساڑھے چھ کروڑ شوکت علی ہیں، یہ شوکت علی غیر انسانی زندگی گزار رہے ہیں، ان کے پاس روزگار ہے، روٹی ہے اور نہ ہی سر چھپانے کا ٹھکانہ۔ اقوام متحدہ، حکومت پاکستان اور ہمارا ضمیر تینوں ان شوکت علیوں کا وجود تسلیم کر چکا ہے، اس ملک میں شوکت علی جیسے ایک کروڑ 45 لاکھ پڑھے لکھے بے روزگار بھی ہیں۔ یہ سارے بے روزگار شوکت علی پچھلے کئی برسوں سے نوکری کیلئے دھکے کھا رہے ہیں۔ یہ ملک شوکت علی جیسے انسانوں کے سپیئر پارٹس کی مارکیٹ بن چکا ہے، ہمارے سینکڑوں ہزاروں شوکت علی اپنا ایک ایک گردہ، ایک ایک آنکھ اور ایک ایک آنت بیچ کر زندگی گزار رہے ہیں۔ اس ملک کے سینکڑوں، ہزاروں شوکت علی عدالت میں جانے کی بجائے خودکشی کا راستہ منتخب کرتے ہیں اور اس ملک میں لوگ بجلی کا بل دینے کیلئے ڈاکے مارنے پر مجبور ہیں اور ضروریات زندگی تک پہنچنے کیلئے تاوان کا طریقہ استعمال کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے ان لوگوں کا کیا قصور ہے؟ اور حکومت تک ان لوگوں کے مسائل، ان لوگوں کی تلخیاں اور ان لوگوں پر ہونے والے ظلم کب پہنچیں گے اور کیا حکومت ان لوگوں کی طرف سے بورڈ لگنے کا انتظار نہیں کر رہی؟ کیا حکومت ان لوگوں کے شوکت علی بننے کا انتظار نہیں کر رہی؟ اور کیا جب تک یہ لوگ اپنے بچے نیلام کرنے کا اعلان نہیں کرتے اس وقت تک حکومت کے کانوں پر جوں نہیں رینگے گی، کیا اس وقت تک ان کی آواز جناب وزیر اعظم شوکت عزیز اور صدر جنرل پرویز مشرف تک نہیں پہنچے گی؟ کیا ان لوگوں کا قصور ان کی شرم، ان کی حیا، ان کی سفید پوشی اور ان کا ضمیر ہے؟ کیا ان کی چپ اور ان کا صبر ان کا جرم ہے؟ اور

کیا اس ملک میں حکومت تک پہنچنے کیلئے خودسوزی، خودکشی، بچوں کی نیلامی اور میڈیا کے سوا کوئی راستہ نہیں بچا؟ اور کیا لوگ اب تھانے، عدالت اور حکومت تک پہنچنے کیلئے صرف اخبارات اور ٹیلی ویژن کا راستہ استعمال کرینگے؟ کیا ہماری عدالتیں اور ہماری حکومتیں اخبارات اور ٹیلی ویژن دیکھ کر لوگوں کی مظلومیت اور ضروریات کا اندازہ کریں گی؟ سوال یہ ہے اگر نوکری شوکت علی کا حق تھا تو اسے یہ حق بچوں کی نیلامی کے بعد کیوں ملا؟ اور اگر شوکت علی اور اس کے مسائل حکومت اور اس ملک کی ذمہ داری نہیں تھی تو ہمارے وزیر اعظم نے شوکت علی کی دادرسی کیوں کی؟ یہ سوال اور یہ اگر وہ بنیادی نقطے ہیں جن میں ہمارے آنے والے کل کے تمام سورج چھپے ہیں، یقین کیجئے اگر ہم نے آج ان سوالوں کا جواب تلاش نہ کیا تو ہمارے لیے کل گزارنا مشکل ہو جائے گا۔

میں اس معاشرے کا ایک ادنیٰ شہری ہوں، میں چوبیس گھنٹے اپنے جیسے ادنیٰ شہریوں کے درمیان رہتا ہوں لہٰذا میں روز اس معاشرے میں آنے والی تبدیلیاں نوٹ کرتا ہوں، میں دیکھ رہا ہوں لوگ اب جائز حق کیلئے عدالت کی بجائے اخبار کے دفتر جاتے ہیں، لوگ جج کے بجائے صحافی کا دروازہ بجاتے ہیں اور لوگ حکومت تک رسائی کیلئے اخباروں اور ٹیلی ویژن چینلوں کا رخ کرتے ہیں، لوگوں کا یہ رویہ ثابت کرتا ہے ہماری سرکاری اور قانونی مشینری جواب دے چکی ہے، حکومت کے دل سے ضمیر اور ذمہ داری ختم ہو چکی ہے اور اب حکومت سے کام لینے کا صرف اور صرف ایک ہی طریقہ بچا ہے اور وہ طریقہ شوکت علی فارمولا ہے۔ یہ صورتحال انتہائی خطرناک ہے کیونکہ اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو شاید وہ وقت آتے دیر نہ لگے جب لوگ ڈاکٹر سے دوا لینے، دکاندار سے چینی خریدنے، بجلی کا میٹر لگوانے، تھانے دار سے رپٹ لکھوانے، جج صاحب سے انصاف لینے اور وزیر کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے جسم پر بم باندھیں۔ ان کے دفتر میں داخل ہوں، صاحب کو بم کی پن دکھائیں، اپنی فائل پر دستخط کرائیں اور گھر واپس آ جائیں، یقین کیجئے اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو لوگ روزانہ تیل کی بوتلیں لیکر گھر سے نکلیں گے اور انہیں جہاں کوئی مشکل پیش آئے گی وہ اپنے جسم پر تیل چھڑکیں گے اور ماچس لہرا کر آگے بڑھ جائیں گے۔ آج شوکت علی چیخ چیخ کر اس معاشرے کو یہ پیغام دے رہا ہے جس ملک میں ضمیر مر جاتے ہیں اس ملک کے فیصلے تیل کی بوتلیں اور بم کرتے ہیں' ہماری حکومت خودکش دھماکے کرنے والے نوجوانوں کے بارے میں متفکر ہے، ہمارے وزراء ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں "یہ لوگ کون ہیں اور یہ کہاں سے آ رہے ہیں" انہیں کون بتائے یہ لوگ ظلم کی کوکھ سے جنم لے رہے ہیں اور یہ سب شوکت علی جیسے لوگوں کا بم ایڈیشن ہیں۔ انہیں کون بتائے اگر انہوں نے اپنی سمت درست نہ کی تو یہ سلسلہ بچوں کی فروخت سے بمباری تک وسیع ہو جائے گا اور ہمارا ہر شہری میاں چنوں بن جائے گا۔

پاؤں سے گلے تک

یہ 27 مارچ 2007ء کا دن تھا اور لیاقت باغ راولپنڈی میں صدارتی جلسہ ہو رہا تھا' اچانک ایک خاتون جلسہ گاہ کی درمیانی صفوں سے اٹھی اور وہ سٹیج کی طرف بڑھنے لگی' سیکورٹی اہلکاروں میں سراسیمگی پھیل گئی' جلسہ گاہ کے مختلف کونوں میں کھڑے "سفید لباس" والے آگے بڑھے اور انہوں نے غیر محسوس طریقے سے خاتون کو گھیرنا شروع کر دیا لیکن خاتون ان کے گھیرے سے باہر نکل گئی' سفید لباس کے بعد پولیس کا سیکورٹی سرکل تھا' پولیس نے بھی خاتون کے راستے میں مزاحم ہونے کی کوشش کی لیکن خاتون پولیس اہلکاروں کو بھی دھکیل کر آگے بڑھ گئی' اس کے بعد آرمی کا سرکل تھا' خاتون نے آرمی کا سرکل بھی توڑ دیا اور اس کے بعد صدر کی سپیشل سیکورٹی تھی' یہ صدر کے ذاتی کمانڈوز ہیں اور صدر ان سب کے ناموں تک سے واقف ہیں' خاتون کمانڈوز کا حلقہ نہیں توڑ سکتی تھی کیونکہ ان لوگوں کو خصوصی اختیارات حاصل ہیں' یہ لوگ وفاقی وزراء سے وزیراعظم تک کو روک سکتے ہیں اور جب تک ان کی تسلی نہیں ہوتی یہ کسی شخص کو صدر کے قریب نہیں پہنچنے دیتے' کمانڈوز نے خاتون کو گھیر لیا اور اسے سٹیج سے دور دھکیلنے لگے لیکن خاتون نے پیچھے ہٹنے سے انکار کر دیا' صدر تقریر کیلئے ڈائس پر پہنچ چکے تھے' صدر نے یہ منظر دیکھا تو انہوں نے کمانڈو کو آواز لگائی "بابر اس کو چھوڑ دو اس کو آنے دو اس سے کاغذ لے لو" لیکن صدر کے حکم کے باوجود بابر خاتون کو چھوڑنے پر رضامند نہ ہوا' صدر نے دوبارہ حکم دیا جس کے بعد بابر خاتون کو لے کر سٹیج پر پہنچ گیا' خاتون صدر کے پاس پہنچی اور ان کے قدموں میں گر گئی' صدر نے اسے اوپر اٹھایا' اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس سے اس کا مسئلہ پوچھنے لگے' خاتون دو منٹ تک انہیں اپنا مسئلہ سمجھاتی رہی' وہ ساتھ ساتھ اپنے آنسو بھی پونچھتی جاتی تھی۔

یہ خاتون کون تھی؟ یہ صدر کے پاؤں میں کیوں گری؟ اس نے صدر کے ساتھ کیا گفتگو کی اور صدر کے ساتھ ملاقات کے بعد یہ خاتون کہاں چلی گئی؟ 28 مارچ تک کسی شخص کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا' تاہم 28 مارچ کے تمام اخبارات میں اس منظر کی تصاویر ضرور شائع ہوئیں' ان تصاویر میں خاتون صدر کی طرف بڑھ رہی تھی' وہ صدر کے پاؤں میں بھی جھکی ہوئی تھی' صدر اسے اٹھا بھی رہے تھے اور اسے دلاسہ بھی دے رہے تھے' 28 مارچ کو یہ خاتون راولپنڈی پریس کلب پہنچی اور اس نے اپنا مسئلہ صحافیوں کے سامنے رکھ دیا' یہ خاتون فہمیدہ اظہر تھی' فہمیدہ کا بھائی اشرف محمود کیانی پولیس کی حراست میں قتل ہو گیا تھا' فہمیدہ اور اس کی بہن محمودہ نے انصاف کیلئے تمام

منصف دروازوں پر دستک دی تھی لیکن ان کی شنوائی نہیں ہوئی تھی لہٰذا انہوں نے 27 مارچ کو لیاقت باغ کے جلسہ عام میں صدر تک پہنچنے کا فیصلہ کیا' فہمیدہ سیکورٹی کے سارے سرکل توڑ کر صدر تک پہنچ گئی' صدر نے اس کی بات غور سے سنی' اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور اسے یقین دہانی کرائی ''میں ذاتی دلچسپی لے کر آپ کا مسئلہ حل کراؤں گا اور ملزمان خواہ کتنے ہی طاقتور کیوں نہ ہوں' میں انہیں سزا کے عمل سے ضرور گزاروں گا'' صدر نے فہمیدہ کو یقین دلایا'' وزیراعلیٰ اور آئی جی پنجاب اس کیس پر خصوصی توجہ دیں گے اور میں اس سارے عمل کی براہ راست نگرانی کروں گا'' فہمیدہ اظہر کا کہنا تھا' وہ صدر کی یقین دہانی سے مطمئن ہیں۔

مجھے یقین ہے فہمیدہ اظہر کی یہ کوشش رنگ لائے گی اور صدر صاحب ذاتی دلچسپی لے کر قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیں گے لیکن سوچنے کا مقام ہے' کیا کسی شخص کے قاتلوں کو گرفتار کرانا صدر کا کام ہے؟ اور اگر یہ صدر کا کام ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے اگر اس دن فہمیدہ اظہر سیکورٹی کے پانچ سرکل توڑنے میں کامیاب نہ ہوتی تو اشرف محمود کیانی کے قتل کا کیا بنتا؟ کیا اس کے باوجود قاتل پکڑے جاتے؟ اور کیا فہمیدہ کو اس زندگی میں انصاف مل جاتا؟ سوچنے کا مقام ہے کیا صدر معظم کے قدموں میں فہمیدہ کا جھکا ہوا سر یہ ثابت نہیں کرتا اس ملک میں انصاف کا کوئی نظام نہیں اور اس ملک میں جس شخص نے بھی انصاف لینا ہے اسے صدر تک پہنچنا پڑے گا' اسے صدر کے پاؤں میں گرنا پڑے گا اور اگر صدر اس کی بات غور سے نہیں سنتے تو اسے اس مملکت خداداد میں انصاف نہیں مل سکتا' کیا یہ خاتون اور اس کا یہ عمل ثابت نہیں کرتا پاکستان کے ادارے اپنا وقار' اپنی قوت اور تحریک کھو چکے ہیں اور اب لوگ تھانے یا عدالت کا رخ کرنے کی بجائے صدر کے پاؤں پڑنا مناسب سمجھتے ہیں اور کیا فہمیدہ اظہر اور اس کا جھکا ہوا سر پاکستان کو ایک ''فیل سٹیٹ'' ثابت نہیں کرتا' کل میرے ایک دوست نے کینیڈا سے فون کیا' یہ صاحب اس قسم کے منظر دیکھ کر پانچ برس پہلے ملک چھوڑ گئے تھے' انہوں نے مجھے فون کیا اور دکھی لہجے میں بولے ''کینیڈا میں چیف جسٹس سب سے محترم اور بااختیار شخص ہوتا ہے' کینیڈا کی پوری پارلیمنٹ' پوری کابینہ' صدر اور ساری سیاسی جماعتیں مل کر چیف جسٹس کی طرف انگلی نہیں اٹھا سکتیں' چیف جسٹس کسی بھی وقت صدر کو عدالت میں طلب کر سکتا ہے اور صدر کو اس کے سامنے سرتابی کی جرأت نہیں ہو سکتی'' میرے دوست کا کہنا تھا'' دس مارچ کو کینیڈا میں پاکستان کے چیف جسٹس کی غیر فعالیت اور ہاؤس اریسٹ کی خبر پہنچی تو کینیڈا کے لوگ حیران رہ گئے اور انہوں نے مجھ سے پوچھنا شروع کر دیا' کیا آپ کے ملک میں صدر چیف جسٹس سے زیادہ بااختیار ہے؟ اور کیا پاکستان میں صدر چیف جسٹس کو غیر فعال کر سکتا ہے؟ 'میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا'' میرے دوست نے ذرا سے توقف کے بعد کہا'' ترقی یافتہ قوموں نے عدالت کو جان بوجھ کر مقننہ' بادشاہ' صدر' وزیراعظم' کابینہ اور بیورو کریسی سے زیادہ اختیارات دے رکھے ہیں' یہ لوگ جانتے ہیں عدالت معاشرے کا وہ فورم ہوتا ہے جس تک تمام لوگ پہنچ سکتے ہیں لہٰذا اگر ان کی عدالت ملک کے تمام عہدوں سے بلند ہو گی تو عوام کا عدالت پر اعتماد قائم ہو گا' عدالت پر اعتماد نظام کو طاقتور بنائے گا اور ایک طاقتور نظام ملک کو ترقی دے گا'' میرے دوست کا کہنا تھا'' تم دنیا بھر کے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کا مطالعہ کر لو تمہیں اقوام عالم میں ہر وہ ملک ترقی یافتہ اور مضبوط ملے گا جس میں

عدالت آزاد اور عدالتی نظام طاقتور ہوگا اور تم ہر اس ملک کو پسماندہ پاؤ گے جس کا عدالتی نظام کمزور اور حکمران مضبوط ہوں گے" میرے دوست کا کہنا تھا "حکومت کی رٹ عدالتوں سے شروع ہوتی ہے اور عدالتوں پر آ کر ختم ہوتی ہے"

مجھے اس کی بات میں بڑا وزن محسوس ہوا' یہ حقیقت ہے پاکستان کا عدالتی نظام نہ صرف کمزور ہے بلکہ اس سے عوام کی توقعات تک ختم ہو چکی ہیں' اب سوال پیدا ہوتا ہے اس نظام کو کس نے کمزور بنایا؟ پاکستان میں بدقسمتی سے 40 برس فوجی حکمران رہے ہیں لہٰذا اس بگاڑ کی زیادہ تر ذمہ داری فوجی حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے' تاریخ بتاتی ہے دنیا میں جب بھی کوئی آمر غیر قانونی اور غیر آئینی طریقے سے اقتدار پر قابض ہوتا ہے تو وہ سب سے پہلے عدالت پر قبضہ کرتا ہے' وہ قانون فہم' انصاف پسند اور ایماندار ججوں کو فارغ کرتا ہے اور ان کی جگہ کمزور اور "معاملہ فہم" جج تعینات کر دیتا ہے' اس کے بعد وہ ججوں اور عدالتی نظام کو کرپٹ کرتا ہے' اس ساری ایکسرسائز کے نتیجے میں عدالتیں اس آمر کو ریلیف دیتی ہیں' وہ اس حکمران کو آئینی شکل دیتی ہیں اور جوں ہی یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے عدالتیں حکمرانوں کا طفیلی ادارہ بن کر رہ جاتی ہیں اور حکمران ججوں اور چیف جسٹس حضرات سے بھی اسی لہجے میں بات کرتا ہے جس میں وہ اپنے ٹیلی فون آپریٹر سے مخاطب ہوتا ہے' تاریخ ثابت کرتی ہے جب یہ صورتحال پیش آتی ہے تو عوام کا عدالت سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور وہ جج کی بجائے حکمرانوں کے پاؤں میں انصاف تلاش کرنے لگتے ہیں' آپ پوری دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی جس جس ملک میں عدالتیں مضبوط تھیں اس ملک میں کبھی مارشل لاء لگا اور نہ ہی کسی شخص کو اقتدار پر قبضے کی جرأت ہوئی مزید آج تک جس ملک میں مارشل لاء لگتے رہے وہ ملک سماجی اور معاشی لحاظ سے دوسرے ملکوں سے پیچھے رہ گئے' آپ یورپ کو دیکھ لیجئے مشرقی یورپ مغربی یورپ سے معاشی اور سماجی لحاظ سے پیچھے ہے' کیوں؟ اس کی واحد وجہ فوجی حکمران تھے' مشرقی یورپ میں پچاس' ساٹھ برس تک آمریت رہی جبکہ اس کے مقابلے میں فرانس' برطانیہ' جرمنی اور آسٹریا میں جمہوریت اور قانون کی حکمرانی تھی' آپ یورپ میں سپین' اٹلی اور پرتگال کو دیکھ لیجئے' یہ تینوں ملک بھی ترقی کی دوڑ میں دوسرے یورپی ملکوں سے پیچھے ہیں' اس کی وجہ بھی آمریت اور مارشل لاء تھے یہ ملک بھی آج سے تیس چالیس برس پہلے تک یونیفارم کا شکار تھے چنانچہ یہ یورپ کے دوسرے ملکوں سے پیچھے رہ گئے' آج سے تیس چالیس برس پہلے ان ملکوں کے حکمران عدالت کے زیر انتظام آ گئے چنانچہ اب یہ ملک بھی ترقی کر رہے ہیں جبکہ ہمارے ملک میں 2007ء میں صدر چیف جسٹس کو گھر بلا لیتے ہیں اور اسے غیر فعال کر کے گھر میں پھینک دیا جاتا ہے چنانچہ آج اس کا یہ نتیجہ ہے لوگوں کو انصاف کیلئے صدر کے پاؤں میں جھکنا پڑ رہا ہے یا پھر جامعہ حفصہ کی طالبات انصاف کیلئے ڈنڈے لے کر سڑک پر نکلنے پر مجبور ہیں۔

اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو ثابت ہوتا ہے یہ وہ حالات ہیں جو کامیاب ریاستوں کو "فیل سٹیٹ" بنا دیتے ہیں' انصاف کے راستے میں حائل یہ وہ رکاوٹیں ہیں جو خونی انقلاب کو راستہ دیتی ہیں اور یہ فہمیدہ اظہر جیسی خواتین ہوتی ہیں جو حکمرانوں کے پاؤں سے اٹھ کر ان کے گلے تک پہنچ جاتی ہیں۔

ہم بددعاؤں کے سوا کچھ نہیں کر سکتے

محمد اصغر فاروقی کی کہانی بھی بہت دلچسپ ہے' اصغر فاروقی جلال پور پیراں والہ کے گاؤں بیٹ کیسر سے تعلق رکھتے ہیں' ان کے بھائی صدیق اکبر کے ساتھ 2004ء میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا' یہ 24 مارچ کا دن تھا' صدیق اکبر اپنے کھیتوں میں پانی لگا رہا تھا' سامنے سڑک پر تین ٹیکسیاں رکیں' ان میں سے سادہ کپڑوں میں چند افراد نکلے' انہوں نے صدیق اکبر کو بلایا اور خود کو زرعی آفیسر ظاہر کرتے ہوئے گندم کے خوشے توڑنے اور زمین سے مٹی اٹھا کر شاپروں میں ڈالنے لگے۔ جب صدیق اکبر ان کے قریب گیا تو ان سب نے اسے گھیرے میں لے لیا اور اس سے رقبہ کے متعلق سوالات کرنے لگے' صدیق نے ان کو بتایا زمین کی پیداوار کے متعلق صحیح معلومات اس کے بچا دے سکتے ہیں' میں ان کو بلاتا ہوں۔ صدیق اکبر جانے لگا تو ان لوگوں نے اسے دبوچ لیا' اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی' اسے گاڑی میں بٹھایا اور اسے پندرہ کلو میٹر دور ملک مشتاق احمد لانگ کے ڈیرے پر لے گئے' وہاں ایلیٹ فورس کے چالیس افراد موجود تھے۔ یہ لوگ صدیق اکبر کو علی پور سادات کے قریب ایک باغیچہ میں لے گئے' اسے آم کے درخت سے باندھا اور اس کے جسم پر لاٹھیاں برسانا شروع کر دیں' سڑک پر موجود بیسیوں آدمیوں نے صدیق اکبر کی چیخیں سنیں اور چیخیں سن کر دوڑ پڑے وہ لوگ صدیق اکبر کو چھڑانے کیلئے آگے بڑھنے لگے تو ایلیٹ فورس نے ان لوگوں کو دھمکا کر پیچھے دھکیل دیا۔ بعد ازاں پولیس نے ان کے گھر پر دھاوا بول دیا اور گھر میں گھس کر اڑھائی گھنٹے تک تلاشی لیتے رہے۔ جب ان سے وجہ پوچھی گئی تو وہ کہنے لگے' قانون کو اپنا کام کرنے دیں۔ گھر کے مکین بے بس اور خوفزدہ ہو کر اپنے گھر کی پامالی دیکھتے رہے۔ اس دوران چھوٹا بھائی صفدر علی سامنے آ گیا تو اس کو بھی اغواء کر لیا گیا۔ صدیق اکبر کے اغواء کے بعد پورے علاقے میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ محمد اصغر فاروقی کے گھر والے سہم سے گئے' ماں کی ممتا تڑپ گئی' والد صاحب کا دل اجڑ گیا' صدیق اکبر کی اہلیہ پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور ان کے چار بچے باپ کی شفقت سے محروم ہو گئے۔

صدیق اکبر کے لواحقین نے مقامی تھانے سے رابطہ کیا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا' اسی شب ملتان کچہری روڈ پر واقع انویسٹی گیشن پر رابطہ کیا گیا تو انہوں نے بھی چپ سادھ لی' ان لوگوں نے اونی سے لے کر اعلیٰ

افسران تک سے پوچھا لیکن کسی نے انہیں صدیق اکبر کے متعلق کچھ نہ بتایا۔ سیاسی زعماء کے دروازے کھٹکھٹائے گئے۔ قاضی حسین احمد' لیاقت بلوچ' مولانا عبدالغفور حیدری' مولانا فضل الرحمان وغیرہ سے بھی درخواست کی گئی مگر یہ سب کوششیں صدا بصحرا ثابت ہوئیں۔ صرف عدالت کا دروازہ جبین حزیں سے نا آشنا رہا' وجہ غربت تھی' یہ لوگ وکلاء کی فیس ادا نہیں کر سکتے تھے' دریائے چناب کے کنارے بیٹھا خاک پھانکنے والا بوڑھا کسان سرد آہوں کے سوا وکلاء کو کیا دے سکتا تھا؟ 26 مارچ 2004ء کی رات ان لوگوں کے فون کی گھنٹی بجی' ریسیور اٹھایا تو کوئی بولا'' نانی امی! میں صدیق اکبر ہوں' مجھے ایجنسی والے لے آئے ہیں'' بس بات کٹ گئی' صدیق اکبر کی آواز ہلکی ہلکی آرہی تھی جیسے مریض کی آواز ہو۔ قریباً ڈیڑھ ماہ بعد چھوٹے بھائی صفدر کو رہا کر دیا گیا اور اسے پنڈی سے ملتان والی بس پر بٹھا دیا گیا۔ اس نے بڑے بھائی صدیق اکبر کا پیغام ان الفاظ میں سنایا'' سب کو سلام کہنا' امی اور ابو کو کہنا میں آپ کی خدمت نہیں کر سکا مجھے معاف کر دیں' میرے لئے دعا کریں'' یہ الفاظ زندگی سے مایوسی کا اظہار تھے اور ان الفاظ نے والدین اور عزیز و اقارب کو لرزا دیا۔ مزید ڈیڑھ ماہ گزرا تو ایک بار پھر صدیق اکبر کی خاندان سے بات کرائی گئی۔ اس وقت صدیق اکبر نے کہا'' سب نماز پڑھا کریں میں سائیں کے پاس ہوں جب وہ چاہیں گے چھوڑ دیں گے''۔

اس کے بعد محمد اصغر فاروقی میرے ساتھ مخاطب ہوئے اور انہوں نے کہا'' ہم لوگوں نے اس سال بھائی کے بغیر عید گزاری تھی' میں نے عید کے دن کچے کمرے کے ایک کونے میں اپنی ماں کو پرانے مصلے پر بیٹھے دیکھا تھا وہ صدیق اکبر کی تصویر دونوں ہاتھوں میں تھامے کہہ رہی تھیں۔ صدیق اکبر بیٹے! آج عید کا دن ہے آج تو منہ دکھا جاتے۔ وہ تصویر کو تکتے تکتے سسکیاں لینے لگتی تھیں اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں پھر بولتیں: خدایا میرے بیٹے کی عید کا کیا ہوا؟ باپ سے دور' دوستوں سے محروم بے قصور قیدی کے ساتھ کیا بیتی ہوگی؟ ربا! میرے بیٹے کی مدد کر اور جو میرے بیٹے کی مدد کرے یا میرے پروردگار تو اس پر بھی آسانیاں پیدا کر دے' عید گاہ سے واپسی پر میرے ابو نے جھرجھری سی لی اور بولے'' صدیق بیٹا! تیرے بغیر ہماری عیدیں پھیکی گزر رہی ہیں۔ تم واپس آ جاؤ'' اصغر فاروقی کا کہنا تھا'' میرے والد صاحب دو مرتبہ ہارٹ اٹیک کا شکار ہو چکے ہیں۔ صدیق اکبر کا بیٹا ریحان! عید کے لئے تیار ہو کر میرے ساتھ گھر سے باہر نکلا تو اس نے سامنے دیکھا اس کا دوست عثمان باپ کے کندھے پر بیٹھا عید گاہ جا رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بولا'' چاچو اگر آج میرے ابو گھر پر ہوتے تو کیا میں بھی ان کے کندھے پر بیٹھ کر عید گاہ جاتا'' ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

اصغر فاروقی کا کہنا تھا'' اس کا بھائی مجرم ہوگا لیکن کیا مجرم کو عدالت میں پیش نہ کرنا اس سے بڑا جرم نہیں'' اس کا کہنا تھا'' خدا کیلئے' ہمیں ہمارے بھائی کی زندگی یا موت کی اطلاع تو دے دیں' اگر وہ مر چکا ہے تو ہمیں بتا دیں تاکہ ہم اپنے دل پر پتھر رکھ لیں' ہم اس کے بچوں کے نام کے سامنے یتیم لکھ دیں اور اگر وہ زندہ ہے تو ہمیں اتنا بتا دیں' کیا ہم زندگی میں دوبارہ اس کی شکل دیکھ سکیں گے''۔ میرے پاس اصغر فاروقی کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا' میں اسے کیا بتاتا ہمارا اپنا ایک کولیگ سہیل قلندر دو ماہ غائب رہا تھا اور پورے ملک کے صحافی مل کر اسے

بازیاب نہیں کرا سکے تھے' یہ تو اغواء کاروں کی ''مہربانی'' تھی جس کی وجہ سے سہیل قلندر باہر آ گیا۔ میں اس کو کیا بتاتا 21 جنوری کو سہیل قلندر کے بیٹے کی سالگرہ تھی' وہ سالگرہ کا کیک لینے گیا تھا اور راستے میں غائب ہو گیا تھا' سہیل قلندر کے دوستوں نے اس کے بیٹے ببرک کی سالگرہ 22 فروری کو اس کی رہائی کے بعد منائی تھی' ہم لوگ تو خود بے بس اور لاچار ہیں۔ میں اسے کیا بتاتا ہم جیسے لاچار لوگ صدیق اکبر جیسے لوگوں کے لئے کچھ نہیں کر سکتے؟ ہم لوگ اب اس ملک کے حکمرانوں کیلئے صرف بددعا کر سکتے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے صرف اتنا عرض کر سکتے ہیں یا باری تعالیٰ جو لوگ تمہارے بندوں کو تکلیف دیتے ہیں تو انہیں زندگی میں ایک بار ایسی اذیت سے ضرور گزار' تو انہیں ایک بار اتنا ضرور بتا دے جب کوئی بیٹا شام کو گھر نہیں آتا تو ماں کے کلیجے کے کون کون سے حصے پر بلیڈ چلتے ہیں اور باپ کے جگر کا کون کون سا حصہ کٹتا ہے۔ یا باری تعالیٰ زندگی میں کم از کم ایک بار ان کے بچے بھی ماں کا ہاتھ پکڑ کر اتنا ضرور پوچھیں ''ماما پاپا کب آئیں گے'' یا باری تعالیٰ ان کے بچے بھی زندگی کی عیدیں اور شب براتیں ان کے کندھوں کی محرومی میں بسر کریں۔ میں اسے کیا بتاتا ہم جیسے بے زبان لوگ بددعاؤں کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ میں اسے کیا بتاتا ہمارے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے صدیق اکبر جیسے لوگوں کیلئے کچھ کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش کے نتیجے میں وہ آج خود انصاف تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ میں اسے کیسے بتاتا چیف جسٹس کے بعد اب کسی شخص کی زبان میں صدیق اکبر جیسے لوگوں کیلئے آواز بلند کرنے کی ہمت نہیں۔ میں اسے کیسے بتاتا اقتدار کے چہرے پر آنکھیں ہوتی ہیں اور نہ ہی سینے میں دل اور جس کے پاس دل ہو اور نہ ہی آنکھیں' ان کی کتاب میں رحم کے لفظ نہیں ہوتے''

خوف الٰہی کی نعمت

حاجی عبدالرؤف کا سفر 2004ء میں شروع ہوا' 16 فروری 2004ء کو ان کے ہاں دو جڑواں بچے پیدا ہوئے تھے' بچے نسبتاً کمزور تھے' لوگوں کا خیال تھا جڑواں بچے عام بچوں کے مقابلے میں کمزور ہوتے ہیں' یہ بچے بڑے ہو کر ٹھیک ہو جائیں گے لیکن دو ہفتے بعد بچوں کا رنگ پیلا ہو گیا' حاجی صاحب انہیں مقامی ڈاکٹر کے پاس لے گئے' ڈاکٹر نے بچوں کو خون لگوا دیا' بچے ٹھیک ہو گئے لیکن پندرہ دن بعد بچے دوبارہ پیلے پڑ گئے' حاجی صاحب نے ایک بار پھر خون لگوا دیا' اس دوران کسی نے مشورہ دیا' آپ بچوں کا میڈیکل چیک اپ کرائیں' حاجی صاحب بچوں کو راولپنڈی لے گئے' انہوں نے ''اے ایف آئی پی'' سے بچوں کا ٹیسٹ کرایا' پتہ چلا بچے تھیلسیمیا کے موذی مرض میں مبتلا ہیں' حاجی صاحب کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھما دیا گیا اور اس ٹکڑے کے بعد ان کا سفر شروع ہو گیا' وہ سرائے عالمگیر کے ایک سابق ایم پی اے ملک حنیف اعوان کے پاس گئے' ملک صاحب انہیں گجرات کے ضلعی ناظم چوہدری شفاعت حسین کے پاس لے گئے' چوہدری صاحب نے انہیں راولپنڈی کے آرمڈ فورسز بون میرو ٹرانس پلانٹ سنٹر بھجوا دیا' ڈاکٹروں نے معائنے کے بعد فیصلہ دیا اگر بیس لاکھ روپے کا بندوبست ہو جائے تو بچے ٹھیک ہو سکتے ہیں' حاجی صاحب واپس گجرات چلے گئے' چوہدری شفاعت حسین نے ان کے لئے بیس لاکھ روپے کا بندوبست کر دیا' وہ چیک اور بچے لے کر راولپنڈی آ گئے' ڈاکٹروں نے حاجی صاحب کے دوسرے بچوں کا بون میرو چیک کیا لیکن بدقسمتی سے بچوں کا بون میرو میچ نہ کر سکا' ڈاکٹروں نے جواب دے دیا' حاجی صاحب چوہدری شفاعت حسین کا چیک اور بچے لے کر واپس کھاریاں چلے گئے' اس کے بعد ان کا ایک نیا سفر شروع ہو گیا۔

بریگیڈیئر خلیل اللہ آرمڈ فورسز بون میرو ٹرانس پلانٹ کے سینئر ڈاکٹر ہیں' بریگیڈیئر صاحب نے کمپیوٹر پر سرچ کی' پتہ چلا اٹلی میں ان بچوں کا علاج ہو سکتا ہے' حاجی عبدالرؤف بریگیڈیئر صاحب کا خط لے کر چوہدری شفاعت کے پاس چلے گئے' چوہدری صاحب نے انہیں کہا ''تم اٹلی سے خرچ کا تخمینہ لگوا لاؤ' ہم پیسوں کیلئے کوشش کریں گے'' حاجی صاحب نے بچوں کی رپورٹیں روم بھجوا دیں' وہاں سے جواب آیا تو اس جواب نے حاجی صاحب کو جڑوں سے ہلا دیا' روم کے انسٹی ٹیوٹ نے بتایا ''ہم بچوں کا علاج کر سکتے ہیں لیکن اس پر دو لاکھ 91 ہزار 5 سو 20 یورو خرچ آئے گا'' یہ رقم دو کروڑ روپے بنتی تھی' اس میں آمدورفت اور چار ماہ تک اٹلی میں رہائش کے

اخراجات شامل نہیں تھے' اب حاجی عبدالرؤف کی مالی حالت یہ تھی کہ وہ اپنی جیب سے لاہور اور راولپنڈی نہیں جا سکتے تھے' چوہدری شجاعت صاحب نے حاجی صاحب کو بتایا' اتنی بڑی رقم کا بندوبست ممکن نہیں تاہم میں وفاقی وزیر صحت محمد نصیر خان کے نام رقعہ دے دیتا ہوں' تم ان سے مل لو' حاجی صاحب رقعہ لے کر اسلام آباد آ گئے' انہیں نصیر خان جیسے مصروف وزیر تک پہنچنے میں کتنے دن لگ گئے اور اس ملاقات کے لئے انہیں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے یہ ایک الگ داستان ہے' بہرحال پانچ چھ دنوں کی لگاتار کوششوں کے بعد ان کی نصیر خان سے ملاقات ہو گئی' نصیر خان نے انہیں پمز کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر فضل ہادی کے پاس بھجوا دیا' حاجی عبدالرؤف تین دن فضل ہادی کے پیچھے بھاگتے رہے' آخر میں ان کے ساتھ ملاقات ہوئی تو انہوں نے انہیں تھیلیسیما سنٹر بھجوا دیا' وہ سنٹر چلے گئے وہاں وہ ڈاکٹر طاہرہ ظفر سے ملے' ڈاکٹر صاحبہ نے انکشاف کیا' اس سنٹر میں تھیلیسیمیا کا علاج نہیں ہوتا' یہ لوگ مریضوں کو محض خون لگاتے ہیں' حاجی صاحب ایک بار پھر نصیر خان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے لیکن اب نصیر خان سے ملاقات مشکل ہو چکی تھی' وہ بچوں کو لے کر ''جیو'' ٹیلی ویژن چلے گئے' جیو نے ان پر ایک ''نیوز پیکج'' بنا دیا' یہ پیکج دوبار نشر ہوا لیکن بدقسمتی سے یہ پیکج صدر یا وزیراعظم دونوں کے نوٹس میں نہ آ سکا' جیو کے ایک رپورٹر نے انہیں کشمالہ طارق کا نمبر دے دیا' حاجی عبدالرؤف نے کشمالہ کو فون کیا' ٹیلی فون پر ان سے بات ہوئی' انہوں نے حاجی صاحب سے ''رنگ بیک'' کا وعدہ کیا لیکن بعدازاں وہ بھی ان بے شمار اہم کاموں میں الجھ گئیں جن میں آج کل ہماری حکومت الجھی ہوئی ہے۔ وہاں سے مایوس ہو کر حاجی صاحب نے میڈیا سے رابطہ کیا' وہ بچوں کو لے کر تمام چھوٹے بڑے اخبارات کے دفاتر گئے' وہ تمام ٹیلی ویژن چینلوں کے سٹوڈیو پہنچے' میڈیا پر خبریں' مضامین اور تصویری رپورٹیں چلیں لیکن کسی طرف سے کوئی خوشخبری نہ ملی' وہ مایوس ہو گئے' مایوسی کے اس عالم میں انہوں نے مجھے فون کیا' ان کا خیال تھا وہ اگر بچوں کے کیس کی فائل بنائیں' یہ فائل ساڑھے چار سو ارکان اسمبلی اور سینیٹرز کو بھجوا دیں اور میں ان تمام سینیٹروں اور ارکان اسمبلی سے درخواست کروں اور وہ اپنی مراعات اور تنخواہوں میں سے صرف پچاس پچاس ہزار روپے ان بچوں کو دے دیں تو بچوں کی زندگی بچ سکتی ہے لیکن میں نے ان سے عرض کیا' آپ ابھی چند سیاستدانوں سے ملے ہیں' آپ کو ان چند سیاستدانوں کے دروازے سے مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملا لیکن جب آپ ایسے ساڑھے چار سو لوگوں کے دروازوں پر جائیں گے تو آپ کی مایوسی میں ساڑھے چار سو گنا اضافہ ہو جائے گا'' وہ خاموش ہو گئے' اگلے دنوں انہوں نے مجھے اپنے دونوں بچوں کی تصویر بھجوا دی۔

یہ تصویر اس وقت میری رائٹنگ ٹیبل پر پڑی ہے' میں جب بھی اس تصویر کو دیکھتا ہوں تو مجھے ان بچوں کی پیلی رنگت میں زندگی کی ہلکی ہلکی سرخی نظر آتی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے ان بچوں کی آنکھوں میں امید کی چمک ابھی سلامت ہے' ان کے ہونٹ ابھی دعا کی طرح کھلے ہیں اور ان کے چہروں پر ابھی خواہشوں کے رنگ پھیکے نہیں پڑے' میں یہ تصویر دیکھتا ہوں اور پھر سوچتا ہوں ابھی چند دنوں کی بات ہے یہ دعائیں' یہ چمک اور یہ سرخی بجھ جائے گی' یہ بچے ایک لڑکھڑاتا ہوا قدم اٹھائیں گے اور زندگی کی حد عبور کر جائیں گے' اس کے ساتھ ہی مجھے محسوس ہوتا

ہے یہ بچے جاتے جاتے اس سماج' اس نظام' اس ملک اور اس ملک کے سولہ کروڑ لوگوں کے دامن پر دھبہ چھوڑ جائیں گے' یہ بچے ہمارے رزق' ہماری خوشیوں اور ہماری کامیابیوں پر ایک ایسا سیاہ دھبہ لگا جائیں گے جسے کروڑوں نیکیاں اور اربوں دعائیں نہیں دھو سکیں گی' بیمار بچے اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاشروں کا امتحان ہوتے ہیں اور جو معاشرے اس امتحان میں فیل ہو جاتے ہیں' وہ اللہ کی رحمت کی فہرست سے خارج ہو جاتے ہیں' اللہ ان سے اپنا رخ پھیر لیتا ہے' اس وقت اس ملک میں ہزاروں ارب پتی ہیں' ایسی سینکڑوں ہزاروں فرمیں ہیں جو ہر مہینے اربوں روپے کا کاروبار کرتی ہیں' ان فرموں میں سے اگر موبائل فون کی کوئی ایک کمپنی ان بچوں کا علاج کرا دے' کوئی ایک ہاؤسنگ سکیم اپنے دو پلاٹ ان بچوں کے نام وقف کر دے' خالد اسحاق' ایس ایم ظفر اور ملک قیوم جیسا کوئی ایک وکیل اپنے دو موکلوں کی فیس ان بچوں کو دے دے' کوئی ایک ایئر لائن' کوئی ایک چیمبر آف کامرس' ریلوے' واپڈا' دوائیں بنانے والی کوئی کمپنی یا پھر نیب جیسا کوئی ادارہ ان بچوں کے سر پر ہاتھ رکھ دے' محکمہ ڈاک ان بچوں کے نام کا ایک لفافہ جاری کر دے اور عوام سے درخواست کرے وہ صرف ایک ایک لفافہ خرید لیں تو مجھے یقین ہے ایک دن میں دو کروڑ روپے جمع ہو جائیں گے' شاہد آفریدی' شعیب اختر یا انضمام الحق ان بچوں کے لئے دو گھنٹے کرکٹ کھیل لیں' چار اداکارائیں ان بچوں کے لئے شہر میں نکل آئیں' جماعت اسلامی' تبلیغی جماعت اور جماعت الدعوہ ان بچوں کے علاج کی ذمہ داری لے لے اور مولانا طارق جمیل اپنے خطاب میں ان بچوں کو صرف ایک منٹ دے دیں تو ان بچوں کے چہرے کی پیلاہٹ سرخی میں بدل سکتی ہے' یہ بچے صحت مند ہو سکتے ہیں لیکن شاید ہمارے پاس دو بیمار بچوں کی زندگی کے لئے کوئی وقت نہیں' ہماری روزمرہ کی ترجیحات میں کسی غریب' کسی بے سہارا اور کسی معصوم بچے کیلئے کوئی گنجائش نہیں' میں سوچتا ہوں کل جب ہم لوگ اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوں گے اور ہمارے دامن پر ان دو بچوں کی موت کا دھبہ ہوگا تو ہم اپنے اللہ کا سامنا کیسے کریں گے' ہم اپنے رب کو اس غفلت کی کیا "جسٹی فکیشن" دیں گے۔ میرا خیال ہے ہم غفلت اور بے حسی کے اس دور میں داخل ہو چکے ہیں جس میں انسان اللہ کے خوف جیسی نعمت سے بھی محروم ہو جاتا ہے جس میں انسان اور پتھر میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

اپنی چنگاریاں' اپنا دامن

وہ 1990ء میں یونیورسٹی سے فارغ ہوا تھا اور اس کے بعد اس نے 2005ء تک طویل بے روزگاری کاٹی' ان پندرہ برسوں میں اس نے نوکری کیلئے سینکڑوں' ہزاروں درخواستیں دیں' بیسیوں جگہ انٹرویو دیئے' بے شمار چھوٹے موٹے کاروبار کئے' وہ دو سال سعودی عرب بھی رہا اور اس نے شیئرز مارکیٹ اور پراپرٹی کے کاروبار کو بھی اپنا ذریعہ بنایا لیکن اس کے مقدر کا ستارہ نہ چمکا' اس کا ہر آنے والا دن پہلے سے بدتر ثابت ہوا' میں اسے 1995ء سے جانتا تھا' وہ ایک نہایت پڑھا لکھا' ایماندار' حساس' محنتی اور مثبت شخص تھا' وہ لاہور کی چار لائبریریوں کا ممبر تھا اور اسے ہزاروں کی تعداد میں کتابیں ازبر تھیں' اس میں عاجزی اور انکساری بھی تھی اور وہ میری زندگی کا واحد شخص تھا جو 15 سال تک جبر کی چکی میں پسنے کے باوجود حالات کے سامنے نہیں جھکا تھا' جس نے شکست تسلیم نہیں کی اور جس نے امید کا دامن نہیں چھوڑا تھا' 2005ء جون میں اس کے ساتھ میری تواتر سے ملاقاتیں شروع ہو گئیں' وہ ہر ہفتے لاہور سے اسلام آباد آتا اور میرے ساتھ گپ شپ کر کے واپس چلا جاتا تھا' میں اس ملاقات کے دوران اس سے بہت کچھ سیکھتا تھا' وہ مجھے بے شمار نئی کتابوں کے حوالے دیتا تھا' وہ میرے لئے بے شمار نئے مضامین اور خبریں لے کر آتا تھا اور میں بعد ازاں ان خبروں' ان مضامین کو بنیاد بنا کر کالم لکھتا تھا' یہ سلسلہ چلتا رہا' ایک بار وہ میرے پاس آیا تو وہ مجھے ذرا سا پریشان' ذرا سا متفکر لگا' اس کی گفتگو میں ربط کم تھا اور وہ بے چینی سے بار بار پہلو بدلتا تھا' میں نے وجہ پوچھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' اس نے روندھی ہوئی آواز میں بتایا' اب اس کا حوصلہ ٹوٹنا شروع ہو گیا ہے' وہ اب مزید ذلت اور بے روزگاری برداشت نہیں کر سکتا' میں اس کا دکھ سمجھتا تھا' ذرا سوچئے جس شخص نے یونیورسٹی سے گولڈ میڈل لیا ہو جو پندرہ سال تک بے روزگار رہا ہو اور جس کی بیگم' تین بچے' ماں باپ اور بہن بھائی بھی اس کے ساتھ چکی میں پس رہے ہوں اس کا دکھ کتنا بڑا ہو گا؟ میں نے اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی لیکن وہ میرے کندھے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا' میں اسے تسلی دیتا رہا' مجھے اس وقت معلوم ہوا تسلی ہر دکھ کا مداوا نہیں ہوتی' جب اس کے جذبات ذرا دیر کیلئے ٹھنڈے ہو گئے تو میں نے اس سے کہا "یار خلیل تم اپنا کام شروع کیوں نہیں کرتے" اس سوال کے جواب میں اس نے وہ تمام کام گنوانا شروع کر دیئے جو اس نے ماضی

میں کئے تھے اوران میں اسے بری طرح گھاٹا پڑا تھا' میں نے اس سے کہا تم ایک بار مزید کوشش کرو مجھے یقین ہے تم اس بار ضرور کامیاب ہو جاؤ گے' اس نے نفی میں سر ہلا دیا لیکن میں نے اصرار جاری رکھا' ہم مسلسل بحث کرتے رہے یہاں تک کہ وہ قائل ہو گیا' اس کے بعد دوسرا مرحلہ آیا ہم نے سوچنا شروع کیا وہ کیا کام کر سکتا ہے' اس نے بتایا وہ ڈرائیونگ کا ماہر ہے' اس نے پندرہ سال کی عمر میں گاڑی چلانا سیکھی تھی اور وہ آنکھیں بند کر کے بھی ڈرائیونگ کر سکتا ہے' میرے ذہن میں آئیڈیا آیا' میں نے اسے مشورہ دیا' تم وین خرید لو ایک کنڈیکٹر رکھو' خود گاڑی چلاؤ' اللہ کرم کرے گا' وہ نیم رضامند ہو گیا' اس کے بعد وین خریدنے کا مسئلہ تھا' وہ ایک مفلوک الحال شخص تھا' اس کا کل اثاثہ بیوی کے زیورات' والدین کے حج کے پیسے اور چند ہزاروں روپے کا فرنیچر تھا' اس نے کہا وہ چند لاکھ روپے جمع کر لے گا' میں نے اپنے اثاثوں کا تخمینہ لگایا' میری حالت بھی بہتر نہیں تھی لیکن اس کے باوجود میں نے دو لاکھ روپے کے بندوبست کا وعدہ کر لیا' وہ لاہور واپس چلا گیا۔

میں نے اسلام آباد میں ایک دوست سے بات کی' اس کے پاس ایک سیکنڈ ہینڈ وین کھڑی تھی' میں نے اس کے ساتھ وین کا سودا کیا' گیارہ لاکھ روپے میں سودا ہو گیا' اگلے ہفتے خلیل اور میں نے اپنی اپنی ''دولت'' ایک جگہ جمع کی تو وہ بمشکل ساڑھے چھ لاکھ روپے بنے' ہمیں مزید ساڑھے چار لاکھ روپے درکار تھے' خلیل اور میں دوبارہ کوششوں میں لگ گئے لیکن ہمیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی' اس افراتفری اور کشمکش میں پندرہ دن گزر گئے' اس کے بعد خلیل اچانک غائب ہو گیا' وہ ایک ہفتے بعد واپس آیا تو مجھے کمزور کمزور سا دکھائی دیا' اس کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک تھیلا تھا' اس نے تھیلے کی زپ کھولی اور تھیلا میری میز پر الٹ دیا' میری میز پر نوٹوں کے پیکٹ آ گرے' میں نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا' وہ مسکرا کر بولا ''میں پیسوں کا بندوبست کرنے گیا تھا' گن لو پورے ساڑھے چار لاکھ روپے ہیں'' میں نے پریشانی کے عالم میں نوٹوں کی طرف دیکھا اور اس کے بعد اس کی طرف دیکھ کر پوچھا ''تم نے یہ ساری رقم کہاں سے حاصل کی'' وہ زہریلے انداز میں بولا ''میں نے اپنا گردہ بیچ دیا'' مجھے یوں محسوس ہوا میرے سر پر کمرے کی چھت آ گری ہو' اس رات میری آنکھوں کی نمی نے مجھے سونے نہیں دیا' مجھے محسوس ہوا میں نے وین کا مشورہ دے کر خلیل کے ساتھ ظلم کیا ہے' میں اس کا قاتل ہوں۔

میں واپس اصل کہانی کی طرف آتا ہوں' خلیل نے دسمبر 2005ء میں وین خریدی' وہ یہ وین لاہور لے گیا اور اس نے وین چلانا شروع کر دی' وہ اٹھارہ گھنٹے وین چلاتا تھا' اللہ نے کرم کیا' اس کے دن پھرنا شروع ہو گئے' اسے روزانہ پندرہ سو سے دو ہزار روپے بچنے لگے' میں' خلیل اور اس کا خاندان مطمئن ہو گئے' میرا خیال تھا خلیل کا پندرہ سال کا بحران ختم ہو چکا ہے لیکن آنے والے دنوں میں میرا خیال غلط ثابت ہوا' فروری کے شروع میں ڈنمارک کے ایک اخبار یولانڈ پوسٹن نے نبی اکرمؐ کی ذات اقدس کے بارے میں گستاخانہ خاکے شائع کر دیئے اور دنیا میں خاکوں کا مسئلہ کھڑا ہو گیا' اسلامی دنیا میں احتجاج کا سلسلہ شروع ہوا' یہ احتجاج پاکستان پہنچا اور لوگ لاٹھیاں اور تیل کی بوتلیں لے کر سڑکوں پر آ گئے' یہاں تک کہ 14 فروری کا دن طلوع ہو گیا' یہ خلیل کی چھوٹی بیٹی کی سالگرہ کا

دن تھا‘ خلیل نے بچی اور اس کی ماں سے وعدہ کیا وہ صرف 2 بجے تک وین چلائے گا اور اس کے بعد سارا خاندان شالیمار باغ میں پکنک منائے گا‘ خلیل گھر سے نکل گیا لیکن اس کے بعد واپس گھر نہیں آیا‘ چودہ فروری کی شام خلیل کی بیوی نے مجھے فون کیا‘ وہ اونچی آواز میں رو رہی تھی‘ اس کا کہنا تھا جب خلیل پنجاب اسمبلی کے سامنے پہنچا تھا تو ہجوم نے اس کی وین کو گھیر لیا تھا‘ وہ لوگ امریکہ اور ڈنمارک کے خلاف نعرے لگا رہے تھے‘ خلیل نے راستہ لینے کیلئے ہارن بجایا تو چند جوشیلے نوجوانوں کو ہارن کی آواز ناگوار گزری‘ وہ وین پر چڑھ گئے‘ انہوں نے سب سے پہلے وین کے شیشے توڑے‘ اس کے بعد اس کے فیول ٹینک کا پائپ کھینچا اور اس کے بعد وین کو آگ لگا دی‘ خلیل بڑی دیر تک اپنی قمیض سے یہ آگ بجھاتا رہا لیکن جب یہ آگ دوزخ کی شکل اختیار کر گئی تو اس نے اپنی قمیض جلتی ہوئی وین پر پھینکی اور چپ چاپ ہجوم میں گم ہو گیا‘ اس کے بعد وہ واپس نہیں آیا۔

میرے سامنے 16,15 اور 17 فروری کے اخبارات بکھرے پڑے ہیں‘ ان تمام اخبارات میں جلتی ہوئی گاڑیوں کی بے شمار تصویریں ہیں‘ میں جب بھی یہ تصویریں دیکھتا ہوں تو میرے سامنے خلیل کا چہرہ آ جاتا ہے‘ خلیل کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ آتی ہے‘ وہ اپنے پیٹ سے دامن اٹھاتا ہے‘ گردے کی جگہ پر انگلی پھیرتا ہے‘ اس کے بعد دھوئیں کی لکیر کی طرف اشارہ کرتا ہے اور پھر مسکرا کر کہتا ہے‘ یہ پٹرول نہیں‘ یہ میرے گردے کا دھواں ہے‘ اس آگ میں میرا پیٹ‘ میرا جسم‘ میرے بچوں کی بھوک‘ میرے خاندان کی خوشحالی اور میرے مستقبل کے خواب جل رہے ہیں‘ یہ میری بینائی‘ میری سوچ کا دھواں ہے‘ وہ کہتا ہے گستاخی ڈنمارک نے کی تھی لیکن سزا مجھے ملی‘ گردے میرے جلے‘ نعش میرے خوابوں‘ میرے آنسوؤں کی گری‘ برباد میں ہوا‘ وہ مجھ سے پوچھتا ہے‘ میرا کیا قصور تھا‘ میں بھی ان لوگوں کی طرح ایک مسلمان ہوں‘ میں بھی پاکستانی ہوں‘ میں بھی مظلوم ہوں اور میں بھی ایک سچا عاشق رسولؐ ہوں لیکن ان لوگوں نے میری وین جلا دی‘ میرے پاس خلیل کے ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں لہٰذا میں یہ سوال لاہور کے تمام زندہ ضمیر خواتین و حضرات کے سامنے رکھتا ہوں‘ میں ان سے پوچھتا ہوں‘ ہم لوگ دشمنوں کی گستاخیوں کا بدلہ اپنے آپ سے کیوں لیتے ہیں‘ ہمارا غصہ صرف خلیل جیسے لوگوں پر کیوں نکلتا ہے‘ ہم اپنی چنگاریوں سے صرف اپنے دامن کیوں جلاتے ہیں؟“

⚙.....⚙.....⚙

کوفی برے ہوتے ہیں کوفہ نہیں

اس کا کہنا تھا ''میرے اندر آگ لگی ہے' اس آگ نے میرے اندر کی وفا' میری شفقت' میری محبت اور میری وفاداری کو جلا کر راکھ کر دیا ہے' میں جب بھی اس ملک' اس ملک کی رولنگ ایلیٹ اور اس ملک کی سٹیبلشمنٹ کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرا جسم بھانبڑ بن جاتا ہے اور میرے اندر آتش فشاں دہکنے لگتا ہے'' مبشر بٹ کے منہ سے حقیقتاً آگ نکل رہی تھی' اس کا ماتھا پسینے سے شرابور تھا اور شدت جذبات سے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے' میں سکتے کے عالم میں اس کی گفتگو سن رہا تھا۔

اس نے کہا ''میں نے پوری زندگی اپنے دادا' اپنی دادی' اپنے تایا جی اور اپنے والد کو ہنستے نہیں دیکھا' میں اس بات پر ہمیشہ حیران ہوتا تھا' ایک دن میں نے اپنے تایا جی سے اس کی وجہ پوچھی تو جانتے ہو انہوں نے کیا جواب دیا'' وہ چند سیکنڈ کے لئے رکا' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے' ''میرے تایا جی نے بتایا ہم لوگ اپنی فیملی 1947ء میں امرتسر چھوڑ آئے تھے اور اس کے بعد ہم نے جب بھی ہنسنے کی کوشش کی ہمارے منہ سے سسکی اور چیخ کے سوا کچھ نہ نکلا'' میرے تایا جی نے بتایا ''ہم لوگ 1947ء میں چھ چھ سات سات سال کے بچے تھے' ہماری ایک جوان بہن تھی جب امرتسر میں فسادات شروع ہوئے اور مسلمان لڑکیاں اغواء ہونے لگیں تو تمہارے دادا کو محسوس ہوا شاید ہم زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکیں' ان کو خطرہ تھا ان کے بعد سکھ ان کی بیٹی کی بے حرمتی بھی کریں گے لہٰذا ایک دن وہ ہماری بڑی بہن کو کوٹھڑی میں لے گئے' وہاں وہ دونوں باپ بیٹی دیر تک گفتگو کرتے رہے' جب وہ باہر آئے تو دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے' ہمارے والد نے ہماری ماں اور ہم سب کو کمرے میں بند کیا اور ہماری بہن کو لے کر صحن میں چلے گئے' میں دروازے کی درز سے باہر جھانکنے لگا' ہمارے والد نے ہماری بہن کو صحن میں لٹایا' اس کے کندھے پر گھٹنا رکھا اور چھری سے اس کا گلا کاٹ دیا' ہماری بہن نے ایک دردناک چیخ ماری اور اس کے بعد فرش پر تڑپنے لگی' ہمارا والد سجدے میں گر گیا اور جب تک بہن کی جان نہ نکلی وہ سجدے میں پڑے رہے' وہ اللہ تعالیٰ سے پاکستان کے استحکام کی دعا مانگتے رہے' اس کے بعد جب انہوں نے دروازہ کھولا تو ان کا منہ تک ہماری بہن کے لہو سے رنگا ہوا تھا' ہماری ماں نے بیٹی کی نعش دیکھی تو وہ بے ہوش ہو کر دہلیز پر گر گئی' اس کے بعد وہ دن ہے اور

آج کا دن ہے ہم جب بھی ہنسنے لگتے ہیں تو ہمیں اپنی بہن کی چیخ یاد آ جاتی ہے اور ہماری آنکھیں گیلی ہو جاتی ہیں"

مبشر بٹ نے آنکھوں پر ہاتھ رکھے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا' کمرے کی فضا سوگوار ہو گئی' مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی نے میرے سانس کی نالی پر پتھر رکھ دیا ہو' تھوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا "کیا تم لوگوں میں سے کسی نے اس ملک کے لئے اتنی قربانی دی تھی' ہم چپ رہے' وہ چند لمحے خاموش رہا اور اس کے بعد بولا "میرے تایا جی کا کہنا تھا پاکستان ہماری بہن کی نعش پر بنا تھا' میں نے اپنے تایا جی کی بات پلے باندھ لی اور اس کے بعد اس ملک کو حقیقتاً اپنا ملک سمجھنے لگے لیکن پھر 1977ء آ گیا' ایک دن ہمارے گھر پولیس آئی' ہمارے ڈرائینگ روم میں بھٹو صاحب کی تصویر لگی تھی' انہوں نے یہ تصویر اتاری اور میرے والد کو گرفتار کر کے لے گئے' میرے والد پر مقدمہ چلا اور میرے والد نے بھٹو کے ساتھ عقیدت کا جرم تسلیم کر لیا' فوجی عدالت نے انہیں سر عام کوڑے مارنے کا حکم جاری کر دیا" مبشر بٹ ذرا دیر کے لئے رکا اور ایک لمبا ہوکا بھر کر بولا "میں اس وقت سات برس کا بچہ تھا' ایک دن شہر میں اعلان ہوا' محمد اکرم کو شہر کے مرکزی چوک میں کوڑے مارے جائیں گے' ہمارے گھر میں صف ماتم بچھ گئی' میں گھر والوں سے چھپ کر چوک میں چلا گیا' چوک میں پورا شہر جمع تھا' میرے والد کو لایا گیا' ان کے کپڑے اتارے گئے' انہیں ٹکٹکی پر چڑھایا گیا اور میرے سامنے انہیں کوڑے مارے گئے' میرے والد کے منہ سے ہر کوڑے پر چیخ نکلتی تھی' میں نے اپنے کانوں' اپنی آنکھوں سے اپنے والد کو چیختے دیکھا۔ یہ ساری چیخیں آج تک میرے اندر ریکارڈ ہیں' لوگ میرے والد کو اٹھا کر گھر لائے اور انہیں چارپائی پر ڈال کر چلے گئے' میں اگلے دس دن اپنے ہاتھوں سے اپنے والد کے زخموں پر برف لگاتا رہا لہٰذا آپ لوگ مجھ سے پوچھو کوڑے کیا ہوتے ہیں' تم مجھ سے پوچھو زخم کیا ہوتے ہیں اور جب ان زخموں پر برف رکھی جاتی ہے تو زخمی کے منہ سے کس قسم کی سسکی نکلتی ہے" وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔

مبشر بٹ نے نفرت سے ہماری طرف دیکھا اور کڑکتے لہجے میں بولا "مجھے بتاؤ ایک ایسا شخص جس نے اس ملک کی تشکیل کے لئے اپنی جوان بہن کی قربانی دی ہو کیا وہ اس ملک میں اس سلوک کا حق دار تھا' مجھے بتاؤ جس شخص کے والد نے غیرت اور بے حرمتی سے بچنے کے لئے اپنی جوان بیٹی ذبح کر دی تھی کیا اس کا بیٹا اس سلوک کا روادار تھا؟" ہم لوگ خاموش رہے' وہ اسی کڑکتے لہجے میں بولا "میرے باپ کا کیا قصور تھا' کیا نظریات' کسی سیاسی پارٹی کا عہدیدار ہونا اور کسی جمہوری لیڈر کو پسند کرنا جرم ہے اور کیا ڈرائینگ روم کی دیوار پر کسی لیڈر کی تصویر لگانا گناہ ہے' مجھے بتاؤ میرے خاندان' میرے والد اور مجھے اس ملک کا کیا فائدہ ہوا" ہم خاموش رہے' اس نے کہا" حکومت نے 1979ء میں ہماری ساری جائیداد ضبط کر لی تھی' میرے والد کی نوکری اور کاروبار پر پابندی لگ گئی تھی اور مجھے خاندان چلانے کیلئے ہوٹل میں ویٹری کرنا پڑی تھی اور تم لوگ کہتے ہو' میں حب الوطن شہری کی طرح اس ملک کی خدمت کروں' کیوں کروں؟ مجھے کوئی جواز بتاؤ" وہ خاموش ہو گیا' کمرے میں طویل عرصے تک خاموشی رہی' وہ ذرا دیر بعد بولا "ایسے بنتے ہیں لوگ دہشت گرد' میرے اندر جھانک کر دیکھو' میرے اندر ایک

ٹیررسٹ کنگ بیٹھا ہوا ہے' تم اس دہشت گرد کو مطمئن کر دو' میں اس ملک کا سب سے بڑا محب وطن بن جاؤں گا'' میں نے اس سے عرض کیا ''یزید نے حضرت امام حسینؓ کو شہید کر دیا تھا' کیا اس میں اسلام کا کوئی قصور تھا؟'' اس نے تھوڑی دیر سوچا اور انکار میں سر ہلا دیا' میں نے اس سے پوچھا '' کیا اس میں مکہ' مدینہ' اور کوفہ کا کوئی قصور تھا' کیا اس میں ساری اسلامی ریاست کا کوئی قصور تھا' کیا اس قتل میں تمام مسلمان شریک تھے'' اس نے انکار میں سر ہلا دیا' میں نے اس سے عرض کیا'' بٹ صاحب ہماری اپروچ ٹھیک نہیں' ہم لوگ دوسرے لوگوں کے لگائے زخموں کا بدلہ ملک' نظریئے اور اداروں سے لیتے ہیں' وہ گالی جو ہمیں لوگوں کو دینی چاہئے ہم وہ گالی ملک اور نظریئے کو دیتے ہیں' بٹ صاحب یقین کیجئے وقت کا یزید برا ہوتا ہے اس دور کا اسلام نہیں' کوفے والے برے ہوتے ہیں کوفہ نہیں اور ابوجہل ظالم ہوتے ہیں مکہ نہیں لیکن ہم لوگ مکے والوں کے جرموں کی سزا مکہ کو دیتے ہیں اور ہم ابولہب کے جرموں کا بدلہ حضرت بلال جیسے لوگوں سے لیتے ہیں' بٹ صاحب مجھے بتایئے کیا یہ زیادتی نہیں' کیا یہ ظلم نہیں'' مبشر بٹ نے لمبی سانس بھری' کرسی کے ساتھ ٹیک لگائی اور پیچھے کی طرف جھول گیا۔

یہ جنگ کیسے شروع ہوئی

امریکہ اور مسلمانوں کی جنگ کا آغاز 1949ء میں ہوا تھا اور یہ جنگ دو استادوں سے شروع ہوئی تھی۔

1906ء میں مصر کے صوبے اسیوط کے ایک گاؤں موشا میں ایک بچہ پیدا ہوا' بچے کے والد کا نام حاجی قطب ابراہیم اور والدہ کا نام فاطمہ حسین بنت عثمان تھا' والد کھیتی باڑی کرتے تھے جبکہ والدہ ایک دیندار اور پرہیز گار خاتون تھی' بچے نے دس سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا' 1933ء میں قاہرہ سے بی اے کیا اور اس کے بعد وہ مصر کی وزارت تعلیم میں انسپکٹر آف سکولز بھرتی ہو گیا' 1949ء میں وزارت نے اسے امریکہ کا نظام تعلیم سمجھنے کے لئے کولوریڈو بھجوا دیا' وہ امریکہ میں دو سال رہے اور ان دو برسوں میں انہوں نے ولسن ٹیچرس کالج واشنگٹن' ٹیچرس کالج کولوریڈو اور سٹین فورڈ یونیورسٹی کیلیفورنیا میں تعلیم حاصل کی' امریکہ میں قیام کے دوران انہیں امریکی معاشرے کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا' یہ امریکہ میں شدت پسندی کا دور تھا' اس دور میں ایک طرف ''ہپی ازم'' کا آغاز ہو رہا تھا' امریکی معاشرہ بڑی تیزی سے ماڈرن اور اعتدال پسند ہو رہا تھا' امریکہ میں منشیات' ڈسکو اور جنس پرستی عام ہو رہی تھی جبکہ دوسری طرف امریکہ میں ایک ایسا طبقہ بھی پیدا ہو رہا تھا جو پوری دنیا میں عیسائیت کا غلبہ چاہتا تھا' اس طبقے کا کہنا تھا ہم نے ناگاساگی اور ہیروشیما کو ایٹم بم سے اڑا کر اپنی برتری ثابت کر دی لہٰذا اب ہمیں پوری دنیا کو عیسائی بنا دینا چاہیے' یہ طبقہ سوویت یونین اور مسلمانوں کو اپنا اگلا ٹارگٹ سمجھتا تھا' مصر کے اس انسپکٹر سکولز نے ان دونوں تحریکوں کا بڑے غور سے مطالعہ کیا۔ وہ 1951ء میں واپس مصر آئے تو وہ مکمل طور پر ایک انقلابی شخصیت بن چکے تھے' وہ لبرل ازم اور عیسائی پادریوں دونوں کے خلاف ہو چکے تھے' ان کا خیال تھا اگر عالم اسلام بیدار نہ ہوا تو اگلے تیس چالیس برسوں میں وہ شدید بحران کا شکار ہو جائے گا' انہوں نے ''اخوان المسلمون'' جوائن کی اور مصری نوجوانوں میں انقلابی روح پھونکنا شروع کر دی۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے اس کہانی کو یہاں روکتے ہیں اور اب دوسرے استاد کی طرف آتے ہیں۔

1949ء میں لیو سٹراس نام کا ایک استاد شکاگو یونیورسٹی میں پڑھاتا تھا' وہ پولیٹیکل فلاسفر تھا' اس وقت شکاگو یونیورسٹی میں ''ہپیوں'' کا قبضہ تھا' یہ لوگ امن اور عالمی بھائی چارے کو مذہب قرار دیتے تھے اور ان کا کہنا تھا دنیا کے تمام انسان برابر ہیں اور مذہب ان انسانوں کو تقسیم کرتا ہے لہٰذا دنیا سے مذہب ختم ہو جانے چاہئیں' لیو ایک

کٹڑ عیسائی اور قدامت پسند فلسفی تھا' اسے یہ تحریک پسند نہ آئی لہٰذا اس نے سوچا بپی ازم کے سامنے قدامت پسندی کا بند باندھنا چاہیے کیونکہ اگر ماڈرن ازم کا راستہ نہ روکا گیا تو عیسائی دنیا اس سے شدید نقصان اٹھائے گی' لیو کا خیال تھا آنے والے دنوں میں اشتراکیت اور مسلمان عیسائیت کے سب سے بڑے دشمن ہوں گے اور اسے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک "لشکر" تیار کرنا چاہیے' لیو نے 1951ء میں شکاگو یونیورسٹی میں اپنا ایک گروپ بنایا اور اس گروپ نے محدود پیمانے پر کام شروع کر دیا' اس گروپ کے ایجنڈے کے چار نقاط تھے' عیسائی تعلیمات کو عام کرنا' ماڈرن ازم کو روکنا' اشتراکی نظریات کا مقابلہ کرنا اور امریکی معاشرے کو مسلمانوں سے خبردار کرنا۔ لیو نے 1951ء سے 1955ء تک شکاگو میں اپنا ایک اچھا خاصا حلقہ پیدا کر لیا' ہم اب تھوڑی دیر کے لئے اس کہانی کو بھی یہاں روکتے ہیں اور واپس پہلے استاد کی طرف آتے ہیں۔

مصر کے اس استاد کا نام سید قطب تھا' سید قطب کو اللہ تعالیٰ نے تحریر اور گفتگو کے فن سے نواز رکھا تھا' سید قطب نے ان دونوں فنون سے مصری نوجوانوں کی کردار سازی شروع کر دی' ان دنوں مصر میں شاہ فاروق کی حکومت تھی' شاہ فاروق ایک عیاش طبع بادشاہ تھے لہٰذا مصری معاشرہ خرابی کی انتہا تک پہنچا ہوا تھا' سید قطب نے لوگوں کو بادشاہ کے خلاف ابھارنا شروع کر دیا' سید قطب کی تبلیغ سے متاثر ہو کر جنرل محمد نجیب اور کرنل جمال عبدالناصر نے 1952ء میں شاہ فاروق کا تختہ الٹ دیا' سید قطب نے شروع میں فوجی بغاوت کی بھرپور حمایت کی لیکن جب نئی فوجی قیادت نے بھی مصر کو لبرل' ماڈرن اور معتدل بنانا شروع کر دیا تو سید قطب حکومت کے خلاف ہو گئے' حکومت نے 1954ء میں انہیں گرفتار کر لیا اور انہیں شدید تشدد کا شکار بنایا گیا' اس وقت تک مصر میں سی آئی اے داخل ہو چکی تھی' سی آئی اے بھی قید خانے میں سید قطب پر تشدد کرتی رہی' حکومت نے سید قطب کو دس سال قید خانے میں رکھا' 1954ء میں عراقی حکومت کی مداخلت پر انہیں رہا کر دیا گیا لیکن ان کے معمولات اور ملاقاتیوں کی کڑی نگرانی ہوتی رہی' وہ شدید علالت کا شکار تھے' ایک سال بعد انہیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا' ان پر بند کمرے میں مقدمہ چلایا گیا اور 29 اگست 1966ء کو سید قطب کو ان کے دو ساتھیوں سمیت پھانسی دے دی گئی۔ سید قطب شہید ہو گئے لیکن وہ اپنے پیچھے شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ چھوڑ گئے' ان شاگردوں میں ان کے عملی شاگرد بھی شامل تھے اور فکری بھی' سید قطب کے فکری شاگردوں میں سے تین حضرات نے آنے والے دنوں میں عالمی شہرت حاصل کی' ان میں سے ایک امام خمینی تھے' خمینی خود کو سید قطب کے نظریاتی اور روحانی شاگرد کہتے تھے۔ دوسرے مولانا مودودی تھے اور تیسرے شاگرد القاعدہ کے بانی اور ماسٹر مائنڈ ایمن الظواہری تھے' ایمن الظواہری کے بچپن کا زیادہ تر حصہ سید قطب کی صحبت اور محبت میں گزرا تھا اور سید قطب کی شہادت کے بعد ایمن الظواہری نے ان کے نظریات کا علم اٹھا لیا تھا۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے اس کہانی کو بھی یہاں روکتے ہیں اور واپس دوسرے استاد کی طرف آتے ہیں۔

لیو سٹراس اور اس کے شاگردوں کی شکاگو کے ہپیوں کے ساتھ لڑائی شروع ہو گئی' یہ لوگ جب یونیورسٹی سے فارغ ہوئے تو قدامت پسند خیالات کے باعث معاشرے نے انہیں مسترد کر دیا اور شکاگو میں ان پر عرصہ

حیات تنگ ہو گیا لہٰذا یہ لوگ شکاگو سے نقل مکانی کر کے واشنگٹن آ گئے' واشنگٹن میں انہوں نے سوچا جب تک ہم اقتدار کے حلقے میں داخل نہیں ہوتے ہم اپنے نظریات کو عملی شکل نہیں دے پائیں گے' انہوں نے ڈیموکریٹک اور ری پبلکن پارٹی کا جائزہ لیا' انہیں ری پبلکن پارٹی "سافٹ ٹارگٹ" محسوس ہوئی لہٰذا یہ لوگ ری پبلکن پارٹی میں شامل ہو گئے اور آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے اوپر آ گئے' لیوسٹراس کو بھی اللہ تعالیٰ نے چار نامور شاگرد "عنایت" کئے تھے' ان شاگردوں نے آنے والے دنوں میں عالمگیر شہرت پائی' ان میں ایک ڈک چینی تھے' دوسرے ڈونلڈ رمز فیلڈ تھے' تیسرے پال وولف وٹز تھے اور چوتھے ولیم کرسٹول تھے' پال وولف وٹز اور ولیم کرسٹول اس کے شکاگو یونیورسٹی کے شاگرد تھے جبکہ رمز فیلڈ اور ڈک چینی اس کے نظریات سے متاثر تھے' لیوسٹراس 1973ء میں انتقال کر گیا جس کے بعد اس کے ان چار شاگردوں نے اس کا علم اٹھا لیا۔ یہاں سے کہانی کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور دونوں استادوں کے شاگرد میدان میں آتے ہیں اور تیزی سے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں' اب ہم دونوں استادوں کے شاگردوں کو ایک ساتھ لے کر آگے بڑھتے ہیں۔

1972ء میں امریکہ میں ری پبلکن پارٹی کے رچرڈ نکسن کی حکومت آتی ہے' نکسن اور ان کے وزیر خارجہ ہنری کسنجر سوویت یونین اور چین کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کا فیصلہ کرتے ہیں لیکن لیوسٹراس کے شاگرد اس کی شدید مخالفت کرتے ہیں' 1974ء میں نکسن کی حکومت ختم ہوتی ہے اور اس کی جگہ جیرالڈ فورڈ صدر بنتے ہیں تو ڈونلڈ رمز فیلڈ ان کے وزیر دفاع اور ڈک چینی صدر کے چیف آف سٹاف بن جاتے ہیں یوں لیوسٹراس کے شاگرد حکومت کا حصہ بن جاتے ہیں جبکہ سید قطب کے شاگردوں کو مصر میں باغیوں کا درجہ مل جاتا ہے اور حکومت ان کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیتی ہے اور یوں آنے والے دن اور واقعات بہت دلچسپ شکل اختیار کرتے ہیں' جیرالڈ فورڈ روس کا دورہ کرتے ہیں جس کے بعد سرد جنگ نئے دور میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس دوران انورالسادات مصر کے صدر بنتے ہیں' وہ 1977ء میں اسرائیل کا دورہ کرتے ہیں کیمپ ڈیوڈ کا معاہدہ ہوتا ہے اور مصر سمیت پوری اسلامی دنیا میں سادات کے خلاف احتجاج شروع ہو جاتا ہے' 1980ء میں ایمن الظواہری اور ان کے ساتھی عملی جہاد کا اعلان کرتے ہیں' یہ لوگ فوج میں اپنا رسوخ قائم کرتے ہیں اور 16 اکتوبر 1981ء کو پریڈ کے دوران انورالسادات کو گولی مار دی جاتی ہے جس کے بعد ایمن الظواہری' عبدالسلام فراج اور ان کے سارے ساتھی گرفتار ہو جاتے ہیں' ایک کہانی یہاں ختم ہوتی ہے جبکہ دوسری کہانی صدر ریگن کے دور میں شروع ہوتی ہے اور یہ کہانی میں آپ کو کل سناؤں گا۔

اس کے بعد کیا ہوا

لیوسٹراس کے شاگرد اس وقت تک ''نیو کنزرویٹوز'' کے نام سے مشہور ہو چکے تھے' رونلڈ ریگن نے 20 جنوری 1981ء کو صدر کا حلف اٹھایا' ان کے ساتھ جارج ڈبلیو بش (سینئر) نائب صدر منتخب ہوئے اور صدر ریگن کے دور میں رچرڈ پرل امریکہ کا نائب سیکرٹری دفاع بن گیا، رچرڈ پرل کا تعلق لیوسٹراس گروپ سے تھا اور اس نے افغانستان میں امریکہ کو روس سے لڑانے میں مرکزی کردار ادا کیا تھا' 1984ء میں لیوسٹراس کے شاگردوں کو محسوس ہوا جارج بش امریکہ کے اگلے صدر ہوں گے چنانچہ انہوں نے غیر محسوس طریقے سے جارج بش کو گھیر لیا، وہ جارج بش کے قریب ہوتے چلے گئے، آپ اس صورتحال کا ایک دلچسپ پہلو ملاحظہ کیجئے۔ 1984ء میں امریکہ افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف برسر پیکار تھا، امریکہ کو اس وقت ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو اس جنگ کو مذہبی فریضہ سمجھ کر لڑیں اور دنیا میں اس وقت سید قطب کا واحد گروپ تھا جو اس جنگ کو جہادی شکل دے سکتا تھا چنانچہ ''نیوز کنزرویٹوز'' نے مصری حکومت سے بات چیت کی اور حسنی مبارک نے ایمن الظواہری اور ان کے ساتھیوں کو رہا کر دیا۔ یہ لوگ 1985ء میں مصر سے افغانستان چلے گئے یوں سید قطب اور لیوسٹراس کے شاگرد پہلی بار ایک جگہ جمع ہو گئے، 1985ء ہی وہ سال تھا جب ایمن الظواہری کی اسامہ بن لادن سے ملاقات ہوئی، اسامہ بن لادن کے پاس پیسہ اور جذبہ تھا جبکہ ایمن الظواہری منصوبہ بندی کے ماہر تھے چنانچہ ان دونوں نے مل کر کمال کر دیا، 1987ء میں افغانستان کی جنگ عملاً ختم ہو گئی اور امریکہ افغانستان سے واپس چلا گیا' امریکہ کی دیکھا دیکھی ایمن الظواہری، اسامہ بن لادن اور عبدالسلام فراج بھی واپس لوٹ گئے، یہ لوگ جب اپنے ملکوں میں پہنچے تو یہ اسلامی دنیا کے ہیرو بن چکے تھے جس کی وجہ سے مصر، الجزائر اور سعودی عرب کی حکومتیں ان لوگوں سے خائف رہنے لگیں، ان لوگوں نے بھی جلد ہی حکومتوں پر نکتہ چینی شروع کر دی جس کے نتیجے میں ان کا اپنی اپنی حکومتوں سے ٹکراؤ شروع ہو گیا، ہم ایک بار پھر اس کہانی کو اس جگہ روکتے ہیں اور لیوسٹراس کے شاگردوں کی طرف واپس آتے ہیں۔

20 جنوری 1989ء کو امریکہ میں جارج بش سینئر نے حلف اٹھایا جس کے بعد لیوسٹراس کا براہ راست شاگرد پال وولف وٹز بش کی وزارت خارجہ کا انڈر سیکرٹری بن گیا' ولیم کرسٹول نائب صدر کا چیف آف سٹاف ہو گیا

جبکہ ڈک چینی کو امریکہ کا وزیر دفاع بنا دیا گیا' اس دور میں عراق ان لوگوں کا فوکس تھا، ان لوگوں نے عراق میں موجود امریکی سفیر اپرل گلیسپی کے ذریعے صدام حسین کو "ٹریپ" کیا، صدام سے کویت پر قبضہ کرایا اور اس کے بعد بش سینئر سے 17 جنوری 1991 کو عراق پر حملہ کرا دیا' اس وقت جنرل کولن پاول چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف تھا' 26 فروری 1991ء کو جب صدام حسین نے کویت خالی کر دیا تو اس وقت نیو کنزرویٹوز اور کولن پاول میں اختلافات پیدا ہو گئے، نیو کنزرویٹوز کی خواہش تھی صدر بش عراق پر باقاعدہ قبضہ کر لیں جبکہ کولن پاول کا کہنا تھا ہم صدام حسین سے کویت خالی کرانے آئے ہیں' کویت خالی ہو چکا ہے لہٰذا ہمیں اب واپس جانا چاہیے۔ صدر بش سینئر نے کولن پاول کی بات مان لی جس کے بعد ان کی کولن پاؤل سے ٹھن گئی۔ ہم ایک بار پھر اس کہانی کو یہاں روکتے ہیں اور سید قطب کے شاگردوں کی طرف واپس آتے ہیں'

1991ء کی گلف وار کے دوران امریکہ نے سعودی عرب کو فوجی "حفاظت" کی پیش کش کی' شاہ فہد نے یہ آفر قبول کر لی' اس وقت اسامہ بن لادن شاہ سے ملے اور انہیں افغان اور عرب مجاہدین کے ذریعے سعودی عرب کی حفاظت کرنے کی پیش کش کی لیکن شاہ نے ان کی یہ آفر مسترد کر دی جس کے نتیجے میں اسامہ بن لادن نے حکومت کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا' اس کے ردعمل میں حکومت نے ان کی شہریت معطل کی اور انہیں ملک سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ اسامہ سعودی عرب سے سوڈان چلے گئے' ایمن الظواہری بھی اس دوران مصر سے نکلے اور ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور ان لوگوں نے سوڈان میں القاعدہ کو متحرک کر دیا اور القاعدہ نے 1993ء میں نیو یارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور صومالیہ میں اقوام متحدہ کے فوجیوں پر حملے کر دیئے۔ 26 جون 1995ء میں ان لوگوں نے مصری صدر حسنی مبارک پر بھی حملہ کر دیا' حسنی مبارک اس وقت ایتھوپیا کے دورے پر تھے' ان حملوں کے ردعمل میں امریکہ نے سوڈان پر شدید دباؤ ڈالنا شروع کر دیا' سوڈان امریکی دباؤ میں آ گیا اور اس نے ان لوگوں کو نکل جانے کا حکم دے دیا' اسامہ بن لادن نے اپنے خاندان کے دو سو افراد لئے اور وہ 1996ء میں جلال آباد آ گئے ۔ اگلے سال کے شروع میں ایمن الظواہری بھی اپنے مجاہدین کے ساتھ افغانستان آ گئے' ہم ایک بار پھر اس کہانی کو روکتے ہیں اور لیو سٹراس کے شاگردوں کی طرف واپس آتے ہیں۔

20 جنوری 1993ء کو بل کلنٹن نے صدر کا حلف اٹھایا' وہ ڈیمو کریٹک پارٹی سے تعلق رکھتے تھے اور دل سے نیو کنزرویٹوز کو ناپسند کرتے تھے' کلنٹن دور میں ان لوگوں کا وائٹ ہاؤس میں داخلہ بند ہو گیا لیکن یہ اس سارا عرصہ صدر کلنٹن کو مسلمانوں کے خلاف اکساتے رہے' اس دوران یہ لوگ بش فیملی اور امریکہ کے پادریوں کے ساتھ بھی رابطے میں رہے' ان لوگوں نے پادریوں کو بش کے بیٹے بش جونیئر کی حمایت پر تیار کر لیا' اسی دوران نیو کنزرویٹوز نے جون 1997ء میں واشنگٹن میں پراجیکٹ آف نیو امریکن سنچری (پی این اے سی) کے نام سے ایک تھینک ٹینک کی بنیاد رکھی، اس تھینک ٹینک کا تین نقاطی ایجنڈا تھا، امریکہ کیلئے خلائی فوج تشکیل دینا، امریکہ کا دفاعی بجٹ بڑھانا اور امریکہ کی دفاعی پالیسی تبدیل کرنا' ابتداء میں اس تھینک ٹینک کے 25 ارکان تھے اور اس کا

چیئرمین ولیم کرسٹول تھا، جارج بش کا بیٹا جیب بش، ڈک چینی، ڈونلڈ رمز فیلڈ، پال وولف وٹزاور زالمے خلیل زاد بھی اس تھنک ٹینک میں شامل تھے، ہم یہاں ایک بار پھر رکتے ہیں اور واپس افغانستان جاتے ہیں۔ 1998ء میں اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری نے قندھار میں پریس کانفرنس کی اور اس پریس کانفرنس میں اس نے امریکہ کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے دو نتائج ظاہر ہوئے نیو کنزرویٹوز کو بل کلنٹن پر دباؤ ڈالنے کا موقع مل گیا اور دوسرا صدام حسین کو القاعدہ میں روشنی کی کرن دکھائی دینے لگی۔ صدام حسین نے اسامہ بن لادن سے رابطہ کیا اور انہیں عراق میں منتقل ہونے کی پیش کش کر دی' اسامہ نے افغانستان چھوڑنے سے انکار کر دیا تاہم ان کے صدام کے ساتھ رابطے استوار ہو گئے۔ 1998ء ہی میں القاعدہ نے ایران کے ساتھ تعلقات استوار کئے اور یوں یہ لوگ ایران اور عراق کی مدد سے حزب اللہ تک پہنچ گئے اور حزب اللہ نے لبنان میں القاعدہ کے مجاہدین کو ٹریننگ دینا شروع کر دی' القاعدہ کے مجاہدین نے حزب اللہ سے ٹریننگ لینے کے بعد نیروبی اور دارالسلام میں امریکی سفارتخانے اڑا دیئے' اس وقت تک ایران' عراق اور حزب اللہ کا خیال تھا القاعدہ کی سرگرمیاں صرف یہیں تک محدود رہیں گی لیکن القاعدہ نائن الیون کی منصوبہ بندی کر رہی تھی' سید قطب کے مجاہد بڑی تیزی سے نائن الیون کی طرف بڑھ رہے تھے' دوسری طرف ''نیو کنزرویٹوز'' کسی ایسے بہانے کی تلاش میں تھے جس کی مدد سے وہ امریکہ کو عالم اسلام کے سامنے کھڑا کر سکیں' ان لوگوں کے تھنک ٹینک پی این اے سی نے 2000ء میں اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا' انہوں نے اپنی میٹنگ میں اعلان کیا تھا ''ہمیں نئے خطرات (مسلمانوں) سے نبٹنے کیلئے ایک نئی پرل ہاربر کی ضرورت ہے''۔ اب صورتحال بہت دلچسپ ہو گئی' سید قطب کے مجاہد افغانستان اور لبنان میں بیٹھ کر نائن الیون کا انتظار کر رہے تھے جبکہ لیوسٹراس کے شاگرد کسی ایسی پرل ہاربر کی تلاش میں مصروف تھے جس کی آڑ میں وہ اسلامی دنیا پر حملہ کر سکیں' اسی دوران 2000ء کے الیکشن ہوئے' جارج بش جونیئر صدر منتخب ہوئے اور ان کے ساتھ ساتھ لیوسٹراس کا سارا گروپ اقتدار میں آ گیا، ڈک چینی نائب صدر بن گئے، رمز فیلڈ وزیر دفاع ہو گئے اور پال وولف وٹز کو نائب وزیر دفاع کا عہدہ مل گیا یوں سید قطب اور لیوسٹراس کے شاگرد آمنے سامنے کھڑے ہو گئے اور دونوں کسی مناسب موقع کا انتظار کرنے لگے' اس کے بعد کیا ہوا' یہ میں آپ کو کل بتاؤں گا۔ (کالم کا باقی حصہ اگلے صفحات میں ملاحظہ کیجئے)

اب کس کی باری ہے

اور پھر نائن الیون کا دن آ گیا۔ امریکہ کے ہوائی اڈوں سے چار جہاز اڑے' دو نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے ٹکرائے' ایک واشنگٹن میں پینٹا گان پر گرا اور ایک وائٹ ہاؤس کی طرف بڑھا لیکن اسے راستے ہی میں گرا دیا گیا۔ سید قطب کے مجاہدین نے امریکہ کو جڑوں سے ہلا دیا۔ یہ آپریشن حزب اللہ' عراق اور ایران تک کیلئے غیر متوقع تھا چنانچہ یہ تینوں ممالک فوری طور پر القاعدہ سے الگ ہو گئے' 14 ستمبر کو صدر بش نے اس حملے کو "صلیبی جنگ" قرار دے دیا' اس وقت چھ اسلامی ملک افغانستان' عراق' شام' ایران' پاکستان اور سعودی عرب امریکہ کے ٹارگٹ تھے' نائین الیون کے بعد دنیا ایک نئے دور میں داخل ہو گئی' نیو کنزرویٹوز آگے بڑھے اور انہوں نے صدر بش سے اسلامی دنیا پر حملہ کرا دیا۔ امریکی فوج نے افغانستان پر حملہ کیا اور افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ افغانستان کے بعد یہ لوگ عراق کی طرف بڑھے اور انہوں نے عراق میں کوئی بچہ چھوڑا' کوئی عورت چھوڑی اور نہ ہی کوئی بزرگ۔ بش انتظامیہ میں وزیر خارجہ کولن پاول واحد شخص تھا جو ان حملوں کے خلاف تھا۔ اس نے کابینہ کے اجلاس میں "کنزرویٹوز" کی مخالفت کی۔ یہ لوگ بھی کولن پاول سے خائف تھے لہٰذا دونوں کے درمیان ایک بار پھر جنگ چھڑ گئی۔ ان دنوں کولن پاول نے خلیج کی صورتحال پر چند ایسے بیانات جاری کر دیئے جو امریکی پالیسی سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے ان بیانات کو ہوا بنا دیا جس کے نتیجے میں کولن پاول نے اعلان کر دیا وہ بش کے اگلے دور میں کابینہ کا حصہ نہیں بنے گا۔ بش کو یہ بیان برا لگا لہٰذا صدر نے 15 نومبر 2004ء کو کولن پاول سے استعفیٰ لے لیا اور اس کی جگہ "نیو کنزرویٹوز" کی رکن کونڈو لیزا رائس کو وزیر خارجہ بنا دیا جس کے بعد امریکہ کا تمام تر اختیار نیو کنزرویٹوز کے ہاتھ میں چلا گیا۔

عراق کے بعد شام اور ایران کی باری تھی لیکن 2005ء میں صدر بش کیلئے تین بڑے مسائل پیدا ہو گئے' ایک امریکہ افغانستان اور عراق میں بری طرح پھنس گیا' دو یورپ سمیت پوری دنیا میں صدر بش کا امیج خراب ہو گیا اور یورپ' روس اور جاپان نیو کنزرویٹوز پر انگلی اٹھانے لگے۔ بش کا خیال تھا یورپ مسلمانوں کے خلاف اس جنگ میں امریکہ کا کھل کر ساتھ دے گا لیکن میڈرڈ اور لندن کے بم دھماکوں کے باوجود یورپ نے عالم اسلام کے

خلاف اعلان جنگ نہ کیا اور تین صدر بش اور نیو کنزرویٹوز باقی اسلامی ممالک پر حملے کیلئے دفاعی بجٹ میں 40 فیصد اضافہ کرنا چاہتے تھے لیکن کانگریس نے ان کی درخواست مسترد کر دی چنانچہ اس صورتحال میں "نیو کنزرویٹوز" اپنی پالیسی کی تشکیل نو پر مجبور ہو گئے اور انہوں نے جنگ کے نئے فیز کیلئے اسرائیل اور بھارت کو "فرنٹ لائن سٹیٹس" بنانے کا فیصلہ کیا۔ آپ کیلئے یہ اطلاع حیران کن ہو گی لیو سٹراس کی "نیو کنزرویٹوز" کے بااثر ارکان کی تعداد پچاس ہے اور ان پچاس ارکان میں سے 25 یہودی ہیں۔ نیو کنزرویٹوز نے جون 2006ء میں شطرنج کے مہرے تبدیل کئے اور اسرائیل سے حماس پر حملے شروع کرا دیئے' 12 جولائی کی صبح اسرائیل کے دو فوجی اغواء ہوئے اور اسی شام اسرائیل نے لبنان پر بھی حملہ کر دیا۔ میں پچھلے ایک ماہ سے لبنان پر اسرائیلی حملوں کا مطالعہ کر رہا ہوں اور مجھے محسوس ہو رہا ہے ان اسرائیلی فوجیوں کا اغواء "نیو کنزرویٹوز" کی چال تھی اور اس کا مقصد اسرائیل کو لبنان پر حملے کا جواز فراہم کرنا تھا۔ آج لبنان پر اسرائیلی حملے دوسرے مہینے میں داخل ہو چکے ہیں۔ گزشتہ ایک ماہ کے دوران اسرائیل نے لبنان پر اڑھائی ہزار حملے کئے ہیں جن کے نتیجے میں پورا لبنان تباہ ہو گیا ہے لیکن حزب اللہ کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا' کیوں؟ آج یہ سوال پوری دنیا کے سوچنے والوں کو حیران کر رہا ہے۔ ہم خوش فہم مسلمان اسے حزب اللہ کی کامیابی سمجھ رہے ہیں لیکن میرا خیال اس سے قدرے مختلف ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے اسرائیل اور امریکہ حزب اللہ کی اس "فتح" کی آڑ میں ایک خطرناک کھیل کھیل رہے ہیں۔ امریکہ کا یہودی میڈیا دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا ہے شام اور ایران حزب اللہ کو عسکری' مالی اور افرادی قوت فراہم کر رہے ہیں اور حزب اللہ کے مجاہدین جو میزائل داغ رہے ہیں وہ انہیں ایران اور شام نے دیئے تھے' یوں محسوس ہوتا ہے اسرائیل اس پروپیگنڈے کی آڑ میں شام اور ایران پر حملہ کرنا چاہتا ہے اور اگر یہ حملہ ہو گیا تو امریکہ اسے بھرپور عسکری اور سفارتی سپورٹ دے گا نیو کنزرویٹوز کا ماضی اور موجودہ حالات بتاتے ہیں اگر اسرائیل اور لبنان کی یہ جنگ بند ہو گئی تو بھی آنے والے چند برسوں میں یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہو گا اور امریکہ اسرائیل کو سامنے رکھ کر کبھی نہ کبھی ان دونوں ممالک پر ضرور حملہ کرے گا۔ شام اور ایران کے بعد یا شام اور ایران کے ساتھ ساتھ پاکستان اور سعودی عرب پر بھی مشکل وقت آ سکتا ہے۔ امریکہ پاکستان کیلئے بھارت کو استعمال کر سکتا ہے' پچھلے دو ماہ میں اس کے ہلکے ہلکے آثار بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ آپ اگر مئی 2006ء سے اگست 2006ء کے دوران پاک بھارت تعلقات میں آنے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیں تو آپ کو صورتحال واضح ہوتی نظر آئے گی۔ مئی 2006ء میں بھارت نے اچانک واویلا شروع کر دیا تھا "پاکستان میں اب بھی دہشت گردوں کے 59 ٹریننگ کیمپ چل رہے ہیں" جولائی میں ممبئی میں بم دھماکے ہوئے اور بھارت نے سیکرٹری خارجہ سطح کے مذاکرات معطل کر دیئے۔ بھارتی وزیراعظم نے پاکستان کو "گرم تعاقب" کی دھمکی دی اور 7 اگست 2006ء کو امریکہ کے نائب وزیر خارجہ رچرڈ باؤچر نے نئی دہلی میں بھارتی سیکرٹری خارجہ شیام سرن سے تین گھنٹے مذاکرات کئے اور ان مذاکرات کے بعد اعلان کیا "امریکہ بھارت کے ساتھ مل کر دہشت گردی کا مقابلہ کرے گا" باؤچر کے اس بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے شاید بھارت

پاکستانی علاقوں میں مجاہدین کے فرضی کیمپوں پر حملے کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے اور امریکہ ان حملوں میں بھارت کی مدد کرے گا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے اگر خدانخواستہ کبھی بھارت نے پاکستانی علاقوں پر حملے شروع کیے تو شاید امریکہ پاکستان کے ساتھ وہی سلوک کرے جو اس نے 1971ء کی جنگ میں کیا تھا' مجھے محسوس ہوتا ہے ایک طرف بھارت ہم پر حملے کرے گا اور دوسری طرف امریکہ ہمیں یہ یقین دہانی کراتا رہے گا "یہ حملے صرف شدت پسندوں کے خلاف ہیں اور حکومت پاکستان کو ان سے پریشان نہیں ہونا چاہیے" اور جب کبھی ہم "پریشان" ہونے کی کوشش کریں گے تو امریکہ ہمیں دھمکی لگا کر بٹھا دے گا۔ ہو سکتا ہے میرا خدشہ سو فیصد غلط ثابت ہو لیکن اس کے باوجود دل ڈرتا ہے' حالات سے محسوس ہوتا ہے شاید پاکستان کے بعد سعودی عرب "نیو کنزرویٹوز" کا ٹارگٹ بن جائے۔ یہ لوگ کوشش کریں گے حرمین شریفین اور سعودی حکومت کو الگ الگ کر دیا جائے تا کہ اسلامی دنیا اس حملے کو دو ریاستوں کا باہمی جھگڑا سمجھ کر خاموش رہے اور امریکہ سعودی جنگ "صلیبی جنگ" نہ بن سکے۔

یہ لیوسٹراس کے پیروکاروں کا منصوبہ ہے جبکہ سید قطب کے مجاہدین کیا سوچ رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی کیا پلاننگ ہے سر دست اسکے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن ایک بات طے ہے دنیا اس وقت دو شدت پسند گروپوں میں بری طرح پھنس چکی ہے۔ لیوسٹراس کے پیروکاروں کے پاس فوج' طاقت اور ٹیکنالوجی ہے جبکہ سید قطب کے مجاہدین کے پاس ذہانت اور جذبہ ہے اور یہ بھی طے ہے یہ دونوں غیر متوازن لوگ ہیں اور یہ لوگ کسی بھی وقت دنیا کو اس انتہا تک لے جا سکتے ہیں جس کے بارے میں آئن سٹائن نے پیشن گوئی کی تھی "تیسری عالمی جنگ ایٹمی ہوگی اور اس کے بعد جو لوگ بچیں گے وہ پتھروں اور ڈنڈوں سے لڑا کریں گے"۔

اب ہم نیو کنزرویٹوز اور مجاہدین کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیتے ہیں لیکن یہ جائزہ ہم کل لیں گے۔

دوسرا راستہ بھی تھا

نیو کنزرویٹوز اور مسلم مجاہدین میں چند چیزیں مشترک ہیں مثلاً دونوں شدت پسند ہیں' دونوں ایک دوسرے کو صفحہ ہستی سے مٹانا چاہتے ہیں اور دونوں دنیا کو مذہب میں تقسیم کرتے ہیں لیکن اس اشتراک فکر کے باوجود دونوں کے طرز عمل میں زمین آسمان کا فرق ہے' ہم اگر دونوں گروہوں کی 55 سالہ جدوجہد کا نفسیاتی تجزیہ کریں تو محسوس ہوتا ہے نیو کنزرویٹوز انتہائی چالاک' مکار اور منظم لوگ ہیں جبکہ مسلم مجاہدین انتہائی جذباتی' جلد باز اور غیر منظم ہیں۔ نیو کنزرویٹوز ایک ٹیم کی طرح مل کر کام کرتے ہیں جبکہ مسلم مجاہدین کی ساری کوششیں انفرادی ہوتی ہیں۔ یہ ایک واضح اور قابل توجہ فرق ہے اور اس فرق کی وجہ سے ہمارے مجاہدین وہ نتائج حاصل نہیں کر سکے جو پچھلے 55 برسوں میں نیو کنزرویٹوز نے حاصل کئے۔ نیو کنزرویٹوز نے 1952ء میں محسوس کر لیا تھا انہیں کامیابی کیلئے بڑی فوج' بڑے پیمانے پر گولہ بارود اور اربوں کھربوں ڈالر چاہئیں اور وہ خواہ صدیوں تک کوشش کر لیں وہ چھوٹے سے چھوٹے اسلامی ملک کے برابر فوج جمع نہیں کر سکیں گے' وہ کسی ملک کے بجٹ کے برابر پیسہ اور کسی ٹرینڈ فوج کے اسلحے کے برابر گولہ بارود جمع نہیں کر سکیں گے چنانچہ انہوں نے اپنے مقصد کے لئے دنیا کی سب سے بڑی فوج' سب سے جدید اسلحہ اور دنیا کا سب سے بڑا بجٹ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا' انہوں نے 1952ء میں فیصلہ کیا وہ کبھی نہ کبھی وائٹ ہاؤس پہنچیں گے۔ وہ امریکہ کا سارا اختیار اپنے ہاتھوں میں لیں گے اور اس کے بعد امریکہ کی ساری طاقت اپنے دشمن کے خلاف استعمال کریں گے' یہ لوگ اس فیصلے کے بعد 1952ء میں امریکہ کے جمہوری نظام میں داخل ہوئے' انہوں نے ری پبلکن پارٹی میں اپنی جگہ بنائی اور 55 برس بعد اس مقام پر پہنچ گئے جہاں سے وہ پوری دنیا کے ساتھ کھیل سکتے ہیں' ان لوگوں نے 55 برسوں میں اپنی نفرت کو ادارے کی شکل دے دی جبکہ اس کے مقابلے میں مسلم مجاہدین نے غیر جمہوری' غیر سیاسی اور غیر منظم راستے منتخب کئے' یہ لوگ اپنی اپنی حکومتوں سے ٹکراتے رہے' قید ہوتے رہے' جلاوطن ہوتے رہے اور اس کے بعد پوری دنیا میں تنہا اور بے گھر ہو کر رہ گئے' آج یہ لوگ اسلامی دنیا کے ہیرو ہیں لیکن اس کے باوجود بے گھر اور بے یارومددگار ہیں اور آج دنیا میں کوئی اسلامی ملک ایسا نہیں جو انہیں پناہ دینے کے لئے تیار ہو لہٰذا یہ لوگ جنگلوں' غاروں اور صحراؤں میں بھٹکتے

پھر رہے ہیں' اگر یہ لوگ بھی ''نیو کنزرویٹوز'' کی طرح جمہوری راستہ اختیار کرتے' اگر یہ لوگ بھی مختلف اسلامی ممالک میں ہم خیال سیاستدانوں' دانشوروں اور بیوروکریٹس کی کھیپ تیار کرتے اور اگر یہ بھی خاموش انقلاب کے راستے کا انتخاب کرتے تو آج یہ لوگ نہ صرف 8 بڑے اسلامی ممالک میں برسر اقتدار ہوتے بلکہ ان ملکوں کی فوجیں' اسلحہ' بجٹ اور تیل بھی ان کے قبضے میں ہوتا اور یہ لوگ ''نیو کنزرویٹوز'' کو بڑے پیمانے پر ٹف ٹائم دینے کے قابل ہوتے لیکن افسوس مسلمان مجاہدین میں سے ہر شخص نے انفرادی طور پر جہاد کا کریڈٹ لینے کی کوشش کی اور اس کوشش میں وہ خود بھی تنہا ہو گیا اور اس نے عالم اسلام کو بھی ایک ایسی بند گلی میں دھکیل دیا جس کا ایک سرا بند ہے اور دوسرے سرے پر ''نیو کنزرویٹوز'' ایٹم بم لے کر بیٹھے ہیں' اس میں کوئی شک نہیں شہادت ہر مسلمان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہوتا ہے لیکن دشمن کو شکست دے کر مرنے والے شہید اور دشمن سے شکست کھا کر جاں بحق ہونے والے شہید کے درجے میں بڑا فرق ہے۔ میں اگر صرف اپنی شہادت پر توجہ دوں۔ میں اگر اکیلا دشمن کے پورے بریگیڈ سے ٹکرا جاؤں' میں اگر خود شہید ہو جاؤں' میں اگر خود جنت میں چلا جاؤں اور اپنے پیچھے رہ جانے والے مسلمانوں کو فراموش کر دوں تو یہ بھی بڑی زیادتی ہو گی' بدقسمتی سے ہمارے مجاہدین نے صرف اپنی جنت اور اپنی شہادت پر توجہ دی اور وہ افغانستان' عراق' لبنان' کشمیر اور فلسطین کے ان مسلمانوں کو بھول گئے جو ان کی شہادت کا تاوان ادا کر رہے ہیں' جن پر اسرائیل اور امریکہ نے عرصہ حیات تنگ کر دیا ہے۔

میں نے شروع میں عرض کیا تھا سید قطب سے تین لوگوں نے اثر لیا تھا' امام خمینی' مولانا مودودی اور ایمن الظواہری۔ ایمن الظواہری کی ابتدائی زندگی سید قطب کے ساتھ گزری تھی اور انہوں نے سید قطب پر ہونے والے ظلم اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے' شاید یہ ان مظالم کا نتیجہ تھا ایمن الظواہری نے آنے والی زندگی میں مشکل راستے کا انتخاب کیا اور انہوں نے چھاپہ مار جہاد کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا جبکہ ان کے مقابلے میں امام خمینی اور مولانا مودودی کا طرز عمل مختلف تھا' امام خمینی نے جہادی گروپ بنانے کے بجائے خاموش اور فکری انقلاب کا راستہ اختیار کیا' انہوں نے ایران کے عوام کو امریکہ پرست شاہ کے خلاف کھڑا کر دیا۔ ایران میں انقلاب آیا اور امام خمینی اقتدار تک پہنچ گئے۔ امام خمینی کا انقلاب آج تک قائم ہے چنانچہ آپ ایران کے بارے میں امریکہ کی پالیسی دیکھ لیجئے۔ امریکہ پچھلے 27 برس سے ایران کو دھمکیاں دے رہا ہے لیکن اس نے آج تک اس سے براہ راست ٹکر لینے کی جرات نہیں کی۔ کیوں؟ کیونکہ وہ جانتا ہے ایران کے انقلابیوں کے پاس فوج بھی ہے' تیل بھی' پیسہ بھی' لوگ بھی اور کسی حد تک ایٹم بم بھی۔ دوسری شخصیت جو سید قطب کے افکار سے متاثر ہوئی وہ مولانا مودودی تھے۔ مولانا نے جماعت اسلامی کی شکل میں ایک نیم سیاسی اور نیم مذہبی جماعت کی بنیاد رکھی' اس جماعت نے ''نیو کنزرویٹوز'' کی طرح دانشمندانہ راستہ اختیار کیا۔ گو جماعت اسلامی نے پاکستان میں بے شمار دانشور' ادیب' پروفیسر' بیوروکریٹس اور بزنس مین پیدا کئے لیکن اس کے باوجود یہ جماعت ملک میں کوئی بڑا سیاسی انقلاب نہ لا سکی۔ گزشتہ 58 برسوں میں جماعت کے بے شمار کارکنوں کو ایوان اقتدار تک پہنچنے کا موقع ملا لیکن کسی ''جینیاتی خرابی'' کے باعث اس کے

کارکنوں نے اقتدار کے ایوانوں میں پہنچ کر پارٹی بدل لی۔ آپ جاوید ہاشمی سے لے کر محمد علی درانی تک ان تمام سیاستدانوں کا ماضی دیکھ لیجئے جنہوں نے جماعت اسلامی کی کوکھ سے جنم لیا لیکن جب یہ لوگ اقتدار تک پہنچے تو یہ میاں نواز شریف کی پارٹی میں شامل ہو گئے یا پھر مشرف بہ مشرف ہو گئے۔ شاید یہی وہ خامی ہے جس کی وجہ سے جماعت اسلامی نیو کنزرویٹوز جتنی طاقت حاصل نہ کر سکی لہٰذا ہم اگر سید قطب کے ان تینوں ''شاگردوں'' کی کامیابیوں کا جائزہ لیں تو ہمیں امام خمینی قدرے بہتر پوزیشن میں نظر آتے ہیں۔ میرا خیال ہے اگر یہ لوگ 1950ء میں اسلامی دنیا کے 8 ملکوں کو فوکس کر لیتے اور مہاتیر محمد سے لے کر شیخ محمد بن راشد المختوم تک مسلمانوں کے تمام معتدل حکمرانوں پر کام کرتے' اگر یہ لوگ ''نیو کنزرویٹوز'' کی طرح غیر محسوس طریقے سے ان تمام لوگوں کو اقتدار میں لے آتے جو ان کی فکر سے متاثر ہیں اور جوامت کے اتحاد اور غلبے پر یقین رکھتے ہیں تو آج صورتحال یکسر مختلف ہوتی' میرا خیال ہے اگر یہ لوگ دوسرا راستہ اختیار کرتے تو آج عالم اسلام کی یہ پوزیشن نہ ہوتی اور ہم آج دنیا میں یوں مار نہ کھا رہے ہوتے لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا لہٰذا آج عالم اسلام نیو کنزرویٹوز اور مجاہدین دونوں کے ہاتھوں نقصان اٹھا رہا ہے اور آج پوری دنیا شدید خطرات میں گھر چکی ہے۔

ہم اب آتے ہیں اس مسئلے کے حل کی طرف' اس مسئلے کے دو حل ہیں' میں آپ کو یہ حل کل بتاؤں گا۔

پسپائی کے پچاس سال

مغرب اور عالم اسلام کے اس تصادم کے تین حل ہیں' دنیا کے سارے عیسائی' یہودی' بودھ' ہندو اور کیمونسٹ بیک جنبش قلم مسلمانوں کے تمام مطالبات مان لیں' تمام غاصب قومیں فلسطین' کشمیر' چیچنیا' سنکیانگ' عراق اور افغانستان مسلمانوں کے حوالے کر دیں' اپنی فوجیں نکالیں' عالم اسلام سے معافی مانگیں' دونوں فریق مل کر دنیا کی حد بندی کر دیں اور اس کے بعد مغرب کی حد میں مسلمان داخل نہ ہوں اور اسلامی حدود میں کوئی گورا قدم نہ رکھے مگر یہ حل ممکن نہیں' کیوں؟ کیونکہ مسلمانوں سے متصادم تمام قومیں کئی گنا طاقتور ہیں اور طاقتور کبھی اپنا قبضہ نہیں چھوڑتا' دوسرا حل جہاد ہے' دنیا کے 61 اسلامی ملک اہل مغرب کے خلاف اعلان جہاد کر دیں' دنیا کے ایک ارب 45 کروڑ مسلمان استعمار کے خلاف کھڑے ہو جائیں جس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہو وہ ڈنڈا لے کر نکل آئے' جس کے پاس چھری ہو وہ چھری لے کر باہر آ جائے اور جس کے پاس پستول' بندوق' توپ اور ایٹم بم ہے وہ ایٹم بم اور پستول لے کر میدان میں کود پڑے' ہم سب مل کر دشت اور دریاؤں سے بحر ظلمات تک گھوڑے دوڑا دیں' ہم سب اپنے اپنے کافر ہمسایوں سے دست و گریبان ہو جائیں اور اس جنگ میں خود بھی مر جائیں اور دشمنوں کو بھی مار دیں لیکن ظاہر ہے یہ حل بھی ممکن نہیں' کیوں؟ کیونکہ اسلامی دنیا اب ''امت'' نہیں رہی' یہ 61 آزاد اور خود مختار ملک ہیں اور ہر ملک کے اپنے اپنے مفادات ہیں اور کوئی اسلامی ملک کسی برادر اسلامی ملک کیلئے اپنے مفادات کی قربانی دینے کیلئے تیار نہیں' مفادات کی حالت یہ ہے اسرائیل اور لبنان کی موجودہ جنگ میں جب مصر سے مداخلت کی اپیل کی گئی تو مصری صدر حسنی مبارک نے جواب دیا ''مصری فوج مصر کی حفاظت کے لئے بنائی گئی تھی لبنان کیلئے نہیں'' اسرائیل کے اردگرد 22 اسلامی ممالک ہیں' اسرائیل نے ان میں سے 9 ممالک کی زمین پر قبضہ کر رکھا ہے لیکن یہ ممالک آج تک اس قبضے کے خلاف اکٹھے نہیں ہو سکے' حالت یہ ہے جب امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا تھا تو پورے عالم اسلام نے امریکہ کی حمایت کی تھی' پاکستان نے اس جنگ میں امریکہ کو ہوائی اڈے فراہم کیے تھے جبکہ عربوں نے امریکی طیاروں کو پٹرول دیا تھا۔ اسی طرح جب عراق پر حملہ ہوا تو سعودی عرب سمیت سارے عرب ممالک نے امریکہ کی مدد فرمائی تھی' امریکی فوج پہلے سعودی عرب' ترکی اور کویت میں اتری تھی اور پھر وہاں سے

مارچ کرتی ہوئی عراق میں داخل ہوئی تھی' لہٰذا جب صورتحال یہ ہو تو اجتماعی جہاد کا تصور ممکن نہیں ہوتا اور اب رہ گیا تیسرا حل تو اس حل کو ہم جاپانی حل کہہ سکتے ہیں۔

جاپان دوسری جنگ عظیم سے پہلے دنیا کی دوسری بڑی عسکری قوت تھا' 1937ء سے لے کر 1945ء تک جاپان میں چھ سو مصنوعات تیار ہوتی تھیں اور اس میں ایک ہزار چار سو ٹینک تھے' جاپانی فوجیوں کے بارے میں کہا جاتا تھا ان کے صرف دو مقصد ہوتے ہیں "مار دو یا مر جاؤ" کہا جاتا تھا پسپائی اور واپسی جیسے لفظ جاپانی ڈکشنری میں شامل نہیں لیکن پھر جاپانیوں کی زندگی میں 6 اور 9 اگست آیا' چھ اگست 1945ء کو صبح آٹھ بج کر 15 منٹ پر امریکی جہاز بی 29 نے ہیروشیما پر پہلا ایٹم بم گرایا' اس بم کا نام "لٹل بوائے" تھا' اس بم نے 30 سیکنڈ میں ایک لاکھ 40 ہزار لوگوں کو لقمہ اجل بنا دیا جبکہ 80 ہزار لوگ زندگی بھر کیلئے معذور ہو گئے' امریکہ نے 9 اگست کو صبح 11 بج کر 2 منٹ پر ناگاساکی پر دوسرا بم گرایا' اس ایٹم بم کا نام "فیٹ مین" تھا اور یہ بم 74 ہزار جاپانیوں کو نگل گیا' ہیروشیما اور ناگاساکی اس وقت جاپان کی "بیک بون" تھے چنانچہ دو دن میں دو بڑے شہروں کی تباہی اور دو لاکھ 14 ہزار لوگوں کی موت نے جاپان کو برباد کر دیا' جاپان نے امریکہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے جس کے بعد امریکی جنرل میک آرتھر نے جاپان کی عنان اقتدار سنبھال لی' اس وقت جاپان کا شہنشاہ ہیرو ہیٹو تھا' جاپانی اپنے شہنشاہ کی اوتار کی طرح عزت کرتے تھے' جنرل میک آرتھر نے بادشاہ کو اپنے دفتر بلایا اور اسے کئی گھنٹے دفتر کے باہر بٹھائے رکھا' جاپانی اس واقعے کو تاریخ کا انتہائی ذلت آمیز واقعہ قرار دیتے ہیں لیکن پھر کیا ہوا' جاپانی قوم نے اپنی ذلت' اپنی نفرت اور اپنی شکست کو علم' فن' سائنس اور معیشت میں تبدیل کر دیا' اس نے توپ اور فوج کے بغیر جنگ لڑنے کا اعلان کیا اور اس جنگ میں امریکہ سے بدلہ لینے کا فیصلہ کیا' جاپانی شہنشاہ ہیرو ہیٹو نے جاپانی قوم کو اپنا اسلحہ امریکی فوج کے حوالے کرنے کا حکم دیا' جاپانی قوم نے اسی وقت اپنے تمام ہتھیار امریکہ کے حوالے کر دیئے اور وہ دن ہے اور آج کا دن ہے جاپان کے کسی شہری نے بندوق اور پستول کو چھو کر نہیں دیکھا' شہنشاہ نے جاپان میں فوج کے خاتمے کا اعلان کر دیا اور یہ قانون پاس کر دیا جاپان اپنے دفاع پر جی این پی کا صرف ایک فیصد خرچ کرے گا۔ 1945ء میں جاپان میں فوجی گاڑیاں بنانے والی 11 اور فوج کے لئے برقی آلات بنانے والی 2 کمپنیاں تھیں' ہونڈا' نیسان اور ایسوزو فوجی ٹرک بناتی تھیں جبکہ ہٹاچی اور توشیبا بموں کے فیوز اور توپوں کے ٹرائیگر تیار کرتی تھیں' اس وقت ٹوکیو میں مشین گن اور رائفلیں بنانے کے 21 کارخانے تھے جاپانی قوم نے ان کو گاڑیاں' سلائی مشینیں' کیمرے' دوربینیں' ریڈیو' ٹیلی ویژن اور گھڑیاں بنانے کی فیکٹریوں میں تبدیل کر دیا' حکومت نے ٹوکیو شہر میں ایک سو بڑی یونیورسٹیوں اور ٹیکنیکل کالجوں کی بنیاد رکھی' آج ان کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعداد ایک ہزار ہو چکی ہے' جاپانی قوم نے بچت' ایکسپورٹ اور ویلفیئر کو اپنی بنیاد بنایا' جاپان کا ہر شہری اپنی آمدنی کا دس فیصد بینک میں جمع کراتا تھا' بینک یہ رقم حکومت کو دیتے تھے' حکومت اس سے فیکٹریاں لگاتی تھی' ان فیکٹریوں کی 70 فیصد پیداوار برآمد کی جاتی تھی اور اس سے جو زرمبادلہ ملتا تھا اس سے نئی مشینری' نئی ٹیکنالوجی اور خام مال خریدا جاتا

تھا' جاپان نے قانون بنایا اگر اس کی کسی فرم میں سو ملازمین کی گنجائش ہے تو اس فرم میں ہر وقت سو ملازم پورے رہیں گے' جس فرم میں ایک آدھ پوسٹ خالی رہ جاتی حکومت اسے بھاری جرمانہ کر دیتی' جاپان نے جاپانی معاشرے کو ویلفیئر سوسائٹی کی شکل دی' اس ویلفیئر سوسائٹی میں عوام کی فلاح و بہبود حکومت کی بجائے لوگوں کا کام تھا' لوگوں نے یہ ذمہ داری خوب نبھائی لہٰذا 1980ء میں جاپان دنیا کی دوسری بڑی معیشت بن گیا' جاپان کی گھڑیوں' کیمروں' ریڈیو' ٹی وی' گاڑیوں اور کمپیوٹروں نے پورے امریکہ کو شکست دے دی' لوگ ہارورڈ کی بجائے ٹوکیو یونیورسٹی میں داخلہ لینے لگے اور امریکی صدر کے ٹائم پیس تک کے پیچھے میڈ ان جاپان کی مہر لگ گئی۔ یہ وہی جاپان تھا جس میں دوسری جنگ عظیم کے بعد 30 لاکھ نعشیں پڑی تھیں اور جس کے پاس ان نعشوں کے لئے کفن تک نہیں تھا۔ جاپان کی یہ ترقی صرف ایک فیصلے کی مرہون منت تھی' جاپان نے 1945ء میں فیصلہ کیا تھا امریکہ کے پاس ایٹم بم ہے لہٰذا اگر اس نے زندہ رہنا ہے تو اسے اپنے جذبے' اپنی نفرت اور اپنے انتقام کی شکل بدلنا ہو گی اور اسے مغرب کے اس نازک حصے پر ضرب لگانا ہو گی جہاں سے وہ بچ نہ سکے اور اس وقت مغرب کا وہ نازک حصہ معیشت' فیکٹری اور تعلیم تھی' جاپان نے اپنے انتقام کو ٹوکیو یونیورسٹی' ہونڈا' ٹیوٹا' نیسان' مزدا' سونی' توشیبا' ہٹاچی اور ٹوکیو سٹاک ایکسچینج کی شکل دے دی لہٰذا آج جاپان فوج' گولی اور توپ کے بغیر دنیا کا سب سے بڑا فاتح ہے اور آج پوری دنیا جاپان کے سامنے سرنگوں ہے۔

•

مغرب اور عالم اسلام کی جنگ کا تیسرا حل جاپان کا یہ ماڈل ہے' اگر ہم پچاس برس کے لئے پسپائی اختیار کر لیں' اگر ہم پچاس سال کیلئے اپنے کشمیر' فلسطین اور چیچنیا کو بھول جائیں' اگر ہم پچاس سال کے لئے اہل مغرب کی طاقت کو تسلیم کر لیں اور اگر ہم اپنے دکھ' اپنی شکست' اپنی تکلیف اور اپنی ذلت کو علم' ٹیکنالوجی اور فیکٹری کی شکل دے دیں' اگر ہم پچاس سال کے لئے گولہ بارود' بم اور فوج پر پابندی لگا دیں اور اگر ہم پچاس سال کیلئے اپنے جہاد کو علم اور درس گاہ کی شکل دے دیں' اگر آج ہمارے فدائی' ہمارے خودکش حملہ آور فیصلہ کر لیں انہوں نے کسی امریکی ٹینک سے ٹکرانے کی بجائے اپنی جان لیبارٹری اور لائبریری میں دینی ہے اور اگر ہم آج یہ فیصلہ کر لیں ہم جو رقم جنگوں اور گولہ بارود پر خرچ کرتے ہیں ہم نے آج سے وہ رقم یونیورسٹیوں اور تجربہ گاہوں پر استعمال کرنی ہے اور ہم نے اس سے علم اور ٹیکنالوجی حاصل کرنی ہے تو یقین کیجئے ہماری پسپائی کے یہ پچاس سال ہمیں فتح کی اس انتہا تک لے جائیں گے جہاں ساری قومیں ہمارے ٹخنوں تک رہ جائیں گی' جاپانی قوم کے بارے میں میک آرتھر نے کہا تھا "ان کے غصے نے انہیں 35 برس میں وہاں پہنچا دیا جہاں امریکہ دو سو سال میں پہنچا تھا" مجھے یقین ہے اگر ہم بھی اپنی نفرت کا رخ موڑ لیں تو ہم پچاس برسوں میں وہاں پہنچ جائیں گے جہاں مغرب پانچ سو سال میں پہنچا تھا۔

نوٹ: یہ پانچ کالموں کے سلسلے کا آخری کالم ہے' یہ سلسلہ 10 اگست کو "یہ جنگ کیسے شروع ہوئی" کے کالم سے شروع ہوا' اگر آپ ان پانچ کالموں کو اکٹھا پڑھیں تو آپ کو مسئلہ سمجھنے میں سہولت ہو گی۔

بادشاہوں کی غلطیاں

تیمور لنگ کا تعلق سمرقند سے تھا' وہ سمرقند کے قریب ایک گاؤں کیش میں پیدا ہوا' اس کے والدین معمولی درجے کے زمیندار تھے' وہ جوان ہوا تو وہ سپاہی کی حیثیت سے فوج میں بھرتی ہو گیا' چند ماہ بعد اس نے سپہ سالار کو قتل کر دیا اور فوج کی عنان سنبھال لی' یہ ایک چھوٹے درجے کے امیر کی فوج تھی' بادشاہ تیمور کی خداداد صلاحیتوں سے ڈر گیا اور اس نے تیمور سے جان چھڑانے کی کوششیں شروع کر دیں' تیمور کو امیر کی سازشوں کی بھنک پڑ گئی لہٰذا اس نے امیر سے جان چھڑا لی اور وہ بادشاہ بن گیا' یہ اس کی پہلی بادشاہت تھی اس کے بعد وہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا اور اس نے آدھی دنیا سموں میں روند دی۔ 1403ء میں جب اس کا انتقال ہوا تو وہ فاتح عالم اور تیمور دی گریٹ بن چکا تھا۔

تیمور تاریخ کا ایک انتہائی دلچسپ کردار تھا' وہ حافظ قرآن تھا' وہ قرآن مجید کو الناس سے الم تک الٹ پڑھ سکتا تھا' وہ دونوں ہاتھوں سے یکساں طاقت سے لڑتا تھا' وہ انتہائی خونخوار تھا' وہ جو ملک فتح کرتا تھا اس کے تمام مردوں کو ذبح کر دیتا تھا' عورتوں کو لونڈیاں اور بچوں کو غلام بنا لیتا تھا اور سارے شہر جلا کر راکھ کر دیتا تھا' وہ چنگیز خان کی طرح کھوپڑیوں کے مینار بھی بناتا تھا' اس ظلم و ستم کے ساتھ ساتھ وہ علم اور فن کا بھی بڑا شیدائی تھا' وہ فاتح کی حیثیت سے جس شہر میں داخل ہوتا تھا وہ اس کے تمام عالموں' فاضلوں اور ماہرین فن کو امان دے دیتا تھا' وہ جنگ کے بعد ان عالموں کے ساتھ مناظرہ کرتا تھا' ان کی گفتگو سے لطف اندوز ہوتا تھا اور انہیں بھاری مراعات دے کر اپنے شہر "سبز" بھجوا دیتا تھا جہاں انہیں تا مرگ شاندار وظیفہ دیا جاتا تھا' اس کی جنگ کا طریقہ بھی انتہائی دلچسپ تھا' وہ اپنے ہدف ملک کے بادشاہ کو اطاعت قبول کرنے کی پیش کش کرتا تھا' اگر بادشاہ یہ پیشکش مسترد کر دیتا تھا تو وہ اس ملک پر حملہ کر دیتا تھا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا تھا' فتح کے بعد وہ اپنے سپاہیوں کو لوٹ مار اور قتل و غارت کی کھلی چھٹی دے دیتا تھا' سپاہی کئی کئی دنوں تک قتل کرتے اور لوٹتے رہتے تھے' جب ان کا دل بھر جاتا تھا تو تیمور شہر کو آگ لگانے کا حکم دے دیتا تھا یوں سارا شہر راکھ کا ڈھیر بن جاتا تھا' تیمور نے اپنی زندگی میں 54 ملک فتح کئے' امیر تیمور نے اپنی آپ بیتی بھی لکھی تھی' اس کتاب کا شمار دنیا کی بہترین کتابوں میں ہوتا ہے' یہ کتاب ترکی زبان میں لکھی گئی لیکن یہ سب سے پہلے فرانسیسی میں شائع ہوئی اور اس کے بعد دنیا کی 70 سے زائد زبانوں میں

اس کا ترجمہ ہوا' اردو میں یہ کتاب "میں ہوں تیمور" کے ٹائٹل سے شائع ہوئی' یہ میری زندگی کی چند بڑی کتابوں میں شمار ہوتی ہے' میں نے جب پہلی بار یہ کتاب پڑھنا شروع کی تو میں تیمور کی شخصیت کا گرویدہ ہو گیا' وہ مجھے عزم وہمت اور جذبے کا ایک ایسا ہمالیہ محسوس ہوا جس کے قدموں میں پہنچ کر دنیا کی ہر چیز چھوٹی ہو جاتی تھی لیکن جب میں نے یہ کتاب ختم کی تو میں نے محسوس کیا امیر تیمور اور اس کے مفتوحہ بادشاہوں کے درمیان انا' بہادری اور کشور کشائی کی جنگ تھی' دونوں بادشاہ ایک دوسرے کو مات دینا چاہتے تھے' تیمور تاریخ میں فاتح عالم کہلانا چاہتا تھا جبکہ دوسرے بادشاہ اس کے ارادوں کی راہ میں رکاوٹ بن رہے تھے'یوں دو بادشاہوں کی انا آپس میں ٹکرائی اور اس ٹکراؤ کے نتیجے میں ہزاروں لاکھوں لوگ مارے گئے' ہزاروں لاکھوں عورتیں عصمت سے محروم ہوئیں' لاکھوں بچے یتیم ہو کر غلام بنے اور سینکڑوں نابغہ روزگار شہر پیوند خاک ہو گئے' میں نے جب یہ کتاب پڑھی تو میں نے سوچا بادشاہوں کی اس لڑائی میں ان لوگوں کا کیا قصور تھا' ان بے گناہ لوگوں نے کیا جرم کیا تھا' مجھے آج تک اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا' اس سوال کے بعد میں نے تاریخ عالم کا نئے زاویئے سے مطالعہ شروع کیا تو میں نے دیکھا محمود غزنوی جے پال سے آ ٹکرایا لیکن اس کا نقصان ہندوستان کے ان ہزاروں بے گناہ شہریوں نے اٹھایا جنہوں نے یہ جنگ چھیڑی تھی اور نہ ہی وہ یہ جنگ روک سکتے تھے' ظہیر الدین بابر اور ابراہیم لودھی دونوں مسلمان تھے دونوں کی انا ٹکرائی اور لاکھوں معصوم لوگ مارے گئے' ہمایوں اور شیر شاہ سوری کی لڑائی میں بھی ہزاروں لاکھوں بے گناہ کام آئے اور آج کی تاریخ میں صدر بش اور ملا عمر کی جنگ کا نقصان بھی لاکھوں بے گناہ افغان اٹھا رہے ہیں' اسی طرح بش اور صدام حسین کی لڑائی کا نقصان بھی عراقی شہری اٹھا رہے ہیں' میں نے سوچا امریکہ اور عراق کی جنگ کے دوران صدام حسین نے عوام سے رائے لی تھی اور نہ ہی اسامہ بن لادن اور امریکی تہذیب کے ٹکراؤ میں کسی نے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے بے گناہوں اور معصوم لوگوں سے ریفرنڈم کرایا تھا' ہمارے صدر پرویز مشرف نے بھی رچرڈ آرمیٹج کے "مشورے" پر عمل کرتے ہوئے پاکستان کے پندرہ کروڑ لوگوں سے پوچھا تھا اور نہ ہی ملا عمر نے امریکی جہازوں کو بمباری کی دعوت دینے سے پہلے عوام کو اعتماد میں لیا تھا' مجھے محسوس ہوا دنیا کی تمام جنگیں دو طاقتور لوگوں کا فیصلہ ہوتی ہیں لیکن اس کا نقصان ہمیشہ عوام اٹھاتے ہیں' دوسری جنگ عظیم ہٹلر اور چرچل کی لڑائی تھی لیکن اس کا نقصان دو کروڑ معصوم اور بے گناہ لوگوں نے اٹھایا' 1945ء میں ہیرو ہیٹو نے امریکی دھمکی کو سنجیدگی سے نہیں لیا لیکن ان کی غیر سنجیدگی کے نتیجے میں ہیروشیما اور ناگاساکی کے وہ بے گناہ لوگ مارے گئے جنہوں نے یہ جنگ چھیڑی تھی اور نہ ہی وہ اسے روکنے کی قدرت رکھتے تھے' میں جوں جوں تاریخ کو اس زاویئے سے پڑھتا گیا مجھے یہ قدرت کی ستم ظریفی بلکہ ظلم محسوس ہونے لگا لہٰذا میں نے ایک دن اپنے ایک دوست سے اس کا ذکر کیا تو اس نے سنجیدگی سے جواب دیا "قدرت عوام کو اس کی غفلت اور بے حسی کی سزا دیتی ہے" میں نے پوچھا "وہ کیسے" وہ بولا "قدرت ایسے مظالم کے ذریعے لوگوں سے پوچھتی ہے تمہارے اوپر ہٹلر جیسے نیم پاگل لوگ حکومت کر رہے تھے لیکن تم لوگ خاموش رہے لہٰذا اب اس بے حسی اور بے وقوفی کی سزا برداشت کرو' مجھے اس کے نقطے سے تھوڑا سا

اختلاف تھا لیکن میں نے بحث کسی اچھے وقت پر چھوڑ دی۔

میں نے گزشتہ روز طالبان کے ترجمان عبدالحئی مطمئن کا ایک بیان پڑھا' اس بیان میں انہوں نے فرمایا ''پاکستان طالبان کا دشمن ہے' پاکستان امریکہ کا اتحادی ہے لہٰذا وہ ہمارے لئے اتنا ہی برا ہے' جتنی افغانستان کی کٹھ پتلی حکومت'' عبدالحئی مطمئن کا یہ بیان بھی تیمور سوچ کا تسلسل ہے پاکستان نے 1994ء میں جب طالبان کا ساتھ دیا تھا تو اس وقت کے حکمرانوں نے عوام سے مشورہ کرنا گوارہ نہیں کیا تھا اور جب 2001ء میں حکومت پاکستان نے یوٹرن لیا تھا تو اس وقت بھی حکومت کے کسی کارندے نے لوگوں سے رائے نہیں لی تھی، پہلی مرتبہ یہ فیصلہ جنرل نصیر اللہ بابر نے کیا تھا اور دوسرا فیصلہ جنرل پرویز مشرف نے کیا تھا لیکن دونوں مرتبہ پاکستان کے بے گناہ اور معصوم لوگوں نے ان فیصلوں کا تاوان ادا کیا، دونوں مرتبہ عام لوگ اس فیصلے کی زد میں آئے، اگر ہم ذرا سا گہرائی میں جا کر دیکھیں تو 1979ء میں افغانستان میں جہاد کا فیصلہ بھی پاکستان کے عوام نے نہیں کیا تھا، یہ فیصلہ جنرل ضیاء الحق نے اپنے ناجائز اقتدار کو جائز بنانے کیلئے کیا تھا لیکن اس کا تاوان پاکستان کے عوام کلاشنکوف اور ہیروئین کی شکل میں آج تک دے رہے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کو اس فیصلے کے ذریعے تا مرگ شہنشاہت مل گئی لیکن ہزاروں پاکستانی عوام بم دھماکوں میں مارے گئے اور پاکستان شیعہ اور سنی میں تقسیم ہو گیا اور اس تقسیم کے نتیجے میں آج پاکستان میں مسجد محفوظ ہے اور نہ ہی امام بارگاہ' جنرل ضیاء الحق کی سنت پر عملدرآمد کرتے ہوئے جنرل پرویز مشرف نے 2001ء میں اس فصل کو آگ لگا دی جو ہماری ایجنسیوں نے 1994ء میں بوئی تھی اور 2001ء تک پہنچ کر جس نے پھل دینا شروع کر دیا تھا' جنرل پرویز مشرف کے اس فیصلے سے انہیں امریکہ کے پہلو میں جگہ مل گئی لیکن پاکستانی عوام خطرات کا شکار ہو گئے اور ان پر خودکش دھماکے ہونے لگے وہ مسجدوں، امام بارگاہوں اور بازاروں میں مرنے لگے یہاں تک کہ آج طالبان نے بھی پاکستان کو دشمن ڈکلیئر کر دیا ہے۔ مجھے خدشہ ہے جس طرح افغانستان میں اتحادی فوجوں پر حملے ہو رہے ہیں چند ماہ بعد پاکستان میں بھی ایسی ہی صورتحال پیدا ہو جائے گی، اگر خدانخواستہ پاکستان میں ایسی صورتحال پیدا ہو گئی تو مجھے یقین ہے اس صورتحال کے موجد تو آرام سے زندگی گزارتے رہیں گے لیکن ہم بے گناہ لوگ ایک بار پھر مرنا شروع ہو جائیں گے۔ کسی ستم ظریف نے کیا خوب کہا تھا ''بادشاہوں کی غلطیوں کا کفارہ عوام ادا کرتے ہیں''۔ ہمارے بادشاہ جو کچھ کر رہے ہیں مجھے خطرہ ہے ہماری آنے والی کئی نسلیں اس کا کفارہ ادا کریں گی۔

67 لاکھ شتر مرغ

حسن کا تعلق غزہ سے تھا، اس کے والد سرکہ بناتے تھے، اس کی والدہ اور بہنیں یہ سرکہ بوتلوں میں بھرتی تھیں، ان بوتلوں پر لیبل لگاتی تھیں اور یہ لوگ یہ بوتلیں شام بھجوا دیتے تھے، شام میں سرکے کی بہت مانگ تھی، اس کام میں انہیں بچت ہو جاتی تھی، یہ لوگ امن پسند تھے، یہ اپنے کام سے کام رکھتے تھے لیکن 1993ء میں ایک دن حسن کے والد غائب ہو گئے، وہ آخری بار غزہ کی اسرائیلی چیک پوسٹ پر دیکھے گئے تھے، حسن نے اسرائیلی فوج کے کرنل سے رابطہ کیا، اس نے تصویر دیکھی اور یہ تصویر ردی کی ٹوکری میں پھینک کر بولا "میں اس شخص کو نہیں جانتا" حسن نے کرنل کے رویے پر احتجاج کیا، کرنل نے گارڈز کو اشارہ کیا اور اسرائیلی فوجیوں نے حسن کو مار مار کر ادھ موا کر دیا، حسن ٹوٹا بازو اور پھٹا سر لے کر واپس آیا تو اس کے گھر میں صف ماتم بچھ گئی، اس کے بعد حسن کے اندر جنگ شروع ہو گئی' وہ اس تذلیل کا بدلہ لینا چاہتا تھا، جس دن اس نے چارپائی سے نیچے قدم رکھا اس دن وہ "دہشت گرد" بن گیا، وہ غزہ سے بیروت گیا اور وہاں اس نے حزب اللہ جوائن کر لی، پچھلے تیرہ برسوں میں حسن نے یہودیوں کے خلاف بے شمار آپریشن کیے، ان آپریشنوں میں اس نے اسرائیل کو شدید نقصان پہنچایا' وہ اس وقت بھی بیروت میں ہے اور بیروت کے کسی خفیہ مقام سے اسرائیلی فوج پر چھوٹے سائز کے میزائل داغ رہا ہے۔

حزب اللہ حسن جیسے مجاہدین کی ایک چھوٹی سی جماعت ہے، اس کے 95 فیصد ارکان نے کسی فوجی اکیڈمی سے ٹریننگ حاصل نہیں کی، یہ لوگ حسن کی طرح نفرت اور ذلت کی آگ میں جلے' جل جل کر کمانڈر بنے اور انہوں نے اسرائیل اور اس کے حواریوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا، 1993ء میں امریکہ کے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے بین الاقوامی دہشت گرد تنظیموں کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی تھی، اس رپورٹ میں انکشاف ہوا حزب اللہ کے کل مجاہدین کی تعداد پانچ سے دس ہزار ہے اور ان میں صرف 300 سے 400 لڑاکا مجاہدین ہیں۔ 2003ء میں دہشت گردوں کے بارے میں سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے دوسری رپورٹ جاری کی تھی' اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا حزب اللہ کے کل مجاہدین کی تعداد تین ہزار سے زائد نہیں، جنوبی لبنان میں یہ لوگ صرف ایک ہزار ہیں اور ان میں بھی کل وقتی مجاہدین صرف 300 ہیں، رپورٹ میں انکشاف ہوا یہ لوگ کبھی کسی ریگولر آرمی کا حصہ

نہیں رہے اور ان کی اہلیت صرف ہلکے پھلکے ہتھیاروں تک محدود ہے، اب ہم ان دونوں رپورٹوں کو سامنے رکھ کر لبنان، فلسطین اور اسرائیل کی موجودہ جنگ کا تجزیہ کرتے ہیں، ہم فرض کرتے ہیں حزب اللہ کے مجاہدین کی تعداد دس ہزار ہے اور یہ دس ہزار نوجوان کسی ریگولر آرمی کا حصہ نہیں ہیں، ان کے پاس ٹینک ہیں، مشین گنیں ہیں اور نہ ہی ایٹم بم ہیں لیکن اس قلیل تعداد اور بے سروسامان نوجوانوں نے پچھلے 20 برس سے اس اسرائیل کا ناطقہ بند کر رکھا ہے جس کے پاس ایک لاکھ 75 ہزار ریگولر آرمی اور 4 لاکھ 30 ہزار ریزرو فوج ہے اور جس کا دفاعی بجٹ 11 بلین ڈالر ہے' اسرائیل کے پاس 3800 ٹینک' دس ہزار توپیں اور 2105 لڑاکا طیارے بھی ہیں لیکن یہ غیر تربیت یافتہ نوجوان اسرائیل کی انتہائی تربیت یافتہ فوج کو لے کر بیٹھ گئے ہیں' یہ غیر تربیت یافتہ نوجوان ایک حملے میں اسرائیل کے پچیس پچیس فوجی ہلاک کر دیتے ہیں اور اسرائیل ان دس ہزار نوجوانوں سے چھٹکارے کیلئے امریکہ سمیت دنیا کی دس بڑی طاقتوں سے مدد لینے پر مجبور ہے۔ یہ اس جنگ کا ایک پہلو ہے۔

آپ جنگ کا دوسرا پہلو بھی ملاحظہ کیجئے، اس وقت دنیا میں 61 اسلامی ممالک ہیں، ان 61 ممالک میں ایک ارب 47 کروڑ 62 لاکھ 33 ہزار 4 سو 70 مسلمان آباد ہیں اور ان 61 اسلامی ممالک میں سے 56 ملکوں کے پاس ریگولر فوجیں ہیں اگر ان 56 ممالک کی فوجوں کو ملایا جائے تو ان کی تعداد 66 لاکھ 76 ہزار 5 سو 60 فوجی ہو جاتی ہے، یہ 56 ممالک ہر سال اپنی فوجوں پر مجموعی طور پر 76 بلین 9 سو 50 ملین ڈالر خرچ کرتے ہیں، ان ممالک میں سعودی عرب کا دفاعی بجٹ 21 بلین 8 سو 76 ملین ڈالر ہے، ترکی کا عسکری بجٹ سوا دس بلین ڈالر، ایران کا پونے چھ بلین ڈالر، پاکستان کا ساڑھے تین بلین ڈالر، کویت کا سوا تین، ایتھوپیا کا سوا تین، الجیریا کا تین، مصر کا پونے تین اور مراکش، عمان اور قطر کا دو، دو بلین ڈالر ہے لیکن آپ انجام دیکھئے حزب اللہ کے تین سو سے دس ہزار مجاہدین نے اسرائیل اور امریکہ سمیت دنیا کی دس بڑی فوجوں کو بوکھلا کر رکھ دیا ہے جبکہ 66 لاکھ 76 ہزار 5 سو 60 فوجیوں اور دو سوا ایٹم بموں' ہزاروں میزائلوں، راکٹوں، ٹینکوں اور توپوں کے مالک 61 اسلامی ممالک اسرائیل کے سامنے دم سادھ کر بیٹھے ہیں، پورا یورپ اور امریکہ کھل کر اسرائیل کی حمایت کر رہا ہے، امریکہ سلامتی کونسل میں جنگ بندی کی قرارداد کو ویٹو کر چکا ہے، برطانیہ، فرانس، جرمنی اور روس اسرائیل کو حق بجانب قرار دے رہے ہیں، اسرائیل امریکی رائفلوں میں امریکی گولیاں بھر کر فلسطینی اور لبنانی مسلمانوں کو نشانہ بنا رہا ہے، پورے لبنان میں اس وقت نعشیں بکھری پڑی ہیں، لبنان کے پانچ شہروں کی 70 فیصد عمارتیں زمین بوس ہو چکی ہیں، بیروت میں پچھلے پانچ دنوں سے مسجدوں میں اذانیں نہیں ہوئیں اور لوگ بمباری کی وجہ سے مردوں کو کفن کے بغیر دفن کرنے پر مجبور ہیں لیکن پورا عالم اسلام اس ظلم پر خاموش ہے، کسی اسلامی ملک نے اب تک سرکاری سطح پر امریکہ اور اسرائیل کے خلاف کوئی بیان نہیں دیا اور کسی اسلامی ملک نے اپنی فوج بیروت بھجوانے کا فیصلہ نہیں کیا' حد ملاحظہ کیجئے اسرائیل کے جو طیارے لبنان اور فلسطین پر حملے کر رہے ہیں، اس کے جو ٹینک اور جو توپیں لبنان کے مسلمانوں پر بمباری کر رہی ہیں ان میں سعودی عرب اور امارات کا تیل استعمال ہو رہا ہے،

اسرائیل کو اس جنگ کیلئے جو بینک پیسے دے رہے ہیں ان بینکوں میں عربوں کے شیئرز ہیں، آپ حد ملاحظہ کیجئے اس وقت اسلامی دنیا میں 30 ہزار ملٹی نیشنل کمپنیاں کام کر رہی ہیں، ان 30 ہزار ملٹی نیشنل کمپنیوں میں سے 21 ہزار کمپنیوں کے مالک یہودی ہیں اور یہ تمام یہودی اس جنگ میں اسرائیل کو مالی امداد دے رہے ہیں لیکن کسی اسلامی ملک نے ان ملٹی نیشنل کمپنیوں کو ملک سے نکلنے کا حکم نہیں دیا' یہ اس جنگ کا دوسرا پہلو ہے۔

اس جنگ کا تیسرا پہلو اس سے بھی خوفناک ہے' پوری دنیا جانتی ہے چھ اسلامی ممالک امریکہ کے ٹارگٹ ہیں، یہ اسلامی ملک افغانستان، عراق، ایران، شام، پاکستان اور سعودی عرب ہیں، امریکہ افغانستان اور عراق کو نشانہ بنا چکا ہے' وہ اب اسرائیل کے ذریعے شام اور ایران کو نشانہ بنائے گا' اس کے بعد وہ بھارت کے ذریعے پاکستان پر حملہ کرے گا اور آخر میں وہ تیل کی قیمتوں کا بہانہ بنا کر سعودی عرب کو ٹارگٹ بنائے گا، پوری دنیا جانتی ہے امریکہ پہلے ڈاکٹر عبدالقدیر کو بنیاد بنا کر پاکستان کے ایٹمی پلانٹ پر قبضہ کرے گا اور اس کے بعد بھارت اسرائیل کے سٹائل میں پاکستان میں لشکر طیبہ کے ٹھکانوں پر بمباری شروع کر دے گا، پوری اسلامی دنیا جانتی ہے امریکہ دنیا میں تیل کی قلت اور تیل کی قیمتوں میں اضافے کو سعودی عرب کے خلاف جنگ کا جواز بنائے گا اور پوری اسلامی دنیا جانتی ہے لبنان کی یہ جنگ صرف بیروت تک محدود نہیں رہے گی' یہ جنگ ہر اس اسلامی ملک تک پھیل جائے گی جس میں ذرا سی بھی غیرت اور ایمان باقی ہوگا لیکن اس کے باوجود کوئی اسلامی ملک سر اٹھا کر نہیں دیکھ رہا، کوئی اسلامی ملک اس آگ کو واپس اسرائیل میں نہیں دھکیل رہا' 61 اسلامی ملک شتر مرغ کی طرح اپنی گردن ریت میں دبا کر بیٹھے ہیں۔ پوری دنیا جانتی ہے یہ جنگ کبھی نہ کبھی پاکستان ضرور پہنچے گی، عالم اسلام کو کبھی نہ کبھی اس مصلحت، اس خاموشی اور اس ناعاقبت اندیشی کی قیمت ادا کرنا پڑے گی' پوری دنیا جانتی ہے آج جو لوگ چٹان پر بیٹھ کر جس سیلاب کا نظارہ کر رہے ہیں وہ سیلاب کبھی نہ کبھی ان کی دہلیز تک بھی پہنچے گا اور جو لوگ جس آگ کو پرائے گھر کی آگ سمجھ رہے ہیں وہ آگ کبھی نہ کبھی ان کے گریبان بھی راکھ کرے گی' عجیب بات ہے 300 نوجوان پوری دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑے ہیں اور 67 لاکھ شتر مرغ ریت کے مورچے میں چھپے بیٹھے ہیں۔

سکھ فوج

رنجیت سنگھ سکھوں کی تاریخ کا پہلا حکمران تھا' وہ 13 نومبر 1780ء میں گوجرانوالہ میں پیدا ہوا' اس کا والد مہان سنگھ چھوٹی سی ''مثل'' کا سردار تھا' ان دنوں پنجاب میں جاگیریں اور چھوٹی سرداریاں مثل کہلاتی تھیں' رنجیت سنگھ پر بچپن میں چیچک کا حملہ ہوا اور وہ اس کی ایک آنکھ لے گئی' بارہ سال کی عمر میں وہ اپنی مثل کا سردار بن گیا' وہ ایک مہم جو انسان تھا' وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا' اس وقت لاہور پر تین سکھ سردار قابض تھے' رنجیت سنگھ نے لاہور کے مسلمانوں سے خفیہ رابطے قائم کئے' مسلمانوں نے اسے لاہور بلایا اور شہر اس کے حوالے کر دیا' اس نے سکھ سرداروں کو مار بھگایا اور لاہور پر قابض ہو گیا' اس وقت اس کی عمر صرف 19 برس تھی' 1802ء میں اس نے امرتسر پر بھی قبضہ کر لیا' 1806ء میں اس کا انگریزوں کے ساتھ پہلا معاہدہ ہوا جس کے بعد وہ وسطی' جنوبی اور شمالی پنجاب کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس نے چند ہی برسوں میں گجرات' ڈسکہ' سیالکوٹ' شیخوپورہ' جھنگ' چنیوٹ' خوشاب' ملتان' راولپنڈی' ڈیرہ اسماعیل خان' ہزارہ' پشاور اور کشمیر کو اپنی سلطنت کا حصہ بنا لیا' 1809ء میں انگریزوں نے اسے دریائے ستلج کے پار پنجاب کا حکمران مان لیا اور وہ پنجاب کا پہلا سکھ حکمران بن گیا۔

1831ء کا سال راجہ رنجیت سنگھ اور سکھ سرکار کی زندگی میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے' اس سال اکتوبر میں رنجیت سنگھ کی ہندوستان کے انگریز گورنر جنرل ولیم بینٹک سے ملاقات ہوئی' رنجیت سنگھ انگریزوں کی شان وشوکت دیکھ کر حیران رہ گیا' وہ بنیادی طور پر دہقان زادہ تھا اور اس نے کبھی سکول کا منہ نہیں دیکھا تھا' اس کی زندگی کا زیادہ تر حصہ گھوڑے کی پیٹھ پر گزرا تھا لہٰذا جب وہ گورنر جنرل ہاؤس میں داخل ہوا تو وہ انگریز کے کروفر سے مرعوب ہو گیا' رنجیت سنگھ کو محسوس ہوا ایک منظم اور طاقتور فوج کے بغیر مضبوط اور دیرپا حکمرانی ممکن نہیں چنانچہ اس نے تاریخ کی پہلی سکھ فوج بنانے کا فیصلہ کیا' اس نے چند ریٹائرڈ انگریز افسر ملازم رکھے اور انہیں ایک منظم فوج بنانے کی ذمہ داری سونپ دی' 1831ء تک ہندوستان میں پارٹ ٹائم فوجی ہوتے تھے' یہ لوگ پانچ ہزاری یا دس ہزاری کہلاتے تھے' یہ سرداروں اور جاگیرداروں کے قبضے میں ہوتے تھے' یہ لوگ زمانہ امن میں کھیتی باڑی اور تجارت کرتے تھے لیکن جب بادشاہ کو ضرورت پڑتی تھی تو یہ فوج کی شکل اختیار کر لیتے تھے' ہندوستان کی پہلی منظم فوج انگریز نے

تشکیل دی تھی رنجیت سنگھ نے انگریز کی پیروی میں سکھ فوج بنانے کا فیصلہ کیا' لاہور میں آج جس جگہ انجینئرنگ یونیورسٹی ہے وہاں اس زمانے میں ایک چھوٹا سا گاؤں "بدھو کا آوا" ہوتا تھا' رنجیت سنگھ نے یہ گاؤں فوج کے حوالے کر دیا' فوج نے اس جگہ پہلی چھاؤنی بنائی' رنجیت سنگھ نے شروع میں چار ہزار سکھ سپاہی بھرتی کئے' انگریز انسٹرکٹروں نے انہیں ٹریننگ دی اور اس کے بعد فوج میں اضافہ ہونے لگا' 1839ء میں جب رنجیت سنگھ کا انتقال ہوا تو سکھ فوج کی تعداد چالیس ہزار تک پہنچ چکی تھی اور اس کا ماہانہ خرچ چار لاکھ روپے تھا جبکہ اس کے پاس ایک لاکھ گھوڑے اور ایک ہلکا توپ خانہ بھی تھا۔ رنجیت سنگھ جب فوج تشکیل دے رہا تھا تو اس وقت تک اس کی سلطنت مضبوط ہو چکی تھی اور اسے کار سرکار چلانے کیلئے سول سروس یا بیورو کریسی کی ضرورت پیش آ رہی تھی' وہ ایک ان پڑھ اور نیم متمدن انسان تھا لہٰذا اس نے سول بیورو کریسی کا کام بھی فوج سے لینے کا فیصلہ کیا' اس نے مالیے کی وصولی' پولیس' لاء اینڈ آرڈر' پہرے داری' سفارت کاری حتیٰ کہ گردواروں کی حفاظت تک فوج کے حوالے کر دی' یہ رنجیت سنگھ کا وہ فیصلہ تھا جو آنے والے دنوں میں سکھ حکومت کے زوال کی وجہ بنا' رنجیت سنگھ کے دور ہی میں فوج کے اثر رسوخ میں اضافہ ہونے لگا تھا لیکن وہ ایک مضبوط اعصاب کا سمجھدار انسان تھا چنانچہ اس کی زندگی میں سکھ فوج اس کی تابعدار اور فرمانبردار رہی لیکن جوں ہی اس کا انتقال ہوا سکھ فوج شاہی تخت پر حاوی ہو گئی اور اس نے پنجاب کی سیاست اپنے ہاتھ میں لے لی۔

رنجیت سنگھ کے بعد اس کا بیٹا کھڑک سنگھ تخت نشین ہوا تو سکھ دو بڑے سیاسی گروپوں میں تقسیم ہو گئے' ایک گروپ ڈوگرا سکھوں پر مشتمل تھا جبکہ دوسرا سندھنانوالہ گروپ تھا' آپ اپنی سہولت کے لئے انہیں ڈ گروپ اور س گروپ کہہ سکتے ہیں۔ کھڑک سنگھ کا تعلق ڈ گروپ سے تھا جبکہ س گروپ کا صدر دھیان سنگھ تھا' دھیان سنگھ کھڑک سنگھ کا مخالف تھا' وہ فوج کے ساتھ مل گیا اور اس نے فوج کو اپنا آئینی کردار ادا کرنے پر ابھارنا شروع کر دیا' دھیان سنگھ کا کہنا تھا کھڑک سنگھ پنجاب کو انگریزوں کے ہاتھ فروخت کر دے گا اور انگریز آ کر سکھ فوج کو ختم کر دیں گے' فوج نے اپنا آئینی کردار ادا کیا' کھڑک سنگھ کو غدار ڈکلیئر کیا' اسے تخت سے اتارا اور اس کے بیٹے کیپٹن نونہال سنگھ کو بادشاہ بنا دیا' نونہال سنگھ لڑکپن میں فوج میں رہا تھا اور فوج اسے اپنا نمائندہ سمجھتی تھی' فوج نے نونہال سنگھ کی کابینہ تشکیل دی تھی اور یوں فوج کو کابینہ بنانے اور اپنے ناپسندیدہ لوگوں کو غدار ڈکلیئر کرنے کا اختیار مل گیا' بدقسمتی سے ایک سال بعد نونہال سنگھ حادثے میں مر گیا جس کے بعد اس کی بیوہ چاند کور تخت پر بیٹھ گئی' چاند کور سکھ سلطنت کی پہلی خاتون حکمران تھی' وہ ایک بااعتماد عورت تھی لہٰذا فوج جلد ہی اس سے "مایوس" ہو گئی' س گروپ کے سربراہ دھیان سنگھ نے ایک اور سازش تیار کی' اس نے رنجیت سنگھ کے دوسرے بیٹے شیر سنگھ کو ساتھ ملایا' ان دونوں نے چند جرنیلوں کو ہاتھ میں لیا' جرنیلوں نے فوج کو قائل کیا اور ستر ہزار فوجیوں نے لاہور کے قلعے پر حملہ کر دیا' چاند کور نے ہتھیار ڈال دیئے' فوج نے شیر سنگھ کو تخت پر بٹھا دیا' شیر سنگھ کو فوج نے حکمران بنایا تھا لہٰذا اس کے دور میں اقتدار عملاً فوج کے پاس تھا' بادشاہ کے تمام فیصلے اس کا ملٹری سیکرٹری کرتا تھا' لوگ انصاف' ٹھیکوں اور مک مکا کیلئے سیدھے "بدھو کا آوا" جاتے تھے' فوج کے پاس کسی بھی شخص کو

غدار قرار دے کر پھانسی دینے کا اختیار تھا اور فوج ایک مہر لگا کر کسی بھی تاجر یا ٹھیکیدار کو لاکھ پتی بنا سکتی تھی' شیر سنگھ کے دور میں فوج نے قلعے کے باہر تمام زمینوں پر قبضہ کر لیا اور وہ یہ زمینیں پٹے پر دینے لگی' فوج حکومت کی آمدنی سے نصف رقم بھی لیتی تھی جبکہ تمام سول محکموں کے سربراہ حاضر سروس فوجی بنا دیئے گئے' یہ افسر حکومت سے دوہری تنخواہ لیتے تھے۔

اس لوٹ کھسوٹ کے نتیجے میں عوام کی حالت پتلی ہوگئی' لاہور میں جلوس نکلنے لگے اور لوگ سرعام خودکشیاں کرنے لگے' دوسری طرف ڈ گروپ اور س گروپ اقتدار کیلئے ایک دوسرے کے ساتھ مسلسل لڑ رہے تھے' ڈ گروپ نے اس سیاسی ابتری کا فائدہ اٹھایا اور اس نے مہاراجہ شیر سنگھ اور دھیان سنگھ دونوں کو قتل کر دیا جس کے بدلے میں ہیرا سنگھ نے ڈ گروپ کا قتل عام شروع کر دیا' ڈ گروپ نے مزاحمت کی اور یوں ہیرا سنگھ کو فوج کی مدد لینا پڑ گئی' ہیرا سنگھ نے فوج کو یقین دلایا اگر وہ کامیاب ہو گیا تو وہ سپاہی کی تنخواہ نو سے بارہ روپے اور گھڑ سوار کی 25 سے 30 روپے کر دے گا' فوج نے ہیرا سنگھ کی حمایت میں ایک بار پھر لاہور پر حملہ کر دیا' لاہور کے شہریوں پر دو راتوں تک گولہ باری ہوتی رہی جس سے ہزاروں بے گناہ شہری مارے گئے' فوج نے لاہور پر قبضہ کیا' رنجیت سنگھ کے چھ سالہ بیٹے دلیپ سنگھ کو تخت پر بٹھایا اور ہیرا سنگھ کو اس کا وزیر بنا دیا' ہیرا سنگھ نے نہ صرف فوج کی مراعات اور تنخواہوں میں اضافہ کر دیا بلکہ اس نے فوج کو ہر قسم کے مالیے اور ٹیکسوں سے بھی آزاد کر دیا لیکن فوج جلد ہی ہیرا سنگھ سے بھی مایوس ہوگئی اور اس نے اسے قتل کر دیا' ہیرا سنگھ کی جگہ جواہر سنگھ کو وزیر بنایا گیا' جواہر سنگھ نے سارا خزانہ فوج کے حوالے کر دیا لیکن فوج کے مطالبات بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ یہ مطالبات پورے کرنا مشکل ہو گیا' جواہر سنگھ نے ہاتھ کھڑے کر دیئے' فوج نے اسے "بدھو کا آوا" طلب کیا اور اسے اس کی بہن جنداں کے سامنے قتل کر دیا' فوج نے جنداں کو نو سالہ بادشاہ دلیپ سنگھ کا سرپرست نامزد کر دیا۔

اس وقت تک سکھ سلطنت بری طرح دیوالیہ ہو چکی تھی' پنجاب میں بے روزگاری' مہنگائی' کرپشن' جرائم اور بدامنی آسمان کو چھو رہی تھی' لوگ بھوکے مر رہے تھے جبکہ فوج بدھو کے آوا میں عیش کر رہی تھی' لاہور شہر سے باہر فوجی افسروں کے بڑے بڑے محل اور فارم ہاؤس تھے' حالت یہ تھی فوج کا ایک درمیانے درجے کا افسر اٹھتا تھا' شہر میں داخل ہوتا تھا اور جس دکان' جس گھر سے جو چیز چاہتا تھا گھوڑے پر لاد کر واپس چلا جاتا تھا اور کسی کو اسے روکنے کی جرأت نہ ہوتی تھی' جنداں بی بی ایک سمجھدار اور معاملہ فہم عورت تھی' اس نے اس صورتحال کا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا' اس نے سکھ فوج کو انگریز فوج سے لڑانے کا منصوبہ بنایا۔ اس نے فوری طور پر دو کام کئے' ایک اس نے انگریز کو پنجاب پر حملے پر اکسایا اور دو اس نے سکھ فوج کے جوانوں میں جذبہ حب الوطنی پیدا کرنا شروع کر دیا' اس نے انہیں باور کرا دیا دنیا میں سکھ جوان سے زیادہ جرأت مند اور بہادر کوئی نہیں' جنداں بی بی کی کوشش کامیاب ہوئی اور سکھ جوان سینہ ٹھونک کر انگریز فوج کے سامنے کھڑے ہوگئے' سکھ جرنیل انگریز فوج کی طاقت اور اپنی کمزوریوں سے واقف تھے لہٰذا انہوں نے لڑائی سے بچنے کی بڑی کوشش کی لیکن جنداں بی بی نے فوج میں خبر پھیلا دی کہ ہمارے جرنیل لڑنا نہیں چاہتے' جوانوں نے جرنیلوں پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا لہٰذا جرنیل بری طرح اندرونی اور بیرونی دباؤ کا شکار ہو گئے یوں 1849ء میں سکھ جرنیلوں کو مجبوراً انگریز کے خلاف میدان میں اترنا پڑ گیا' جنگ

شروع ہوئی تو پہلے ہی حملے میں سکھ فوج کے 8 ہزار جوان مارے گئے' اس مشکل وقت میں فوج نے عوام سے مدد مانگی لیکن لوگوں نے فوج کے ساتھ لڑنے سے انکار کر دیا' اگلے دن سکھ جرنیلوں نے ہتھیار پھینکے اور میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے' جنداں بی بی نے لاہور انگریزوں کے لئے کھول دیا' انگریز آئے اور سکھوں کی پہلی اور شاید آخری سلطنت تاریخ کا حصہ بن گئی' اس شکست کے بعد فوج کا لفظ سکھوں میں تحقیر کا نشانہ بن گیا' یہ سلسلہ آج تک جاری ہے' آج بھی جب دو تین سکھ اکٹھے ہو کر کسی جگہ جاتے ہیں تو دیکھنے والے ان سے پوچھتے ہیں "اے فوجاں کتھوں آیاں نے" (یہ فوجیں کہاں سے آئی ہیں) یا "اے فوجاں کتھے جا رئیں نے" (یہ فوجیں کہاں جا رہی ہیں)" اور وہ ہنس کو جواب دیتے ہیں "فوجاں لہوروں آیاں نے" جبکہ ڈیڑھ سو سال گزرنے کے باوجود آج بھی جب کوئی سکھ سینہ تان کر کھڑا ہوتا ہے تو دوسرا سکھ اسے کہتا ہے "میں بلاواں جنداں نوں" (میں جنداں کو بلاؤں) اور وہ سکھ شرما کر سینہ اندر کر لیتا ہے۔

نوٹ: "یہ محض ایک تاریخی واقعہ ہے' اس کا موجودہ سیاسی اور فوجی حالات سے کوئی تعلق نہیں۔"

دفاع

سعودی عرب کے ایک اخبار نے چند روز پہلے دنیا کے 25 ایسے ممالک کی فہرست جاری کی جن میں فوج نہیں' یہ ممالک امریکہ' آسٹریلیا' نیوزی لینڈ اور یورپ کے قرب و جوار میں واقع ہیں اور یہ چھوٹے چھوٹے جزائر پر مشتمل ہیں' ان ممالک میں انڈورا' بارباڈوس' کوسٹاریکا' ڈومینیکن' گرینڈا' ہیٹی' آئس لینڈ' کیریباتی' ملکٹن شین' جزائر مارشل' ماریشس' مائیکرونیشیا' موناکو' پیلاؤ' پانامہ' توالو' سان مارینو' سا موآ' سولومن جزائر' سینٹ ونسنٹ اینڈ گرینا ڈائن' سینٹ کٹس' سینٹ لوشیا' ناورو' ویٹی کن اور وناؤٹو شامل ہیں۔ میں نے یہ خبر پڑھی تو میں نے ان 25 ممالک کا ڈیٹا جمع کیا اور پڑھنا شروع کر دیا' میں ان ممالک کی ان خوبیوں کا جائزہ لینا چاہتا تھا جن کے باعث یہ نہ صرف فوج کے بغیر اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہیں بلکہ یہ ترقی بھی کر رہے ہیں' مجھے معلوم ہوا یہ تمام ممالک رقبے' آبادی اور وسائل میں انتہائی چھوٹے ہیں لیکن ان ممالک نے چھوٹا ہونے کے باوجود دنیا میں بعض ایسے اعزاز حاصل کئے ہیں جن سے بڑی بڑی مملکتیں اور قومیں بھی محروم ہیں مثلاً آپ ہیٹی کو لیجئے' ہیٹی دنیا کی قدیم ترین جمہوریہ ہے' ہیٹی میں 1804ء میں پارلیمنٹ بنی اور یہ پارلیمنٹ آج تک چل رہی ہے' ڈومینیکن 1844ء کو آزاد ہوا' وہاں اب تک سو صدر آ چکے ہیں' یہ تمام صدر جمہوری طریقے سے آئے اور جمہوری طریقے سے رخصت ہوئے' کوسٹاریکا 1825ء میں آزاد ہوا' وہ 1945ء تک خانہ جنگیوں' مارشل لاؤں اور سیاسی ابتری کا شکار رہا' اس نے 1946ء میں فوج ختم کر دی اور تمام شہریوں کیلئے تعلیم مفت اور لازمی قرار دے دی' اس اقدام کے نتیجے میں کوسٹاریکا کو لاطینی امریکہ کے سب سے بڑے جمہوری ملک کا اعزاز حاصل ہو گیا' بارباڈوس 1966ء میں آزاد ہوا اور اس کے تمام صدور جمہوری طریقے سے آٹھ آٹھ دس دس سال اقتدار میں رہے اور وہاں آج تک کسی نے کسی کے اقتدار پر شب خون نہیں مارا' اینڈورا فرانس اور سپین کے درمیان واقع ہے اس ملک کی آبادی 67 ہزار ہے لیکن یہاں ہر سال ایک کروڑ سیاح آتے ہیں' آئس لینڈ میں یورپ کی پہلی پارلیمنٹ بنی تھی' آئس لینڈ کے لوگ اسے آلتھنگ کہتے ہیں اور یہ 930ء میں بنی تھی' اس ملک میں 1980ء میں دنیا کی پہلی خاتون صدر منتخب ہوئی تھی' اس کا نام مزوگرس فن بوگا ودتر تھا اور یہ مسلسل چار مرتبہ آئس لینڈ کی صدر رہی' کیریباتی 33 جزیروں کا

مجموعہ ہے' یہ 1979ء میں آزاد ہوا اور اس کے عوام نے 29 سال کے ایک نوجوان جرمیاح بتائی کو صدر منتخب کیا' یہ دنیا کا کم عمر ترین صدر تھا اور یہ مسلسل بارہ سال تک اقتدار میں رہا' لیکٹن سٹین آسٹریا اور سوئٹزر لینڈ کے درمیان واقع ہے یہ 1866ء میں آزاد ہوا اور اس نے 1868ء میں فوج ختم کر دی' یہ دنیا میں فوج ختم کرنے والا پہلا ملک تھا' اس نے 1978ء میں یورپ کا کم عمر ترین وزیراعظم منتخب کیا' اس وزیراعظم کا نام برن ہربٹ تھا اور انتخاب کے وقت اس کی عمر صرف 22 برس تھی' 1993ء میں اس سے بھی کم عمر شخص ڈاکٹر ماریو فرک کو وزیراعظم بنا دیا گیا' ڈاکٹر ماریو کی عمر 28 برس تھی' 2000ء میں لیکٹن سٹین کے عوام کا معیار زندگی یورپ کے تمام ممالک میں بلند ترین تھا' 2000ء میں پورے ملک میں کوئی غریب شخص نہیں تھا۔ جزائر مارشل 1991ء میں آزاد ہوا' اس میں 24 ہوائی اڈے ہیں' اس نے 1983ء میں امریکہ پر جوہری آلودگی پھیلانے کا الزام لگایا اور امریکہ سے 183 ملین ڈالر ہرجانہ وصول کیا' یہ امریکہ سے ہرجانہ وصول کرنے والا پہلا ملک تھا' ماریشس 1968ء میں آزاد ہوا اور اس کے وزیراعظم سر سیو وساگر رام غلام مسلسل 18 برس تک وزیراعظم منتخب ہوتے رہے وہ 1986ء میں دنیا میں لمبی مدت تک اقتدار میں رہنے والے وزیراعظم تھے' اسے تیسری دنیا میں سب سے زیادہ سیاح حاصل کرنے اور دنیا کی تیسری بڑی کمپنی بنانے کا اعزاز حاصل ہے۔ مائیکرونیشیا 1991ء میں آزاد ہوا اور اس میں لوگوں نے آج تک کوئی درخت نہیں کٹنے دیا لہٰذا یہاں سب سے زیادہ بارشیں ہوتی ہیں' موناکو دنیا کا دوسرا چھوٹا ملک ہے' اسے دولت مند عاشقوں کی جنت کہا جاتا ہے' یہ دنیا کا سب سے گنجان آباد ملک بھی ہے اس کے ایک مربع کلومیٹر میں 15 ہزار 3 سو 21 لوگ رہتے ہیں اور یہ ملک صرف سیاحوں کے ذریعے اتنی دولت کما لیتا ہے جتنی ہر سال جاپان گاڑیوں کی فروخت سے حاصل کرتا ہے' پہلاؤ 1994ء میں آزاد ہوا اور یہ دنیا کا واحد ملک ہے جس میں جج تاحیات بھرتی ہوتے ہیں' یہ ملک پورے امریکہ اور لاطینی امریکہ کو سبزیاں فراہم کرتا ہے' پانامہ 1903ء میں آزاد ہوا' یہ ملک بھی شدید مارشل لاؤں اور خانہ جنگیوں کا شکار رہا لہٰذا 1994ء میں اس کی پارلیمنٹ نے فوج ختم کر دی' اس ملک میں 51 میل لمبی نہر ہے یہ نہر بحر اوقیانوس کو بحر الکاہل سے ملاتی ہے' پانامہ اس نہر سے ہر سال 9 بلین ڈالر کماتا ہے' تو الو 1978ء میں آزاد ہوا اور اس نے سیاحت کو انڈسٹری بنا لیا لہٰذا اس کے عوام خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ سان مارینو 1631ء میں آزاد ہوا' اس نے انگور' مویشی' ڈاک ٹکٹ اور سرامکس کو ذریعہ روزگار بنایا اور کمال کر دیا' اس ملک میں چھ ماہ کیلئے صدر کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ساموآ 1962ء میں آزاد ہوا' اس کے 4 ہزار کارکنوں نے مسلسل 90 دن تک ہڑتال کر کے دنیا میں ریکارڈ قائم کر دیا' سولومن جزائر 1978ء میں آزاد ہوئے اور انہوں نے ناریل' سیاحت اور مچھلی کی پیکنگ سے کمال کر دیا' اس میں لاطینی امریکہ کی پہلی بین الاقوامی یونیورسٹی بھی قائم ہوئی' سینٹ کٹس نے نمک کو صنعت بنا لیا' سینٹ لوشیا نے بجلی کے پرزوں کی مارکیٹ ہاتھ میں لے لی' ان کے ایک شاعر ڈیرک والکوٹ نے 1992ء میں نوبل پرائز بھی حاصل کیا۔ ناورو کے پاس دنیا کی سب سے چھوٹی جمہوریہ کا ٹائٹل ہے اور اس نے فاسفیٹ کی کھاد سے پورے ملک کے لوگوں کو خوشحال بنا دیا'

آج اس ملک میں کوئی غریب شخص موجود نہیں' اس ملک نے 1993ء میں ماحولیاتی آلودگی پھیلانے پر آسٹریلیا سے 73 ملین ڈالر ہرجانہ بھی لیا تھا' وناؤٹو نے ناریل کو صنعت بنایا اور اس صنعت کی وجہ اس کے لوگ خوشحال زندگی گزار رہے ہیں' ویٹی کن 1929ء کو آزاد ہوا اور اس نے امن کو ریاست کی بنیاد قرار دیا اور سینٹ وِنسنٹ اینڈ گرینا ڈائن نے سیاحوں کی توجہ کو ذریعہ روزگار بنا لیا لہٰذا اس کے عوام بھی اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔

میں نے جب ان ممالک کے حالات کا جائزہ لیا تو مجھے محسوس ہوا ان ممالک نے رقبے' آبادی اور وسائل کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دیا' انہوں نے محدود وسائل میں رہ کر اپنے لئے ترقی' خوشحالی اور عزت کا راستہ نکال لیا' یہ حقیقت ہے ان تمام ممالک میں فوج نہیں لیکن ان سب ملکوں میں عدالتیں' سکول اور ہسپتال موجود ہیں اور ان ملکوں کا تعلیم' صحت اور انصاف کا نظام انتہائی مضبوط ہے' ان میں 13 ممالک ایسے ہیں جن میں مقدمے کی سماعت کی زیادہ سے زیادہ مدت ایک ماہ ہے' ایک ملک میں ججوں کی تقرری تاحیات ہوتی ہے اور دو ملکوں میں ججوں کے پاس پولیس اور پولیس کے پاس ججوں کے اختیارات ہیں ان تمام ممالک میں تعلیم مفت اور لازمی ہے اور ان تمام ملکوں میں عوام کو صحت کی انتہائی جدید اور یکساں سہولتیں حاصل ہیں' ان تمام ممالک میں میڈیا مکمل طور پر آزاد اور لوگوں کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہے' ان 25 ممالک میں سے 9 ملکوں میں پچھلے دس سال میں قتل اور ڈکیتی کی کوئی واردات نہیں ہوئی اور دو ملکوں میں پچھلے تین برسوں سے کوئی رپورٹ درج نہیں ہوئی' موناکو کی ٹریفک پولیس کو دنیا کی بہترین ٹریفک پولیس کا اعزاز حاصل ہے' آئس لینڈ کے ہسپتالوں کو دنیا کے صاف ترین ہسپتالوں کا ٹائٹل دیا گیا اور سینٹ لوشیا کے طالب علموں کو بہترین آئی کیو لیول کا ایوارڈ ملا لہٰذا جب میں نے ان ممالک کا پروفائل پڑھا تو مجھے محسوس ہوا فوجوں کے بغیر بھی ملک قائم رہ سکتے ہیں لیکن عدالتوں' سکولوں اور ہسپتالوں کے بغیر کوئی ملک قائم نہیں رہ سکتا مجھے محسوس ہوا ملک اسلحے اور جوانوں کے بغیر بھی خوشحال ہو سکتے ہیں لیکن دنیا کا کوئی ملک دواء' کتاب اور انصاف کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا' مجھے محسوس ہوا عدالتیں ملکوں کا سب سے بڑا دفاع' سکول سب سے بڑی فوج اور ہسپتال سب سے مضبوط قلعہ ہوتے ہیں اور جن ملکوں کے پاس یہ قلعے' یہ فوجیں اور دفاع کی یہ قوت ہوتی ہے ان ملکوں کو دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی وہ ملک کسی میدان میں ہار نہیں مانتے۔

بھارت صرف 653 عہدوں کی قربانی دے دے

بریگیڈیئر لال شنکر اور بریگیڈیئر رمیش کمار ورما آرمی ہیڈ کوارٹر کولکتہ میں تعینات تھے' وہ بھارتی فوج کے خفیہ اسلحہ خانہ کے انچارج تھے' یہ اسلحہ خانہ بھارتی حکومت نے ''بیک اپ'' کے لئے بنا رکھا ہے اور وہ اس میں دنیا جہاں سے جدید اسلحہ منگوا کر سٹور کرتی رہتی ہے' بھارتی حکومت نے ستمبر میں روس اور اسرائیل سے جدید رائفلیں منگوائیں' یہ رائفلیں دس اکتوبر 2006ء کو کولکتہ پہنچیں' بریگیڈیئرز نے اپنی نگرانی میں یہ اسلحہ بحری جہاز سے اتروایا لیکن کالی کٹ کی بندرگاہ اور اسلحہ خانہ کے راستے میں رائفلوں کی چند پیٹیاں غائب ہو گئیں' حکومتی تخمینے کے مطابق ان پیٹیوں کی مالیت ساڑھے تین کروڑ روپے تھی' بھارت کے ''جی ایچ کیو'' نے اس ہیرا پھیری کا شدید نوٹس لیا' تفتیش شروع ہوئی تو دونوں بریگیڈیئر مجرم نکل آئے' جس کے نتیجے میں بھارتی وزارت دفاع نے بریگیڈیئرز کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ اس حکم کی تعمیل میں 14 اکتوبر 2006ء کو بریگیڈیئر لال شنکر اور بریگیڈیئر رمیش کمار کو گرفتار کر لیا گیا۔

بھارتی فوج کے ان بریگیڈیئروں کی گرفتاری کوئی نیا واقعہ نہیں' بھارت میں آئے روز اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے ہیں' ہر مہینے بھارتی فوج کے دس سے بیس اعلیٰ افسر کرپشن میں ملوث پائے جاتے ہیں' گرفتار ہوتے ہیں اور پوری دنیا میں بھارتی فوج کی بے عزتی اور ہزیمت کا باعث بنتے ہیں' میں نے پچھلے دنوں ایک بھارتی اخبار میں ایک میجر کی خبر پڑھی تھی' یہ میجر صاحب فوجی ''کوٹے'' کی شراب سمگل کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے' اسی طرح بھارت کی پنجاب رجمنٹ کے ایک میجر صاحب ملٹری ہسپتال کی دوائیں فروخت کرتے ہوئے دھر لئے گئے جبکہ بھارت کی چھاؤنیوں میں سائیکل اور موٹر سائیکلوں کی چوری عام سی بات ہو چکی ہے' اس قسم کی وارداتوں میں بھی عموماً بڑے افسر ملوث ہوتے ہیں' آپ کو یاد ہو گا اٹل بہاری واجپائی کے دور میں تہلکہ سکینڈل سامنے آیا تھا' اس سکینڈل میں بھارتی فوج کے ایک میجر جنرل کو 25 ہزار روپے رشوت لیتے ہوئے دکھایا گیا تھا جبکہ راجیو گاندھی کے دور میں بوفورس سکینڈل آیا تھا' اس سکینڈل میں کل تین کروڑ روپے کمیشن لی گئی تھی' یہ رقم بعد ازاں ایک سو چار سیاستدانوں اور فوجی افسروں نے آپس میں تقسیم کی تھی لہٰذا اسلحہ کی چوری ہو' شراب کی سمگلنگ یا

پھر توپوں کے سودے میں کمیشن یہ واقعات بھارتی فوج کی غربت' ناداری اور مسکینی ظاہر کرتے ہیں' یہ واقعات ثابت کرتے ہیں بھارتی فوج کے افسروں کی تنخواہیں کم ہیں اور ان بے چاروں کیلئے اتنی تنخواہوں میں "لیونگ سٹینڈرڈ" برقرار رکھنا مشکل ہے چنانچہ وہ لوگ کبھی شراب سمگل کرنے' کبھی اسلحہ بیچنے' کبھی سائیکل چوری کرنے اور کبھی پچیس تیس ہزار روپے رشوت لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

میں جب بھی اس قسم کی خبریں پڑھتا ہوں تو مجھے بھارتی حکومت کی بے وقوفی پر افسوس ہوتا ہے اور میں سوچتا ہوں اگر بھارتی حکومت نے ذرا سی عقلمندی کا مظاہرہ کیا ہوتا' اگر وہ ہماری طرح اپنی صرف 653 نقد آور پوسٹیں ریٹائر اور حاضر سروس فوجی افسروں کے حوالے کر دیتی تو آج بھارتی فوج میں ایسے سنگین اور افسوس ناک واقعات پیش نہ آتے اور آج یوں بھارتی فوج کا وقار اور عزت مٹی میں نہ ملتی' مجھے بھارتی حکومت کی بے وقوفی پر افسوس ہوتا ہے اور میں اکثر سوچتا ہوں اگر بھارتی حکومت بھارتی فوج کے افسروں کو امریکہ' تاجکستان' متحدہ عرب امارات' سعودی عرب' تھائی لینڈ' یوکرائن' برازیل' انڈونیشیا اور بحرین میں سفیر لگا دیتی' اگر وہ ریٹائر فوجی افسروں کو وفاقی یونیورسٹی' بھارتی پنجاب کی انجینئرنگ یونیورسٹی اور چندی گڑھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر لگا دیتی' اگر وہ فوجی افسروں کو فیڈرل پبلک سروس کمیشن کا چیئرمین بنا دیتی' اگر وہ فوجی افسروں کو بھارتی پنجاب کے پبلک سروس کمیشن کا چیئرمین لگا دیتی' اگر بھارتی حکومت کسی میجر جنرل کو انڈین ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی کی چیئرمین شپ دے دیتی اور کسی کرنل کو ڈائریکٹر ایڈمن اور ڈائریکٹر انفورسمنٹ بنا دیتی' اگر وہ تین بریگیڈیئرز کو نیشنل کمیونیکیشن سکیورٹی بورڈ کا سیکرٹری' ایڈیشنل سیکرٹری' جوائنٹ سیکرٹری اور کسی کرنل کو ڈپٹی سیکرٹری بنا دیتی' اگر وہ کسی ریٹائر کرنل کو پرنٹنگ کارپوریشن کا ایم ڈی' کسی بریگیڈیئر کو ڈیپارٹمنٹ آف کمیونیکیشن سکیورٹی کا ایڈیشنل ڈی جی' کسی بریگیڈیئر کو نیشنل کمیشن فار ہیومن ڈویلپمنٹ اور کسی میجر جنرل کو نیشنل ری کنسٹرکشن بیورو کا ممبر بنا دیتی' اگر وہ بھارتی فوج کے حاضر اور ریٹائر افسروں کو ایکسپورٹ پروموشن بیورو' بھارتی پورٹ اتھارٹی' ممبئی پورٹ ٹرسٹ' انڈین میرین اکیڈمی' نیشنل شپنگ کارپوریشن' نیشنل ہائی وے اتھارٹی' موٹر وے پولیس' کلکتہ پورٹ اتھارٹی' انڈین ریلوے' انڈین سپورٹس بورڈ' ڈیفنس ڈویژن' منسٹری آف ڈیفنس' ائیر پورٹ سکیورٹی فورس' انڈین آرمڈ سروسز بورڈ' ممبئی شپ یارڈ' سروے آف انڈیا' ائیر انڈیا' سول ایوی ایشن اتھارٹی' انڈین آرڈیننس فیکٹریز' ملٹری لینڈز اینڈ کنٹونمنٹ ڈیپارٹمنٹ' ڈیفنس پروڈکشن ڈویژن' وزارت تعلیم' اسٹیبلشمنٹ ڈویژن' فنانس ڈویژن' منسٹری آف فوڈ اینڈ ایگریکلچر' منسٹری آف ہاؤسنگ اینڈ ورکس' منسٹری آف انڈسٹریز اینڈ پروڈکشن' انڈین سٹیل ملز' یوٹیلٹی سٹورز کارپوریشن' منسٹری آف انفارمیشن' ٹیلی کام ڈویژن' این آر ٹی سی' انڈین ٹیلی کمیونیکیشن لمیٹڈ' نیشنل ٹریننگ بیورو' کیپیٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی اور انڈین رینجرز کی چیئرمین شپ' سیکرٹری شپ' ڈائریکٹر جنرل شپ' مینجنگ ڈائریکٹر شپ اور ممبر شپ دے دیتی' اگر بھارتی حکومت بھارتی فوج کے ریٹائر جرنیلوں' بریگیڈیئرز' کرنلز' میجرز اور کیپٹنز کو کلچر' سپورٹس اور ٹورازم' اویکیو پراپرٹی ٹرسٹ بورڈ' نارکوٹیکس کنٹرول بورڈ' اینٹی نارکوٹیکس کنٹرول فورس' افغان

رفیوجیز آرگنائزیشن‘ منسٹری آف پٹرولیم اینڈ نیچرل ری سورسز‘ انڈین منرل ڈویلپمنٹ اتھارٹی‘ نیشنل لاجسٹک سیل‘ ایس اینڈ ٹی آرڈویژن‘ منسٹری آف واٹر اینڈ پاور‘ منسٹری آف وومن ڈویلپمنٹ‘ سپیشل ایجوکیشن اور انڈین بیت المال کی سربراہی دے دیتی اور اگر بھارتی حکومت کسی ریٹائر میجر کو بھارتی پنجاب کا آئی جی لگا دیتی تو آج بھارت سرکار اور بھارتی فوج کی یہ صورتحال نہ ہوتی‘ آج بریگیڈیئر لال شنکر اور بریگیڈیئر رمیش کمار ورما جیسے شاندار افسروں کو اسلحہ چوری نہ کرنا پڑتا اور آج پوری دنیا بھارتی حکومت پر نہ ہنس رہی ہوتی۔

مجھے پچھلے دنوں ٹرانس پیرنسی انٹرنیشنل کی رپورٹ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا‘ اس رپورٹ میں انکشاف ہوا بھارت رشوت دینے والے کرپٹ ترین ممالک میں دوسرے نمبر پر پہنچ گیا ہے‘ میرا خیال ہے بھارت کو یہ دن بھی فوج کو سول محکموں سے دور رکھنے کی وجہ سے دیکھنا پڑا‘ اگر بھارتی حکومت نے ہماری طرح اپنے سول محکمے فوج کیلئے کھول دیئے ہوتے تو آج نہ صرف اس کے 76 ریٹائر جنرل‘ سو بریگیڈیئرز‘ 181 کرنل‘ 209 میجر اور 87 کیپٹن برسر روزگار ہوتے بلکہ بھارتی فوج کی کارکردگی اور مورال بھی بہت بلند ہوتا‘ میں جب بھی اس قسم کی خبریں پڑھتا ہوں تو میں سوچتا ہوں کاش میں بھارت میں ہوتا تو میں بھارتی حکومت کو تین مفید مشورے دے سکتا‘ میں اس سے درخواست کرتا وہ ملک کی 653 سول پوسٹوں پر فوجی افسر تعینات کر دے‘ وہ یہ قانون پاس کر دے آئندہ بھارتی فوج سے جو بھی افسر ریٹائر ہوگا اسے سول محکمے میں چار گنا زیادہ تنخواہ پر بھرتی کر لیا جائے گا اور وہ تا مرگ پنشن بھی وصول کرے گا اور تنخواہ بھی اور میں بھارتی حکومت کو مشورہ دیتا وہ ملک میں ارب پتیوں کی ایک نئی کلاس پیدا کرنے کیلئے اپنے 13 بڑے شہروں میں ڈیفنس ہاؤسنگ سکیمیں شروع کر دے‘ میں بھارتی حکومت کو سمجھاتا سول محکموں میں 653 ریٹائر فوجی افسر تعینات کرنے سے نہ صرف بھارتی فوج کرپشن سے پاک ہو جائے گی بلکہ ملکی معیشت بھی بہتر ہوگی‘ اس سے جنگ کا خطرہ بھی ٹل جائے گا اور ملک بھی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سیاست سے پاک ہو جائے گا۔

جاپان اب ترقی کر کے دکھائے

ہیڈکی ٹوجو (Hideki Tojo) چار ستارہ جنرل تھا' وہ 1940ء میں جاپان کا چیف آف آرمی سٹاف بنا' وہ جاپان کا سکندر اعظم بننا چاہتا تھا' جنرل ٹوجو نے فوج کی عنان سنبھالنے کے بعد ملک میں بڑی سطح پر اسلحہ سازی اور فوجی بھرتیاں شروع کر دیں' اس نے جاپانی فوج میں دنیا کا پہلا خودکش دستہ بھی تیار کیا' ہیرو ہیٹو اس وقت جاپان کے شہنشاہ تھے' وہ دھیمے مزاج کے بردبار شخص تھے' وہ جنرل ٹوجو کی پالیسیوں سے اتفاق نہیں کرتے تھے لیکن جنرل ٹوجو نے 1941ء میں شہنشاہ کو مارشل لاء کی دھمکی دی اور اس دھمکی کی بنیاد پر خود کو جاپان کا وزیراعظم منتخب کرا لیا یوں وہ تاریخ کا پہلا باوردی وزیراعظم بن گیا۔ یہ جنگ عظیم دوم کا زمانہ تھا اس وقت تک امریکہ اس جنگ سے علیحدہ تھا' امریکی صدر روز ویلٹ نے نہ صرف غیر جانبداری کا اعلان کر رکھا تھا بلکہ وہ نازیوں اور اتحادیوں کے درمیان صلح کی کوشش بھی کر رہے تھے' جنرل ٹوجو نے ایک عجیب جنگی منصوبہ بنایا' اس نے 7 دسمبر 1941ء کو اچانک پرل ہاربر پر حملہ کر دیا' اس حملے میں امریکی نیوی کو شدید نقصان پہنچا' جنرل ٹوجو کے اس اقدام کے نتیجے میں امریکہ اور جاپان بھی دوسری جنگ عظیم کا حصہ بن گئے' دنیا اس وقت تک جاپان کی جنگی تیاری اور جاپانی جرنیلوں کی طالع آزمائی سے واقف نہیں تھی لہٰذا جب جنرل ٹوجو کی فوجوں نے حملے شروع کئے تو اس نے چند ہی ماہ میں کوریا' چین' ملایا' سنگاپور' ہند چینی' تھائی لینڈ' برما' ولندیزی جزائر' فلپائن اور بحر الکاہل کے جزائر فتح کر لئے' جنرل ٹوجو اس کامیابی پر پھولے نہیں سما رہا تھا لیکن شہنشاہ ہیرو ہیٹو ان کامیابیوں پر بہت متفکر تھا' شہنشاہ نے جنرل ٹوجو کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن بندوق کی نالی سے سوچنے والے لوگ آسانی سے نہیں سمجھا کرتے لہٰذا جنرل ٹوجو آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ 1944ء میں جاپان کی معیشت پر جنگ کے اثرات ظاہر ہونے لگے جاپان شدید کساد بازاری' بے روزگاری اور قلت کا شکار ہو گیا اور لوگ دوا کی ایک گولی اور ایک ڈبل روٹی کے لئے ترسنے لگے' جاپانی شہنشاہ ہیرو ہیٹو نے اس صورتحال کا فائدہ اٹھایا اور انہوں نے 18 جولائی 1944ء کو جنرل ٹوجو سے استعفیٰ لے لیا' جنرل ٹوجو نے استعفیٰ دے دیا لیکن وہ جاتے جاتے فوج کو یہ پیغام دے گیا' "ہم دنیا کی بہترین فوج ہیں لیکن ہمارا شہنشاہ ہمیں بزدلی کی موت مارنا چاہتا ہے" 22 جولائی 1944ء کو جنرل کوینا کی کوئی سو

(Kuniaki koiso) جنرل ٹوجو کی جگہ سپہ سالار بن گیا‘ شہنشاہ نے اسے جنگ بندی کا ٹاسک دیا لیکن اس نے بھی جنگ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا‘ اس کا کہنا تھا ہم آخری گولی اور آخری سپاہی تک لڑیں گے لہٰذا جاپان جنگ میں آگے بڑھتا رہا۔

1945ء کے شروع میں جرمنی پسپائی اختیار کرنے لگا جس کے بعد شہنشاہ ہیرو ہیٹو کو جنگ کا نتیجہ صاف دکھائی دینے لگا لیکن جاپانی فوج مسلسل فاتح عالم بننے کا خواب دیکھ رہی تھی‘ مارچ کے آخر میں جب اتحادیوں نے جرمنی کا محاصرہ کیا اور ہٹلر کسی نامعلوم مقام پر منتقل ہو گیا تو شہنشاہ ہیرو ہیٹو نے جنگ بندی کا فیصلہ کیا‘ فوج نے یہ فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا‘ جنرل کوئی سو اور شہنشاہ کے درمیان طویل ڈائیلاگ ہوا جس کے آخر میں شہنشاہ نے جنرل کوئی سو سے بھی استعفیٰ لے لیا‘ 7 اپریل 1945ء کو جنرل کانتارو سوزوکی جاپانی فوج کا نیا سپہ سالار بنا‘ جنرل نے فوج کی کمان سنبھالنے سے پہلے شہنشاہ سے جنگ بندی کا وعدہ کیا لیکن جوں ہی اس کے کندھے پر سپہ سالار کے ستارے لگے جنرل وعدے سے مکر گیا‘ اس کا کہنا تھا‘ ہم نیویارک پر جھنڈا لہرائے بغیر جنگ بندی کا اعلان نہیں کریں گے‘ دوسری طرف ہیرو ہیٹو کا کہنا تھا‘ اتحادی جرمنی سے فارغ ہونے کے بعد مشترکہ طور پر جاپان پر حملہ کریں گے اور اس کے بعد فوج بچے گی اور نہ ہی جاپان‘ جنرل سوزوکی نے شہنشاہ کے خیالات کو قہقہوں میں اڑا دیا۔ 30 اپریل 1945ء کو ہٹلر نے خودکشی کر لی اور 8 مئی کو جرمنی نے اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے‘ شہنشاہ ہیرو ہیٹو نے جنرل سوزوکی کو آخری بار بلا کر سمجھایا لیکن جنرل کا کہنا تھا ”جاپان جرمنی ہے اور نہ ہی میں ہٹلر ہوں‘ ہم اتحادیوں کی طاقت کو ہوا میں اڑا دیں گے“ شہنشاہ بے بسی سے ہاتھ مل کر رہ گیا۔ شہنشاہ ہیرو ہیٹو کے خدشات درست ثابت ہوئے‘ اتحادی جرمنی سے فارغ ہو کر جاپان کی طرف متوجہ ہو گئے‘ امریکہ نے جاپانی فوج کو وارننگ دی‘ جنرل سوزوکی نے اس وارننگ کے جواب میں آخری گولی اور آخری سپاہی کا نعرہ لگا دیا اور اس نعرے کے جواب میں امریکہ نے 6 اگست 1945ء کو ہیروشیما پر ایٹم بم پھینک دیا‘ دوسرا بم 9 اگست 1945ء کو ناگاساکی پر پھینکا گیا اور اس کے بعد جاپان رہا اور نہ ہی جاپانی فوج‘ 14 اگست 1945ء کو جاپان نے امریکہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور امریکی کمانڈر جنرل میک آرتھر جاپان کا مالک اور مختار بن گیا‘ جاپانی فوج کے تمام جوانوں اور جرنیلوں نے وردیاں اتاریں اور کسانوں اور مزدوروں کے کپڑے پہن کر روپوش ہو گئے‘ جنرل سوزوکی گرفتار ہوا اور امریکیوں کی قید میں انتہائی ذلت آمیز زندگی گزارنے لگا اور پوری دنیا کی فوجوں میں جنرل ٹوجو کی ایک نئی اصطلاح سامنے آ گئی‘ پچھلے 60 برسوں میں جب بھی کسی فوج میں کوئی فوجی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس کے ساتھی اسے ٹوجو کے نام سے پکارنے لگتے ہیں۔

جاپان نے 1947ء میں نیا آئین بنایا اور اس آئین کی دفعہ نو کے تحت جاپان میں فوج پر پابندی لگا دی‘ اسی آئین میں فیصلہ ہوا جاپان دفاع پر اپنے جی ڈی پی کا صرف ایک فیصد خرچ کرے گا‘ اس فیصلے کے بعد جاپان دنیا کا واحد ملک بن گیا جس میں دفاع کی وزارت نہیں تھی‘ جس میں فضائیہ‘ بحریہ اور ملٹری نہیں تھی البتہ جاپان نے

مر مٹنے کا مقام

''یہ تم لوگوں کا مسئلہ نہیں ہونا چاہیے'' اس نے راول جھیل پر نظریں جما دیں' وہاں ہر طرف دھوپ' ہریالی اور سکون تھا' پانی میں پہاڑوں کا عکس ہلکورے لے رہا تھا' وہ واپس میری طرف مڑا'' تمام لوگوں کے پاس اللہ کے آخری نبیؐ ہیں' چار خلفائے راشدین ہیں' اسی نوے ہزار صحابہ کرامؓ ہیں ' ازواج مطہراتؓ ہیں' ان کے بعد اولیا اور صوفیا کرام کا طویل سلسلہ ہے' تمہارے ہر شہر' ہر قصبے میں دس بیس مزار ہیں اور لوگ ہر مزار پر منتیں مانگتے ہیں' چڑھاوے چڑھاتے ہیں' تم لوگ شخصیت پرست ہو لہٰذا شخصیت پرست معاشروں اور لوگوں کا یہ مسئلہ نہیں ہونا چاہیے' تم لوگوں کو بس ایک تحریک' ایک اینشیٹو اور ایک قدم کی ضرورت ہے اور تم لوگوں کے مسائل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے'' مجھے اس کی بات عجیب محسوس ہو رہی تھی' میرے ذہن میں بے شمار سوال ابل رہے تھے لیکن میں یہ سوال پوچھ کر اس کا تسلسل نہیں توڑنا چاہتا تھا' جان کا یہ نفسیاتی مسئلہ تھا' اگر گفتگو کے دوران اسے ٹوک دیا جائے تو وہ پھسل جاتا ہے' اس کی گفتگو لایعنی اور بے ربط ہو جاتی ہے' اس کی باتوں سے لطف اندوز ہونے کا صرف ایک طریقہ ہے' آپ خاموشی سے اس کی گفتگو سنتے رہیں' اسے بولنے دیں اور میں اس وقت یہی کر رہا تھا۔

''تم لوگ حضرت امام حسینؓ کی ذات اقدس کو لو'' وہ دوبارہ گویا ہوا'' پورا عالم اسلام ان کے ساتھ گہری عقیدت رکھتا ہے' دنیا کے ایک ارب 45 کروڑ مسلمان ہر محرم میں ان کا سوگ مناتے ہیں۔ سوگ منانے کا یہ عمل چودہ سو سال سے جاری ہے اور ہر سال اس میں اضافہ ہوتا ہے'' میں نے ہاں میں سر ہلا دیا' وہ گویا ہوا'' میں تم لوگوں کو اس سوگ کو پراڈکٹو بنانے کا طریقہ بتاتا ہوں' تم لوگ پاکستان میں حضرت امام حسینؓ کے نام سے دس کینسر ہسپتال بناؤ اور عوام سے درخواست کرو' وہ محرم کے مہینے اپنی کمائی کا نصف اس ہسپتال کو دے دیں' تم دیکھ لینا' تمہارے ملک سے کینسر کا مرض ختم ہو جائے گا' اسی طرح تم حضرت ابوبکر صدیقؓ ' حضرت عمرؓ ' حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے نام پر ہسپتال اور یونیورسٹیاں بناؤ' تم ازواج مطہرات کے نام پر چیریٹی سکولز' کالجز اور یونیورسٹیاں قائم کرو اور اس کے بعد لوگوں سے درخواست کرو' وہ ان اداروں کو اون کر لیں' وہ اپنے صدقات' خیرات اور زکوٰۃ ان اداروں کو دے دیں' وہ اپنی اپنی عقیدت کو مالی شکل دے کر ان اداروں کی مدد کریں' آپ لوگوں کو دعوت دیں

اگر وہ اپنی زمین' جائیداد اور کاروبار کا ایک حصہ ان اداروں کے نام وقف کر دیں تو وہ ایک ایسا صدقہ جاریہ کریں گے جس کا ثواب انہیں قیامت تک ملتا رہے گا' میرا خیال ہے تمہارے ملک سے بیماری اور تعلیم کا مسئلہ ختم ہو جائے گا'' میں خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا' اس نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا ''اس طرح تم لاہور میں حضرت داتا گنج بخش یونیورسٹی' پیر مکی شریف پیپاٹائٹس ہسپتال' شاہ حسین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی اور میاں میر لیبارٹری بناؤ' ملتان میں حضرت شاہ رکن الدین ہسپتال' بہاؤالدین ذکریا سائنس فاؤنڈیشن' بہاولپور میں بابا فریدٹی بی ہسپتال' کراچی میں شاہ غازی یونیورسٹی' اسلام آباد میں بری امام سکول آف ٹیکنالوجی اور گولڑہ شریف یونیورسٹیاں بناؤ' تم دیکھنا تمہارا صحت اور تعلیم کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا'' میں خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا' جان بولا ''میں نے تمہارے ملک میں دو چیزیں دیکھی ہیں' تمہارے لوگ ان مقدس ہستیوں سے بے تحاشا محبت اور عقیدت رکھتے ہیں' یہ لوگ جب تک سر نہ ڈھانپ لیں ان مقدس ہستیوں کا نام نہیں لیتے' لوگ جوتے اتار کر ان کے مزاروں میں داخل ہوتے ہیں اور جو بھی درگاہوں پر جاتا ہے وہ وہاں حسب توفیق صدقہ دیتا ہے' دوسری بات ان لوگوں کے مزاروں' ان کی درگاہوں پر بہت برکت ہے' اگر کسی بزرگ نے اپنی زندگی میں ایک دیگ چولہے پر چڑھادی تو اس کے بعد لوگوں نے یہ دیگ اترنے نہیں دی' لوگ چار چار سو سال تک چولہے میں لکڑیاں اور دیگ میں چاول ڈالتے رہے اور تین تین چار چار سو سال تک ہزاروں لاکھوں لوگ ان روحانی میسوں سے مفت کھانا کھاتے رہے' پورے یورپ میں اس قسم کی ایک بھی مثال نہیں' اگر کوئی شخص اس عقیدت اور اس برکت کو ٹیکنیکل طریقے سے استعمال کرے تو پاکستان میں ایسے بے شمار ادارے بن سکتے ہیں جو اس ملک کے لوگوں کا مقدر بدل دیں' میں جب دیکھتا ہوں حضرت بری امام کے مزار پر تین سو سال سے آگ نہیں بجھی اور حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر پانچ سو سال سے دودھ کی سبیلیں لگی ہیں تو میں سوچتا ہوں اگر ان کے نام سے ہسپتال اور یونیورسٹیاں بنی ہوتیں تو یہ ادارے اب تک کتنے لوگوں کو زندگی دے چکے ہوتے'' وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا۔

میں نے پہلو بدلا' وہ میرا سوال بھانپ گیا لہٰذا مسکرا کر بولا ''تم سوچ رہے ہو اس ملک میں ان مقدس ہستیوں کے ناموں سے بے شمار ادارے چل رہے ہیں' تمہاری بات ٹھیک ہے' لیکن یہ ادارے حکومت نے بنائے تھے' ان میں ان ہستیوں کے چاہنے والوں کا کوئی کنٹری بیوشن نہیں تھا' میں چاہتا ہوں' تم لوگ ان بزرگوں کے نام سے باقاعدہ پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنیاں اور ٹرسٹ بناؤ' یہ کمپنیاں اور ٹرسٹ آگے چل کر جدید تعلیمی ادارے اور ہسپتال بنائیں' ان اداروں کے باقاعدہ شیئرز لانچ کیے جائیں' لوگ یہ شیئرز خریدیں اور ان شیئرز کی قیمت سے یہ ادارے چلیں' اس طرح ان کے مزاروں پر جمع ہونے والے صدقات کا ایک حصہ ان اداروں کے فنڈ میں چلا جائے' اس کے علاوہ لوگوں سے درخواست کی جائے وہ اپنی آمدنی' اپنی جائیداد اور اپنے اثاثوں کے کچھ حصے ان اداروں کے نام وقف کر دیں' مجھے یقین ہے اس عمل سے یہ ادارے نہ صرف چلنا شروع ہو جائیں گے بلکہ ان کی برکت سے تمہارا ملک بھی ترقی کرے گا' میں کراچی کے ایک تاجر کو جانتا ہوں' اس نے دس روپے سے کاروبار شروع کیا تھا اور

وہ آج ارب پتی ہے' میں نے اس سے اس ترقی کی وجہ پوچھی تو اس نے عجیب بات بتائی' اس نے بتایا جوانی میں وہ بہت غریب تھا' وہ انتہائی غربت اور پریشانی کے عالم میں ملتان کی ایک درگاہ پر گیا' وہاں اس نے درگاہ کے صحن میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر مدد کی درخواست کی' وہ جب باہر نکلنے لگا تو درگاہ کا ایک مجاور اس کے پاس آیا اور اس کی جیب میں دس روپے کا نوٹ ڈال کر بولا ''باباجی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کرم کرے گا'' وہ واپس کراچی آ گیا اور ان دس روپوں سے کاروبار شروع کر دیا' وہ دس روپے آج پانچ ارب روپے بن چکے ہیں' اگر تم اس تاجر سے ملو اور اس سے کہو تم ملتان میں باباجی کے نام پر ایک ہسپتال بنانا چاہتے ہو تو مجھے یقین ہے وہ شخص اس پراجیکٹ پر ایک آدھ ارب روپے لگا دے گا' اگر یہ نہ ہو تو بھی جس صاحب مزار کی برکت سے دس روپے کا نوٹ پانچ ارب روپے بن گیا تھا' اس ولی کے نام پر بننے والا ہسپتال اور اس کے نام کی یونیورسٹی بھی چل نکلے گی بس ہمت کرنے کی دیر ہے۔ فیصلہ کرنے اور آگے بڑھنے کی دیر ہے'' وہ خاموش ہو گیا' راول جھیل پر شام اتر رہی تھی' آبی پرندوں کے عکس پانی میں ڈول رہے تھے اور ہوا میں خنکی بڑھ رہی تھی' میں نے اس سے پہلی مرتبہ پوچھا ''تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو'' اس نے مسکرا کر جواب دیا ''عقیدت سے بڑا سرمایہ کوئی نہیں ہوتا اور اسلامی دنیا اس سرمائے سے لبالب بھری ہے' جو قوم بارہ کارٹونوں کے ردعمل میں دنیا کی ساری سپر پاورز کو کان پکڑا سکتی ہے وہ قوم اس عقیدت کو ہسپتالوں اور تعلیمی اداروں میں لگا کر ترقی کیوں نہیں کر سکتی' تمہیں پورے یورپ اور پورے امریکہ میں حضرت عیسیٰ کے نام پر جان دینے والا کوئی شخص نہیں ملے گا لیکن تمہارے ملک میں مقدس ہستیوں کی آن' شان اور حرمت پر جان دینے والے لاکھوں بلکہ کروڑوں لوگ موجود ہیں لہٰذا جس ملک کے پاس اتنے جانثار ہوں' جس ملک میں عقیدت اور برکت کے اتنے دریا بہتے ہوں اس ملک کے نوجوان اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ اور امریکہ جائیں' یہ عجیب لگتا ہے اور اس ملک کے بیماروں کو علاج کے لئے برطانیہ' فرانس' امریکہ اور بھارت جانا پڑے' یہ بڑی قابل افسوس بات ہے'' وہ رکا' تھوڑی دیر سوچا اور پھر مسکرا کر بولا ''عقیدت اور برکت کے اتنے بڑے سٹیٹ بینک کے باوجود تم لوگ مسائل کا شکار ہو' یہ مر مٹنے کا مقام ہے۔''

عشق کا مقام

عامر چیمہ کون تھا' وہ جرمنی میں کیا کر رہا تھا' وہ دن میں مذہب کا کتنا مطالعہ کرتا تھا' اس کی دماغی حالت کیا تھی' برلن کی پولیس نے اسے کیوں گرفتار کیا' اسے جرمنی کے بدنام ترین قید خانے موآبٹ جیل میں کیوں رکھا گیا' اس نے تین مئی 2006ء کو خودکشی کی یا وہ حقیقتاً جیل حکام کے ہاتھوں شہید ہوا' وہ غازی ہے' شہید ہے یا پھر مقتول' آیئے ہم یہ سارے سوال آنے والے وقت پر چھوڑ دیں' ہم ان کے جواب وقت کی تحقیق' وقت کے وکیل اور وقت کی عدالت کے حوالے کر دیں' ہم اس کا فیصلہ مغرب کے ایماندار سکالرز اور محققین پر چھوڑ دیں اور انتظار کریں آنے والا وقت عامر چیمہ کو کیا قرار دیتا ہے' وہ عامر چیمہ کے مقدمے کا کیا فیصلہ سناتا ہے لیکن ہم اس ریفرنڈم کو وقت کے حوالے نہیں کر سکتے جو مئی کے مہینے میں ہوا اور اس نے پوری دنیا کے ذہنوں کا دھارا بدل دیا' ہم اس ریفرنڈم کا فیصلہ ابھی اور اسی وقت سنائیں گے' یہ ریفرنڈم عامر چیمہ کے انتقال سے برپا ہوا تھا اور اس نے پوری دنیا کے سیکولر ذہنوں کو جڑوں سے ہلا دیا تھا' اس نے دنیا پر عوام کے اصل جذبات آشکار کر دیئے تھے اور اس نے تہذیبوں کے تمام تصادم کھول کر رکھ دیئے تھے۔

اس ریفرنڈم کا آغاز راولپنڈی کی ایک متوسط بستی ڈھوک کشمیریاں کی گلی نمبر 18 سے ہوتا ہے' یہ ریفرنڈم اس کے بعد وزیر آباد کے قصبے سارو کی میں جاتا ہے اور اس کے بعد اس ریفرنڈم کا سلسلہ پورے عالم اسلام میں پھیل جاتا ہے اور اس کے بعد کرہ ارض پر بکھرے 62 اسلامی ممالک کے ایک ارب 47 کروڑ 62 لاکھ 33 ہزار 4 سو 70 مسلمانوں تک نہ صرف عامر چیمہ کا نام پہنچتا ہے بلکہ وہ مسلمان اسے اپنے خیالات اور خواہشات کا ترجمان سمجھنے لگتے ہیں' میں اپنے خیالات اور رویوں میں ایک لبرل شخص ہوں' میری سوچ صدر بش اور جناب پرویز مشرف سے ملتی جلتی ہے' میں بھی یہ سمجھتا ہوں مسلمانوں کو اعتدال پسند اور نرم ہونا چاہیے' میں بھی یہ یقین رکھتا ہوں انسانوں کے دل تلوار سے فتح نہیں کیے جا سکتے' لوگوں کو بدلنے کیلئے فوج اور جرنیلوں کی نہیں بلکہ اولیاء اور صوفیاء کرام کی ضرورت ہوتی ہے' میں بھی یہ خیال کرتا ہوں آپ جسم سے بم باندھ کر لوگوں کے جذبات اور خیالات کے دھارے نہیں بدل سکتے' میرا ابھی یہی خیال ہے آج کے دور میں ایک دو سو لوگوں کے لشکر سے

مغرب کی ٹیکنالوجی کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا' میں بھی یہ سمجھتا ہوں ڈسپرین ایجاد کرنے والا شخص نعرے لگانے اور جلوس نکالنے والے دس لاکھ لوگوں سے بہتر ہے لیکن جب عامر چیمہ کے ریفرنڈم کی باری آتی ہے تو میرے تمام لبرل خیالات جواب دے جاتے ہیں' میرے سارے فلسفوں کی بنیادیں ہل جاتی ہیں اور میں بھی دنیا کو حیرت سے دیکھنے لگتا ہوں۔

یہ ریفرنڈم کیا تھا اور اس کا آغاز کیسے ہوا؟ عامر چیمہ نے تین مئی کو موآبٹ جیل میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آنکھیں بند کر لیں' چار مئی کے پاکستانی اخبارات میں عامر چیمہ کے انتقال کی چھوٹی سی خبر شائع ہوئی' اس کے بعد جوں جوں دن گزرتے گئے عامر چیمہ کا نام اور خبر بڑی ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ 13 مئی کو جب وزیر آباد کے قصبے ساروکی میں عامر چیمہ کا جنازہ ہوا تو عامر چیمہ نہ صرف پاکستان کے سارے میڈیا کی ہیڈ لائن تھا بلکہ دنیا بھر کے اخبارات' ریڈیوز اور ٹیلی ویژن اس کے جنازے کی جھلکیاں دکھا رہے تھے' عامر چیمہ کا جنازہ پنجاب کے پانچ بڑے جنازوں میں سے ایک تھا' گوجرانوالہ ڈویژن کی تاریخ میں پہلی بار کسی جگہ دو لاکھ لوگ اکٹھے ہوئے تھے' یہ ایک ایسے شخص کا جنازہ تھا جو تین مئی 2006ء تک ایک عام اور گمنام شخص تھا' اس گمنام اور عام شخص کو کس بات' کس ادا نے خاص بنا دیا' یہ ادا' یہ بات بنیادی طور پر اسلامی معاشرے اور مسلمانوں کی اساس ہے' یہ وہ خون ہے جو ہر مسلمان کی رگوں میں دوڑتا ہے' یہ محبت کا وہ دریا ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا جب تک یہ لوگ آپ سے اپنی آل اولاد اور زمین جائیداد سے بڑھ کر محبت نہیں کرتے یہ مسلمان نہیں ہو سکتے' یہ وہ خیال' یہ وہ احساس ہے جو ہر مسلمان کے اندر روح کی گہرائی تک پیوست ہے' یہ وہ جذبہ ہے جو ایک مسلمان کو دوسرے شخص سے جدا کرتا ہے' یہ احساس' یہ جذبہ رسول اللہ کی محبت ہے اور یہ محبت جس دل پر دستک دے دیتی ہے' وہ شخص گمنامی سے نکل کر عامر چیمہ بن جاتا ہے' وہ غازی علم دین شہید ہو جاتا ہے' علامہ اقبال نے کہا تھا میں نے غازی علم دین شہید کے رشک میں جتنے آنسو بہائے ہیں وہ میری بخشش کیلئے کافی ہیں عامر چیمہ کا جنازہ بھی اس محبت کا ایک چھوٹا سا ریفرنڈم تھا۔

ساروکی کے اس ریفرنڈم سے پہلے ایک ریفرنڈم گلی نمبر 18 میں ہوا' اس ریفرنڈم نے اس غیر معروف اور پسماندہ گلی کا مقدر بدل دیا' رسول اللہ کی محبت میں ڈوبے ہزاروں عقیدت مندوں نے اس گلی کو اپنا مرکز بنا لیا' لوگ اس گلی میں قدم رکھنے سے پہلے وضو کرتے تھے' سفید کپڑے پہنتے تھے اور خوشبو لگاتے تھے' لوگ باادب ہو کر عامر چیمہ کے والد کے ہاتھ چومتے تھے' 3 مئی سے 15 مئی تک 12 دنوں میں ایک لاکھ لوگوں نے اس بوڑھے پروفیسر کے ہاتھ چومے' یہ سعادت اس ملک کے شاید ہی کسی شخص کو حاصل ہوئی ہو' لوگوں نے گلی نمبر 18 میں پھولوں اور گلدستوں کا انبار لگا دیا' عامر چیمہ کے گھر کے سامنے لوگوں نے اتنے پھول رکھے کہ جو بھی شخص اس گلی میں داخل ہوتا تھا اس کا پورا جسم مہکنے لگتا تھا' لوگوں کی اس آمدورفت سے متاثر ہو کر پولیس کو گلی نمبر 18 میں باقاعدہ چوکی بنانا پڑ گئی' لوگ آتے تھے' عامر چیمہ کے گیٹ کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہو جاتے تھے اور گیٹ کو سلام کر کے

واپس چلے جاتے تھے' عقیدت کی اس کشش میں اتنی شدت تھی کہ لبرل اور اعتدال پسند حکومت کے ارکان بھی خود کو گلی نمبر 18 سے دور نہ رکھ سکے' ان بارہ دنوں میں پنجاب اور وفاق کے 23 وزراء عامر چیمہ کے گھر گئے اور انہوں نے شہید کے والد کے ہاتھ چومے' ضلع راولپنڈی کی ساری انتظامیہ بار بار اس کے گھر گئی' اخبارات میں عامر چیمہ کی تصویریں' اس کے لواحقین اور اس کے چاہنے والوں کے بیانات منوں کے حساب سے شائع ہوئے' عامر چیمہ نے مئی کے مہینے میں ریکارڈ کوریج حاصل کی' آج پاکستان کا بچہ بچہ نہ صرف اس کے نام سے واقف ہے بلکہ وہ اس پر فخر کرتا ہے' یہ کیا ہے؟ یہ مغرب اور مغربی سوچ کے خلاف ریفرنڈم ہے' یہ ریفرنڈم ثابت کرتا ہے مسلمان اور مغربی انسان کی سوچ میں زمین آسمان کا فرق ہے' جسے مغرب آزادی اظہار کہتا ہے اسے مسلمان نہ صرف توہین سمجھتے ہیں بلکہ وہ توہین کا یہ داغ دھونے کیلئے جان تک دے دیتے ہیں' مجھے ایک بار ایک مغربی سکالر نے کہا تھا'' ہمیں سمجھ نہیں آتی ایک مسلمان مغرب میں پیدا ہوتا ہے' اس کا سارا لائف سٹائل مغربی ہوتا ہے' اس میں تمام شرعی عیب بھی موجود ہوتے ہیں لیکن جب اسلام اور رسول اللہ کا ذکر آتا ہے تو اس مغربی مسلمان اور کٹر مولوی کے ردعمل میں کوئی فرق نہیں ہوتا؟ کیوں'' میں نے عرض کیا'' یہ وہ بنیادی بات ہے جسے مغرب کبھی نہیں سمجھ سکتا' یہ دلوں کے سودے ہوتے ہیں اور دلوں کے سودے کبھی بیوپاری کی سمجھ میں نہیں آ سکتے' نبی اکرمؐ کی ذات ایمان کی وہ حساس رگ ہوتی ہے جو برف سے بنے مسلمان کو بھی آگ کا گولہ بنا دیتی ہے' مسلمان دنیا کے ہر مسئلے پر سمجھوتہ کر لیتا ہے لیکن وہ رسول اللہ کی ذات پر کبھی سمجھوتہ نہیں کرتا' عشق رسولؐ وہ مقام ہے جہاں سے مومن کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے' جہاں موت سے بڑی سعادت اور فنا سے بڑی کوئی زندگی نہیں ہوتی' جہاں پہنچ کر انسان مرنے کے بعد زندہ ہوتا ہے'' میں نے اس سے کہا'' دنیا میں لوگ مرنے کے بعد گمنام ہو جاتے ہیں لیکن عشق رسولؐ میں آنے والی موت انسان کو ابد تک زندہ کر دیتی ہے' یہ ایک ایسی آگ ہے جو انسان کو جلاتی نہیں' اسے بناتی ہے' اسے دوبارہ زندہ کرتی ہے اور تم اور تمہارے لوگ اس کیفیت' اس سرور کو کبھی نہیں سمجھ سکتے' تم لوگوں نے زندگی میں محبت رسول کا ذائقہ چکھا ہی نہیں' تمہیں کیا پتہ رسول اللہ سے محبت کرنے والے شخص کے دل سے کون سی روشنی نکلتی ہے اور یہ روشنی کس طرح موت کے خوف کو مالٹے کے چھلکے کی طرح اتار کر دور پھینک دیتی ہے' یہ اسے سارے دکھوں سے آزاد کر دیتی ہے''

ہم سب لوگ عامر چیمہ جیسے لوگوں کا مقام نہیں سمجھ سکتے۔

ڈائیلاگ کی گنجائش موجود ہے

چند روز پہلے سینیٹر مشاہد حسین نے برطانیہ کے ارکان اسمبلی کے اعزاز میں ڈنر دیا تھا' اس ڈنر میں برطانیہ سے لارڈ امر بھالیہ' برٹش ایم پی اے شاہد ملک اور ناروے کی پارلیمنٹ کے پاکستانی رکن خالد محمود شریک تھے' ان لوگوں نے ڈنمارک میں نبی اکرمؐ کی ذات اقدس کے بارے میں گستاخانہ خاکوں کی اشاعت کے بعد یورپ میں پیدا ہونے والی صورتحال کے بارے میں بریفنگ دی' یہ ایک محدود محفل تھی جس میں چند سینیٹرز ایم این اے اور چند صحافی شامل تھے' ایم پی اے شاہد ملک اور ایم پی اے خالد محمود نے یورپ کی صورتحال پر روشنی ڈالی' خالد محمود کے ساتھ یہ میری دوسری ملاقات تھی' ان کے ساتھ پہلی ملاقات اوسلو میں ہوئی تھی' وہ اس وقت سٹی کونسل کے رکن تھے' وہ اب ناروے کی پارلیمنٹ کے ممبر بن چکے ہیں' انہوں نے اپنی گفتگو میں بتایا "جنوری میں ناروے کے ایک میگزین نے یہ گستاخ خاکے ری پرنٹ کیے تھے' یہ محدود سرکولیشن کا میگزین تھا جس کے قارئین کی تعداد کسی بھی طرح دو تین ہزار سے زیادہ نہیں' یہ میگزین ناروے کا ایک عیسائی فرقہ چلا رہا ہے' ہم نے جب یہ خاکے دیکھے تو ہمیں بہت افسوس ہوا' ناروے میں مسلمانوں کی ایک بڑی تنظیم ہے' جس کا نام اسلامک کونسل ہے' اس کونسل کے چیئرمین ایک فلسطینی عالم ہیں جبکہ سیکرٹری جنرل ایک پاکستانی ہیں' ہم لوگوں نے کونسل کا اجلاس بلایا' اجلاس میں فیصلہ ہوا ہم لوگ اس گستاخی پر احتجاج کریں گے' ہم لوگوں نے دن اور وقت طے کیا اور تمام مسلمانوں کو جلوس میں شرکت کی دعوت دی' ہم نے اس جلوس کے بارے میں مقامی اخبارات میں خبریں بھی شائع کرائیں' ہم لوگ جب وقت مقررہ پر باہر نکلے تو ہم نے دیکھا ہمارے ساتھ بے شمار غیر مسلم نارویجن بھی شامل ہیں' ان لوگوں نے نہ صرف ہمارا ساتھ دیا بلکہ یہ ہمارے ساتھ نعرے بھی لگاتے رہے' ہم نے ان سے پوچھا تم لوگ غیر مسلم ہو کر ہمارا ساتھ کیوں دے رہے ہو تو ان لوگوں نے جواب دیا' ہم سمجھتے ہیں اس میگزین نے آپ کے ساتھ زیادتی کی' میگزین کو کسی فرقے' مذہب اور طبقے کی دل آزادی کا حق حاصل نہیں لہٰذا ہم لوگ آپ کے حق کیلئے لڑ رہے ہیں' خالد محمود کا کہنا تھا "ناروے میں ایسے بے شمار لوگ ہیں جو مذہبی تعصب سے بالاتر ہو کر مسلمانوں کے ساتھ تعلقات رکھتے ہیں اور ہمارے مسائل میں ہماری مدد کرتے ہیں" مجھے خالد محمود کی بات اچھی لگی اور مجھے محسوس ہوا یورپ میں جہاں یولانڈ پوسٹن جیسے متعصب اخبارات اور فیلمنگ روز جیسے بد بودار ایڈیٹر موجود ہیں وہاں بے شمار ایسے لوگ بھی ہیں جو

مسلمانوں اور مسلمانوں کے عقائد کا احترام کرتے ہیں' جو ان پر ہونے والی زیادتیوں پر ان کے ساتھ مل کر احتجاج کرتے ہیں' مجھے محسوس ہوا ہمیں جہاں ان متعصب اخبارات' ایڈیٹروں اور اسلام دشمن لوگوں کا مقابلہ کرنا چاہیے وہاں ہمیں ان اسلام دوست شہریوں کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہیے' ہمیں ان لوگوں سے بھی رابطہ رکھنا چاہیے۔

اگر ہم عالم اسلام' یورپ اور امریکہ کے تعلقات کا تجزیہ کریں تو ہمیں یورپ عالم اسلام کے زیادہ قریب محسوس ہوتا ہے' یورپی ممالک میں اس وقت کروڑوں کی تعداد میں مسلمان آباد ہیں' برطانیہ' فرانس' جرمنی اور اٹلی میں اس وقت مسلمانوں کی چوتھی نسل پروان چڑھ رہی ہے' یورپ میں مساجد' مسلمانوں کے قبرستان' اسلامک سنٹرز اور سکولز موجود ہیں۔ یورپی ممالک مسلمانوں کے عقائد کا بھی خیال رکھتے ہیں' یورپ کے زیادہ تر دفاتر' اداروں' فیکٹریوں اور فرموں میں مسلمانوں کو عید' رمضان اور عاشورہ پر چھٹیاں دی جاتی ہیں' مسلمان نماز جمعہ کیلئے بھی اپنے اپنے دفاتر سے چھٹی لے لیتے ہیں لہٰذا اگر دیکھا جائے تو عالم اسلام یورپ کے زیادہ نزدیک ہے جبکہ اس کے مقابلے میں امریکہ میں اسلام نسبتاً ایک نیا مذہب ہے' دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد دس پندرہ ہزار تھی' مسلمانوں کا امریکہ کی طرف رجحان 80ء کی دہائی میں شروع ہوا چنانچہ امریکی قوم اسلام اور اسلامی عقائد سے اتنی واقف نہیں تھی جتنی یورپی اقوام آگاہ ہیں' نائین الیون کے بعد امریکہ نے مسلمانوں کے خلاف جنگ شروع کی تو امریکہ کا خیال تھا یہ صلیبی جنگوں کا ایک نیا سلسلہ ہے جس میں یورپ امریکہ کا کھل کر ساتھ دے گا لیکن جب یہ جنگ شروع ہوئی تو یورپ نے امریکی توقعات کے برعکس اس کا ساتھ نہ دیا' فرانس' جرمنی اور روس عراق پر امریکی حملے کے خلاف تھے یوں دہشت گردی کے خلاف اس جنگ میں امریکہ اکیلا رہ گیا چنانچہ ایک سطح پر امریکی انتظامیہ نے یہ سوچنا شروع کر دیا اگر اس نے یہ جنگ جیتنی ہے تو اسے یورپ کو بھی اس میں ملوث کرنا پڑے گا' اگر ہم اس پس منظر کو مدنظر رکھیں تو یہ خاکے ایک ایسی سازش محسوس ہوتے ہیں جس کے ذریعے بعض نادیدہ طاقتیں یورپ کو بھی "دہشت گردی" کے خلاف اس جنگ میں گھسیٹ رہی ہیں' جن کے ذریعے یورپ بھی صلیبی جنگوں کا حصہ بننا شروع ہو گیا ہے۔

اگر ہم ان خاکوں کے کینوس کو ذرا وسیع پس منظر میں دیکھیں تو ہمیں ان کے مزید دو تین پہلو بھی دکھائی دیں گے' یورپ میں اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے' نائین الیون کے بعد جرمنی' فرانس اور سپین کے ہزاروں شہریوں نے اسلام قبول کیا تھا' اسلام قبول کرنے کا یہ عمل نہ صرف جاری ہے بلکہ اس میں تیزی بھی آ رہی ہے' اس کی وجہ اسلام کا مطالعہ ہے' نائین الیون کے بعد جب مغربی میڈیا نے اسلام' اسلام اور مسلمان' مسلمان کا راگ الاپنا شروع کیا تھا تو وہاں کے لوگوں نے تجسس سے مغلوب ہو کر اسلام کا مطالعہ شروع کر دیا تھا' 2002ء میں یورپ میں قرآن مجید کے جتنے تراجم فروخت ہوئے اتنے پچھلے پچاس برسوں میں مجموعی طور پر نہیں ہوئے تھے' یورپی عوام نے جب یہ مطالعہ شروع کیا تو وہ اسلام کی حقانیت کے قائل ہو گئے اور انہوں نے دھڑا دھڑ اسلام قبول کرنا شروع کر دیا' یہ بات وہاں کے مذہبی طبقات کیلئے بڑی الارمنگ تھی چنانچہ انہوں نے یہ سلسلہ روکنے کا فیصلہ کیا' میرا خیال

ہے یہ خاکے اس پیش بندی کا ایک حصہ ہیں' ان خاکوں کی تیسری وجہ خالصتاً کاروباری اور تجارتی ہے' یورپ میں اس وقت مسلمانوں کی چوتھی نسل پروان چڑھ رہی ہے' یہ لوگ جب یورپ پہنچے تھے تو یہ تیسرے درجے کے شہری تھے اور انہیں وہاں صرف وہی نوکریاں دی جاتی تھیں جو عموماً تیسرے درجے کے شہریوں کو ملتی ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ لوگ پہلے درجے کے شہری بن گئے' انہوں نے تعلیم حاصل کی' کاروبار کیے' الیکشن لڑے یہاں تک کہ وہ آج کارخانوں' فارم ہاؤسز اور بڑے بڑے اداروں کے مالکان ہیں' یورپ کے تین بڑے اداروں کی تحقیق کے مطابق مسلمان یورپ میں ایک بڑی کاروباری طاقت بن کر ابھر رہے ہیں چنانچہ یورپ کے متعصب طبقوں کا خیال ہے اگر مسلمان اسی طرح ترقی کرتے رہے تو یہ لوگ ان کے مذہب کو شدید نقصان پہنچائیں گے چنانچہ یہ لوگ بڑے عرصے سے مسلمانوں کا کاروباری زور توڑنے میں مصروف ہیں' میرا خیال ہے اگر ہم اس پس منظر کو سامنے رکھ کر ان خاکوں کو دیکھیں تو ہمیں محسوس ہوگا خاکے شائع کرانے والوں کو مسلمانوں کا اندازہ تھا وہ جانتے تھے مسلمان ان خاکوں کے خلاف احتجاج کریں گے اور وہ بعدازاں اس احتجاج کو بنیاد بنا کر مسلمانوں کے خلاف ایسے قوانین منظور کرالیں گے جن کے ذریعے ان کا کاروباری اثر و نفوذ محدود کیا جا سکے۔

یہ وہ سارے خدشات ہیں جن کی روشنی میں اگر ہم خاکوں کو دیکھیں تو مستقبل میں یورپ کے ساتھ اپنے تعلقات کی نوعیت طے کر سکتے ہیں' حقیقت یہ ہے عالم اسلام کے موجودہ ردعمل کی وجہ سے یورپ میں مسلمانوں کے ساتھ ڈائیلاگ کی سوچ ابھر رہی ہے' یورپ میں ایک بہت بڑا طبقہ ہے جو مسلمانوں کے ساتھ ایسے ڈائیلاگ کا خواہاں ہے جس کے نتیجے میں یورپی اقوام اور مسلمان مستقبل میں اس نوعیت کے مذہبی اور نظریاتی تصادم سے بچ سکیں' جس کے ذریعے دونوں ایک دوسرے کا نقطہ نظر سمجھ سکیں اور دونوں مل کر ایک ایسا لائحہ عمل طے کرلیں جس کی مدد سے دونوں اچھے ہمسایوں کی طرح رہ سکیں۔ ہمیں اس موقع کا فائدہ اٹھانا چاہیے' ہمیں چاہیے ہم یورپ کے ساتھ ایک سنجیدہ ڈائیلاگ کریں اور اس ڈائیلاگ کے ذریعے وہاں توہین رسالت کے باقاعدہ قوانین بنوائیں۔ ہم انہیں اپنی روایات' نظریات اور ثقافت کا احترام کرنے پر مجبور کریں' ہم دونوں مذاہب اور تہذیبوں کے درمیان ایک ایسی لکیر وضع کر دیں جس کے دونوں طرف رہنے والے ایک دوسرے کا احترام کریں' ایک دوسرے سے محبت کریں۔

مجھے محسوس ہوتا ہے اگر عالم اسلام نے یہ موقع کھو دیا تو ہم تہذیبوں کی اس جنگ میں اپنے دشمنوں میں اضافہ کرلیں گے' ہم اپنے دوستوں کی تعداد میں کمی لے آئیں گے۔

☼......☼......☼

زوال کی تین وجوہات

اسلامی دنیا لبنان اور فلسطین کی صورتحال پر کیوں خاموش ہے؟ یہ سوال آج دنیا کے ہر شخص کی زبان پر ہے! اس سوال کے پیچھے زوال کی طویل تاریخ ہے۔ انسان کی دس ہزار سالہ تاریخ میں جس قوم نے بھی ترقی کی اس میں تین خوبیاں تھیں، وہ علم میں دوسری قوموں سے برتر تھی، اس کی معیشت مضبوط تھی اور وہ باقی قوموں سے طاقت ور تھی، ترقی کا یہ فارمولا آج تک دنیا میں کارفرما ہے لیکن افسوس اسلامی ممالک ان تینوں شعبوں میں دنیا سے بہت پیچھے ہیں، اس وقت دنیا میں ایک ارب 47 کروڑ 62 لاکھ 33 ہزار 4 سو 70 مسلمان ہیں، دنیا کا ہر پانچواں شخص مسلمان ہے، دنیا میں ایک ہندو اور ایک بودھ کے مقابلے میں دو مسلمان اور ایک یہودی کے مقابلے میں 100 مسلمان ہیں، دنیا میں 61 اسلامی ممالک ہیں، ان میں سے 57 او آئی سی کے رکن ہیں لیکن یہ دنیا کی تیسری بڑی قوت ہونے کے باوجود انتہائی کمزور، حقیر اور بے بس ہیں، کیوں؟ اس کا جواب ہمیں ترقی کے تین بڑے اصولوں میں ملتا ہے۔

دنیا میں ترقی کا پہلا اصول علم ہے، اس وقت پوری اسلامی دنیا میں صرف 500 یونیورسٹیاں ہیں۔ ان یونیورسٹیوں کو اگر ہم مسلمانوں کی مجموعی تعداد پر تقسیم کریں تو ایک یونیورسٹی 30 لاکھ مسلمان نوجوانوں کے حصے آتی ہے جبکہ اس کے مقابلے میں صرف امریکہ میں 5 ہزار 7 سو 58 یونیورسٹیاں ہیں اور ٹوکیو شہر میں 1000 یونیورسٹیاں ہیں، عیسائی دنیا کے 40 فیصد نوجوان یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہیں جبکہ اسلامی دنیا کے صرف دو فیصد نوجوان یونیورسٹی تک پہنچ پاتے ہیں، اسلامی دنیا میں اکیس لاکھ لوگوں میں سے صرف 230 لوگوں کو سائنس کا علم ہوتا ہے جبکہ امریکہ کے دس لاکھ شہریوں میں سے 4 ہزار اور جاپان کے 5 ہزار شہری سائنس دان ہوتے ہیں، پوری عرب دنیا میں صرف 35 ہزار فل ٹائم ریسرچ سکالرز ہیں جبکہ صرف امریکہ میں ان کی تعداد 22 لاکھ ہے۔ پوری اسلامی دنیا اپنے جی ڈی پی کا صرف اعشاریہ دو فیصد ریسرچ پر خرچ کرتی ہے جبکہ عیسائی دنیا اپنی آمدنی کا پانچ فیصد حصہ تحقیق اور علم پر لگاتی ہے۔ اس وقت دنیا میں 200 بڑی یونیورسٹیاں ہیں ان دو سو یونیورسٹیوں میں سے 54 امریکہ، 24 برطانیہ، 17 آسٹریلیا، 10 چین، 10 جاپان، 10 ہالینڈ، 9 فرانس، 7 جرمنی، 9 کینیڈا اور 7 سوئزرلینڈ میں ہیں، ان دو سو یونیورسٹیوں میں اسلامی دنیا کی صرف ایک یونیورسٹی ہے جبکہ اس فہرست میں بھارت کی تین یونیورسٹیاں آتی ہیں، اگر ہم اس فہرست کا ذرا سا کڑا جائزہ لیں تو دنیا کی پہلی

ٹیں یونیورسٹیوں میں 18 یونیورسٹیاں امریکہ میں ہیں، کمپیوٹر کے پہلے دس بڑے ادارے امریکہ میں ہیں اور دنیا کے 30 فیصد غیر ملکی طالب علم امریکہ میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، پوری دنیا میں امریکہ اعلیٰ تعلیم پر سب سے زیادہ رقم خرچ کرتا ہے، امریکہ اپنے جی ڈی پی کا دو اشاریہ چھ فیصد ہائیر ایجوکیشن پر صرف کرتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں یورپ ایک اشاریہ دو اور جاپان ایک اشاریہ ایک فیصد خرچ کرتے ہیں۔ امریکہ ٹیکنالوجی اور ایجادات میں دنیا میں پہلے نمبر پر آتا ہے، اس کی کمپنیاں تحقیق پر دنیا میں سب سے زیادہ رقم خرچ کرتی ہیں امریکہ تحقیقی اداروں کے معیار میں سب سے آگے ہے اور اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ نوبل انعام یافتہ سائنس دان امریکہ میں ہیں۔ چین اور بھارت علم اور ٹیکنالوجی میں نئی طاقت بن کر ابھر رہے ہیں، امریکی ماہرین کا خیال ہے چین 2045ء میں امریکہ کی جگہ لے لے گا، اس کی وجہ یونیورسٹیاں اور ٹیکنالوجی ہے، چین میں اس وقت 9000 اور بھارت میں 8407 یونیورسٹیاں ہیں۔ یہ دونوں ملک ہر سال 9 لاکھ 50 ہزار انجینئر پیدا کرتے ہیں اس کے مقابلے میں امریکہ میں ہر سال صرف 70 ہزار نئے انجینئر مارکیٹ میں آتے ہیں، اس وقت دنیا میں 120 کیمیکل پلانٹس بن رہے ہیں ان میں سے 50 چین میں ہیں لہٰذا آپ دیکھ لیجیے اس وقت ہر وہ ملک ترقی یافتہ ہے جو علم، یونیورسٹیوں اور شرح خواندگی میں دنیا سے آگے ہے اور ہر وہ ملک پسماندہ ہے جو علم میں پیچھے ہے اور بدقسمتی سے اسلامی دنیا اس شعبے میں دنیا میں سب سے پیچھے ہے۔

ترقی کا دوسرا اصول معیشت ہوتی ہے، 161 اسلامی ممالک کا مجموعی جی ڈی پی صرف 2 ٹریلین ڈالر ہے جبکہ امریکہ صرف مصنوعات اور خدمات کے شعبے سے 12 ٹریلین کماتا ہے، امریکہ کے صرف ایک شہر لاس ویگاس کی معیشت سوا 13 ٹریلین ڈالر ہے، امریکہ کی سٹاک ایکسچینج وال سٹریٹ 20 ٹریلین ڈالر کی مالک ہے، صرف کوکا کولا کمپنی کے نام کی قیمت 97 ارب ڈالر ہے، دنیا میں اس وقت 36 ہزار ملٹی نیشنل کمپنیاں ہیں ان میں سے 25 ہزار کا تعلق امریکہ سے ہے، دنیا کے 25 امیر ترین لوگوں میں سے 12 کا تعلق امریکہ سے ہے۔ دنیا کی 52 فیصد فیکٹریاں عیسائی دنیا میں ہیں جبکہ دنیا کی 70 فیصد صنعتوں کے مالک عیسائی اور یہودی ہیں، دنیا کی دس ہزار بڑی ایجادات میں سے 6103 ایجادات امریکی جبکہ 8315 ایجادات عیسائیوں اور یہودیوں نے کی تھیں، اسلامی دنیا جتنی رقم کا تیل فروخت کرتی ہے امریکہ اور یورپ اس سے دوگنی رقم کی ہر سال شراب بیچتے ہیں، ہمارے سارے تیل کی مالیت امریکہ کی برگر بنانے والی تین کمپنیوں کے سالانہ ٹرن اوور کے برابر ہے۔ امریکہ کے سروسز کے شعبے کی آمدنی پوری اسلامی دنیا کے مجموعی جی ڈی پی سے زیادہ ہے اور ہم 161 اسلامی ممالک ہر سال ایکسپورٹس سے جتنی رقم حاصل کرتے ہیں اتنی رقم ہالینڈ صرف پھول بیچ کر کما لیتا ہے۔

اب آ جائیں طاقت کے اصول کی طرف، ذرا اپنے دل سے پوچھئے اس وقت دنیا کی سب سے بڑی فوجی طاقت کون ہے؟ کس ملک کے پاس بڑی فوج ہے، کس کا دفاعی بجٹ زیادہ ہے، کس کے پاس دنیا میں سب سے زیادہ جوہری ہتھیار ہیں، میزائل کس کے پاس زیادہ ہیں، کس کے طیارے پوری دنیا کا چکر لگا سکتے ہیں، وہ

کون سا ملک ہے جو اڑتے ہوئے طیاروں میں پیٹرول بھر سکتا ہے' جس کے پاس توپیں اور ٹینک ہیں' جو لیزر گائیڈڈ بموں سے ہزاروں میل دور تباہی مچا سکتا ہے، کس کے مصنوعی سیارے دنیا کی ایک ایک انچ پر نظریں گاڑھے بیٹھے ہیں، کون ہے جو ہزاروں میل دور بیٹھ کر آپ کے چشمے کا نمبر معلوم کر سکتا ہے اور کون ہے جو دنیا کا ہر کمپیوٹر اور ہر ٹیلی فون مانیٹر کر رہا ہے۔ یقیناً آپ کا جواب ہوگا امریکہ، آپ کی بات درست ہے امریکہ کے بعد برطانیہ، جرمنی، فرانس، اٹلی اور روس آتے ہیں اور اس کے بعد چین اور بھارت کا نمبر آتا ہے جبکہ بدقسمتی سے ایک بھی اسلامی ملک دفاعی ساز وسامان بنانے والے ممالک کی فہرست میں شامل نہیں، پورے عالم اسلام میں پاکستان واحد ملک ہے جس کے پاس ایٹم بم ہیں' اسلامی بلاک کے کسی ملک میں اتنا دم خم نہیں کہ وہ کسی یورپی ملک کے بغیر اپنا دفاع کر سکے، آپ پوری اسلامی دنیا کی فوجی تنصیبات اور فوجی اثاثوں کا تجزیہ کر لیں، ان کے پاس رائفل سے لے کر جہاز تک امریکہ اور یورپ کے ہوں گے، وہ رائفلوں کی گولیاں تک کسی عیسائی ملک سے لے رہے ہوں گے۔

یہ ہے اسلامی دنیا کی صورت حال، یہ ہیں ہمارے زوال کی اصل وجوہات' قدرت کا قانون ہے جب بھی کوئی چیز بلندی سے گرتی ہے تو وہ ہمیشہ نیچے آتی ہے، قدرت نے آج تک دنیا کے کسی شخص، کسی قوم کے لئے اپنا یہ قانون تبدیل نہیں کیا، دنیا میں کامیابی اور فتح کیلئے خود کو طاقتور ثابت کرنا پڑتا ہے' یہ بھی قدرت کا قانون ہے قدرت نے اپنا یہ قانون اپنے انبیاء کرام تک کیلئے تبدیل نہیں کیا تھا، حضرت آدمؑ سے لے کر رسول اکرمؐ تک دنیا کے ہر نبی کو میدان جنگ میں اپنی طاقت ثابت کرنی پڑی تھی اور وقت کے ہر دور میں صرف وہی تہذیب قائم رہی جس کے پاس فوج، علم اور ٹیکنالوجی تھی لیکن بدقسمتی سے اس وقت عالم اسلام ان تینوں شعبوں میں بہت پیچھے ہے، بدقسمتی سے ہم سب زنگ آلود تلواریں لے کر میزائلوں کے سامنے صف آراء ہیں، ہم سب کی گردنوں میں جہالت کے طوق پڑے ہیں اور ہم سب کشکول لے کر غیروں کے دروازوں پر کھڑے ہیں اور اس کے بعد اللہ کی نصرت کا انتظار کر رہے ہیں اور ہمارا خیال ہے اللہ ہمارے لئے اپنے سارے اصول بدل دے گا، ہمارا خیال ہے اللہ تعالیٰ نے جو نظام اپنے نبیوں کیلئے تبدیل نہیں کیا تھا وہ ہمارے لئے بدل دے گا' ہم کس قدر سادہ لوگ ہیں' ہم ڈیڑھ ارب لوگ جو 21 ویں صدی میں ایک نئی بندوق ایجاد نہیں کر سکتے' جو عالمی سطح کی یونیورسٹی نہیں بنا سکتے اور جو انٹرنیشنل سطح کا برگر اور کوکا نہیں بنا سکتے' جو اپنا تیل بیچنے کیلئے عیسائی کمپنیوں کے محتاج ہیں' جو قرآن مجید تک یہودیوں کے پریسوں پر عیسائیوں کی روشنائی سے چھاپتے ہیں اور جن کے خانہ کعبہ میں یہودی کمپنی کا ائیر کنڈیشن سسٹم لگا ہے ان لوگوں کا خیال ہے اللہ تعالیٰ ان کیلئے اپنا نظام بدل دے گا' کیا یہ ممکن ہے؟ ہم لوگ کتنے بے وقوف ہیں' ہم یہ سمجھتے ہیں ہم نعوذ باللہ اپنے اللہ کو بھی دھوکہ دے لیں گے۔

زوال کی چوتھی وجہ

احسن اقبال کا خیال مختلف تھا' ان کا فرمانا تھا' قوموں کی ترقی کیلئے صرف علم' معیشت اور طاقت کافی نہیں ہوتی اس کیلئے کریکٹر بھی ضروری ہوتا ہے۔ میں نے اتفاق کیا' میں نے ان سے عرض کیا واقعی اسلامی دنیا کے زوال کی چوتھی وجہ کریکٹر کی کمی ہے' ہم کردار میں بھی دنیا سے پیچھے ہیں' ہم اس شعبے میں بھی مار کھا رہے ہیں۔

کریکٹر پانچ خوبیوں کا مجموعہ ہوتا ہے' یہ خوبیاں ایمانداری' وسعت قلبی' وعدے کی پابندی' سچائی اور انصاف ہیں جب یہ پانچ خوبیاں جمع ہوتی ہیں تو ان سے کریکٹر پیدا ہوتا ہے لیکن بدقسمتی سے پوری اسلامی دنیا میں یہ خوبیاں ناپید ہیں' آپ ایمانداری کو لے لیجئے' پاکستان سمیت کون سا اسلامی ملک ہے جس کی اسی یا نوے فیصد آبادی ایماندار ہے۔ آپ کسی اسلامی ملک میں خوراک اور ادویات کے خالص ہونے کی قسم نہیں کھا سکتے۔ آپ انتہا دیکھئے پوری عرب دنیا میں یورپ اور امریکہ سے خوراک آتی ہے۔ ڈنمارک کی کمپنی ''آرلے'' سعودی عرب کو ڈیری مصنوعات بیچتی ہے' یو اے ای کی ریاستیں ڈنمارک سے گوشت منگواتی ہیں اور پوری اسلامی دنیا جرمنی' سوئٹزرلینڈ اور امریکہ سے ادویات خریدتی ہے گویا ہماری ایمانداری کا یہ عالم ہے ایک اسلامی ملک دوسرے برادر اسلامی ملک سے کھانے پینے کی اشیاء تک نہیں خریدتا' کیوں؟ کیونکہ اسے ان اشیاء کی کوالٹی کا یقین نہیں ہوتا' آپ اسلامی دنیا کا دفتری نظام دیکھ لیجئے' پاکستان سمیت کسی اسلامی ملک کے سرکاری ملازم وقت پر دفتر نہیں آتے۔ پورے عالم اسلام کے دفتروں میں ایمانداری سے کام نہیں ہوتا' پورے عالم اسلام میں کرپشن اور رشوت ستانی عام ہے' ہم لوگ حج اور عمرے کے دوران ہیروئن اور چرس سمگل کرتے ہیں' طواف کے دوران حاجیوں کی جیبیں کاٹتے ہیں اور ہم حرمین میں کھڑے ہو کر بھیک مانگتے ہیں' کریکٹر کی دوسری خوبی وسعت قلبی ہوتی ہے' ہم لوگ بدقسمتی سے تنگ دل اور متعصب لوگ ہیں' چھوٹے بڑے' گورے کالے اور عربی عجمی کی جتنی تفریق اسلامی ممالک میں پائی ہے اتنی دنیا کے کسی ملک میں نظر نہیں آتی' امریکہ نے 1850ء میں ''کاسٹ'' کا لفظ ختم کر دیا تھا لیکن اسلامی دنیا میں آج تک سرکاری فارموں میں فرقہ، کاسٹ اور سب کاسٹ کے خانے موجود ہیں، دنیا میں بے شمار ایسے اسلامی ممالک ہیں جو ساٹھ ساٹھ سال تک غیر ملکی مسلمانوں کو شہریت نہیں دیتے، اسلامی دنیا 72 فرقوں میں تقسیم

ہے، ایک فرقے کا مسلمان دوسرے فرقے کی مسجد میں نماز نہیں پڑھ سکتا، ہر فرقے کے قبرستان الگ ہیں، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لوٹے کے ساتھ وضو نہیں کرتا اور ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ایمان کو مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے، کریکٹر کی تیسری خوبی وعدے کی پابندی ہے، آپ اپنے گردوپیش میں نظر دوڑایئے کیا آپ سمیت اسلامی دنیا کا کوئی شہری اپنے وعدوں کا پاس کرتا ہے، ہم لوگ تو اللہ کے ساتھ کئے وعدے نہیں نبھاتے، اللہ اور اس کا رسول کہتا ہے مسلمان ایک وجود کی طرح ہیں لیکن لبنان، فلسطین، افغانستان اور عراق میں مسلمان مر رہے ہیں اور ہم مسلمان سب سے پہلے پاکستان کے نعرے لگا رہے ہیں مسلمانوں میں خانہ کعبہ میں کھڑے ہو کر نوے دنوں کا وعدہ کرنے والے حضرات گیارہ گیارہ سال تک کرسی سے نہیں ہٹتے اور 2004ء میں یونیفارم اتارنے کا وعدہ کرنے والے 2006ء تک چلے جاتے ہیں، آپ پوری دنیا کا دورہ کریں آپ کو یہودی، عیسائی، سکھ، ہندو اور بودھ وعدے کا پابند ملے گا لیکن مسلمان وعدے سے پھرتے ہوئے ایک منٹ نہیں لگائے گا، آپ کاروبار سے سیاست تک کوئی شعبہ دیکھ لیں آپ کو ہر شعبے میں وعدہ خلافی اور عہد شکنی ملے گی، ملازم ملازمت کا بانڈ بھر کر کام نہیں کرتا اور مالک وعدہ کرنے کے بعد ملازم کو پوری تنخواہ نہیں دیتا، چوتھی خوبی سچائی ہوتی ہے، آپ پوری اسلامی دنیا کا مشاہدہ کر لیں آپ کو 61 اسلامی ممالک میں سچ زوال پذیر دکھائی دے گا، ہم لوگ اپنی ذات سے لے کر آئین اور قانون تک ہر چیز سے جھوٹ بولتے ہیں اور ہم لوگ ہاتھ میں قرآن اٹھا کر غلط بیانی کرتے ہیں، میرے ایک دوست کہا کرتے ہیں جو دکاندار اللہ اور رسول کی قسمیں کھائے میں اس سے سودا نہیں خریدتا اور کریکٹر کی پانچویں خوبی انصاف ہوتا ہے، اس وقت اسلامی معاشروں میں لوگوں کے ساتھ جتنی بے انصافی ہوتی ہے اس کی مثال کسی غیر اسلامی ملک میں نہیں ملتی، آج 61 اسلامی ممالک میں سے 23 ملکوں میں آمریت ہے ہم اپنی ذات سے لے کر جانوروں تک پر ظلم کرتے ہیں۔ 7 امیر اسلامی ممالک 9 غریب اسلامی ملکوں سے بچے چوری کرتے ہیں اور انہیں اونٹ دوڑ میں مروا دیتے ہیں، اسلامی ممالک کی عدالتیں تاخیر اور ناانصافی کا گڑھ ہیں اور ان سے صرف طاقتور کو انصاف ملتا ہے۔

میں نے احسن اقبال کے ساتھ اتفاق کیا، میں نے ان سے عرض کیا صفائی مسلمانوں کا نصف ایمان تھی لیکن آپ کو کسی اسلامی ملک میں صفائی نہیں ملے گی، علم مومن کی میراث تھا لیکن آج کے مومن کی جہالت سے دل گھبراتا ہے، جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق مسلمان کی پہچان ہوتا تھا لیکن آج کا مسلمان جابر سلطان کی اجازت کے باوجود کلمہ حق نہیں کہتا، شراب، زنا، جوا اور سود اسلام میں حرام ہیں لیکن یہ چاروں برائیاں تمام اسلامی ممالک میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں، پردہ اسلام کی شناخت تھا لیکن فحاشی اسلامی ممالک میں انڈسٹری کی شکل اختیار کر چکی ہے، برداشت اور اعتدال مسلمان کا طرہ امتیاز تھا لیکن پوری دنیا میں سب سے زیادہ شیشے توڑے اور سب سے زیادہ ٹائر اسلامی ملکوں میں جلائے جاتے ہیں شہریوں کے تحفظ کی بنیاد اسلام نے رکھی تھی لیکن آج حالت یہ ہے پورے یورپ میں کوئی جوان بچی سکرٹ اور شرٹ پہن کر ملک کے دوسرے کونے تک چلی جاتی ہے اور کوئی اس کی

طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا لیکن اسلامی ملک میں ایک مسلمان بچی برقعہ اوڑھ کر دوسرے محلے تک نہیں جا سکتی، اسلامی ملکوں میں مسجدوں سے جوتے، پنکھے اور لاؤڈ سپیکر چوری ہو جاتے ہیں، ہسپتالوں سے نومولود بچے اغوا کر لئے جاتے ہیں، ڈاکٹر مریضوں کے گردے نکال لیتے ہیں اور سیاستدان پارلیمنٹ ہاؤس میں یونیفارم کی حمایت میں قراردادیں پاس کرتے ہیں' یہ ہے ہمارا کریکٹر چنانچہ ہم اللہ تعالیٰ کی محبوب قوم ہونے کے باوجود پوری دنیا میں جوتے کھا رہے ہیں، ہم رو رو کر اپنی جائے نمازیں گیلی کر دیتے ہیں لیکن ہماری دعائیں، ہماری آہیں مسجد کی چھت تک نہیں جاتیں، میں نے احسن اقبال صاحب سے عرض کیا' اللہ کے نزدیک ایک باکردار کافر ایک بے ایمان اور بدکردار مسلمان سے ہزار درجے بہتر ہوتا ہے چنانچہ آج اللہ تعالیٰ ہمارے دشمنوں کو دل کھول کر نواز رہا ہے' آج ہمارے دشمنوں کا پانی تیل بن چکا ہے جبکہ ہمارا تیل بھی پانی ہو گیا ہے' آج ان کی مٹی سونا ہے جبکہ ہمارا سونا بھی مٹی کے بھاؤ بک رہا ہے' آج ہم 67 لاکھ کی فوج اور ایک ارب 48 لاکھ کی آبادی کے باوجود 4 کروڑ یہودیوں سے اپنے لبنان کو نہیں بچا سکتے' کیوں؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ جعلی دوائیں بنانے اور اونٹ ریس کرانے والوں کیلئے ابابیلیں نہیں بھجوایا کرتا' اس لئے کہ ہم پوری دنیا کو بے وقوف بنا سکتے ہیں لیکن ہم (نعوذ باللہ) اپنے خدا کو دھوکہ نہیں دے سکتے' اس لئے کہ ہم اس کے قوانین کی خلاف ورزی کر کے اس سے مدد حاصل نہیں کر سکتے۔

یہ ہمارے زوال کی چوتھی وجہ ہے۔

۞......۞......۞

نورے کی ماں

نورا مصلی میری زندگی کا پہلا کمی تھا' میں اس سے پہلے کمیوں سے واقف تھا اور نہ ہی مصلیوں کے بارے میں کچھ جانتا تھا' میں بس اتنا دیکھتا تھا بعض لوگ ہمارے گھر اور ڈیرے پر آتے ہیں' وہ سارا دن ہماری خدمت کرتے ہیں' ہمارے جھوٹے برتن دھوتے ہیں' ہمارے ڈھور ڈنگروں کو چارہ کھلاتے اور پانی پلاتے ہیں' ہمارے کھیتوں میں کام کرتے ہیں' ہمارے صحنوں میں جھاڑو دیتے ہیں' ہمارے بزرگوں کے حقے تازہ کرتے ہیں' ہماری بھینسوں کا دودھ دھوتے ہیں' ہمارے کپڑے نچوڑتے ہیں اور ہمارے مہمانوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں' میں یہ بھی دیکھتا تھا ان لوگوں کو چارپائیوں پر بیٹھنے' ہمارے بزرگوں کے حقے کو منہ لگانے اور ہمارے برتنوں میں کھانا کھانے کی اجازت نہیں' ہم سب انہیں بھائی' چاچا اور پھوپھی کہتے تھے لیکن جب وہ ہم سے ملنے آتے تھے تو وہ ہمارے سامنے چپ چاپ زمین پر بیٹھ جاتے تھے' میں ان لوگوں کو دیکھتا تھا اور سوچتا تھا ہمارے کچھ چاچے' پھوپھیاں اور بھائی تو ہمارے ساتھ چارپائیوں پر بیٹھتے ہیں' وہ ہمارے ساتھ کھاتے اور پیتے ہیں لیکن اس قسم کے بھائی' پھوپھیاں اور چاچے فاصلے پر رہتے ہیں اور زمین پر بیٹھتے ہیں' کیوں؟ مجھے اس کیوں کا جواب نہیں ملتا تھا' میں یہ بھی دیکھتا تھا ہماری ان پھپھیوں' چاچوں اور بھائیوں کے بچے بھی ہیں' یہ بچے ہمارے ہم عمر ہیں لیکن ان بچوں کو ہمارے ساتھ کھیلنے کی اجازت نہیں' ہم لوگ ان کے سامنے کھیلتے ہیں اور یہ بچے زمین پر بیٹھ کر ہمیں حسرت سے دیکھتے رہتے ہیں اور اپنے کالے ننگے بازوؤں کے ساتھ ناک صاف کرتے رہتے ہیں' میں سوچتا تھا ایسے کیوں ہے؟ مجھے اس کیوں کا جواب نہیں ملتا تھا لیکن جب میں پانچ سال کا ہوا اور میری والدہ نے مجھے سکول داخل کرایا تو مجھے ان دونوں کیوں کا جواب مل گیا' اس جواب کا نام نورا تھا' یہ نورا کون تھا؟ نورا میرا کمی تھا' مجھے سکول میں داخلے پر نئے جوتوں' نئے کپڑوں' نئے بستے' نئی تختی اور نئی کتابوں کے ساتھ نورا تحفے میں ملا تھا' میرے لیے یہ ایک انوکھا تحفہ تھا' مجھے آج بھی یاد ہے جب میں پہلی بار سکول جانے لگا تھا تو میری والدہ نے میرے سامنے ایک بچہ کھڑا کر دیا تھا اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی تھی "یہ تمہارا کمی ہے' یہ تمہارے ساتھ سکول جایا کرے گا" میں اس بچے کو دیکھ کر حیران رہ گیا' وہ کالے سیاہ رنگ کا ایک مضبوط بچہ تھا' اس کی آنکھیں سرخ' ناک کے نتھنے نیلے اور اس کے

دانت پیلے تھے' اس کے منہ سے بو آ رہی تھی اور اس کے پورے جسم پر ایک چھوٹے سائز کی شلوار تھی' یہ شلوار بے شمار پیوندوں اور داغوں سے اٹی پڑی تھی اور کثرت استعمال سے اس کا اصل رنگ تک اڑ چکا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے نورا اچھا لگا۔

نورے کی ڈیوٹیاں بہت دلچسپ تھیں' وہ میرا بستہ اور میری بوری سکول پہنچاتا تھا' میں اکڑ کر اس کے آگے آگے چلتا تھا اور نورا میری بوری اٹھا کر میرے پیچھے آتا تھا اگر کبھی مجھے اپنی ''کھوتی'' سکول لے جانے کی اجازت مل جاتی تو میں کھوتی پر بیٹھتا تھا اور نورا کھوتی کی دم کھینچ کر اس کی سپیڈ کنٹرول کرتا تھا' سکول میں اس کے تین کام ہوتے تھے' وہ میری تختی دھوتا تھا' میری سلیٹ صاف کرتا تھا' میری دوات میں پانی ڈال کر لاتا تھا اور اگر کبھی ماسٹر صاحب مجھ سے خفا ہو جاتے تو میری جگہ کان پکڑتا تھا اور ماسٹر صاحب سے میرے حصے کی مار بھی کھاتا تھا' واپسی پر وہ میرے لئے دوسروں کے کھیت سے مولیاں' گاجریں اور تربوز بھی چوری کرتا تھا' مجھے بیر بھی توڑ کر دیتا تھا اور ان ساری خدمات کے عوض میری ماں اسے ایک پراٹھا' دودھ کا ایک گلاس اور میرے پرانے کپڑے دیتی تھی' یہ کپڑے نورے کے قد کاٹھ اور جسامت کے لحاظ سے بہت تنگ اور چھوٹے ہوتے تھے لیکن اس کے باوجود نورا یہ کپڑے پہن کر بہت خوش ہوتا تھا' وہ میرے کپڑوں کی وجہ سے کمیوں کے محلے کا رئیس کہلاتا تھا۔

نورا ایک بھرپور کردار تھا اور یہ کردار بھرپور فرصت اور زیادہ تفصیل کا متقاضی ہے' میں ان شاء اللہ کسی اور وقت نورے پر پوری تفصیل سے روشنی ڈالوں گا' سردست میں نورے کی والدہ کی ایک عجیب عادت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں' نورے کی ماں اسے روز صبح ہمارے گھر چھوڑنے آتی تھی' وہ جب گھر سے نکلتی تھی تو ایک تازہ گنا توڑ کر ہاتھ میں پکڑ لیتی تھی اور اپنے گھر سے ہمارے گھر تک اس گنے سے نورے کی پٹائی کرتی آتی تھی' نورا چیخیں مارتا ہوا آگے آگے بھاگتا تھا اور اس کی ماں گنا لہراتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے' یہ روز کا معمول تھا' نورا جتنا عرصہ میری ''خدمت'' میں رہا میں نے ہمیشہ اس کے ننگے جسم پر چوٹوں کے نشان دیکھے' ان چوٹوں سے بعض اوقات خون بھی رستا تھا لیکن نورا ایک باکمال بچہ تھا' وہ ٹھیک دس پندرہ منٹ بعد ان چوٹوں کو بھول جاتا تھا اور قہقہے لگاتا ہوا کھوتی کی دم سے لٹک جاتا تھا' میں نے ایک بار اپنی ماں سے پوچھا ''اماں نورے کی ماں اسے روز کیوں مارتی ہے'' میری ماں نے عجیب جواب دیا' اس کا کہنا تھا ''تمام کمیوں کی مائیں اپنے بچوں کے ساتھ یہی سلوک کرتی ہیں'' میں نے وجہ پوچھی تو ماں نے بتایا ''ان لوگوں کا خیال ہے اس سے بچوں میں برداشت پیدا ہوتی ہے'' میں نے حیرت سے ماں کو دیکھا' انہوں نے بتایا ''ان کے بچے کمی ہوتے ہیں' انہوں نے جلد یا بدیر کسی ڈیرے پر کام کرنا ہوتا ہے' ڈیرے کے لوگ ذرا سخت طبیعت کے لوگ ہوتے ہیں لہٰذا یہ لوگ اپنے بچوں کو شروع سے مار کھانے' ذلت برداشت کرنے اور ظلم سہنے کی عادت ڈال دیتے ہیں' ان کا خیال ہوتا ہے اس سے ان کے بچوں کی آنے والی زندگی آسان ہو جاتی ہے''

مجھے نورا اور اپنی ماں کا یہ عجیب و غریب فلسفہ دونوں بھول گئے لیکن میں نے کل کے اخبار میں ایک عجیب

خبر پڑھی اس خبر نے مجھے نورا اور ماں کا فلسفہ دونوں یاد کرا دیئے' خبر یہ تھی حکومت نے کراچی ائیر پورٹ پر بیرون ملک جانے والے مسافروں کے جوتے اتروا کر تلاشی کا سلسلہ شروع کر دیا ہے' جس کے بعد سکیورٹی اہلکار بورڈنگ پاس لینے والے تمام پاکستانی مسافروں کے جوتے اور بیلٹس اترواتے ہیں' ان کے پرس' چابیاں اور موبائل نکلواتے ہیں اور ان کی بھرپور تلاشی کے بعد انہیں کلیئر کرتے ہیں' اب آپ پوچھیں گے اس خبر میں کون سی ایسی بات تھی جس نے مجھے تیس برس پرانا نورا یاد کرا دیا' اس خبر میں ایک ٹھیک ٹھاک نورا چھپا تھا' میں آپ کو ابھی اس نورے تک لے جاتا ہوں' نائین الیون کے بعد امریکہ اور سیون سیون کے بعد یورپ نے اپنے ائیر پورٹس پر پاکستانیوں کے جوتے اتروانے شروع کر دیئے تھے' انہوں نے جوتا اتروائی کی اس رسم میں بڑا کڑا میرٹ رکھا تھا' وہ سرکاری دورے پر جانے والے ہمارے وزراء' سیکرٹریوں اور جرنیلوں تک کو نہیں بخشتے تھے' پاکستانی اس سلوک پر شدید احتجاج کرتے تھے اور حکومت کو اس احتجاج پر عموماً پسپائی اختیار کرنا پڑتی تھی لہٰذا حکومت نے طویل غور و فکر کے بعد نورے کی ماں بننے کا فیصلہ کیا' اس نے اپنے ہی شہریوں کے ساتھ اپنے ائیر پورٹوں پر امریکہ اور یورپ جیسا سلوک شروع کر دیا' اس نے پاک سرزمین سے لوگوں کے جوتے اتروانے اور بیلٹس کھلوانا شروع کر دیں تاکہ ہمارے لوگوں میں برداشت پیدا ہو جائے اور جب یہ لوگ نیویارک یا لندن کے ائیر پورٹ پر اتریں اور وہاں ان کی بے عزتی ہو تو انہیں تکلیف نہ ہو اور وہ بڑی آسانی سے یہ ذلت برداشت کر جائیں' مجھے حکومت کا یہ اقدام بہت اچھا لگا اور میں دل سے ان لوگوں کی ذہانت اور فطانت کا قائل ہو گیا اور میں نے سوچا میں برادرم رانا طاہر کے ذریعے اپنے ''وژنری'' وزیراعظم صاحب سے رابطہ کروں اور ان سے درخواست کروں وہ اب مہربانی فرما کر پاکستان کے دس بارہ شہروں میں گوانتاناموبے جیسے ایکسرے کیمپ بھی بنوائیں اور پاکستان کے تمام زندہ اور مردہ شہریوں کیلئے ان کیمپوں میں ایک ایک ماہ کی ٹریننگ لازمی قرار دے دیں تاکہ جب ہمارا کوئی شہری اچانک غائب ہو جائے تو اس کے لواحقین کو اور اسے زیادہ تکلیف نہ ہو اور وہ اس ذلت اور اس دکھ کو کمین لوگوں کیلئے حکومت کا نارمل پیکج سمجھے اور نورے کی طرح دس منٹ بعد اپنی ساری تکلیف بھلا کر کھوتی کی دم سے لٹک جائے۔

بھائی لوگوں کی خدمت

ممبئی بھارت کا سب سے بڑا شہر ہے، اس کی آبادی ڈیڑھ کروڑ ہے۔ اس شہر میں دو قسم کی حکومتیں ہیں، ایک حکومت سرکار کہلاتی ہے اور اسے مہاراشٹر کا وزیراعلیٰ چلاتا ہے جبکہ دوسری حکومت غیر سرکاری ہے اور یہ ''انڈر ورلڈ'' کے احکامات سے چلتی ہے۔ ممبئی کی انڈرورلڈ دنیا میں پانچویں نمبر پر آتی ہے۔ ممبئی شہر کی تمام گلیاں، کوچے، بازار اور آبادیاں مختلف بدمعاشوں، کن ٹٹوں اور غنڈوں کے قبضے میں ہیں۔ یہ لوگ فٹ پاتھ پر بھیک مانگنے والوں سے لے کر ملٹی سٹوریز بلڈنگ کے مالکان تک سے بھتہ لیتے ہیں۔ یہ لوگ اس بھتے کو اپنی زبان میں ''ہفتہ'' کہتے ہیں۔ ممبئی میں اگر کوئی شریف انسان ہفتہ دینے سے انکار کرے یا وہ کسی مجبوری کے باعث بھتہ دینے کے قابل نہ ہو تو یہ لوگ اسے سرعام پیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ اس عمل کو ''دھلائی'' کہتے ہیں۔ انڈرورلڈ کے ایجنٹ شہر کے مختلف علاقوں سے ''ہفتے'' جمع کر کے بڑے غنڈے تک پہنچاتے ہیں۔ یہ بڑے غنڈے سیکٹر انچارج کہلاتے ہیں اور سیکٹر انچارج یہ مال اپنے سے بڑے غنڈے تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہ بڑا غنڈہ ممبئی کی زبان میں ''بھائی'' کہلاتا ہے۔ یہ شخص بنیادی طور پر ممبئی کا اصل مالک ہوتا ہے اور ممبئی کی تجارت سے لیکر سیاست تک ہر شعبہ اس کی انگلیوں پر ناچتا ہے، ممبئی میں اس کی اجازت کے بغیر پتہ تک نہیں ہل سکتا۔ یہ ''بھائی'' فوج کی طرح کام کرتا ہے۔ اس کے ہزاروں کارکن شہر میں بکھرے ہوتے ہیں' یہ لوگ اسے پل پل کی خبر دیتے رہتے ہیں۔ بھائی الیکشن میں اپنی مرضی کے لوگوں کو منتخب کراتا ہے، یہ پولیس چیف تک تبدیل کرا دیتا ہے۔ ''بھائی'' کے خاص کارندے ''چھوٹے'' کہلاتے ہیں۔ یہ چھوٹے ''بھائی'' کے جانثار ہوتے ہیں اور ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے بھائی کی عزت اور خدمت کا خیال رکھنا۔ یہ بھائی کی آن، شان اور جان پر اپنی اور اپنے خاندان کی جان قربان کر دیتے ہیں۔ چھوٹوں کے گھر میں آٹا ہو یا نہ ہو، ان کی بیوی کو دوا ملے یا نہ ملے، ان کے باپ کو کفن نصیب ہو یا نہ ہو اور ان کے سر پر چھت ہو یا نہ ہو انہیں اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی' یہ لوگ بس بھائی کے لیے جیتے اور بھائی کے لیے مرتے ہیں۔ ان بھائی لوگوں کی روایات بھی بڑی دلچسپ ہیں مثلاً یہ لوگ جب اپنے ساتھیوں کو جمع کرتے ہیں تو ایک کوڈ ورڈ بولتے ہیں ''فلاں نے بھائی کو گالی دی'' یہ کوڈ ورڈ سن کر تمام غنڈے جمع ہو جاتے ہیں اور ''تو نے بھائی کو گالی دی'' کا نعرہ لگا کر ہدف پر پل پڑتے ہیں۔

میں پچھلے پانچ برسوں سے جب بھی اخبارات پڑھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے امریکہ پاکستان کا

''بھائی'' بن چکا ہے اور پاکستان نے بین الاقوامی سطح پر اپنے لیے چھوٹے کا کردار منتخب کر لیا ہے لہٰذا دنیا کے کسی بھی کونے میں کوئی شخص امریکہ کی عزت اور حرمت کی طرف انگلی اٹھاتا ہے تو ہم فوری طور پر ''تو نے بھائی کو گالی دی'' کا نعرہ لگاتے ہیں اور ہدف پر پل پڑتے ہیں۔ اگر یقین نہ آئے تو آپ شمالی اور جنوبی وزیرستان کو دیکھ لیجئے، ہم وہاں کیا کر رہے ہیں، امریکہ کا خیال ہے ان بنجر، بے آب و گیاہ اور دور دراز علاقوں میں دہشت گرد پروان چڑھ رہے ہیں' امریکی ماہرین کو خدشہ ہے یہ دہشت گرد خچروں اور گھوڑوں پر بیٹھ کر امریکہ پہنچ جائیں گے اور مسواکوں اور تسبیحوں سے امریکہ کو تباہ کر دیں گے۔ امریکہ کو داتا کے غریبوں، ناداروں اور بے بس لوگوں سے خطرہ ہے لہٰذا ہم لوگ امریکہ کی محبت میں ان لوگوں پر گولیاں اور گولے برسا رہے ہیں۔ ہماری چھوٹا گیری کا یہ عالم ہے امریکہ کے کسی دانشور کو خواب میں اسامہ بن لادن نظر آ جاتا ہے تو ہم فوراً اسامہ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ کوئی امریکی کلرک کوئٹہ میں حکمت یار یا ملا عمر کی نشاندہی کر دیتا ہے تو ہم پورا علاقہ چھان مارتے ہیں اور ہم ''بھائی'' کی خدمت کرتے ہوئے یہ تک بھول جاتے ہیں اس وقت ہمارا سارا ملک لا اینڈ آرڈر کے شدید مسائل کا شکار ہے۔ صوبہ سرحد میں ڈی آئی جی قتل ہو رہے ہیں، لاہور جیسے شہر میں ڈی آئی جی کو لٹیرے لوٹ رہے ہیں اور ہمارے آئی جی یہ اعتراف کر رہے ہیں پنجاب میں پچیس تیس مافیاز ہیں اور ان مافیاز نے پورے صوبے کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ ہم ''بھائی'' کی خدمت کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں پاکستان کے پانچ بڑے شہروں میں روزانہ دو سے چار ہزار وارداتیں ہوتی ہیں اور ہمارا' موٹروے تک اب ڈاکوؤں سے محفوظ نہیں رہی، ہم رات نو بجے کے بعد کسی برانچ روڈ پر سفر نہیں کر سکتے اور مغرب کے بعد ملک میں حکومت عملاً ختم ہو جاتی ہے۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں پاکستان کے تمام بڑے شہروں کے دفتروں اور گھروں کے باہر سکیورٹی گارڈز کھڑے ہیں، ہمیں ہر دوسری گاڑی میں ایک سکیورٹی گارڈ اور کلاشنکوف دکھائی دیتی ہے، تمام صاحب ثروت لوگوں کی گاڑیوں کے آگے پیچھے اب سکیورٹی کی گاڑیاں ہوتی ہیں، لوگ اپنے بچوں کو ''سکیورٹی کور'' میں سکول بھجواتے ہیں، ہمارے پولیس افسروں تک نے ذاتی گارڈز رکھے ہوئے ہیں اور ہمارے ملک میں سکیورٹی کا یہ عالم ہے میرے ایک دوست نے اپنے والد کے لیے گارڈز رکھ لئے ہیں۔ یہ گارڈز والد صاحب کو مسجد میں نماز پڑھاتے ہیں اور میرے دوست کے بزرگ جب نماز کیلئے نکلتے ہیں تو گارڈز انہیں سکیورٹی کور دیتے ہیں اور جتنی دیر بزرگ مسجد میں رہتے ہیں گارڈز ان کے پیچھے کھڑے رہتے ہیں۔ موبائل اور پرس کا چھینا جانا ہمارے معمول کا حصہ بن چکا ہے۔ صرف کراچی شہر میں روزانہ تین ہزار موبائل چھینے جاتے ہیں، ملک میں ڈاکوں کی یہ حالت ہے آپ کسی دن کا اخبار کھول کر دیکھ لیں آپ کو اس میں دس بیس ڈاکوں کی خبر ضرور ملے گی۔ عوام اس صورتحال کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ وہ روز لٹتے ہیں لیکن وہ تھانے نہیں جاتے۔ لا اینڈ آرڈر کی یہ حالت ہے اب لوگ قتل کے خلاف رپورٹ درج کرانے کی بجائے خود انصاف کرتے ہیں اور چپ چاپ پھانسی چڑھ جاتے ہیں، اس وقت ملک میں ریکارڈ اشتہاری موجود ہیں اور پولیس کو کسی بھی دور میں اتنے لوگ مطلوب نہیں تھے، پچھلے سال پاکستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ لوگوں کو پھانسی کی سزا ہوئی اور ملک میں امن و امان کی یہ حالت ہے وزیر اعلیٰ پنجاب تک پولیس کو یہ دھمکی دینے پر مجبور

ہو چکے ہیں کہ اگر کوئی ایس ایچ او کام نہیں کرے گا تو اسے نوکری سے فارغ کر دیا جائے گا لیکن حکومت ان حالات پر توجہ کی بجائے ''بڑے بھائی'' کی خدمت میں مصروف ہے۔

آپ ملک میں لا اینڈ آرڈر کی صورتحال دیکھئے دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی سپریم کورٹ نے پولیس کی تنخواہیں روکنے کی دھمکی دی ہے۔ لوگ ملک میں بجلی کا بل جمع کرانے کے لیے ڈاکے مارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، بچوں کی لڑائیاں قتل وغارت گری تک پہنچ جاتی ہیں، پاکستان میں خالص دوا ملتی ہے اور نہ پانی اور آٹا، ہمارے ایک وفاقی وزیر پچھلے دنوں افریقہ سے ہیرے سمگل کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ ہاؤسنگ سکیمیں لوگوں کے اربوں روپے لوٹ کر کھا گئیں، لوگوں نے نیب کو ''ایکشن کمیشن'' کا نام دے دیا ہے اور ملک میں شراب کے کنٹینر کے کنٹینرز آ رہے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں، ملک میں مسجدیں فرقہ واریت کا میدان جنگ بن چکی ہیں۔ اسلام کے نام پر بننے والے ملک میں ہر محرم پر سکیورٹی الرٹ ہو جاتی ہے۔ ملک میں عاشورہ پر موٹر سائیکل کی دوسری سواری پر پابندی لگ جاتی ہے اور اس ملک میں لوگ رائفلوں کے سائے میں جنازے پڑھتے ہیں لیکن ہماری حکومت کے پاس ان مسائل کے لیے کوئی وقت نہیں، ہم نے آج تک اس ملک میں جعلی دواؤں، جعلی خوراک اور جعلی ہاؤسنگ سکیموں کے خلاف کوئی آپریشن نہیں کیا۔ ہمارے پاس ناجائز تجاوزات تک دور کرنے کیلئے وقت نہیں۔ انسانی سمگلر دس دس لاکھ روپے لے کر ہمارے نوجوانوں کو مرنے کے لیے ایران کے بارڈر پر چھوڑ آتے ہیں لیکن ہمارے پاس ان انسانی سمگلروں سے نمٹنے کیلئے بھی وقت نہیں اور ہمارے پاس ڈاکوؤں، رسہ گیروں اور چوروں سے مقابلے کے لیے وقت نہیں۔ آپ ذرا غور کیجئے ہم لوگ 18 سو کلو میٹر لمبی افغان سرحد کی ذمہ داری تو اٹھا لیتے ہیں لیکن ہم کراچی، لاہور، پشاور اور فیصل آباد کے شہریوں کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ ہم امریکیوں پر ہونے والے حملوں کی روک تھام تو کر سکتے ہیں اور ہم لوگ برطانیہ کے طیاروں کو لاحق خطرات کا پیشگی اندازہ تو لگا سکتے ہیں لیکن ہم لاہور میں ڈی آئی جی کو لٹنے سے نہیں بچا سکتے، ہم لاہور اور کراچی کے شہریوں کی طرف بڑھتے خطرات کا اندازہ نہیں لگا سکتے، ہمارے پاس سات سمندر پار لیٹے صدر بش کے لیے تو وقت ہے لیکن ہمارے پاس اپنے ہمسائے میں بیٹھے اس بشیر کیلئے کوئی وقت نہیں جس کے ٹیکس، جس کے خون اور جس کے پسینے سے یہ ملک چل رہا ہے۔ ہم امریکہ اور امریکی مفادات کی حفاظت تو کر سکتے ہیں لیکن ہم اپنے شہریوں کی جان اور مال کا احساس نہیں کر سکتے' میرا خیال ہے ہم پوری طرح چھوٹے بن چکے ہیں اور اب دنیا میں ہماری صرف اور صرف ایک ہی ذمہ داری رہ گئی ہے ہم صرف بھائی لوگوں کی خدمت کریں اور ہم بھائی کو گالی دینے والوں سے انتقام لیتے رہیں' میرا کبھی کبھی دل چاہتا ہے میں ''بڑے بھائی'' جناب صدر بش سے درخواست کروں وہ ہمارے حکمرانوں کو فون کریں اور انہیں یہ دھمکی دیں ''تم لا اینڈ آرڈر ٹھیک کرو ورنہ ہم تمہارا تورا بورہ بنا دیں گے'' میرا خیال ہے ہمارے ملک میں اب لا اینڈ آرڈر صرف اسی وقت ٹھیک ہو سکتا ہے جب امریکہ کو پاکستان میں ایک اچھی پولیس درکار ہوگی' جب انکل سام جی چاہیں گے اور جب تک وہ وقت نہیں آتا ہم اسی طرح بھائی لوگوں کی خدمت کرتے رہیں گے۔

جادوگر

جان غیر ملکی صحافی ہے' وہ تھائی لینڈ میں ایک امریکی اخبار کا بیورو چیف ہے' ایشیا کے چار ممالک پاکستان' افغانستان' ایران اور بھارت بھی اس کے دائرہ کار میں آتے ہیں' وہ خبروں کی تلاش میں اکثر پاکستان آتا رہتا ہے' وہ جب بھی پاکستان آتا ہے تو اس کے ساتھ میری ملاقاتیں رہتی ہیں۔ وہ چند روز پہلے ایم کیو ایم ایشو کی کوریج کیلئے اسلام آباد آیا' ہم دونوں ڈنر کے لئے دامن کوہ چلے گئے وہاں ہماری حالات حاضرہ پر گپ شپ شروع ہو گئی' اس گپ شپ کے دوران جان نے بڑے پتے کی بات کہی' اس نے کہا ''دنیا میں عورت' الیکشن اور کرکٹ کے بارے میں پیشن گوئی نہیں کی جا سکتی'' میں نے پوچھا ''وہ کیسے'' وہ مسکرا کر بولا ''عورت کے موڈز میں بڑی تیزی سے تبدیلی آتی ہے وہ پانچ منٹ میں قہقہہ بھی لگا سکتی ہے' دھاڑیں مار کر رو بھی سکتی ہے اور انہی پانچ منٹوں میں کسی کے سر پر گملا بھی مار سکتی ہے'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا' جان بولا ''الیکشن بھی عورت کی طرح ہوتے ہیں' ان کے موڈز کے بارے میں بھی پیشن گوئی نہیں کی جا سکتی'' جان کا کہنا تھا ''ووٹر اور بیلٹ بکس کے درمیان پانچ فٹ کا فاصلہ ہوتا ہے لیکن یہ دنیا کا حساس اور قیمتی ترین فاصلہ ہوتا ہے' اس پانچ فٹ کے فاصلے کے دوران 30 فیصد ووٹر اپنا فیصلہ تبدیل کر لیتے ہیں اور 30 فیصد ووٹر کی یہ تبدیلی ہزاروں لاکھوں لوگوں کا مقدر بدل دیتی ہے'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا' وہ مسکرایا۔ ''کرکٹ بھی عورت اور الیکشن کی طرح ہوتی ہے' اس کھیل میں آخری گیند پر ایک چھکا ہاری ہوئی ٹیم کو فتح یاب کر دیتا ہے اور ایک وکٹ گرنے پر جیتتی ہوئی ٹیم ہار جاتی ہے' اس کھیل میں کسی وقت ایک باؤلر اچھا بیٹسمین ثابت ہو سکتا ہے اور کسی بھی وقت ایک بیٹسمین باؤلر بن سکتا ہے'' وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے قہقہہ لگایا اور بڑے پیار سے عرض کیا ''جان تم پوری دنیا کے بارے میں یہ رائے دے سکتے ہو لیکن جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے ہم دنیا کی پہلی سائنسی قوم ہیں جس نے کم از کم کرکٹ اور الیکشن کو پیشن گوئی کے قابل بنا دیا'' وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا' میں نے عرض کیا ''جب ہماری ٹیم میدان میں اترتی ہے تو گوالمنڈی کے بٹ صاحب تک کو کھیل کے نتیجے کا پتہ ہوتا ہے' وہ صبح دس بجے اعلان کر دیتے ہیں شام کو کون سی ٹیم جیتے گی اور ان کی پیشن گوئی سو فیصد سچ ثابت ہوتی ہے'' جان نے جذباتی ہو کر کہا ''تم لوگوں کے بٹ تو بڑے جینئس ہیں'' میں نے عرض کیا ''ہمارے بٹ نہیں ہمارے بکی بڑے جینئس ہیں'' اس نے قہقہہ لگایا اور اس کے بعد بولا ''اور الیکشن'' میں۔ نے قہقہہ لگایا اور اس سے الٹا سوال پوچھا ''اگر آج امریکہ میں پارٹی الیکشن ہوں تو کیا تم بتا

سکتے ہو ڈیموکریٹک پارٹی اور ری پبلکن پارٹی کا صدر کون ہو گا؟'' اس نے فوراً انکار میں سر ہلا دیا' میں نے مسکرا کر جواب دیا ''لیکن ہم پاکستان میں پارٹی الیکشن سے پہلے یہ پیشن گوئی کر سکتے ہیں کون صاحب کس پارٹی کے صدر منتخب ہوں گے'' اس نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر مسکرا کر بولا ''مثلاً'' میں نے جواب دیا ''مثلاً تم نے پچھلی ملاقات میں مجھ سے پوچھا تھا' مسلم لیگ ق کے صوبائی الیکشنوں میں کون کون صدر منتخب ہو گا'' میں نے تمہیں بتایا تھا پنجاب سے چوہدری پرویز الٰہی' بلوچستان سے جام یوسف اور سندھ سے ارباب غلام رحیم منتخب ہوں گے'' آج دیکھ لو یہ حضرات صدر منتخب ہو چکے ہیں'' اس نے فوراً ہاں میں سر ہلا دیا' میں نے عرض کیا ''تمہیں معلوم ہے مجھے یہ کس نے بتایا تھا'' اس نے انکار میں سر ہلا دیا' میں نے مسکرا کر جواب دیا ''میرے ڈرائیور نے'' وہ چونک کر سیدھا بیٹھ گیا اور حیرت سے بولا ''تمہارا ڈرائیور بھی جینئس ہے'' میں نے انکار میں سر ہلا دیا ''صرف میرا ڈرائیور نہیں بلکہ اس ملک کے ساڑھے پندرہ کروڑ لوگوں کو اس کا علم تھا' ہم میں سے ہر شخص الیکشن کمشنر ہے اور ہر شخص پولیٹیکل جینئس ہے' ہم سب پارٹی الیکشن سے ایک دو سال پہلے اس کے نتائج سے واقف ہو جاتے ہیں'' جان سر ہلا کر بولا ''بڑی حیران کن بات ہے'' میں نے عرض کیا ''میں تمہیں مزید حیران کن بات بتاتا ہوں' چند دن بعد مسلم لیگ ق کے مرکزی صدر کے الیکشن ہوں گے' میں آج پیشن گوئی کرتا ہوں اس الیکشن میں چوہدری شجاعت حسین صدر منتخب ہوں گے'' اس نے حیران ہو کر کہا ''ڈونٹ ٹیل می' تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو'' میں نے عرض کیا ''جس طرح میں نے صوبائی صدور کے بارے میں وثوق سے دعویٰ کیا تھا' اسی طرح تم آج لکھ لو دنیا ادھر سے ادھر ہو سکتی ہے لیکن مسلم لیگ قائداعظم کے صدر چوہدری شجاعت ہی ہوں گے اور جب تک صدر پرویز مشرف برسر اقتدار ہیں چوہدری صاحب منتخب ہوتے رہیں گے''

اس نے تھوڑی دیر سوچا اور سنجیدگی سے بولا ''میں نے پچھلے دنوں وزیراعلیٰ پنجاب چوہدری پرویز الٰہی کا ایک بیان پڑھا تھا' اس بیان میں چیف منسٹر نے دعویٰ کیا تھا وہ جنرل پرویز مشرف کو موجودہ اسمبلیوں سے دوبار صدر منتخب کرا سکتے ہیں' مجھے سمجھ نہیں آئی جس چیز کی آئین اور قانون میں ایک بار گنجائش موجود نہیں تمہارے چیف منسٹر وہ کام دوبار کیسے کرائیں گے'' میں نے قہقہہ لگایا اور تھوڑا سا سوچ کر جواب دیا ''وہ ایک جینئس سیاستدان ہیں اگر انہیں یہ ٹاسک دے دیا جائے تو میرا دعویٰ ہے وہ یہ کام اٹھارہ مرتبہ کر سکتے ہیں'' جان پریشان ہو گیا' اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور تھکی تھکی آواز میں بولا ''لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟'' میں ذرا سا آگے جھکا اور آہستہ آہستہ عرض کیا ''ہمارے مسلم لیگی قائدین جادوگر ہیں' یہ لوگ اگر کرنے پر آ جائیں تو پوری دنیا کو حیران کر سکتے ہیں'' اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور پریشان لہجے میں پوچھا ''مثلاً'' میں نے ہنس کر جواب دیا ''مثلاً یہ ملک محمد علی جناحؒ نے بنایا تھا اور محمد علی جناحؒ کو قائداعظم ان کی بہن محترمہ فاطمہ جناح نے بنایا تھا لیکن ہماری مسلم لیگ نے صدر ایوب خان کی محبت میں اسی فاطمہ جناح کو الیکشن میں شکست دے دی تھی' یہ مسلم لیگ کی تاریخ ہے یہ جب ٹھان لیتی ہے تو یہ فاطمہ جناح تک کو خاطر میں نہیں لاتی' مجھے یقین ہے اگر آج قائداعظمؒ زندہ ہوتے تو وہ بھی مسلم لیگ ق کے ہاتھوں شکست کھا جاتے''

☆.....☆.....☆

نمک کی چٹان پر گنا

ہمارے محبوب وزیر اعظم جناب شوکت عزیز 1982ء سے 1984ء تک ملائیشیا میں رہے ہیں' وہ ملائیشیا میں سٹی بینک کے کنٹری چیف آفیسر تھے' پچھلے دنوں انہوں نے ایک محفل میں ملائیشیا میں اپنے قیام کی چند یادیں دہرائیں' انہوں نے بتایا ملائیشیا میں ایک دن وہ گملوں کو پانی دے رہے تھے' ان کی ذرا سی بے احتیاطی سے پانی گملے سے باہر گر گیا اور فرش گیلا ہو گیا' ملائیشیا میں گند ڈالنا جرم ہے چنانچہ انہیں سو ڈالر جرمانہ ہو گیا' انہوں نے معافی تلافی کی بڑی کوشش کی لیکن انہیں یہ جرمانہ بہر حال ادا کرنا پڑا' وزیر اعظم نے یہ واقعہ کیوں سنایا؟ میں پچھلے پانچ چھ دن سے حیران ہوں' شاید وزیر اعظم اس واقعے سے ملائیشیا میں ''رول آف لاء'' کی صورتحال بتانا چاہتے ہوں' شاید وہ ملائیشیا میں صفائی کی اہمیت ثابت کرنا چاہتے ہوں یا وہ پاکستان میں قانون کی صورتحال اور ہمارے گھروں سے سڑکوں تک پھیلی گندگی کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہوں' یہ بتانا چاہتے ہوں ایک اسلامی ملک صفائی کو کس قدر سنجیدہ لیتا ہے' میں ابھی تک حیران ہوں' اگر ہم صفائی کا پس منظر دیکھیں تو اسلام دنیا کا پہلا مذہب تھا جس کا آغاز صفائی سے ہوا' اسلام کے ابتدائی دنوں میں جب کوئی شخص اسلام قبول کرتا تھا تو نبی اکرمؐ اسے سب سے پہلے طہارت اور وضو کا طریقہ سکھاتے تھے' مدینہ منورہ میں ایسے صحابہ کرامؓ موجود تھے جو ایک وضو سے پانچ نمازیں ادا کرتے تھے' پاکیزگی اس دور میں تقویٰ کا حصہ ہوتی تھی' مدینہ میں تمام لوگوں کے لباس صاف اور خوشبودار ہوتے تھے' اسلام کے ابتدائی دنوں میں نبی رسالتؐ اور صحابہ اکرامؓ کے پاس ستر ڈھانپنے کے لئے صرف دو چادریں ہوتی تھیں اور ان پر بھی دس دس بیس بیس پیوند لگے ہوتے تھے لیکن دونوں چادریں پاک اور صاف ہوتی تھیں' اسلام پہلا مذہب تھا جس نے ماحول کی صفائی کو عبادت کا درجہ دیا' اسلام نے شجر کاری کو با قاعدہ معاشرے کا حصہ بنایا' آپؐ نے فرمایا اگر میرے ہاتھ میں ایک سوکھی ٹہنی ہو اور دوسری طرف صور اسرافیل پھونکا جا رہا ہو تو میں یہ ٹہنی فوراً زمین میں بو دوں گا' اسلام جانوروں کو گلیوں' بازاروں میں کھلا چھوڑنے کے خلاف تھا' راستے میں کھونٹا گاڑنے اور گھروں کا گند دروازے کے باہر پھینکنے کو انتہائی ناپسندیدہ فعل سمجھا جاتا تھا' اس کے برعکس اگر آپ اس زمانے کے دوسرے مذاہب اور معاشروں کا جائزہ لیں تو آپ کو ان میں صفائی کا یہ تصور نہیں ملے گا' میں پیرس شہر میں وارسائی گیا' وارسائی فرانسیسی بادشاہوں کا گرمائی دارالحکومت تھا' وہاں بادشاہوں کے محلات تھے' یہ محلات 1789ء کے

فرنچ انقلاب کے بعد خالی کرالئے گئے اور وہ اب عجائب گھر بن چکے ہیں' یہ انتہائی خوبصورت اور پر تعیش محلات ہیں' ان کی چھتوں پر سونے سے تصویریں بنی ہیں اور دہلیز سے لے کر باغوں تک سنگ مرمر نصب ہے لیکن اس پورے محل میں کوئی غسل خانہ اور کوئی ٹوائلٹ نہیں' میں نے محلات کی سیر کے بعد سوچا "بادشاہ لوگ بوقت ضرورت کہاں جاتے تھے" پتہ چلا بادشاہ سلامت تخت پر بیٹھے بیٹھے اشارہ کرتے تھے اور خادم سونے کا پیالہ لے کر حاضر ہو جاتے تھے اور بادشاہ سلامت وہیں بیٹھے بیٹھے فارغ ہو جاتے تھے جبکہ درباریوں کے لئے دربار سے ذرا سا ہٹ کر پردے لگے تھے اور ان پردوں کے پیچھے خادم پیتل کی بالٹیاں لے کر کھڑے ہوتے تھے' درباری ان بالٹیوں میں پیشاب کرتے تھے' درباریوں کی فراغت کے بعد پردے کے آگے پیچھے خوشبو چھڑک دی جاتی تھی' فرانس کی پرفیوم انڈسٹری نے انہیں پردوں سے جنم لیا تھا' پتہ چلا فرانس کا پہلا ٹوائلٹ 1852ء میں بنا تھا اور 1902ء میں پیرس کے لوگوں کو نہانے پر مجبور کرنے کیلئے باقاعدہ قانون سازی کرنا پڑی تھی جبکہ اس کے مقابلے میں قرطبہ کی اسلامی حکومت نے 785ء میں شہر کا پہلا سیوریج سسٹم بنایا تھا' اموی دور میں قرطبہ شہر کے ہر گھر میں ٹوائلٹ اور غسل خانہ ہوتا تھا' پورے شہر میں پبلک ٹوائلٹس اور غسل خانے بھی تھے' ان غسل خانوں اور ٹوائلٹس کے آثار آج بھی موجود ہیں' پندرھویں صدی میں اندلس کی اسلامی ریاست کے زوال کے بعد فرڈیننڈ ونے غرناطہ کے محل سے ایک غسل خانہ اکھاڑہ اور یہ غسل خانہ ملکہ ازابیلہ کو تحفے میں دے دیا' عباسی خلفاء کے دور میں بغداد سے لے کر سمرقند تک درخت کاٹنے اور سڑکوں پر گند پھیلانے کی سزا دس کوڑے ہوتی تھی اور مجرم کو اس سزا کے بعد شہر میں سو درخت بھی لگانا پڑتے تھے اور دس دن تک سڑک پر جھاڑو بھی دینا پڑتا تھا اور امیر تیمور کے دور میں سمرقند دنیا کا صاف ترین شہر تھا' یہ وہ ادوار تھے جب یورپ اپنے بدترین دور سے گزر رہا تھا' لندن میں ٹخنوں تک کیچڑ اور لید ہوتی تھی اور دنیا کا کوئی فاتح اس گندے جزیرے پر پاؤں تک رکھنا پسند نہیں کرتا تھا لیکن پھر یورپ جاگا اور اس نے محسوس کیا ترقی اور صفائی کا ایک دوسرے سے انگوٹھی اور نگینے کا تعلق ہے اور جب تک کوئی قوم صفائی کو اپنا پورا ایمان نہیں بناتی اس وقت تک وہ ترقی یافتہ اقوام کی فہرست میں شامل نہیں ہو سکتی لہٰذا یورپ نے اسلام کے فلسفہ صفائی کو قانون بنا دیا جس کے نتیجے میں یورپ ترقی کے اس مقام پر چلا گیا جو اس وقت پورے عالم اسلام کی خواہش ہے' آپ آج دنیا کی تمام ترقی یافتہ اقوام کا دورہ کرلیں آپ کو ان سب میں ایک چیز مشترک ملے گی اور وہ چیز ہوگی صفائی' اسی طرح آپ دنیا کے تمام پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ ممالک میں بھی جا کر دیکھ لیں آپ کو وہاں بھی ایک چیز مشترک نظر آئے گی اور وہ چیز ہوگی گندگی' آپ کو تمام پسماندہ ممالک کی گلیاں' بازار' سڑکیں اور گھر گندے ملیں گے' آپ کو وہاں بدبو' گرد' غبار اور کچرا ملے گا اور بدقسمتی سے آج پورا عالم اسلام بدبو اور پسماندگی کا دارالحکومت ہے' گندگی کے اس دارالحکومت میں ہمیں صرف ملائیشیا مختلف نظر آتا ہے۔ ملائیشیا کی ترقی کا آغاز بھی صفائی سے ہوا تھا' مہاتیر محمد نے 1980ء میں صفائی کو قانون کی شکل دی تھی' 1980ء میں ملائشیا میں گند ڈالنے اور پھیلانے والوں کیلئے بھاری جرمانے طے کئے گئے تھے اور ان سزاؤں پر پورا پورا عملدرآمد ہوا تھا لہٰذا آج ملائیشیا اسلامی دنیا کا واحد ملک ہے' جس میں آپ کو یورپی معیار کی صفائی اور ستھرائی ملتی ہے' آپ کو کوالالمپور شہر میں فائیو سٹار ہوٹلوں کے معیار کے پبلک ٹوائلٹس ملتے ہیں اور آپ کو کسی شہر کی کسی

سڑک پر تنکا اور ٹشو پیپر دکھائی نہیں دیتا۔

ملائشیا کے مقابلے میں ہم اگر جناب شوکت عزیز کے پاکستان کا جائزہ لیں تو ہمیں اس ملک کی کوئی سڑک صاف ملتی ہے اور نہ ہی کوئی گلی' کوئی محلہ' آپ کراچی سے اسلام آباد تک دیکھ لیں آپ کو یقین نہیں آئے گا' یہ اسی شوکت عزیز صاحب کا ملک ہے جن کی زندگی کا بڑا حصہ دنیا کے ترقی یافتہ اور صاف ستھرے ملکوں میں گزرا تھا' آپ کو یقین نہیں آئے گا یہ شوکت عزیز صاحب جیسے وژنری وزیر اعظم کا ملک ہے' اس کی کیا وجہ ہے؟ میرا خیال ہے اس کی وجہ ہمارے وزیر اعظم کی ترجیحات ہیں ان کی ترجیحات میں تمام چیزیں موجود ہیں لیکن ان میں صفائی کی کوئی گنجائش نہیں۔ وزیر اعظم اس ملک کو ترقی یافتہ ملک دیکھنا چاہتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ بھول جاتے ہیں ترقی صفائی کی ''بائی پراڈکٹ'' ہوتی ہے اور جس ملک کے عوام گھر کا کچرا گلی میں پھینک رہے ہوں یا سگریٹ' ٹشو اور بوتلیں سڑک پر پھینک رہے ہوں وہ ملک ترقی نہیں کر سکتا' ملکوں کی ترقی ٹوائلٹس' باتھ رومز اور کچرے کی ٹوکریوں سے شروع ہوتی ہے اور جو قومیں اپنی ''ایش ٹرے'' تک صاف نہیں کرتیں وہ جدید دور میں داخل نہیں ہو سکتیں' ہمارے وزیر اعظم بھول جاتے ہیں امریکہ ہو' سنگاپور ہو یا مہاتیر محمد کا ملائشیا ترقی صفائی کے پیٹ سے جنم لیتی ہے اور جو قومیں صفائی کو اپنا ایمان نہیں بناتیں ترقی کبھی ان کا مقدر نہیں بنتی اور صفائی کے بغیر ترقی کا خواب دیکھنا نمک کی چٹان پر گنا اگانے کی خواہش سے مختلف نہیں۔

خواہشوں کا دن

24 ستمبر کو ہم ایمسٹرڈیم سے پیرس روانہ ہوئے' مخدوم عباس گاڑی چلا رہے تھے' مخدوم صاحب پکے لاہوریے ہیں' وہ تین برس قبل یورپ آئے اور انہوں نے سویڈن میں چاولوں کی پراسیسنگ کا بڑا یونٹ لگایا' اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور ان کا کاروبار دنوں میں پورے یورپ میں پھیل گیا' وہ اس وقت یورپ میں تیزی سے ترقی کرنے والے پاکستانیوں میں شمار ہوتے ہیں' وہ مجھ سے ملنے کے لئے سویڈن سے ایمسٹرڈیم تشریف لائے تھے' ہم دونوں 24 ستمبر کی شام پیرس کے لئے روانہ ہوئے تھے' جب ہم بیلجیئم پہنچے تو اچانک برادرم طارق بھٹی کا فون آ گیا' طارق شریف بھٹی گوجر خان کے رہنے والے ہیں' اٹلی میں ان کی ٹیلی کمیونیکیشن کی کمپنی ہے' ان کی کمپنی یورپ کے گیارہ ملکوں میں کام کرتی ہے اور اٹلی کی ٹیلی کمیونیکیشن انڈسٹری میں ان کا شیئر 35 فیصد ہے' انہوں نے پیرس میں جرابیں بیچنے سے عملی زندگی کا آغاز کیا تھا لیکن صرف 30 برس بعد وہ نہ صرف یورپ کے خوشحال ترین پاکستانی ہیں بلکہ اٹلی کے صدر تک ان کے نام اور کام سے واقف ہیں' پاکستان میں صدر پرویز مشرف اور وزیراعظم شوکت عزیز کے ساتھ ان کے دیرینہ مراسم ہیں' طارق بھٹی کی آواز میں پریشانی تھی' ان کا کہنا تھا پاکستان میں دوپہر سے مختلف افواہیں گردش کر رہی ہیں۔ بعض لوگ کہہ رہے ہیں امریکہ میں صدر پرویز مشرف کو ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے' چند لوگوں کا کہنا ہے پاکستان میں فوج کے جونیئر افسروں نے حکومت کا تختہ الٹ دیا ہے' بعض لوگ دعویٰ کر رہے ہیں صدر مشرف نے وزیراعظم شوکت عزیز کی حکومت معطل کر دی ہے اور ان کی جگہ سید مشاہد حسین کو وزیراعظم بنا دیا ہے اور بعض لوگ کہہ رہے ہیں چوہدری شجاعت حسین کی طبیعت خراب ہو گئی ہے اور شوکت عزیز نے مسلم لیگ ق کے صدر کا عہدہ بھی سنبھال لیا ہے وغیرہ آپ مہربانی فرما کر پاکستان فون کریں اور حالات کا جائزہ لیں' میں نے فوری طور پر پاکستان میں مختلف دوستوں سے رابطے کئے' معلوم ہوا ساری اطلاعات محض افواہیں' خدشات اور خواہشیں ہیں اصل واقعہ بجلی کا طویل بریک ڈاؤن ہے' پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار کراچی سے لنڈی کوتل تک بجلی بند ہوئی ہے اور واپڈا بریک ڈاؤن کی اصل وجوہات تلاش نہیں کر سکا۔ یہ بریک ڈاؤن آہستہ آہستہ افواہوں کی شکل میں ڈھل گیا اور یہ افواہیں جوں جوں آگے بڑھیں لوگ ان میں اپنی اپنی خواہشیں اور اپنے اپنے خدشات شامل کرتے چلے گئے یہاں تک کہ حکومت

کے مخالفین نے مٹھائیاں خریدنا شروع کر دیں لیکن جوں ہی بجلی بحال ہوئی لوگوں کے ٹیلی ویژن آن ہوئے اور انہیں اپنے محبوب وزیراعظم کی زیارت نصیب ہوئی تو یہ افواہیں دم توڑنے لگیں یہاں تک کہ رات تک حالات پوری طرح حکومت کے "قابو" میں آ گئے میں نے طارق بھٹی کے تمام خدشات دور کر دیئے' وہ مطمئن ہو گئے لیکن میں اور مخدوم عباس افواہوں کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔

ہمارے ملک میں افواہیں کیوں پیدا ہوتی ہیں اور لوگ ان افواہوں پر کیوں یقین کر لیتے ہیں' لوگ صدر پرویز مشرف اور وزیراعظم شوکت عزیز کے مستقبل کے بارے میں خدشات کا کیوں شکار ہوتے ہیں اور لوگ معمولی معمولی افواہوں پر حلوائی کی دکان کی طرف کیوں دوڑ پڑتے ہیں' یہ سوال انتہائی اہم ہیں' میرا خیال ہے اگر حکومت ان سوالوں پر غور کر لے اور اگر ہمارے حکمران ان وجوہات کا جائزہ لے لیں تو شاید مستقبل میں کبھی وہ وقت نہ آئے جب عوام صرف بریک ڈاؤن پر بڑے بڑے نتائج اخذ کرنا شروع کر دیں' جب لوگ ٹیلی فون' ٹیلی ویژن اور موبائل سروس بند ہونے پر مٹھائیاں خریدنا اور تقسیم کرنا شروع کر دیں' 24 ستمبر 2006ء کا دن ثابت کرتا ہے لوگ حکومت کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہیں اور پندرہ سولہ کروڑ لوگوں کے دلوں میں کہیں نہ کہیں حکومت کی تبدیلی کی خواہش موجود ہے اور حکومت بھی عوام کی اس خواہش سے آگاہ ہے لہٰذا وزیراعظم شوکت عزیز تک کو اپنی حکومت کی یقین دہانی کے لئے پورے میڈیا کے ساتھ یوٹیلٹی سٹور جانا پڑا اور بجلی کی بحالی کے بعد وزارت اطلاعات کو وزیراعظم شوکت عزیز کو ٹیلی ویژن سکرین پر پہنچانے کے لئے پوری طاقت صرف کرنا پڑی اور پنجاب حکومت کو اپنے ناظموں کو حکم دینا پڑا وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بتائیں حکومت اپنی جگہ قائم ہے اور جس کسی نے اس اطلاع پر سنجیدہ ہونے کی کوشش کی اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی' مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے حکومت کی ہدایت پر ناظم اپنے گھروں اور دفتروں سے نکلے اور انہوں نے "گراس روٹ لیول" تک جا کر لوگوں کو حکومت کی یقین دہانی کرانی شروع کر دی' میرے ایک دوست نے بتایا بعض ناظم وفاداری میں اتنے آگے نکل گئے کہ انہوں نے رکشوں پر لاؤڈ سپیکر رکھ کر اعلان شروع کرا دیئے "حکومت اپنی جگہ قائم ہے لہٰذا عوام کو زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں" میرے دوست کا کہنا تھا پنجاب کے ایک شہر میں ناظم صاحب نے مٹھائی کی تمام دکانوں پر تالے لگوا دیئے تا کہ لوگ خوشی منانے کے لئے مٹھائی نہ خرید سکیں' اس دن اپوزیشن کے تمام چھوٹے بڑے لیڈروں پر بھی نظر رکھی گئی لیکن سوال یہ ہے' ایسا کیوں ہے؟ لوگ حکومت کی تبدیلی کیوں چاہتے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں حکومت اپنی تمام تر خوشحالی' مقدس اصلاحات اور کامیاب سفارتکاری کے باوجود عوام کی توقعات پر پورا نہیں اتر رہی' کہیں ایسا تو نہیں جناب شوکت عزیز کی معاشی فتوحات عوام تک نہیں پہنچ پا رہیں اور جناب صدر پرویز مشرف کی اعتدال پسندی اور عوام کے درمیان بھی کوئی ان دیکھی خلیج موجود ہو' کہیں ایسا تو نہیں حکومت کی کاشت کردہ خوشحالی صرف ان کے اپنے گودام تک محدود ہو اور عوام کے لئے 1993ء' 1999ء اور 2006ء میں کوئی فرق نہ ہو' کہیں ایسا تو نہیں عوام بے نظیر بھٹو' نواز شریف اور شوکت عزیز کی حکومت میں کوئی فرق محسوس نہ کرتے ہوں اور ان کے لئے تمام حکومتیں محض ناموں کی تبدیلی ہو اور کہیں ایسا تو نہیں لوگوں کی نظر میں جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف

میں کوئی فرق نہ ہو! سوچنے کی بات ہے 12 اکتوبر 1999ء کو جس صدر پرویز مشرف کے آنے پر لوگوں نے مٹھائیاں تقسیم کی تھیں انہیں لوگوں نے 24 ستمبر 2006ء کو ان کے جانے کی افواہوں پر مٹھائیاں خریدنا شروع کر دی تھیں اور وہ لوگ جو دو برس پہلے تک وزیراعظم شوکت عزیز کو مبارکبادیں دے رہے تھے وہ 24 ستمبر کو ان کے جانے کی افواہوں پر ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے' کیوں؟ اس کیوں میں حکومت کی ساری کمزوریاں' ساری کوتاہیاں اور ساری غفلتیں پوشیدہ ہیں' یہ کیوں ثابت کرتا ہے لوگ حکومت کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہیں' یہ کیوں دعویٰ کر رہا ہے حکومت کی کامیابیاں اور فتوحات لوگوں تک نہیں پہنچ پا رہیں اور لوگ جس سے جان چھڑانے کے لئے گرم لو کی دعائیں کر رہے ہیں' لوگ ایک جیلر کی قید سے نکل کر دوسرے جیلر کی قید میں جانا چاہ رہے ہیں' یہ کیوں ثابت کرتا ہے کسی حکمران کی نیک نامی کیلئے صرف کتابیں' انٹرویو' ٹیلی ویژن کے پروگرام' پریس بریفنگز' سیمینار' تالیاں اور عالمی اخبارات اور جرائد میں تصاویر کی اشاعت کافی نہیں ہوتی' حکمرانوں کی اصل کامیابی ان کے عوام ہوتے ہیں اور جب کسی ملک کے عوام اپنے حکمران سے خوش اور مطمئن ہوتے ہیں تو وہ معمولی واقعات کے بعد حلوائیوں کی طرف نہیں دوڑ پڑتے' یہ کیوں ثابت کرتا ہے اگر ملکوں پر اصلی لیڈروں کی اصلی حکومت ہو تو ملکوں میں ایسی افواہیں جنم نہیں لیتیں' یہ کیوں ثابت کرتا ہے 24 ستمبر کا دن صرف افواہوں کا دن نہیں تھا یہ لوگوں کی خواہشوں کا دن بھی تھا' یہ لوگوں کی دعاؤں اور تمناؤں کا دن بھی تھا اور یہ کیوں ثابت کرتا ہے حکومت عوام کے دلوں میں اپنا احترام کھو چکی ہے اور عوام حکومت سے دور ہو چکے ہیں۔

تم کا فرلوگ

''سٹاپ' سٹاپ' یور پرائم منسٹر از ڈوئنگ سم تھنگ'' فلپ کی آواز میں حیرت بھی تھی اور اضطراب بھی' میری انگلی ریموٹ کنٹرول پر رک گئی' سامنے ٹیلی ویژن سکرین پر وزیراعظم شوکت عزیز عوام میں گھل مل رہے تھے' لوگ عقیدت سے ان کے ہاتھ چوم رہے تھے' ان کیلئے زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے اور ان کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے جبکہ وزیراعظم مختلف سٹالوں کا دورہ کر رہے تھے' وہ ریٹ لسٹیں چیک کر رہے تھے' بوریوں اور تھیلوں سے دالیں' چاول' چینی اور آٹا نکال نکال کر دیکھ رہے تھے اور دکانداروں کو مہنگی چیزیں بیچنے پر ڈانٹ پلا رہے تھے' میں نے ٹیلی ویژن کا والیم اونچا کر دیا' نیوز کاسٹر جوشیلی آواز میں انکشاف کر رہی تھی'' وزیراعظم اچانک اسلام آباد کے جی نائین فور کے اتوار بازار پہنچ گئے اور انہوں نے وہاں عوام کے مسائل کا جائزہ لینا شروع کر دیا' وزیراعظم پروٹوکول کے بغیر اتوار بازار پہنچے' ان کی گاڑی ٹریفک سگنلز پر رکتی رہی' وہ اتوار بازار میں پیدل چلتے رہے اور انہوں نے سخت گرمی' حبس اور بھیڑ میں لوگوں سے ہاتھ ملایا اور بڑے تحمل سے ان کی گفتگو سنی'' میں نے دیکھا' وزیراعظم کے ساتھ صحافیوں اور کیمرہ مینوں کا پورا اسکواڈ ہے اور وہ کیمروں کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے ہیں' فلپ بڑے غور سے یہ منظر دیکھ رہا تھا جبکہ میں اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہا تھا مجھے وزیراعظم کے عوام میں گھلنے ملنے سے پہلے یہ منظر دیکھنے کی سعادت نصیب ہو گئی۔

وزیراعظم جناب شوکت عزیز سٹالوں کے درمیان ٹہل رہے تھے' لوگ ان کے گرد دائرہ بنا کر چل رہے تھے جبکہ دکاندار ان کے جلال سے کانپ رہے تھے' فلپ نے میرے ہاتھ سے ریموٹ کنٹرول لے کر آواز بند کر دی اور مسکرا کر پوچھا'' وزیراعظم صاحب کیا کر رہے ہیں'' میں نے فخر سے جواب دیا'' وہ قیمتوں کا جائزہ لے رہے ہیں' وہ دیکھ رہے ہیں ان کے عوام کو معیاری اور سستی چیزیں مل رہی ہیں یا نہیں؟'' فلپ مسکرایا اور اس نے گردن اٹھا کر آگے پیچھے دیکھنا شروع کر دیا' یہ فلپ کا مخصوص سٹائل ہے وہ جب بھی لمبی چوڑی بات کرنا چاہتا ہے تو وہ شتر مرغ کی طرح گردن اٹھاتا ہے' آگے پیچھے دیکھتا ہے اور اس کے بعد اس کی زبان کے سارے بند کھل جاتے ہیں' اس نے کھنگار کر گلا صاف کیا اور چہکتی ہوئی آواز میں بولا'' کیا اتوار بازار میں قیمتوں کا جائزہ لینا

وزیراعظم کا کام ہوتا ہے" میں اس کی بات سمجھ گیا لہٰذا میں نے تفاخر سے جواب دیا "یہ ہماری اسلامی روایات ہیں' ہمارے وزیراعظم خلفاء راشدین کی روایات پر عمل پیرا ہیں' وہ حضرت عمر فاروقؓ کی طرح بھیس بدل کر اپنی رعایا کے حالات جاننا چاہتے ہیں" فلپ نے قہقہہ لگایا "ڈونٹ ٹیل می' یہ وزراء اعظم کا کام نہیں ہوتا' مہنگائی پر قابو پانا پرائس کنٹرول انسپکٹروں' میونسپل کارپوریشن کے عملے اور فوڈ ڈیپارٹمنٹ کی ذمہ داری ہوتی ہے' وزیراعظم کا کام پالیسیاں بنانا اور ان پالیسیوں پر عملدرآمد کرانا ہوتا ہے' ایک فوڈ کنٹرول انسپکٹر اور وزیراعظم میں فرق ہونا چاہیے' اگر ہمارے ملک میں ٹونی بلیئر ایسا کرتا تو شام سے پہلے اس کی حکومت ختم ہو جاتی" مجھے فلپ کی بات عجیب لگی' میں نے حیرت سے پوچھا "وہ کیوں؟" وہ بولا "ہم سمجھتے ہیں جب وزیراعظم سستے بازاروں کا جائزہ لے گا تو اس کا مطلب ہوگا برطانیہ کا فوڈ کنٹرول ڈیپارٹمنٹ صحیح کام نہیں کر رہا' اپوزیشن یہ ایشو اٹھائے گی اور ٹونی بلیئر کی حکومت ہل جائے گی" مجھے ابھی تک اس کی بات سمجھ نہ آئی' وہ میری ناسمجھی بھانپ گیا چنانچہ اس نے اپنی بات جاری رکھی "چند برس پہلے ٹونی بلیئر نے اپنے چھوٹے بیٹے کیلئے ٹیوٹر کا بندوبست کیا تھا' یہ بات کسی طرح پریس تک پہنچ گئی' اس کے بعد اپوزیشن نے طوفان کھڑا کر دیا' اپوزیشن کا کہنا تھا وزیراعظم کے گھر ٹیوٹر آنے کا مطلب ہے سرکاری سکولوں کا نظام ٹھیک کام نہیں کر رہا چنانچہ لیبر پارٹی کو حکومت چھوڑ دینی چاہیے' ٹونی بلیئر نے فوراً ٹیوٹر کو گھر سے نکالا اور عوام سے معافی مانگ کر جان چھڑائی" میں اس کا نقطہ سمجھ گیا لہٰذا میں نے عرض کیا "ہماری اور برطانیہ کی حکومت میں بڑا فرق ہے' ہماری حکومت ایک آٹومیٹک سسٹم کے تحت چل رہی ہے' سرکاری جماعت چودھری شجاعت حسین کے پاس ہے' وہ پارٹی کے تمام امور احسن طریقے سے چلا رہے ہیں چنانچہ وزیراعظم کو پارٹی کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں' خارجہ امور' افغانستان کے ساتھ چھوٹی بڑی جھڑپیں' دہشت گردی' وانا آپریشن' پاک بھارت دوستی اور نواز شریف بے نظیر کے معاملات صدر کے پاس ہیں چنانچہ وزیراعظم کو ان معاملات کی طرف سے بھی مکمل اطمینان ہے' ایم کیو ایم' پیٹریاٹ' ملت پارٹی (سابق)' منظور احمد وٹو' حامد ناصر چٹھہ اور مولانا فضل الرحمان کا چارج نیب کے پاس ہے لہٰذا وزیراعظم کو ان کی طرف سے بھی پوری پوری تسلی ہے اور میڈیا کو ایجنسیاں ڈیل کر رہی ہیں چنانچہ وزیراعظم کو اس کی طرف سے کوئی خوف نہیں' رہی معیشت' صنعت' تجارت' بجٹ اور تعلیم تو ہم یہ سارے بکھیڑے پہلے ہی امریکہ کے حوالے کر چکے ہیں چنانچہ اب ہمارے وزیراعظم کے پاس وقت ہی وقت ہے' یہ ان کی مہربانی اور خلوص ہے وہ یہ وقت عوام میں گھل مل کر گزار رہے ہیں اور وہ یہ وقت اپنی رعایا' اپنے لوگوں کو دے رہے ہیں"

فلپ نے قہقہہ لگایا "یار تم لوگ بہت عجیب ہو' ہمارے ملکوں میں اگر وزیراعظم ٹیلی فون ایکسچینج سے رابطہ کرلے' وہ ڈاک خانے کا ریکارڈ چیک کرلے' وہ بازار سے چیز خرید کر واپس کر دے' وہ سرکاری ڈسپنسری کی بجائے مارکیٹ سے دوا خرید لے اور وہ ٹرین سے اتر کر ٹیکسی لے لے تو اس کی حکومت خطرے میں پڑ جاتی ہے' اس کے لئے لوگوں کو منہ دکھانا مشکل ہو جاتا ہے لیکن تم لوگ......" وہ خاموش ہو گیا' کمرے میں تھوڑی دیر خاموشی رہی' فلپ نے سگریٹ سلگایا اور ایک لمبا کش لے کر بولا "اور یہ جو نیوز کاسٹر بار بار اعلان کر رہی تھی وزیراعظم پروٹوکول

اور سکیورٹی کے بغیر اتوار بازار تشریف لے گئے ہیں اور ان کی گاڑی ہر سگنل پر رکتی رہی تھی" میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا' اس نے دوسرا کش لیا" اس کا مطلب ہے پاکستان میں سربراہان مملکت ٹریفک رولز کی پابندی نہیں کرتے اور وزیراعظم نے سگنلز پر رک کر نئی تاریخ رقم کر دی" میں خاموش رہا' وہ بولا" پورے یورپ' پورے امریکہ' پورے مشرق بعید اور پورے مشرق وسطیٰ میں صدر سے لے کر عام شہری تک ہر شخص ٹریفک سگنل پر رکتا ہے' وہاں اگر وزیراعظم اشارہ توڑ دے تو یہ میڈیا کی سب سے بڑی خبر ہوتی ہے لیکن تمہارے ملک میں وزیراعظم اشارے پر رک جائے تو یہ اطلاع ہاٹ نیوز بن جاتی ہے اور تم لوگ واقعی حیرت انگیز ہو" وہ رکا' اس نے ایک لمبا کش لیا اور اس کے بعد ہنس کر بولا" میں تم سے آخری سوال پوچھتا ہوں" میں نے اثبات میں گردن ہلا دی' وہ بولا" تمہارے ملک میں بجلی چوری ہوتی ہے' پانی چور نہروں کے ناکے توڑ دیتے ہیں' تمہاری ویگنوں میں بارہ کی جگہ اٹھارہ سواریاں بٹھائی جاتی ہیں' تھانوں میں چھترول ہوتی ہے' زکوٰۃ کی رقم خورد برد ہو جاتی ہے اور تمہارے استاد رجسٹروں پر حاضری لگا کر سکولوں سے غائب ہو جاتے ہیں" وہ رکا اور مسکرا کر بولا" میں ٹھیک کہہ رہا ہوں" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا' اس نے پوچھا" تم بتاؤ تمہارے وزیراعظم سکولوں' زکوٰۃ کمیٹیوں' تھانوں' ویگنوں اور بجلی کے دفتروں پر کب چھاپے ماریں گے" میری برداشت جواب دے گئی' میں نے اس کی طرف غصے سے دیکھا اور سختی سے جواب دیا" تم کافر لوگ بڑے متعصب ہو' تم ہمیں ترقی کرتے نہیں دیکھ سکتے" فلپ نے قہقہہ لگایا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔

☼.....☼.....☼

نمک کی کان

بادشاہ کی عجیب عادت تھی، وہ صبح سویرے مشیر خاص اور شاہی حجام کو طلب کر لیتا تھا۔ حجام بادشاہ کی گردن پر چادر لپیٹ کر اس کی حجامت بناتا اور مشیر اسے عوام کی خوشحالی اور اس کے بلند ہوتے اقبال کی خوشخبری سناتا تھا۔ وہ بادشاہ کو بتاتا تھا حضور آپ کی فلاں پالیسی کی برکت سے ہمارے فارن ایکسچینج ریزروز میں سوا بلین ڈالر کا اضافہ ہو گیا، آپ نے سلیمان شاہ جیسا شاندار اور باصلاحیت مشیر منتخب کیا اور اس مشیر کی ان تھک محنت سے ہمیں تین بلین ڈالر کا مزید قرضہ مل گیا، آپ نے عمر ایوب کا انتخاب فرمایا تھا اور اس نوجوان کی مہربانی سے ہمارے چینی بنانے والے مشیروں نے اربوں روپے کمائے اور انہوں نے نہایت ایمانداری سے اپنے منافع کا بیس فیصد پارٹی کے فنڈ میں جمع کرا دیا اور اب پارٹی بڑی آسانی سے اگلے الیکشنوں کا بوجھ اٹھا سکتی ہے اور حضور آپ کے یوٹیلٹی سٹوروں پر چھاپوں نے تو کمال کر دیا، اس وقت پوری دنیا میں ان کی دھوم مچی ہے۔ مجھے کل امریکہ، جاپان اور برطانیہ کے بادشاہوں نے فون کیا، وہ ہم سے چھاپوں کا ماڈل خریدنا چاہتے ہیں لیکن ہم نے فوراً معذرت کر لی' ہم نے احتیاطاً ملک کے چار صوبوں کے 18 یوٹیلٹی سٹورز شارٹ لسٹ کر لئے ہیں، ہم بہت جلد آپ کو ان سٹورز پر بھی چھاپے مارنے کی تکلیف دیں گے جس کے نتیجے میں پوری قوم آپ کی صلاحیتوں کی معترف ہو جائے گی اور حضور والا عوام دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں۔ پورے ملک میں خوشحالی کے دریا بہہ رہے ہیں، لوگ جھولیاں اٹھا اٹھا کر آپ کو دعائیں دے رہے ہیں، لوگوں کی فی کس آمدنی میں اضافہ ہو چکا ہے اور جب سے محمد علی درانی آپ کے مشیر خاص بنے ہیں اس وقت سے لوگوں کو پیاس لگتی ہے، نہ بھوک اور نہ ہی گرمی اور 16 کروڑ لوگ صبح شام ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں اور دھمالیں ڈالتے ہیں۔

مشیر خاص بادشاہ کو یہ اچھی خبریں سناتا رہتا، بادشاہ آرام اور سکون سے سنتا رہتا اور حجام پوری یکسوئی سے بادشاہ کی حجامت بناتا رہتا، یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا یہاں تک کہ حجام اس گفتگو سے تنگ آ گیا اور اس نے کلمہ حق کہنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک روز جب مشیر خاص بادشاہ کو رپورٹ دے چکا تو حجام نے قینچی اور کنگھی ایک طرف رکھی اور ہاتھ باندھ کر عرض کیا "حضور اگر جان کی امان پاؤں تو میں کلمہ حق کی جسارت کروں" بادشاہ نے رحم دلی کا ثبوت

دیتے ہوئے اسے اجازت دے دی، حجام نے عرض کیا ''مشیر خاص بکواس کر رہا ہے، حکومت کی یہ ساری کامیابیاں اور کامرانیاں محل کی دیواروں تک محدود ہیں، عوام اس وقت مہنگائی، بے روزگاری، بے انصافی، لاقانونیت، بے بسی اور ستم ظریفی کی انتہا سے گزر رہے ہیں، ہماری پاور ٹی لائین موٹی ہوتی جا رہی ہے، لوگوں کے پاس کھانے کیلئے روٹی، پینے کیلئے پانی اور پہننے کیلئے کپڑا نہیں، ملک میں اہل ایمان کو سزائیں اور بے ایمانوں کو سرکاری عہدے مل رہے ہیں، ڈاکے، قتل اور فراڈ روز کا معمول بن چکے ہیں، سڑکیں کھنڈر ہو رہی ہیں اور قبرستانوں میں مارکیٹیں بن رہی ہیں، لوگ روٹی اور سالن کی ایک پلیٹ کے بدلے مہینہ مہینہ کام کرنے کیلئے تیار ہیں اور لوگ جھولیاں پھیلا پھیلا کر آپ اور آپ کی ٹیم کو بددعائیں دے رہے ہیں اور آپ کے سارے مشیر آپ کو غلط رپورٹیں دیتے ہیں''۔ بادشاہ کا موڈ اچھا تھا لہذا وہ حجام کی بات چپ چاپ سنتا رہا، حجام خاموش ہوا تو بادشاہ نے بڑی شفقت سے اس کی پیٹھ ٹھونکی، سرکاری منشی کو طلب کیا اور اسی وقت مشیر خاص کو حجام اور حجام کو مشیر بنا دیا اور اس کے بعد اسے حکم دیا آئندہ تم مجھے عوام کی صورتحال سے مطلع کیا کرو گے۔ حجام خوش ہو گیا۔

اس کے بعد نیا مشیر خاص روزانہ بادشاہ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا اور لوگ حکومت کے بارے میں جو کچھ سوچتے ہیں وہ سچ سچ بادشاہ کے گوش گزار کر دیتا۔ شروع شروع میں حجام کی رپورٹیں بہت کڑوی ہوتی تھیں لیکن پھر ان رپورٹوں میں خوشگوار تبدیلی آنے لگی، اب حجام کی رپورٹوں میں بھی عوام خوشحال ہونے لگے، فارن ایکسچینج ریزرو میں اضافہ ہونے لگا، بے روزگاری، مہنگائی اور لاقانونیت میں کمی آنے لگی، عوام بادشاہ سے مطمئن ہونے لگے اور لوگ جھولیاں پھیلا پھیلا کر بادشاہ کیلئے دعائیں کرنے لگے۔ بادشاہ یہ تبدیلی نوٹ کرتا رہا، ایک دن جب حجام سب اچھا کی رپورٹ دے چکا تو بادشاہ نے سرکاری جلاد بلایا اور حجام کو دھوپ میں لٹا کر کوڑے مارنے کا حکم جاری کر دیا، حجام نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا ''حضور میری کیا خطا ہے؟'' بادشاہ جلال سے بولا ''او بدبخت انسان تمہیں مشیر بنے ہوئے صرف ایک مہینہ گزرا ہے، پہلے مشیروں کو تو حالات ٹھیک کرنے میں سال چھ مہینے لگ جاتے تھے لیکن تم نے ایک ہی مہینے میں ملک کا مقدر بدل دیا'' حجام نے جان کی امان طلب کی اور اس کے بعد عرض کیا ''حضور میں ایک مہینہ پہلے بھی صحیح کہہ رہا تھا اور آج بھی سچ بول رہا ہوں''۔ بادشاہ نے اسے غصے سے دیکھا، حجام بولا ''حضور جب میں فقط ایک حجام تھا تو میں تیلی محلے میں رہتا تھا، وہاں بے روزگاری، لاقانونیت، غربت اور مہنگائی تھی اور میں روزانہ ان مسائل کا مشاہدہ کرتا تھا چنانچہ میں نے آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا لیکن جب آپ نے مجھے مشیر خاص بنایا تو آپ نے مجھے منسٹر انکلیو میں گھر دے دیا اور میں تیلی محلے سے اٹھ کر محلات میں آ گیا۔ یہاں کے حالات بالکل مختلف تھے۔ یہاں قانون بھی تھا، تحفظ بھی، روزگار بھی، ہسپتال اور ڈاکٹر بھی، شاہی سواری بھی اور سیکرٹ فنڈز بھی، میں دن رات اس ماحول میں رہنے لگا تو میں نے آپ کو بھی وہی کچھ بتانا شروع کر دیا جو میں دیکھ رہا تھا'' بادشاہ خاموشی سے سنتا رہا، حجام نے عرض کیا ''حضور اگر آپ عوام کی اصل صورتحال جاننا چاہتے ہیں تو آپ اپنی کابینہ کو منسٹر انکلیو سے تیلی محلے میں منتقل کر دیں۔ آپ ان لوگوں کو جوڑ کانے، ڈونگہ بونگہ اور چاکیواڑہ میں رکھیں

اور آپ انہیں رکشوں اور ویگنوں میں گھر بھجوائیں یہ لوگ آپ کو اس وقت عوام کی اصل رپورٹیں دیں گے" حجام خاموش ہو گیا۔

بادشاہ نے گستاخ حجام کے ساتھ کیا سلوک کیا، راوی اس مسئلے پر خاموش ہے لیکن حجام کی بات میں بہت وزن تھا۔ مجھے یہ واقعہ جناب عباس اطہر کا کالم پڑھ کر یاد آیا' جناب عباس اطہر مجھ سمیت پاکستان کے بے شمار صحافیوں کے استاد ہیں' انہوں نے اپنے گزشتہ کالم میں بڑا خوبصورت نکتہ اٹھایا، انہوں نے گورنر پنجاب جناب خالد مقبول کو عوام کی اصل صورتحال بتانے کی "جسارت" کی۔ انہوں نے فرمایا، ہمارے حکمران، گورنر ہاؤسز کے سرسبز لانوں میں بیٹھ کر عام آدمی کی زندگی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ یہ لوگ زندگی کو کالے شیشوں کے پیچھے سے دیکھتے ہیں لہٰذا یہ لوگ اس ملک کے اصل ایشو کو نہیں سمجھ سکتے، میں شاہ جی سے ذرا سا اختلاف کرتا ہوں، میرا خیال ہے اس میں ان بے چاروں کا کوئی قصور نہیں، یہ دراصل وہ لوگ ہیں جو تیں چالیس برس پہلے تپلی محلوں سے نکلے تھے اور اس کے بعد انہوں نے ان محلوں کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا چنانچہ یہ لوگ تپلی محلوں میں رہنے والے 95 فیصد لوگوں کے مسائل نہیں سمجھ سکتے' خود سوچئے' جس شخص نے چالیس برس اپنی جیب سے پیٹرول نہ ڈلوایا ہو، جس کے جوتے تک بیٹ مین پالش کرتے ہیں اور جس کی گاڑی کا اے سی ان کی تشریف آوری سے ایک گھنٹہ پہلے آن کر دیا جاتا ہو وہ زندگی کی حقیقتوں کا کیسے ادراک کرے گا، اسے کیسے معلوم ہوگا درد کیا ہوتا ہے، وہ اس باپ کا دکھ کیسے جانے گا جس کا بیٹا روزانہ ڈگریاں اٹھا کر گھر سے نکلتا ہے اور شام کو ناکام واپس لوٹ آتا ہے، اسے کیا معلوم جہیز کیا ہوتا ہے اور ڈسپرین کی ایک گولی اور اینٹی بائیوٹیک کی ایک ڈبی کیلئے انسان کو زندگی کے کس کس تنور سے گزرنا پڑتا ہے۔ اسے کیا معلوم فقیر کی قبا کیا ہوتی ہے اور انسان کو خودکشی تک لے جانے والے حالات کیسے ہوتے ہیں۔ شاہ جی کا کہنا ہے ان لوگوں نے غلط عینکیں چڑھا رکھی ہیں جبکہ میرا خیال ہے ان لوگوں کی تو آنکھیں ہی نہیں ہیں۔ اللہ نے انہیں بینائی کی نعمت ہی سے نہیں نوازا' یہ بے چشم اور بے رحم لوگ دیوار کے اس پار پیدا ہوتے ہیں جہاں ہر چیز ہری اور روشن ہوتی ہے۔ جہاں ڈبل روٹی نہ ملے تو لوگ کیک کھا کر گزارا کر لیتے ہیں اور جن کے غریب ترین بیرے بھی اپنی گاڑی پر آتے جاتے ہیں' یہ ناواقف لوگ ہیں' انہوں نے زندگی میں کبھی آٹا نہیں خریدا چنانچہ یہ لوگ بھوک جیسے احساس ہی سے بے بہرہ ہیں اور یہ لوگ نمک کی ایک ایسی کان میں رہتے ہیں جس میں داخل ہونے والے حجام بھی شام سے پہلے نمک ہو جاتے ہیں۔

☼.....☼.....☼

میٹھے منہ

انور مقصود پاکستان کے لیجنڈ اداکار ہیں' ان کا شمار پاکستان کے ان چند تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جو بیک وقت اچھے لکھاری' اچھے مقرر' اچھے کمپیئر' اچھے اداکار اور اچھے انسان ہیں' اللہ تعالیٰ نے انہیں ذو معنی فقرے بنانے کی صلاحیت بھی دے رکھی ہے' لوگ جو بات بیس کتابیں لکھ کر نہیں کہہ پاتے انور مقصود وہ بات ایک فقرے میں بیان کر دیتے ہیں' میں نے سنا تھا لفظوں کی دھار تلوار سے تیز ہوتی ہے لیکن مجھے انور مقصود کے علاوہ اردو میں کوئی ایسا لکھنے والا نہیں ملا جس کے لفظوں کی دھار بھی ہو اور یہ دھار واقعی تلوار سے تیز ہو' دو ماہ پہلے مجھے انور مقصود صاحب کا ایک ٹیلی شو دیکھنے کا اتفاق ہوا' یہ شو چینی کے بارے میں تھا' شو میں چینی مہنگی ہونے کی وجوہات پر گفتگو ہو رہی تھی' انور مقصود نے بشریٰ انصاری کو چینی بنا رکھا تھا' انور صاحب چینی سے سوال کرتے تھے اور بشریٰ انصاری جواب دیتی تھیں' شو کے آخر میں انور مقصود نے چینی (بشریٰ انصاری) سے پوچھا ''آج کل آپ کہاں ہوتی ہیں'' چینی ذرا سا مسکرائی اور شرما کر بولی ''کابینہ میں'' یہ دو لفظ ''کابینہ میں'' ایک ایسی حقیقت ہیں جنہیں لکھتے ہوئے پچھلے تین ماہ سے بڑے بڑے صحافیوں کے ہاتھ کانپ رہے تھے لیکن یہ انور مقصود کا کمال تھا انہوں نے بشریٰ انصاری کے منہ سے یہ دو لفظ کہلوائے اور بم پھینک کر گھر چلے گئے' اس دن سے ان دو لفظوں کا مزہ لے رہا ہوں۔

چینی کی حقیقت بہت دلچسپ ہے' اس وقت پاکستان میں 75 شوگر ملیں آپریشنل ہیں' ان میں سے 41 پنجاب' 28 سندھ اور 6 صوبہ سرحد میں ہیں' پنجاب کی 41 شوگر ملوں میں سے 20 سیاستدانوں کی ملکیت ہیں جبکہ 21 ملیں سیاستدانوں اور ریٹائر جرنیلوں کے بزنس مین رشتے دار چلا رہے ہیں' صوبہ سندھ کی 28 ملوں میں سے 6 سیاستدانوں' 10 بزنس مینوں اور 12 سیاستدانوں کے رشتے داروں کے پاس ہیں جبکہ سرحد کی چھ شوگر ملوں میں سے 5 سیاستدانوں کی ملکیت ہیں' ان ملوں کی تفصیل بہت دلچسپ ہے' پنجاب کی شوگر ملوں میں سے 9 نواز شریف اور ان کے رشتے داروں کی ملکیت ہیں جبکہ دو ملیں مسلم لیگ ن کے اعلیٰ عہدیداروں کے پاس ہیں' ان 11 ملوں میں سے 8 ملوں کے پچھلے دروازے حکومتی جماعت کے صحن میں کھلتے ہیں' پنجاب کی چار شوگر ملیں چودھری برادران کی ملکیت ہیں' دو ملیں صنعت و پیداوار کے موجودہ وفاقی وزیر جہانگیر ترین کی ہیں' ایک شوگر مل کے مالک وفاقی

وزیر تجارت ہمایوں اختر خان ہیں اور ایک ایک شوگر مل ق لیگ کے ارکان قومی اسمبلی نصر اللہ دریشک اور انور علی چیمہ کی ملکیت ہیں' باقی 21 ملوں کے مالکان ہمارے جرنیل ہیں اور ان کے نام تحریر کرنا اس وقت تقریباً ناممکن ہے' جرنیلوں کے نام لکھنے کیلئے ہمیں ذرا سی آزادی اور تھوڑی سی فکری بلوغت کا انتظار کرنا پڑے گا' صوبہ سندھ کی پانچ ملیں آصف علی زرداری کی ملکیت ہیں یا وہ ان کے بڑے شیئر ہولڈر ہیں' ایک مل پیپلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل راجہ پرویز اشرف کی ہے جبکہ باقی 22 ملوں کا ذکر بھی سردست ممکن نہیں' صوبہ سرحد کی کل 6 ملوں میں سے 5 ملیں سابق وفاقی وزیر عباس سرفراز کی ہیں' عباس سرفراز آزاد سیاستدان تھے لیکن وہ ان ملوں کی وجہ سے اب مسلم لیگ ق میں شامل ہو چکے ہیں' ان 75 شوگر ملوں میں سے پنجاب کی 17 ملوں نے دسمبر 2005ء کے آخر میں ''اتحاد'' قائم کیا' ان اتحادیوں کو قومی اسمبلی میں بیٹھے ان پانچ بڑے جاگیرداروں نے سپورٹ کیا جو پاکستان کا 70 فیصد گنا اگاتے ہیں' ان 17 ملوں نے 31 جنوری 2006ء تک 5 لاکھ 95 ہزار 177 ٹن چینی پیدا کی لیکن انہوں نے اس میں سے 3 لاکھ 63 ہزار 734 ٹن چینی گوداموں میں ذخیرہ کر دی' اس ذخیرہ اندوزی کے ردعمل میں مارکیٹ میں چینی کی قیمت دگنی ہو گئی اور ملک میں چینی کا شدید بحران پیدا ہو گیا' یہ بحران آنے والے دنوں میں اتنی شدت اختیار کر گیا کہ حکومت نیب کی مدد لینے پر مجبور ہو گئی' نیب نے چینی کے بارے میں تحقیقات شروع کر دیں' یہ تفتیش چند دن چلی تو پتہ چلا اگر یہ تحقیقات جاری رہیں تو حکومت بھی ٹوٹ جائے گی اور پیپلز پارٹی کے ساتھ جاری ڈیل میں بھی رخنہ پڑ جائے گا لہٰذا نیب نے انکوائری سے معذرت کر لی یوں چینی کا مقدمہ ایک بار پھر وزیراعظم کی عدالت میں آ گیا' وزیراعظم اپنے اختیارات کے دائرے میں رہ کر مختلف اوقات میں مختلف پالیسیاں بناتے اور بیانات جاری کرتے رہے لیکن چینی 40 روپے سے نیچے نہ آئی' اس دوران حکومت نے باہر سے چینی درآمد کرنے کا اعلان بھی کیا لیکن یہ اعلان بھی کاغذوں میں دفن ہو کر رہ گیا' حکومت نے اس دوران یوٹیلٹی سٹوروں پر سستی چینی فراہم کرنا شروع کر دی لیکن عوام کی لمبی لمبی قطاروں سے حکومت کا سافٹ امیج متاثر ہونے لگا' وزیراعظم نے یوٹیلٹی سٹوروں پر ''چھاپہ سکیم'' بھی شروع کی لیکن ان کے چھاپوں سے بھی چینی نے سستا ہونے سے انکار کر دیا لہٰذا مجبور او وزیراعظم نے 15 جون 2006ء کو اپنے چیمبر میں پریس کانفرنس بلائی اور انہوں نے وہاں اعلان فرمایا ''ہم نے بینکوں کو ہدایت کر دی ہے وہ چینی کے ذخیرہ اندوزوں کو قرضے جاری نہ کریں اور ہم نے سی بی آر کو بھی شوگر ملوں کی ٹیکس ریٹرنز کے سو فیصد معائنے کا حکم دے دیا ہے'' وزیراعظم نے یہ اعلان فرمایا اور وزیراعظم ہاؤس واپس چلے گئے' میں نے جب وزیراعظم کا یہ بیان پڑھا تو میرے اوپر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی' میں نے پہلے ٹشو سے آنکھیں پونچھیں اور اس کے بعد قہقہہ لگایا' میرے ایک دوست میرے پاس بیٹھے تھے' انہوں نے مجھ سے پوچھا ''تم پہلے روئے اور اس کے بعد ہنسے آخر ماجرا کیا ہے؟'' میں نے عرض کیا ''اے اللہ کے نیک بندے میری دلی خواہش تھی یہ حکومت کامیابی سے چلتی رہے لیکن جب میں نے وزیراعظم کا بیان پڑھا تو مجھے اپنی یہ خواہش خطرے میں محسوس ہوئی لہٰذا میری آنکھوں میں آنسو آ گئے'' میرے دوست نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے بعد بولے ''لیکن تم

ہنسے کیوں تھے" میں نے ایک اور قہقہہ لگایا اور نرم لہجے میں جواب دیا "مجھے محسوس ہوا وہ کام جس سے نیب نے بھی معذرت کر لی تھی اس کا بیڑا ہمارے وزیراعظم نے اٹھالیا ہے' وزیراعظم نے نہ صرف کابینہ میں بیٹھی چینی کو چیلنج کر دیا ہے بلکہ انہوں نے اپنی حکومت کے چینی سے بنے ستون بھی ڈھانے کا فیصلہ کر لیا ہے' میں وزیراعظم سے اسی جرأت اور اسی نڈرپن کی توقع رکھتا تھا' مجھے ایک ایسا ہی قائد چاہیے تھا جو حالات کے سامنے دبے اور نہ ہی جھکے' میں نے جب ان کا یہ بیان پڑھا تو مجھے محسوس ہوا مجھے وہ قائد مل گیا ہے لہٰذا خوشی سے میری باچھیں کھل اٹھیں' میرا دل چاہتا ہے' میں اب گلی میں کھڑا ہو جاؤں اور چلا چلا کر نعرے لگاؤں شوکت عزیز قدم بڑھاؤ' ہم تمہارے ساتھ ہیں" میرے دوست نے تھوڑی دیر سوچا اور اس کے بعد مسکرا کر بولا "تمہاری بات درست ہے لیکن حکومت کی یہ چینی محض چینی نہیں' یہ وہ میٹھی دلدل ہے جو ہر کلمہ حق کہنے والے کو نگل جائے گی' پچھلے ساٹھ برسوں میں ہماری رولنگ کلاس پر چم تلے ایک نہیں ہوئی لیکن چینی وہ ایشو ہے جس پر سول اور ملٹری بیوروکریسی سے لے کر تمام سیاسی جماعتیں ایک ہیں' اس معاملے میں سب کے منہ میٹھے ہیں اور ہر جو شخص ان کے منہ کڑوے کرنے کی کوشش کرے گا یہ لوگ مل کر اس کا اقتدار پھیکا کر دیں گے"

☼......☼......☼

پاکستان فیل سٹیٹ نہیں

میں نے کہا ''یہ سب بکواس ہے' پاکستان ناکام ریاست نہیں' یہ ساری فہرست ہی دو نمبر ہے'' اس نے سگریٹ کا ٹوٹا تیسری انگلی میں دبایا' مٹھی بند کی' مٹھی منہ کے ساتھ لگائی اور ایک لمبا کش لیا' میں نے کہا ''یہ میگزین فارن پالیسی اور یہ ادارہ فنڈ فار پیس دونوں با اعتماد نہیں ہیں' ان کی رپورٹ بھی غلط ہے' خدا کی پناہ پاکستان کا شمار دنیا کے تیزی سے ترقی کرنے والے ممالک میں ہوتا ہے' یہ ایشیا کے ان پانچ ممالک میں شامل ہے جن کی معیشت جیٹ سپیڈ سے آگے بڑھ رہی ہے لیکن فارن پالیسی میگزین ناکام ریاستوں کی فہرست میں پاکستان کو 34 ویں درجے پر لے آیا ہے اور فنڈ فار پیس کا کہنا ہے سوڈان دنیا کی ناکام ترین ریاست ہے جبکہ کانگو' آئیوری کوسٹ' عراق' زمبابوے' چاڈ' صومالیہ' ہیٹی' پاکستان اور افغانستان اس کے بعد آتے ہیں' آج کے دور میں اس سے بڑا جھوٹ کیا ہوگا''

وہ کش لگا تا رہا اور میری بات بڑے غور سے سنتا رہا' وہ فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا' میں اسے ہمیشہ کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دیتا ہوں لیکن اس کا کہنا ہے وہ پچھلی دس نسلوں سے زمین پر بیٹھتا آ رہا ہے چنانچہ وہ کرسی پر ''ایزی فیل'' نہیں کرتا' اسے زمین پر بیٹھ کر سکون اور آرام ملتا ہے اس نے اس سلسلے میں اتنی دلیلیں دیں کہ میں نے اسے کرسی کی دعوت دینا بند کر دی' وہ اب آتا ہے' سامنے فرش پر اکڑوں بیٹھ جاتا ہے' تیسری انگلی میں سگریٹ لگاتا ہے اور غور سے میری باتیں سننے لگتا ہے۔

میں نے اس سے کہا ''تم گاڑیاں دیکھو پچھلے سات سال میں پاکستان میں گاڑیوں کی تعداد میں چار گنا اضافہ ہوا' پاکستان کی سڑکوں پر چلنے والی نوے فیصد گاڑیاں نئی ہیں' پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جس میں گاڑیاں ''بلیک'' میں ملتی ہیں' گاڑی کی قیمت بارہ لاکھ ہے لیکن جب آپ گاڑی خریدنے جاتے ہیں تو آپ کو یہ گاڑی ساڑھے تیرہ لاکھ روپے میں ملتی ہے' پاکستان میں گاڑیاں بنانے والی 4 کمپنیوں کے پاس لوگوں کے 22 ارب روپے ایڈوانس جمع ہیں۔ پاکستان میں ایک ماہ میں 93 کروڑ ڈالر کی گاڑیاں امپورٹ ہوئی ہیں اور پاکستان کا شمار ان ملکوں میں ہوتا ہے جو مہنگی گاڑیوں کی بڑی مارکیٹ ہیں لیکن فارن پالیسی اور فنڈ فار پیس کا خیال ہے پاکستان

ایک ناکام ریاست ہے' ہو فیئی اٹ از'' وہ چپ چاپ کش لگاتا رہا' میں نے کہا'' پاکستان میں پچھلے سات برسوں میں بے تحاشا خوشحالی آئی' پاکستان کے 8 شہروں میں غیر ملکی ریستوران کھلے' پاکستان میں برگر اور فرائیڈ چکن کی کمپنیاں آرہی ہیں' دنیا کے بڑے بڑے برانڈز پاکستان آنے لگے ہیں' لاہور اور اسلام آباد میں دو' دو' تین تین لاکھ روپے کے سوٹ بک رہے ہیں' میگا مالز کی برانچیں کھل رہی ہیں' ہائی رائز بلڈنگز بن رہی ہیں' اربوں ڈالر کی ہاؤسنگ سکیمیں شروع ہو رہی ہیں' گوادر کے نام سے پاکستان میں دبئی بن رہا ہے' شہروں میں سڑکیں بن رہی ہیں' لائنس لگ رہی ہیں' انڈر پاس اور فلائی اوور بن رہے ہیں' پورا پاکستان تیزی سے موٹر ویز سے منسلک ہو رہا ہے' سیمنٹ پاکستان کی سب سے بڑی انڈسٹری بن چکا ہے' پاکستان اور بھارت مشترکہ فلم سازی پر تیار ہیں' پاکستانی سینماؤں میں بھارتی فلمیں چل رہی ہیں' سات سال میں 27 نئے ٹیلی ویژن چینل کھلے ہیں' ہر شہر میں ایف ایم ریڈیو ہیں' خواتین نے جینز پہننا اور اپنی مرضی سے شادیاں کرنا شروع کر دی ہیں' مختاراں مائی پوری دنیا میں سٹیٹ گیسٹ کا پروٹوکول لے رہی ہیں' ریستورانوں میں شراب سرو ہو رہی ہے اور ناچ گانا ہمارے معاشرے کا حصہ بن چکا ہے' ہر گھر میں کیبل کے ذریعے سو چینل دیکھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر عطاء الرحمان پورے ملک میں پی ایچ ڈی کا سیلاب لے آئے ہیں' ملک میں نئی یونیورسٹیاں' کالج اور سکول کھل رہے ہیں' ملک بھر میں پھولوں کے میلے اور تصویروں کی نمائشیں ہوتی ہیں' خواتین آگے آ رہی ہیں اور مرد پیچھے جا رہے ہیں' فری اینڈ فیئر الیکشن ہو رہے ہیں اور ملک بھر میں سیاسی سرگرمیوں پر کسی قسم کی کوئی قدغن نہیں لیکن تم مغرب کا تعصب دیکھو اتنی ترقی کے باوجود فارن پالیسی اور فنڈ فار پیس جیسے ادارے پاکستان کو ناکام ریاست قرار دے رہے ہیں'' وہ کش لگاتا رہا' میں نے کہا'' صدر بش اور کونڈو لیزا رائس تک صدر مشرف کی جمہوریت نوازی کی تعریف فرما چکی ہیں' ٹونی بلیئر اور من موہن سنگھ تک پاکستان کے جمہوری مستقبل سے مطمئن ہیں' پاکستان کے جمہوری ادارے مضبوط سے مضبوط تر ہو رہے ہیں' الیکشن کمیشن فیئر اینڈ فری الیکشنز کی تیاری کر رہا ہے' حکومت عوام دوست بجٹ تیار کر رہی ہے' انسانی سمگلنگ رک چکی ہے اور پچھلے چھ سات برسوں میں حکومت نے آٹھ لاکھ نوجوانوں کو نوکریاں دی ہیں' چینی اور سیمنٹ کی قیمتیں گر رہی ہیں اور حکومت کی برڈ فلو سکیم سے پاکستان میں مرغی کا گوشت سستا ہو چکا ہے' یہ حقیقت ہے دالیں ابھی نوے روپے کلو بک رہی ہیں لیکن یہ یورپ اور امریکہ سے سستی ہیں' پٹرول' گیس اور بجلی مہنگی ہو رہی ہے لیکن یہ بھی ترقی اور خوشحالی کی علامت ہیں چنانچہ جس ملک میں لوگ مہنگا پٹرول افورڈ کر لیتے ہیں اس کا مطلب ہوتا ہے اس ملک کے لوگوں کی قوت خرید بہتر ہے''

اس نے سگریٹ کا ٹوٹا بجھایا' فرش پر پھینکا اور اسے جوتے سے رگڑ کر بولا'' جناب میں آپ سے پوری طرح متفق ہوں' اس میں کوئی شک نہیں ہمارا ملک ترقی کر رہا ہے' ہم ایک کامیاب ریاست ہیں لیکن یہ بتاؤ کیا ملک کے 80 فیصد عوام کی انصاف تک رسائی ہے؟ کیا لوگ عدالت جانے سے نہیں گھبراتے؟ کیا یہ دنیا کا واحد ملک نہیں جس میں جب تک مقتول کی جائیداد نہیں بک جاتی اس وقت تک اس کا مقدمہ جج کی میز تک نہیں پہنچتا'

کیا اس ملک میں تحفظ' امان اور انصاف کے لئے آپ کے پاس پیسے نہیں ہونے چاہئیں' کیا اس ملک میں اب زندہ رہنے کے لئے آپ کو منرل واٹر نہیں پینا پڑتا اور کیا یہ پانی اس ملک کے صرف تین فیصد لوگوں کو دستیاب نہیں' کیا اس ملک میں جب تک آپ کے گیٹ پر گارڈ نہ کھڑا ہو آپ سکون کی نیند نہیں لے سکتے' کیا اس ملک میں پولیس بڑے لوگوں کی پولیس نہیں بن چکی' کیا اس ملک میں روزانہ 800 لوگ قتل نہیں ہوتے' کیا اس ملک میں ڈاکے فیشن نہیں بن چکے اور کیا یہاں اغواء برائے تاوان معمول نہیں' کیا کراچی کے صنعت کار اور تاجر اغواء کے خوف سے دوبئی شفٹ نہیں ہو رہے کیا۔ اس ملک میں مڈل کلاس کے ہاتھ سے تعلیم نہیں نکل چکی؟ کیا حکومت نے بنیادی تعلیم تک پرائیویٹائز نہیں کر دی اور تم بتاؤ میری بیٹی نے بورڈ میں تیسری پوزیشن حاصل کی لیکن میں اسے کالج میں داخل نہیں کرا سکتا کیوں؟' کیونکہ میرے پاس فیس کے پیسے نہیں ہیں' پوری دنیا میں تعلیم' صحت' انصاف اور تحفظ بنیادی ضرورتیں ہیں لیکن کیا اس ملک میں یہ چاروں بنیادی ضرورتیں عوام کے پاس ہیں؟ کیا یہ سچ نہیں اس ملک میں جسے تحفظ چاہیے وہ اپنا گارڈ رکھتا ہے' جسے انصاف چاہئے وہ اپنا مکان اور اپنی دکان بیچتا ہے اور یہ پیسے وکیل کے حوالے کرتا ہے وہ مقدمہ دائر کرتا ہے اور اس کے بعد روز مرتا' روز جیتا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں اس ملک میں جسے دوا چاہیے وہ ڈاکٹر کو فیس دے اور بازار سے دس ہزار روپے کی دوائیں خرید لے اور جس کے بچوں کو تعلیم چاہیے وہ گردے بیچ کر بچوں کو سکول میں داخل کرائے' کیا یہ سچ نہیں اس ملک میں بے روزگاری کا یہ عالم ہے پولیس جس ڈاکو' جس قاتل کو پکڑتی ہے اس کی عمر بیس سے تیس برس کے درمیان نکلتی ہے' کیا یہ سچ نہیں پاکستان میں دنیا میں سب سے زیادہ ایکسیڈنٹ ہوتے ہیں اور اس ملک میں ضروریات زندگی اوسط آمدنی سے ساڑھے تین گنا مہنگی ہیں لہٰذا اگر ان تمام حقائق کو دیکھا جائے تو ہم اپنے ملک کو اتنا زیادہ کامیاب بھی قرار نہیں دے سکتے' یہ درست ہے ہم ترقی کر رہے ہیں لیکن کون لوگ ترقی کر رہے ہیں؟ وہ لوگ جو کروڑ پتی ہیں، کیا یہ سچ نہیں کروڑ والا کروڑ سے کروڑ کما رہا ہے لیکن ہزاروں اور لاکھوں والے روز بروز غریب ہو رہے ہیں' یہ ہے حقائق کا دوسرا رخ''

وہ خاموش ہو گیا' مجھے غصہ آ گیا اور میں نے چلا کر کہا ''اس کا مطلب ہے تم بھی پاکستان کو فیل سٹیٹ سمجھتے ہو' اس نے فوراً انکار میں سر ہلا دیا ''نہیں پاکستان فیل سٹیٹ نہیں لیکن اس کا نظام فیل ہو چکا ہے کیونکہ یہ سسٹم اپنے شہریوں کو روزگار دے رہا ہے اور نہ ہی احترام' مجھے خطرہ ہے اگر ہم نے یہ سسٹم نہ بدلا تو کہیں خدانخواستہ فنڈ فار پیس اور فارن پالیسی جیسے اداروں کے خدشات درست ثابت نہ ہو جائیں' کہیں ہم حقیقتاً مار نہ کھا جائیں۔'' مجھے اس کی بات سے اتفاق نہیں تھا لہٰذا میں غصے سے باہر نکل گیا۔

قبر تک

یہ وزیراعظم شوکت عزیز کی کابینہ کے ایک اجلاس کا منظر تھا، اجلاس کے دوران وزیر مملکت اسحاق خان خاکوانی نے اپنی فائل سے ایک ٹینڈر نوٹس نکالا اور وزیراعظم کی خدمت میں پیش کر دیا، وزیراعظم نوٹس دیکھ کر حیران رہ گئے، یہ پاسکو کی انتظامیہ کی طرف سے جاری کردہ نوٹس تھا جس میں پاسکو نے 50 لگژری گاڑیاں خریدنے کیلئے ٹینڈر طلب کئے گئے تھے، ان گاڑیوں میں بی ایم ڈبلیو، لینڈ کروزر، ٹویوٹا ہائی لکس، پراڈو اور ٹویوٹا کرولا شامل تھیں، پاسکو یہ گاڑیاں اسلام آباد میں اپنے افسروں کیلئے خریدنا چاہتا تھا، اسحاق خاکوانی نے وزیراعظم سے عرض کیا ''پاکستان کا کوئی سرکاری افسر وزیراعظم کی اجازت کے بغیر قیمتی گاڑیاں نہیں خرید سکتا لیکن پاسکو کی انتظامیہ نے نہ صرف گاڑیاں خریدنے کا فیصلہ کر لیا بلکہ وزیراعظم کی اجازت کے بغیر اخبارات میں ٹینڈر بھی چھپوا دیئے'' اسحاق خاکوانی نے اس کے بعد باآواز بلند ٹینڈر نوٹس پڑھا، نوٹس سننے کے بعد تمام وزراء ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے، وزیراعظم نے زراعت کے وفاقی وزیر سکندر بوسن کی طرف دیکھا اور ان سے پوچھا ''کیا پاسکو نے آپ سے ان گاڑیوں کیلئے اجازت لی تھی'' سکندر بوسن نے بے چارگی سے جواب دیا ''پاسکو کے سربراہ ایک فوجی جرنیل ہیں اور میں انہیں گاڑیاں خریدنے سے نہیں روک سکتا'' سکندر بوسن کے اس جواب کے بعد وزیراعظم نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے یہ ٹینڈر نوٹس منسوخ کر دیا۔

آج اس واقعے کو سات دن گزر چکے ہیں لیکن ابھی تک کسی طرف سے اس واقعے کی کوئی وضاحت آئی اور نہ ہی کسی نے اس کی تردید کی، ابھی تک کسی اتھارٹی نے اس خلاف ورزی کی انکوائری کی اور نہ ہی کسی نے کسی سے وضاحت طلب کی لہٰذا یہ سٹوری بھی بے شمار دوسری کہانیوں کی طرح بے حسی کے قبرستان میں دفن ہو گئی، میری گزشتہ روز رؤف کلاسرا سے بات ہو رہی تھی رؤف کلاسرا پاسکو کی فوجی قیادت کو اس کا قصوروار ٹھہرا رہا تھا جبکہ میرا خیال اس سے یکسر مختلف تھا، میں نے اس سے کہا ''قیمتی اور آرام دہ گاڑیاں ایک ایسا حمام ہے جس میں حکومت کے زیادہ تر عہدیدار اور وزراء ننگے ہیں، سیکرٹریوں سے لے کر وزیراعظم تک اس ملک کی تمام مقتدر ہستیاں اس دلدل میں اس قدر دھنس چکی ہیں کہ ان میں اب کسی دوسرے محکمے کے احتساب کی جرأت اور ہمت نہیں بچی، رؤف

کلاسرا نے میری بات سے اتفاق نہیں کیا لیکن میں ڈٹا رہا' میں نے اسے بتایا پچھلے سال اخبارات میں ان گاڑیوں کے بارے میں خبریں شائع ہوئیں جو حکومت نے وی وی آئی پیز کے لئے باہر سے 60 بلٹ پروف گاڑیاں منگوائی تھیں، ان میں سے ہر گاڑی کی قیمت 7 کروڑ روپے تھی اور ان میں دو تین ایسی لیموزین بھی شامل تھیں جن کی فی کس قیمت سولہ کروڑ تھی، حکومت نے 20 گاڑیاں کینسل کر دیں لیکن چالیس گاڑیاں آئیں اور یہ گاڑیاں اب وی وی آئی پیز کے زیر استعمال ہیں، حکومت نے ان گاڑیوں کے ٹیکس کی مد میں خزانے کو 70 کروڑ روپے کا نقصان پہنچایا۔ وزیراعظم صاحب نے اپنے لئے دو نئے جہازوں کا بھی آرڈر دیا تھا، ان میں سے ایک جہاز پاکستان آ چکا ہے اور وزیراعظم اس میں باقاعدہ سفر کر رہے ہیں جبکہ دوسری ایئر بس ابھی پاکستان نہیں پہنچی، پچھلے سال وی وی آئی پی جہاز کی مرمت پر 58 کروڑ روپے خرچ ہوئے تھے لہٰذا وزیراعظم کی دیکھا دیکھی دوسرے اعلیٰ عہدیداروں نے بھی اب دھڑا دھڑ بڑی گاڑیاں منگوانا شروع کر دی ہیں، پچھلے سال سپیکر قومی اسمبلی چوہدری امیر حسین نے ایک کروڑ بیس لاکھ کی نئی مرسیڈیز خریدی تھی، جب میڈیا نے اس پر شور کیا تو انہوں نے اس مرسیڈیز کے ساتھ ساتھ 90 لاکھ کی دو لینڈ کروزر بھی خرید لیں۔ اس وقت ہماری کابینہ کے 17 وزراء کے پاس بڑی گاڑیاں ہیں۔ تمام وزراء گاڑیوں کے پورے پورے فلیٹ کے ساتھ سفر کرتے ہیں، ان کے ساتھ پولیس کی سیکورٹی جیپ کے علاوہ ذاتی سٹاف کی گاڑیاں بھی ہوتی ہیں، صوبائی حکومتوں کی بھی یہی صورتحال ہے آپ چیف منسٹرز کے پروٹوکول نکال کر دیکھ لیجئے، آپ صوبائی حکومتوں سے پوچھئے چار برسوں میں کس کس چیف منسٹر نے کون کون سی گاڑیاں خریدی ہیں اور ان کی قیمت کیا تھی، آپ حقائق جان کر حیران رہ جائیں گے، آپ افواج پاکستان کے چیفس کو بھی دیکھ لیجئے آپ کو حیرت ہوگی ان سب کے پاس بھی نئی بلٹ پروف گاڑیاں ہیں اور وہ بھی پورے نو آبادیاتی پروٹوکول کے ساتھ سڑک پر نکلتے ہیں، ان کے آگے بھی پچاس پچاس موٹر سائیکل اور ہوٹر والی گاڑیاں چلتی ہیں اور ان کے سیکورٹی گارڈز بھی سارے راستے اور سارے علاقے کو اپنے نرغے میں لے لیتے ہیں لیکن آپ دلچسپ صورتحال ملاحظہ کیجئے ان حضرات نے یہ گاڑیاں باقاعدہ تحریری اجازت سے منگوائی تھیں اور انہیں یہ اجازت وزیراعظم کے آفس سے دی گئی تھی لہٰذا کہنے کا مطلب ہے بڑی اور بلٹ پروف گاڑیاں اب باقاعدہ سیاسی کلچر بن چکی ہیں، ہمارے ملک کے ذمہ داروں میں اب سرکاری خزانے سے مہنگی سے مہنگی گاڑیاں خریدنے کا باقاعدہ مقابلہ ہوتا ہے اور اس مقابلے میں شامل تقریباً تمام لوگ جیت جاتے ہیں۔

میں نے رؤف کلاسرا سے عرض کیا' یہ مقابلہ صرف اعلیٰ مقتدر ہستیوں کے ایوانوں تک محدود نہیں بلکہ اب یہ ایوانوں سے نکل کر کارپوریشنوں، وزارتوں اور ڈویژن میں آ چکا ہے اور جب مختلف محکموں کے چیئرمین، ڈی جی اور ایم ڈی اپنے وزراء کو پانچ پانچ کروڑ کی گاڑیوں میں گھومتے دیکھتے ہیں تو ان کے ارمان بھی انگڑائیاں لینے لگتے ہیں لہٰذا وہ بھی وی وی آئی پی بننے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں' پچھلے دنوں بحریہ ٹاؤن کے چیف ایگزیکٹو ملک ریاض حسین نے گیارہ کروڑ روپے کی رولز رائس فینٹم منگوائی، میرے ایک مہربان ریٹائر جنرل صاحب کو پتہ چلا تو

انہوں نے مجھ سے فرمائش کی تم مجھے ملک ریاض سے دو گھنٹے کیلئے رولز رائس لے کر دے سکتے ہو، میں نے عرض کیا ”سر ان کے ساتھ میری بے تکلفی ابھی رولز رائس کے دائرے میں داخل نہیں ہوئی“ وہ خاموش ہو گئے، اس کے بعد میں نے ان سے احتیاطاً پوچھ لیا ”سر آپ نے یہ گاڑی کیا کرنی ہے“ انہوں نے قہقہہ لگا کر فرمایا ”میرا ایک جونیئر افسر پرموٹ ہو گیا ہے، اس کے پاس سرکاری بی ایم ڈبلیو ہے، میں اسے مبارک باد دینے کیلئے رولز رائس پر جانا چاہتا ہوں“ جنرل صاحب کی یہ خواہش بظاہر منفی محسوس ہوتی ہے لیکن فی زمانہ یہ بہت بڑی حقیقت ہے جب ملک کا سرکاری کلچر بڑی گاڑیوں میں ڈھل چکا ہو تو پھر آپ کس کس کا ہاتھ روکیں گے، آپ کس کس کی خواہشوں کے راستے میں بند باندھیں گے۔ چینی کہاوت ہے مچھلی ہمیشہ اپنے سر سے گلنا شروع ہوتی ہے، اگر ہم ذرا سا غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا ہمارے ملک، ہمارے معاشرے کا سر گل چکا ہے، ہمارے سیاسی ایوان بری طرح لرز رہے ہیں لیکن ہم ماننے کیلئے تیار نہیں ہیں، ارسطو سے سکندر اعظم نے پوچھا تھا ”بابا ریاستیں کب تباہ ہوتی ہیں“ اس نے ہنس کر جواب دیا تھا ”جب بادشاہ عوام کی انتڑیوں کو اپنے دسترخوان پر سجانے لگیں“ اگر ہم سوچیں تو بڑی گاڑیوں پر خرچ ہونے والی یہ رقم بھی بالآخر عوام کے پیٹ سے نکلتی ہے اور یہ اس ملک کے لوگوں کے ساتھ بڑی زیادتی ہے جس میں 34 فیصد لوگ خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہے ہوں‘ جس میں لوگ دوا اور روٹی کے لئے گردے بیچ رہے ہوں اور جس میں لوگ اپنی بیٹیاں نیلام کر رہے ہوں‘ آخر ہم نے بھی کبھی نہ کبھی مرنا ہے‘ آخر ہم نے بھی کبھی نہ کبھی اپنے خدا کے سامنے پیش ہونا ہے لہٰذا مجھے سمجھ نہیں آتی ہم اپنے اللہ کے سامنے کون سا منہ لے کر جائیں گے‘ اس میں کوئی شک نہیں گاڑی آج کی ضرورت ہے لیکن سرکاری خزانے سے خریدی گئی بڑی اور مہنگی گاڑیاں ضرورت نہیں ہوس ہیں اور یہ حقیقت ہے ضرورت کبھی نہ کبھی پوری ہو جاتی ہے لیکن ہوس کا منہ قبر تک کھلا رہتا ہے۔

بدقسمتی کا اونٹ

یہ تو معلوم نہیں وہ کون تھا، وہ کہاں رہتا تھا، وہ کیا کرتا تھا اور وہ کس جگہ دفن ہے لیکن اس شخص کا تخلیق کیا ہوا فقرہ شاید رہتی دنیا تک قائم رہے، لوگ دنیا میں جب بھی بدنصیبی کا ذکر کریں گے تو وہ بے اختیار اس شخص کا فقرہ دہرائیں گے' اس نے کہا تھا" بدنصیب انسان اونٹ پر بھی بیٹھا ہو تو اسے کتا کاٹ لیتا ہے"۔ شیخ عبدالحفیظ صاحب میرے بزرگ دوست ہیں، وہ علم نجوم اور رمل کے ماہر ہیں۔ وہ لوگوں کی قسمت کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں لہٰذا وہ اکثر کہتے ہیں " جب کسی انسان کی خوش نصیبی کا دور شروع ہوتا ہے تو اللہ اس کی خامیوں کو خوبیوں میں بدل دیتا ہے اور اس کی غلطیوں پر بھی پھل لگنے لگتا ہے لیکن جب کوئی شخص بدقسمتی کے فیز میں داخل ہوتا ہے تو اس کی خوبیاں بھی خامیاں بن جاتی ہیں اور اس کی اچھائیوں پر بھی کانٹے اگ آتے ہیں" میں ہمیشہ ان کی اس آبزرویشن سے اختلاف کرتا ہوں لیکن گزشتہ چند ماہ سے مجھے ان کی بات میں تھوڑی تھوڑی صداقت محسوس ہونے لگی ہے، میں دیکھتا تھا ہماری حکومت بڑے ہموار طریقے سے چل رہی تھی، اس کے سامنے کوئی چیلنج نہیں تھا، جناب شوکت عزیز دونوں ہاتھوں سے خزانہ بھر رہے تھے، جناب پرویز مشرف کی مقبولیت کا گراف انتہائی سرے کو چھو رہا تھا اور حکومت میں جو تھوڑی بہت خرابی تھی اس پر ہمارے نئے وزیر اطلاعات محمد علی درانی اپنی دروغ گوئی کا رنگ کر دیتے تھے وزیر اعلیٰ جناب پرویز الٰہی اور ان کے صاحبزادے پنجاب کی زمینوں اور پلاٹوں کو " پرائیوٹائز" کر رہے تھے، لاہور ٹریفک پولیس کے ایک ایس پی اور ان کے امریکہ پلٹ بھائی ڈیفنس ہاؤسنگ سکیم کی قیادت کو دونوں ہاتھ سے نواز رہے تھے اور اپوزیشن کے منصوبوں میں دراڑیں پڑ رہی تھیں لہٰذا حالات ہر لحاظ سے حکومت کے ہاتھ میں تھے لیکن پھر اچھائیوں پر کانٹے اگنا شروع ہو گئے اور چیزیں ایک ایک کر کے حکومت کے ہاتھ سے نکلنے لگیں، کراچی سٹیل ملز کا مسئلہ اٹھا اور لوگوں نے پہلی بار وزیر اعظم شوکت عزیز کی معاشی دیانت کو چیلنج کر دیا، سٹیل ملز کا مقدمہ سپریم کورٹ تک پہنچا اور عدالت نے نج کاری کے عمل کو جانبدارانہ قرار دے دیا، اس کے بعد سٹاک ایکس چینج کا معاملہ بیدار ہوا اور اس معاملے نے وزیر اعظم کی ساری معاشی ٹیم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وزیر اعظم کے ساتھ ساتھ سلیمان شاہ جیسے بین الاقوامی ماہر بھی بدنام ہو گئے، ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ اچانک ایم کیو ایم روٹھ گئی

اور سندھ حکومت جاتی ہوئی دکھائی دینے لگی، حکومت وہاں سے نکلی تو مولانا فضل الرحمٰن آگے بڑھے اور وہ نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کے ساتھ شامل ہو گئے، حکومت ابھی اس جھٹکے سے نہیں سنبھال پائی تھی کہ اپوزیشن نے تحریک عدم اعتماد پیش کر دی، اس سے پہلے بھارت میں ٹرینوں کے دھماکے ہوئے اور پاک بھارت مذاکرات تعطل کا شکار ہو گئے، اسی دوران حکومت نے تحفظ حقوق نسواں بل پیش کر دیا اور مسلم لیگ (ق) تک کے ارکان نے اس کی مخالفت کر دی، حکومت ابھی بمشکل ان کا ''منت ترلہ'' کر رہی تھی کہ اچانک ڈاکٹر عبدالقدیر کو کینسر ہو گیا اور لوگوں نے حکومت کو مورد الزام ٹھہرانا شروع کر دیا اور ابھی یہ خبریں جاری تھی کہ کوہلو کا واقعہ پیش آیا اور نواب اکبر خان بگٹی قتل ہو گئے۔

یہ اوپر تلے پیش آنے والے واقعات بتاتے ہیں شاید حکومت کا وہ دور شروع ہو چکا ہے جس میں حکومتیں اونٹ پر چڑھ کر بھی بدقسمتی کے پنجوں اور جبڑوں سے محفوظ نہیں رہتیں، آپ حکومت کی بدقسمتی کا اندازا لگایئے نواب اکبر خان بگٹی کی ہلاکت کا واقعہ 27 اگست کے اخبارات میں شائع ہوا اور 28 اگست کو صدر صاحب مری میں سوئی گیس کا افتتاح کر رہے تھے، اس افتتاح پر ایک بلوچ سردار نے مجھے فون کیا اور دکھی آواز میں پوچھا ''حکومت سوئی کے سردار کو قتل کر کے مری میں سوئی گیس کا افتتاح کر رہی ہے یہ لوگ ہمیں کیا پیغام دینا چاہتے ہیں'' میں خاموش رہا لیکن اس کے بعد دیر تک سوچتا رہا حکومت نے مری میں سوئی گیس کے افتتاح کا پروگرام چار ماہ پہلے بنایا تھا اور یہ حقیقتاً ایک مثبت اور اچھا منصوبہ ہے لیکن آپ بدقسمتی ملاحظہ کیجئے حکومت کے اس نیک اور اچھے کام کے ساتھ بھی کانٹے لگ گئے، اس افتتاح سے ٹھیک دو دن پہلے نواب اکبر خان بگٹی کا سانحہ پیش آیا اور حکومت کیلئے بدنامی سنبھالنا مشکل ہو گئی اگر ہم بدقسمتی کی اس تھیوری کو سچ مان لیں تو صاف محسوس ہوتا ہے حکومت اس خطرناک فیز میں داخل ہو چکی ہے جس میں کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے، کسی بھی وقت ایم کیو ایم حکومت سے الگ ہو سکتی ہے، ایم ایم اے بلوچستان حکومت سے علیحدگی کا اعلان کر سکتی ہے اور اپوزیشن پارٹیاں مل کر اسمبلیوں سے استعفے دے سکتی ہیں جس کے بعد حکومت کا اونٹ بیٹھ جائے گا اور بدقسمتی کے جبڑے اونٹ تک کو نگل جائیں گے، میں ایم کیو ایم اور ایم ایم اے کے بارے میں شدید خدشات کا شکار ہوں، یہ دونوں اپوزیشن کی جماعتیں ہیں لیکن یہ پچھلے چار برس سے اقتدار میں ہیں، ان چار برسوں میں ان کی کارکردگی زیادہ آئیڈیل نہیں رہی لہٰذا ان لوگوں کی کوشش ہو گی یہ الیکشن سے پہلے حکومت سے الگ ہو جائیں تاکہ یہ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کو ایشو بنا کر عوام سے ایک بار پھر ووٹ لے سکیں۔

لوگوں کا ہم کالم نویسوں کے بارے میں عمومی خیال ہوتا ہے ہم لوگ ایسے طبیب ہیں جو تشخیص میں تو بہت ماہر ہوتے ہیں لیکن ان کے پاس مسئلے کا کوئی حل نہیں ہوتا' بعض لوگ کہتے ہیں ہم لوگ ماہر سرجن کی طرح مریض کا آپریشن تو کر لیتے ہیں لیکن ہمیں ٹانکے لگانے نہیں آتے، میں آج یہ الزام بھی دھو دینا چاہتا ہوں، میں آج مریض کو ٹانکے لگا دیتا ہوں' میں حکومت کے سامنے ایک ایسا حل رکھتا ہوں جس کے ذریعے وہ بدقسمتی کے

''کتوں'' سے بھی بچ جائے گی اور وہ اس ملک پر مزید دس پندرہ برس تک برسر اقتدار بھی رہے گی' اس مسئلے کے دو حل ہیں' اول پرانے زمانے میں لوگ مشکل وقت ٹالنے کیلئے کالے بکروں کی قربانی دیا کرتے تھے حکومت بھی یہ وقت ٹالنے کیلئے ایک آدھ بکرے کی قربانی دے دے' حکومت کی ساری بلائیں ٹل جائیں گی' اگر حکومت کو چوائس کا مسئلہ پیش آئے تو میں انہیں دس بارہ بکروں کی فہرست پیش کرسکتا ہوں حکومت ان میں سے اپنی مرضی کا بکرا پکڑ لے اور قربان کر کے جان چھڑائے' دوسرا حل' ڈاکٹر امجد' پیر صاحب زکوڑی شریف اور ظفر بختاوری ہیں، یہ تینوں حضرات وزارت عظمیٰ کے بڑے شاندار امیدوار ہیں، اگر وزارت عظمیٰ کا بوجھ باری باری ان تینوں کے کندھوں پر لاد دیا جائے تو میرا خیال ہے یہ لوگ نہ صرف مسائل کے سارے کتے بھگا دیں گے بلکہ حکومت کے اونٹ کو دوڑاتے دوڑاتے واشنگٹن تک لے جائیں گے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر حکومت کامل علی آغا پر پوری طرح اعتماد کر سکتی ہے، آغا صاحب کو بھی اللہ تعالیٰ نے خود کو حالات کے مطابق ڈھالنے کا ٹھیک ٹھاک ملکہ دے رکھا ہے' رہ گیا پنجاب تو اس کیلئے میں میاں عامر محمود کا نام پیش کروں گا، میاں صاحب جنرل صاحب کیلئے وہ کچھ کر سکتے ہیں جو ساری فوج مل کر نہیں کر سکتی۔

☼.....☼.....☼

پرلوگ

فرعون رامیسس دوم 1279 قبل مسیح میں مصر کا حکمران بنا' اس وقت اس کی عمر صرف 20 سال تھی' اس نے 66 برس دو ماہ تک مصر پر حکومت کی' وہ ایک شاندار شخصیت کا وژنری انسان تھا' اس نے مصری تہذیب کو اپنے نقطہ کمال تک پہنچا دیا' اس نے پوری دنیا سے ماہرین فن جمع کئے اور ان ماہرین نے آنے والوں دنوں میں مصر کو تاریخ کی پہلی سپر پاور بنا دیا' رامیسس نے نہ مٹنے والی روشنائی بنوائی' اس نے نعشوں کو ہزاروں سال تک سلامت رکھنے والے کیمیکل ایجاد کرائے' اس نے بادل لانے اور برسانے والی ٹیکنالوجی حاصل کر لی' اس نے ہواؤں کا رخ موڑنے اور موجوں کو پسپا کرنے کا فن سیکھ لیا' اس نے ایک ایسی ٹیکنالوجی بنا لی جس کی مدد سے مصری انجینئر سینکڑوں ٹن بھاری پتھر ہوا میں اٹھاتے تھے اور اس کے بعد ان پتھروں کو جوڑ کر اہرام بنا دیتے تھے' اس کے پاس ستارہ شناسوں کا پورا سکواڈ تھا' اس کے ستارہ شناس آسمان کی تبدیلیاں دیکھ کر آنے والے حالات بتا دیتے تھے' اس نے دریائے نیل کے دونوں کناروں پر اناج اور باغ اگا دیئے تھے' جس کی وجہ سے مصر کے لوگ خوشحالی اور استحکام کی آخری حدیں چھونے لگے' اس نے مصر میں درس گاہوں کا جال بچھا دیا تھا' اس کے دور میں فلسفی اور دانشور عام تھے' آج دنیا یونان کے جن فلسفیوں' سائنس دانوں اور دانشوروں کو علم و فن کی بنیاد قرار دیتے ہیں ان تمام لوگوں نے مصریوں سے علم سیکھا تھا اور ان تمام علوم کا منبع رامیسس تھا' اس نے دنیا کے بہترین جادوگر جمع کئے اور انہیں دربار میں اعلیٰ عہدے دے دیئے' اس کے پاس دنیا کی بہترین فوج تھی' اس کے پاس سونے اور چاندی کے پہاڑ تھے اور وہ جواہرات جڑے ہوئے برتنوں میں کھانا کھاتا تھا' ان تمام کامیابیوں اور فتوحات نے رامیسس کا دماغ خراب کر دیا اور اس نے خود کو کائنات کا خدا (نعوذ باللہ) سمجھنا شروع کر دیا' اس کا کہنا تھا دنیا کی تمام طاقتیں اس کے کنٹرول میں ہیں اور وہ چاہے تو ہواؤں کا رخ پھیر دے' وہ چاہے تو کنگلوں کو بادشاہ بنا دے اور اگر وہ چاہے تو وہ بادشاہوں کو کنگلا کر دے' خدائی کے اسی زعم میں ایک دن اس نے اپنے نجومیوں سے پوچھا ''بتاؤ میری خدائی کب تک قائم رہے گی؟'' نجومیوں نے ستاروں کی چال پڑھی اور اس کے بعد عرض کیا ''حضور بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہو گا' یہ بچہ آپ اور آپ کی خدائی کیلئے خطرناک ثابت ہو گا'' رامیسس نے اسی وقت حکم دیا ''آج کے بعد بنی اسرائیل میں جو بھی بچہ پیدا ہو اسے فوراً قتل کر دیا جائے'' اس حکم کے بعد بنی اسرائیل کے بچوں کا قتل شروع ہو گیا' یہاں سے حضرت موسیٰ اور فرعون کی کہانی شروع ہوتی ہے۔

فرعون رامیسیس دوم 1213 قبل مسیح میں حضرت موسیٰ کا پیچھا کرتا ہوا دریائے نیل میں ڈوب کر مر گیا لیکن قدرت نے اس کی نعش ہمیشہ کیلئے محفوظ کر دی' رامیسیس کی نعش آج بھی قاہرہ کے میوزیم میں رکھی ہے' اس کے منہ میں ایک چھوٹی سی نلکی ہے اور اس نلکی کے ذریعے اس کے منہ میں قطرہ قطرہ پانی ٹپکایا جاتا ہے اور اس کے ناخن مسلسل بڑھتے رہتے ہیں جنہیں دو تین ماہ بعد باقاعدہ تراشا جاتا ہے' اس سارے عمل میں اللہ تعالیٰ کی کیا حکمت ہے اس پر کوئی عالم دین ہی روشنی ڈال سکتا ہے' سر دست ہم 3285 برس بعد آج کے زمانے میں بیٹھ کر فرعون کے اس نفسیاتی خوف کا تجزیہ کرتے ہیں جس نے اسے بنی اسرائیل کے بچے قتل کرانے پر مجبور کر دیا تھا' آج ہم فرعون کے احکامات کا پوسٹ مارٹم کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے فرعون کو بظاہر اس بے وقوفی کی کوئی ضرورت نہیں تھی' اس کی کرسی مضبوط تھی' اپوزیشن کا کوئی وجود نہ تھا' عوام خوشحال تھے اور علم و ادب میں پوری دنیا میں مصر کا کوئی ثانی نہیں تھا لہٰذا اگر فرعون قدرت کے نظام سے چھیڑ چھاڑ نہ کرتا تو اس کی حکومت اسی طرح چلتی رہتی' سوال یہ ہے پھر اس نے ایسا کیوں کیا؟ تھوڑا سا مزید گہرائی میں جائیں تو ہمیں محسوس ہوگا یہ بنیادی طور پر فرعون کا خوف نہیں تھا' یہ اس کے حواریوں بلکہ اس کی "مسلم لیگ ''ق'' " کا خوف تھا' اس کی مسلم لیگ کا خیال تھا اگر نجومیوں کی بات درست ثابت ہوگئی تو ہم سب فارغ ہو جائیں گے چنانچہ انہوں نے فوراً فرعون سے ایل ایف او جاری کرا دیا' جس کے بعد فرعون کی قدرت کے ساتھ لڑائی شروع ہوگئی اور اس لڑائی کے نتیجے میں فرعون رہا اور نہ ہی مصر' آپ کو محسوس ہوگا فرعون کا سارا بحران اس کی ق لیگ نے پیدا کیا تھا' یہ ق لیگیں بنیادی طور پر بحران کی وہ لکیریں ہوتی ہیں جو پتھر اور لوہے کے بنے قلعوں کو کھنڈر بنا دیتی ہیں یہ فرعون جیسے شاندار بادشاہوں کو برباد کر دیتی ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے' یہ ق لیگیں جنم کیسے لیتی ہیں؟ ان کے جنم کو سمجھنے کیلئے آپ کو جنگل کی روایات میں جھانکنا پڑے گا۔

کہا جاتا ہے جنگل میں جب کوئی شیر پہلی بار شکار کیلئے نکلتا ہے تو اس کے حواریوں کا ایک گروہ بن جاتا ہے' یہ حواری ایسے چھوٹے اور مسکین جانور ہوتے ہیں جو شیر کے شکار پر زندہ رہتے ہیں' ان میں سے کوئی شکار کا سر کھاتا ہے' کوئی شکار کی کھال ادھیڑتا ہے' کوئی اس کی آنتیں چباتا ہے' کوئی اس کی دم چوستا ہے' کوئی اس کی آنکھیں نوچتا ہے اور کوئی اس کے پائے پکا کر کھا جاتا ہے' حواریوں کا یہ گروہ نکمے جانوروں کا دستہ ہوتا ہے اور ان کی بقا شیر اور شیر کے شکار سے وابستہ ہوتی ہے' یہ جانور روز شیر کی کچھار کے سامنے قطار باندھ کر بیٹھ جاتے ہیں' جونہی شیر نکلتا ہے یہ چپ چاپ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑتے ہیں' شیر شکار کے بعد ایک آدھ ران لیتا ہے اور دھوپ میں بیٹھ کر خلال کرنے لگتا ہے جس کے بعد ان حواریوں کی باری آتی ہے' یہ حواری جانور اس شکار سے بڑے آرام سے ایک آدھ ہفتہ نکال لیتے ہیں' جب یہ شیر بوڑھا ہو جاتا ہے' یہ درویشی اختیار کرنے لگتا ہے یا یہ اس جنگل سے اکتا جاتا ہے تو یہ حواری اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اسے یہ بتانا شروع کر دیتے ہیں حضور آپ کا وجود اس جنگل کی خوشحالی اور استحکام کیلئے انتہائی ضروری ہے اگر آپ نے وردی اتار دی تو یہ سارا جنگل برباد ہو جائے گا لہٰذا خدا کے واسطے اس جنگل کی بقا کیلئے اپنے فیصلے پر نظر ثانی فرمائیں' اکثر شیر ان حواریوں کی باتوں میں آ جاتے ہیں اور وہ مزید دس بیس برس تک شکار کھیلنے کا اعلان کر دیتے ہیں' ان دس بیس برسوں کے دوران

کسی دن شیر کے پنجے کمزور پڑ جاتے ہیں اور اس کے دانت گر جاتے ہیں تو یہ سارے حواری کسی دوسرے شیر کی کچھار کے سامنے قطار باندھ کر بیٹھ جاتے ہیں' یہ سلسلہ جب جنگلوں سے نکل کر شہروں اور ملکوں میں آتا ہے تو اس سے لیگیں بنتی ہیں اور ان لیگیوں سے انسانی شیروں کے زوال کا دور شروع ہوتا ہے۔

یہ بنیادی طور پر اقتدار کا فلسفہ ہے' فرعون سے لے کر آج تک ہر صاحب اقتدار کی ایک لیگ ہوتی ہے اور یہ لیگ اسے ہر وقت یہ باور کراتی رہتی ہے ''آپ کا وجود اس ملک کیلئے انتہائی ناگزیر ہے اور اگر آپ نے میدان چھوڑ دیا تو خوشحالی اور استحکام کا یہ عمل دم توڑ دے گا جس کے بعد یہ ملک ختم ہو جائے گا'' اور دنیا کے 99 اعشاریہ 99 فیصد حکمران ان لوگوں کی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں جس کے بعد جب تک وہ حکمران قائم رہتے ہیں یہ لوگ اس کے شکار پر پلتے رہتے ہیں' ان لیگیوں کا ریکارڈ ہے انہوں نے آج تک کسی سربراہ کو اقتدار سے باعزت طریقے سے رخصت نہیں ہونے دیا لہٰذا آج رامیسیس دوم کے 3285 برس بعد محسوس ہوتا ہے بنی اسرائیل کے بچے قتل کرنے کا منصوبہ فرعون نے نہیں بنایا ہوگا' یہ یقیناً فرعون کی ف لیگ کا جمہوری فیصلہ ہوگا' فرعون کی ف لیگ کو جب نجومیوں کی پیش گوئی کا علم ہوا ہوگا تو اس نے فوراً ایک بڑا اجلاس بلایا ہوگا اور اس اجلاس میں ''پارٹی'' نے فیصلہ کیا ہوگا ''ہمیں ملک کی خوشحالی اور جمہوریت کی بقا کیلئے ہر قیمت پر فرعون کی جان بچانا ہوگی' اس فیصلے کے بعد انہوں نے فرعون کو قائل کر لیا ہوگا وہ بنی اسرائیل کے تمام نومولود بچے قتل کرنے کا حکم دے دے اور فرعون نے بھی وسیع تر قومی مفاد اور نظریہ ضرورت کے تحت اس قرارداد پر دستخط کر دیئے ہوں گے جس کے بعد جب تک فرعون زندہ رہا ف لیگ بنی اسرائیل کے بچے قتل کراتی رہی لیکن آخر میں پتہ چلا وہ خطرہ جسے ف لیگ محل سے باہر ڈھونڈتی رہی تھی وہ فرعون کی گود میں پروان چڑھتا رہا تھا' مجھے یقین ہے ف لیگ نے آخری وقت بھی اس خطرے سے نبٹنے کی کوشش کی ہوگی لیکن اس لمحے وقت کی پلوں تلے بہت پانی جمع ہو چکا ہوگا۔

میں نے فرعون اور موسیٰؑ کا واقعہ زندگی میں بے شمار مرتبہ پڑھا لیکن اس واقعے کا یہ نفسیاتی پہلو ہمیشہ میری نظروں سے اوجھل رہا' میں نے 25 جولائی 2006ء کے اخبارات میں ایک تین کالم خبر پڑھی تو اس خبر نے مجھے فرعون کی ساری مجبوریاں سمجھا دیں اور مجھے وہ پہلی بار بیچارہ بیچارہ سے محسوس ہوا' یہ خبر پنجاب کی مسلم لیگ ق کے بارے میں تھی' اس خبر میں انکشاف تھا مسلم لیگ ق پنجاب نے 24 جولائی کو لاہور میں قرارداد پاس کی ''پاکستان مسلم لیگ وطن عزیز میں جاری ترقیاتی پروگراموں اور جمہوری عمل کے استحکام کیلئے جنرل پرویز مشرف کی صدارت کو ناگزیر سمجھتی ہے لہٰذا ہم جنرل مشرف کو موجود اسمبلیوں سے اگلے پانچ سال کیلئے وردی سمیت صدر منتخب کرائیں گے'' میں نے جوں ہی یہ خبر پڑھی مجھے 3285 برس پرانے حکمرانوں کی مجبوریاں یاد آ گئیں اور میں بے اختیار مسلم لیگ ق کے دفتر کی طرف دوڑ پڑا' میں مارگلہ روڈ پر مسلم لیگ کے دفتر کے سامنے رکا' اس عمارت کو سیلوٹ کیا اور اس کے بعد عرض کیا ''میں اس عمارت اور اس عمارت میں رہنے والے لوگوں کا دل سے ممنون ہوں ان لوگوں نے میرے تمام فکری مغالطے دور کر دیئے انہوں نے دنیا کا 3285 برس پرانا مسئلہ حل کر دیا''۔

چودھری شجاعت سمجھ دار ہیں

ہمارے محبوب صدر جنرل پرویز مشرف کی کتاب ''ان دی لائن آف فائر'' کا انتہائی دلچسپ حصہ 12 اکتوبر 1999ء کے انقلاب سے متعلق ہے' صدر نے نواز شریف کی جسارت کو ''کو'' لکھا ہے جبکہ فوجی کارروائی کو ''کاؤنٹر کو'' کا نام دیا ہے' یہ حصہ صفحہ 101 سے شروع ہو کر صفحہ 140 تک جاتا ہے۔ جناب عباس اطہر سمیت ہمارے تجزیہ نگاروں اور ٹیلی ویژن چینلوں نے اس حصے کو زیادہ اہمیت نہیں دی جبکہ فوج کی طاقت' سوچ اور ہیئت کو سمجھنے کے لئے یہ حصہ انتہائی اہم ہے' اس حصے میں ہمیں ہماری سیاست کا مستقبل اور قوم کے آنے والے دن بھی دکھائی دیتے ہیں۔

صدر محترم نے کتاب کے اس حصے میں 12 اکتوبر کو ایک خود کار واقعہ قرار دیا ہے' ان کا فرمانا ہے فوج نے اقتدار میں آنے کیلئے کسی قسم کی منصوبہ بندی نہیں کی تھی نواز شریف نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے جن کے نتیجے میں فوج ایوان اقتدار میں داخل ہو گئی' صدر نے فرمایا' 12 اکتوبر کا انقلاب شام پانچ بجے شروع ہوا' پاکستان ٹیلی ویژن سے ان کی بے دخلی کی خبر نشر ہوئی جس کے بعد فوج حرکت میں آ گئی اور صرف ساڑھے تین گھنٹے میں حالات فوج کے قابو میں تھے' صدر نے فرمایا' پانچ بجے شام چیف آف جنرل سٹاف لیفٹیننٹ جنرل محمد عزیز خان اور کور کمانڈر راولپنڈی لیفٹیننٹ جنرل محمود احمد آرمی کلب چک لالہ میں ٹینس کھیل رہے تھے جبکہ ٹرپل ون بریگیڈ کے دو کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل شاہد علی اور لیفٹیننٹ کرنل جاوید سلطان اسی کلب میں سکواش کھیلنے میں مصروف تھے جوں ہی ان لوگوں نے میری بے دخلی کی خبر سنی انہوں نے کھیل بند کیا اور جی ایچ کیو کی طرف دوڑ پڑے۔ ڈی جی ملٹری آپریشنز میجر جنرل شاہد عزیز گھر پر آرام کر رہے تھے' وہ بھی خبر سن کر جی ایچ کیو پہنچ گئے' جی ایچ کیو آ کر میجر جنرل شاہد عزیز نے ٹرپل ون بریگیڈ کے بریگیڈیئر صلاح الدین ستی کو آپریشن کا حکم دے دیا' کرنل شاہد علی اور کرنل جاوید سلطان کو وزیراعظم ہاؤس' ایوان صدر' ٹیلی ویژن اور ریڈیو سٹیشنوں کے ''تحفظ'' کی ذمہ داری سونپ دی گئی' کرنل شاہد علی نے چند جوان لئے اور وہ اسلام آباد روانہ ہو گئے' جس کے بعد جنرل شاہد عزیز نے لاہور' کراچی اور پشاور کے کور کمانڈروں کو احکامات جاری کرنا شروع کر دیئے' لاہور کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل خالد مقبول اس وقت گوجرانوالہ میں تھے' ان کی غیر موجودگی میں میجر جنرل طارق مجید سینئر افسر تھے' جنرل شاہد عزیز نے جنرل طارق مجید کو گورنر ہاؤس پنجاب' نواز شریف فیملی کی رہائش گاہیں' رائے ونڈ کا فارم ہاؤس' ایئر پورٹ' ٹیلی ویژن'

ریڈیو سٹیشن اور شہر میں داخل ہونے اور باہر جانے کے تمام راستوں پر قبضے کا حکم دے دیا' اسی قسم کے احکامات کراچی کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل مظفر عثمانی اور کور کمانڈر پشاور کو بھی جاری کر دیئے گئے''

صدر محترم نے صفحہ 123 پر تحریر کیا ''جب کرنل شاہد راولپنڈی سے نکلنے لگے تو انہوں نے وزیراعظم ہاؤس کی گارڈز کے انچارج کو فون کیا' یہ ایک سرونگ میجر تھا' میجر اس وقت وزیراعظم ہاؤس کے میدان میں جاگنگ کر رہا تھا' میجر کو اس کی بیوی کے ذریعے ٹیلی فون پر بلایا گیا' کرنل شاہد علی نے اسے وزیراعظم ہاؤس کو فوراً سیل کرنے کا حکم دے دیا' اسی طرح کرنل جاوید سلطان نے بھی ایوان صدر کے سیکورٹی انچارج میجر کو فون کیا اور اسے حکم دیا' ''ایوان صدر کو فوراً سیل کر دو اور اس کے بعد ٹیلی ویژن سٹیشن کو قبضے میں لے لو'' دونوں میجر آگے بڑھے اور انہوں نے وزیراعظم ہاؤس' ایوان صدر اور پاکستان ٹیلی ویژن سٹیشن سیل کر دیئے'' محترم صدر نے لاہور کے بارے میں لکھا'' پانچ بج کر 45 منٹ پر پاک فوج کے چار دستے نکلے اور لاہور شہر میں پھیل گئے' ان میں سے ایک گورنر ہاؤس چلا گیا' دوسرا ٹیلی ویژن سٹیشن' تیسرا وزیراعظم کی رہائش گاہوں اور چوتھا وزیراعظم کے رائے ونڈ فارم ہاؤس کی طرف روانہ ہو گیا' گورنر پنجاب ذوالفقار علی کھوسہ 200 لوگوں کے مجمع سے خطاب کرنے کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک دو فوجی جوان ان کے دفتر میں داخل ہو گئے' گورنر کے پرائیویٹ گارڈز نے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن وہ انہیں ایک طرف دھکیلتے ہوئے اندر آ گئے' ان دو جوانوں کے بعد ان کا کمانڈر داخل ہوا اور اس نے گورنر کو اپنے ساتھ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر چلنے کا حکم دے دیا'' تیسرا واقعہ ان دونوں سے کہیں دلچسپ تھا' محترم صدر نے تحریر کیا'' کرنل شاہد علی اپنے دو تین جوانوں کے ساتھ وزیراعظم ہاؤس کے بڑے پورچ میں داخل ہوئے' پورچ میں جنرل ضیاء الدین کی سیاہ گاڑی کھڑی تھی' گاڑی پر فل جرنیل کے ستار لگے تھے' جنرل ضیاء الدین چیف آف آرمی سٹاف کی یونیفارم میں گاڑی کے پاس کھڑے تھے' ان کے ساتھ نئے مقرر شدہ چیف آف جنرل سٹاف لیفٹیننٹ جنرل اکرم اور وزیراعظم کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر جاوید کھڑے تھے' یہ دونوں افسر بھی یونیفارم میں تھے' ان کے ساتھ وزیراعظم کی سیکورٹی کے ڈی جی (یہ ایک ریٹائرڈ میجر جنرل تھے) اور وزیراعظم کے پرنسپل سیکرٹری سعید مہدی کھڑے تھے اور ان کے ساتھ وزیراعظم ہاؤس کے سیکورٹی گارڈز اور ایلیٹ فورس کے جوان تھے، کرنل شاہد علی نے اپنے دو تین جوان پورچ میں تعینات کئے اور ان تمام افسروں کو ہتھیار پھینکنے کا حکم دے دیا' صدر کی کتاب میں اس کے بعد افسروں کے طویل مکالمات شروع ہو جاتے ہیں، جنرل ضیاء الدین جی ایچ کیو جانا چاہتے تھے جبکہ کرنل شاہد علی ان کا راستہ روکے کھڑے تھے، کرنل شاہد کو جنرل ضیاء الدین، جنرل اکرم اور بریگیڈیئر جاوید نے کبھی دھمکانے اور کبھی ترغیب دینے کی کوشش کی لیکن وہ ثابت قدم رہے یہاں تک کہ جنرل ضیاء الدین اور ان کے ساتھی ہتھیار پھینک کر اندر چلے گئے یوں کرنل شاہد علی اپنے چند جوانوں کی مدد سے وزیراعظم ہاؤس پر قابو پا لیتے ہیں۔

میں نے جب یہ تینوں واقعات پڑھے تو مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی اللہ کے کرم سے ہماری فوج اتنی طاقتور

ہے کہ ایک جاگنگ کرتا ہوا میجر دس منٹ میں ہیوی مینڈیٹ وزیراعظم ہاؤس کو سیل کر سکتا ہے اور ایک میجر چند جوانوں کی مدد سے ایوان صدر کو تالے لگا سکتا ہے جبکہ پاکستان کے سب سے بڑے صوبے کے سیاسی گورنر کو گرفتار کرنے کیلئے صرف دو فوجی جوان کافی ہیں۔ اسی طرح ایک کرنل دو تین جوانوں کی مدد سے نہ صرف وزیراعظم، وزیراعلیٰ، وزراء، سینیٹروں اور ایم این اے کو فارغ کر سکتا ہے بلکہ وہ جنرل اور بریگیڈیئر لیول کے باغی افسروں کو بھی بے دست و پا کر سکتا ہے جبکہ ایک جونیئر افسر پندرہ منٹ میں ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی نشریات روک سکتا ہے۔ مجھے صدر صاحب کی کتاب پڑھنے کے بعد محسوس ہوا ملک میں ''کاؤنٹر کو'' کرنے کیلئے کسی لمبی چوڑی فورس یا پلاننگ کی ضرورت نہیں ہوتی اگر چند سینئر افسر ٹینس اور سکواش کھیلتے ہوئے فیصلہ کر لیں تو وہ صرف پندرہ منٹ میں ملک کو تمام سیاسی خطرات سے آزاد کر سکتے ہیں، مجھے صدر صاحب کی کتاب پڑھ کر معلوم ہوا ہماری فوج میں جونیئر افسر جرنیلوں سے کہیں زیادہ طاقتور اور بااختیار ہیں۔

یہ کتاب پڑھنے کے بعد میرے دل میں چوہدری شجاعت حسین، شیخ رشید احمد اور مشاہد حسین کی قدر میں اضافہ ہوا اور میں ان کی دانشمندی اور معاملہ فہمی کا قائل ہو گیا، یہ تینوں حضرات میاں نواز شریف کے انتہائی قریب تھے، میں نے اپنی آنکھوں سے کئی بار ان حضرات کو نواز شریف پر جان چھڑکتے دیکھا تھا لیکن جب ''کاؤنٹر کو'' ہوا تو یہ لوگ فوراً فوجی حکومت کا حصہ بن گئے' ان حضرات کی اس معاملہ فہمی پر اس دور میں بعض لوگوں نے انہیں نامناسب خطاب سے نوازنا شروع کر دیا تھا' بدقسمتی سے میں بھی ان بے وقوف لوگوں میں شامل تھا' ان دنوں شیخ رشید نے بڑا خوبصورت بیان دیا تھا' انہوں نے فرمایا تھا ''میں طویل تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں، پاکستان میں فوج کے بغیر سیاست ممکن نہیں'' مجھے اس وقت شیخ صاحب کے خیالات سے اتفاق نہیں تھا لیکن آج صدر محترم کی کتاب پڑھنے کے بعد مجھے شیخ رشید کی معاملہ فہمی اور الہامی خیالات پر یقین ہو گیا اور مجھے محسوس ہوا شیخ رشید کی طرح چوہدری شجاعت حسین اور مشاہد حسین سمیت مسلم لیگ (ق) کے تمام ارکان، ایم کیو ایم، پیٹریاٹ اور مولانا فضل الرحمن بھی ٹھیک ٹھاک معاملہ فہم اور سمجھدار لوگ ہیں' یہ لوگ بھی بروقت اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے لہٰذا آج یہ تمام لوگ تاریخی اختیارات اور اقتدار سے لطف اندوز ہو رہے ہیں جبکہ وہ لوگ جنہوں نے ابھی تک اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا وہ ملک کے اندر اور ملک کے باہر دھکے کھا رہے ہیں، وہ آج تک ملک میں جمہوریت کے خواب دیکھ رہے ہیں' مجھے معلوم ہوا قدرت نے ہماری فوج کو اپنا ملک فتح کرنے کی ٹھیک ٹھاک صلاحیت سے نواز رکھا ہے چنانچہ اب اس ملک میں سیاست کرنے کا صرف ایک ہی فارمولا ہے تمام سیاستدان چودھری شجاعت بن جائیں' جنرل مشرف زندہ باد کے نعرے لگائیں اور انتقال تک حکومت کریں۔

یہ کتاب ثابت کرتی ہے

کسی سردار نے اپنی بیوی سے پوچھا ''اگر کوئی شخص تمہاری عصمت کے بدلے تمہیں دس ہزار روپے کی پیشکش کرے تو تمہارا کیا ردعمل ہوگا'' بیوی نے غصے سے جواب دیا ''میں اس کا منہ توڑ دوں گی'' سردار نے پوچھا ''اگر وہ ایک لاکھ روپے کی آفر دے تو؟'' بیوی نے جواب دیا ''میں معذرت کر لوں گی'' سردار مسکرایا ''اور اگر وہ تمہارے سامنے ایک کروڑ روپے رکھ دے تو'' بیوی نے تھوڑی دیر سوچا اور سنجیدہ ہو کر بولی ''میں خاموش رہوں گی'' سردار نے قہقہہ لگایا ''اور اگر وہ دو کروڑ روپے دے دے تو'' بیوی نے فوراً جواب دیا ''میں اس کی آفر قبول کر لوں گی'' سردار نے میز پر ہاتھ مار کر نعرہ لگایا ''لو ایک بات تو ثابت ہو گئی'' بیوی نے سر اٹھا کر پوچھا ''کیا؟'' سردار پورے وثوق سے بولا ''میں ایک ایسی عورت کے ساتھ رہ رہا ہوں جسے خریدا جا سکتا ہے۔''

میں آج تک اس واقعہ کو محض ایک لطیفہ سمجھتا رہا ہوں لیکن جب سے ہمارے محبوب صدر جناب پرویز مشرف کی ''خودنوشت'' ان دی لائن آف فائر مارکیٹ میں آئی ہے مجھے محسوس ہو رہا ہے یہ محض ایک لطیفہ یا ایک واقعہ نہیں، یہ ایک باقاعدہ فلسفہ حیات ہے اور ہم 16 کروڑ لوگ اس فلسفہ حیات کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں' گو صدر پرویز مشرف، ہمایوں گوہر اور ان کی صاحبزادی ثانیہ گوہر نے اس کتاب سے عالمگیر شہرت حاصل کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کتاب نے ہماری سیاست' ہماری سفارت اور ہماری عسکری اسٹیبلشمنٹ کو بھی پوری دنیا کے سامنے ننگا کر دیا' ہم پہلی مرتبہ مکمل کر دنیا کے سامنے آ گئے' دنیا اس سے پہلے ہمیں سردار کی بیوی کی طرح قابل خرید اور بداخلاق سمجھتی تھی لیکن ہم نے پہلی مرتبہ دنیا کو اس کا تحریری ثبوت پیش کر دیا' ہم نے پہلی مرتبہ اپنے جرائم تسلیم کر لئے' صدر صاحب کی کتاب کے اصل تجزیئے تو دس پندرہ برس بعد اس وقت ہوں گے جب صدر صاحب ہمیں داغ مفارقت دے چکے ہوں گے تاہم سر دست ہم اس کتاب کی چند موٹی موٹی باتوں کا ایک 'محتاط' سا جائزہ لے سکتے ہیں' صدر صاحب نے اپنی ذات اور اپنی خودنوشت دونوں کو اعتدال پسند ثابت کرنے کے لئے کتاب کا آغاز اپنی جوانی کے دو معاشقوں سے کیا۔ صدر نے اعتراف کیا وہ میٹرک میں اپنی ایک ہمسائی کے عشق میں مبتلا تھے اور وہ اپنی نانی کے برقعے کی جیب میں رقعے ڈال کر اسے بھجوایا کرتے تھے۔ صدر نے انکشاف کیا وہ اس دور میں ایک

بنگالی لڑکی کے سحر میں بھی مبتلا ہو گئے تھے اور انہوں نے فرمایا وہ اکثر کالج سے غائب ہو جاتے تھے' رات کو فلم دیکھتے تھے' واپسی پر مسجد میں لیٹ جاتے تھے اور صبح ہاسٹل آ جاتے تھے' صدر صاحب کے ان انکشافات سے جہاں ان تمام نوجوانوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے جو راتوں کو ہاسٹلوں سے غائب ہو جاتے ہیں' جن کے گھروں کی کھڑکیاں ہمسایوں کے صحن میں کھلتی ہیں اور جو ابھی اپنی نانیوں کے برقعوں کے اس سائنسی استعمال سے ناواقف ہیں وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے ہمارے ملک میں صدر بننے کے لئے اعلیٰ اخلاقی اقدار یا بہت زیادہ ذہانت اور محنت کی ضرورت نہیں گو صدر صاحب کی جوانی کے یہ تجربات سچ ہیں اور ان تجربات کا اعتراف انہیں ایک جرأت مند اور بے باک شخص ظاہر کرتا ہے لیکن اگر صدر یہ اعتراف نہ کرتے تو بھی ان کی جرأت مندی اور بے باکی پر کوئی حرف نہ آتا' دنیا انہیں پہلے ہی سچا' کھرا اور جرأت مند شخص تسلیم کر چکی ہے' صدر صاحب نے انکشاف کیا جنرل جہانگیر کرامت کے دور میں کور کمانڈرز کے اجلاس میں جنرل علی قلی خان فوج کو اقتدار پر قبضے کی ترغیب دیتے رہتے تھے' اس انکشاف سے ثابت ہوتا ہے فوج میں اقتدار تک پہنچنے کی سوچ ہر وقت موجود رہتی ہے' صدر صاحب نے انکشاف کیا نائن الیون کے بعد امریکہ کے نائب وزیر خارجہ رچرڈ آرمیٹج نے پاکستان کو دھمکی دی ''اگر پاکستان نے امریکہ کا ساتھ نہ دیا تو وہ بمباری کے ذریعے پاکستان کو پتھر کے زمانے میں پہنچا دیں گے'' اس دھمکی کے بعد حکومت نے امریکہ کی حمایت کا فیصلہ کر لیا' صدر کا یہ انکشاف ثابت کرتا ہے ہم لوگ، ہماری پالیسی، ہمارا قانون، ہمارا آئین اور ہماری حکومتیں ایک دھمکی کے فاصلے پر ہیں اور امریکہ کا ایک درمیانے درجے کا افسر جب چاہے ٹیلی فون اٹھا کر ہمیں یوٹرن لینے پر مجبور کر سکتا ہے، صدر صاحب نے انکشاف کیا امریکی سفیر وینڈی چیمبرلین 13 ستمبر 2001ء کو سات مطالبات کی فہرست لے کر ان کے پاس آئیں۔ یہ انکشاف ثابت کرتا ہے پاکستان میں امریکی سفیر کو وائسرائے کی حیثیت حاصل ہے اور امریکہ جب چاہے اپنا سفیر بھجوا کر ہم سے بڑے سے بڑے فیصلہ کرا سکتا ہے، صدر نے انکشاف کیا ہم نے القاعدہ کے 689 ارکان پکڑے، ان میں سے 369 لوگ امریکہ کے حوالے کئے اور لاکھوں ڈالر کمائے، یہ انکشاف ثابت کرتا ہے ہم ڈالر کمانے کیلئے ہر قسم کی ''قربانی'' دے سکتے ہیں، یہ انکشاف ثابت کرتا ہے ہمارے ملک میں قومی سطح کی ایسی خدمات کا صلہ سرکاری خزانے میں جمع نہیں ہوتا، یہ براہ راست افراد کی جیبوں میں چلا جاتا ہے، صدر نے انکشاف کیا انہوں نے اپنے پرنسپل سیکرٹری طارق عزیز کی مدد سے (ق) لیگ بنائی اور انہوں نے جناب شوکت عزیز کو وزیراعظم بنانے کا فیصلہ ذاتی طور پر کیا، یہ دونوں انکشاف ثابت کرتے ہیں پاکستان میں کوئی بھی طاقتور حکمران کسی بھی وقت ایک بڑے سائز کی مسلم لیگ بنا سکتا ہے اور ملک میں وزیراعظم کے عہدے کیلئے کوئی کوالیفکیشن موجود نہیں اور صدر صاحب نے اس کتاب کی لانچنگ کے دوران وردی کے بارے میں فرمایا ''وردی اتارنے کا وعدہ منہ کے الفاظ تھے''۔ یہ انکشاف ثابت کرتا ہے صدر صاحب کے وعدے کسی بھی وقت منہ کے الفاظ ثابت ہو سکتے ہیں' وہ تین لفظ بول کر اپنے بڑے سے بڑے فیصلے سے انحراف کر سکتے ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت ان کے اس انحراف کا احتساب نہیں کر سکتی۔

اگر ہم اس کتاب کا سرسری سا جائزہ لیں تو ثابت ہوتا ہے ہمارے ملک میں اخلاقیات، قانون، آئین اور سیاسی روایات نام کی کوئی چیز موجود نہیں، ہمارے ملک کی کوئی خارجہ پالیسی، کوئی داخلی قانون اور کوئی آئین نہیں اور یہ کتاب ثابت کرتی ہے اس ملک میں 1958ء سے کسی جیرل خان یا کسی آغا توپ خان کی حکومت چلی آ رہی ہے اور اس توپ خان کا ہر خواب، ہر خواہش اور ہر خیال قانون، آئین اور (نعوذ باللہ) حکم الٰہی کا درجہ رکھتا ہے اور پوری قوم اس حکم کے سامنے بے بس ہے۔ یہ کتاب ثابت کرتی ہے ہمارا ملک موم کی ناک ہے اور جو شخص جب چاہے اس ناک کو چٹکی میں لے کر اس کا زاویہ بدل سکتا ہے اور یہ کتاب ثابت کرتی ہے ہم لوگ کوئی قوم، کوئی ملک نہیں ہیں ہم سردار کی بیوی ہیں اور دنیا کا ہر سوداگر ہماری قیمت لگا سکتا ہے' یہ کتاب ثابت کرتی ہے ہم بک بھی سکتے ہیں' دب بھی سکتے ہیں' بھاگ بھی سکتے ہیں اور ہم معافی بھی مانگ سکتے ہیں۔

میرے ایک سرکاری دوست کا فرمانا ہے "یہ کتاب پاکستان کی تاریخ ہے" میں ان کے فرمان میں تھوڑا سا اضافہ کرنا چاہتا ہوں' میرا یہ خیال ہے یہ کتاب ہماری تاریخ نہیں بلکہ یہ ہمارا مستقبل بھی ہے اور یہ کتاب ثابت کرتی ہے ہم کیا تھے' ہم کیا ہیں اور ہم آنے والے دنوں میں کیا ہوں گے' یہ کتاب ایک آئینہ ہے جس میں ہم اپنی تمام بدصورتیاں دیکھ سکتے ہیں۔

پانچ چھ سالوں کی گیم

میں میاں نواز شریف کے دفتر سے واپس آیا تو میرے دوست نے بے تابی سے پوچھا ''ملاقات کیسی رہی'' میں نے کوٹ کے بٹن کھولے اور لمبا سانس لے کر جواب دیا ''بہت اچھی، میاں نواز شریف پہلے سے زیادہ میچور ہیں اس جلاوطنی نے انہیں حقیقی سیاستدان بنا دیا'' میرے دوست نے قہقہہ لگایا اور طنزیہ انداز سے بولا ''میچورٹی!'' میں اس کی بات سمجھ گیا، میرا یہ دوست پیشے کے لحاظ سے صحافی ہے اور یہ میاں نواز شریف کو غیر سنجیدہ سیاستدان سمجھتا ہے، اس کا خیال ہے میاں صاحب نے جلاوطنی سے کچھ نہیں سیکھا، وہ ابھی تک خواب و خیال کی دنیا میں رہ رہے ہیں' حکومت انتخابات میں ان کی پارٹی کو جڑ سے اکھاڑ دے گی اور وہ اسمبلیوں میں بمشکل پانچ سات نشستیں لے سکیں گے لیکن میاں صاحب صورتحال کی نزاکت کو نہیں سمجھ رہے'' مجھے اپنے دوست سے ہمیشہ اختلاف رہا' میرا خیال ہے ہم لوگ میاں نواز شریف کو سمجھنے میں غلطی کرتے آ رہے ہیں' ہم کیا غلطی کرتے ہیں یہ میں آپ کو چند لمحے بعد بتاؤں گا' سر دست میں میاں صاحب سے ملاقات کی طرف آتا ہوں۔

میاں صاحب سے میری ملاقات 5 مارچ 2007ء کو ساڑھے بارہ بجے ان کے آفس میں ہوئی تھی۔ میاں صاحب کا آفس نادر چودھری اور پرویز رشید چلا رہے ہیں۔ میاں نواز شریف کی پچھلی سیاست کیسی تھی، وہ آنے والے دنوں میں سیاست کے میدان میں کیا رول ادا کریں گے اور میاں صاحب کو قدرت نے کون سے مواقع فراہم کیے تھے اور وہ ان مواقع سے کتنا فائدے اٹھا سکے، یہ ایک طویل بحث ہے لیکن جہاں تک میاں نواز شریف کی ذات کا تعلق ہے، ان میں ایک دلچسپ خوبی ہے۔ میاں صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ایک برکت اور ایک رونق بخش رکھی ہے، وہ جہاں بیٹھتے ہیں لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں، میں جب ان کے دفتر پہنچا تو گلی تک لوگ کھڑے تھے۔ دفتر میں بھی لوگوں کا جمگھٹا لگا تھا' میں نے پرویز رشید سے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے بتایا جس دن میاں صاحب لندن نہیں ہوتے اس دن دفتر سنسان ہو جاتا ہے اور ہم لوگ سارا دن ایک دوسرے کی شکل دیکھتے رہتے ہیں۔ پرویز رشید کا کہنا تھا ''ہم نے یہ دفتر شروع کیا تو یہاں لوگوں کی یلغار ہو گئی جس کے ردعمل میں بلڈنگ کے دوسرے کرایہ داروں نے ہماری شکایت کر دی، یہ لوگ ہمارے کلچر سے واقف نہیں تھے لہٰذا اب ہم نے بڑی حد تک

لوگوں کو کنٹرول کرلیا ہے، ہماری کوشش ہوتی ہے لوگ میاں صاحب سے ملاقات کیلئے وقت لے کر آئیں لیکن اس کے باوجود روزانہ سوڈیڑھ سو لوگ آجاتے ہیں" میں نے میاں صاحب سے بھی اپنی آبزرویشن کا ذکر کیا۔انہوں نے قہقہہ لگایا اور اوپر دیکھ کر بولے "یہ سب اللہ کا کرم ہے" میاں صاحب نے مجھے اپنا موبائل دکھایا' ان کے موبائل میں دو ہزار نو سو 34 پیغام تھے' یہ سب ایک دن کے پیغام تھے۔

میری میاں صاحب سے گفتگو شروع ہوئی تو مجھے ان کے خیالات میں بڑی کلیئرٹی محسوس ہوئی، ان کا کہنا تھا وہ جنرل پرویز مشرف سے کسی قیمت پر کمپرومائز نہیں کریں گے' ان کا کہنا تھا'' میری زندگی کا اب صرف ایک ہی مقصد ہے فوج کو سیاست سے الگ کرنا اور پاکستان میں اصل جمہوریت کا نفاذ'' میاں صاحب کا خیال تھا'' وقت اور حالات بڑی تیزی سے سیاسی جماعتوں کو اتحاد کی طرف لے جا رہے ہیں لہٰذا وہ وقت دور نہیں جب ساری سیاسی جماعتیں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں گی اور حکومت کے لیے اپنے آپ کو بچانا مشکل ہو جائے گا'' میں نے ان سے پوچھا'' اگر کبھی ان کے پرانے ساتھی چودھری شجاعت حسین، مشاہد حسین اور شیخ رشید ان کے پاس واپس آ گئے تو'' انہوں نے فوراً نفی میں سر ہلایا اور یقین سے کہا'' میرے دروازے ان لوگوں کے لیے بند ہو چکے ہیں'' میں نے عرض کیا'' جب آپ بینظیر بھٹو، مولانا فضل الرحمٰن اور عمران خان سے اتحاد کر سکتے ہیں تو چودھری شجاعت حسین میں کیا خرابی ہے'' میاں صاحب فوراً بولے'' مخالفت اور بے وفائی میں فرق ہوتا ہے، بینظیر بھٹو اور عمران خان ہمارے سیاسی مخالف تھے جبکہ چودھری شجاعت' مشاہد حسین اور شیخ رشید نے پارٹی اور میرے ساتھ بے وفائی کی۔ میں اگر ان لوگوں کو دوبارہ سینے سے لگا لیتا ہوں تو یہ میرے وفادار ساتھیوں کے ساتھ زیادتی ہو گی'' میں نے ان سے عرض کیا'' آپ کو برطانیہ جیسے کھلے معاشرے میں رہ کر محسوس نہیں ہوتا قدرت نے آپ کو دو بار پاکستان کی قسمت بدلنے کا موقع دیا لیکن آپ پاکستان کو برطانیہ نہیں بنا سکے'' انہوں نے فوراً جواب دیا'' برطانیہ کی سیاست میں فوج نہیں، ہم لوگ بھی پاکستان کو ترقی کے اس معیار تک پہنچا سکتے تھے لیکن فوج نے ہمارے ہاتھ باندھ رکھے تھے، میں یہ نہیں کہتا ہم لوگ مکمل طور پر بے قصور ہیں' ہم لوگوں سے بھی غلطیاں ہوئی تھیں، میں آج ان غلطیوں کو'' ریلائز'' کر رہا ہوں اور ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے دوبارہ موقع دیا تو میں یہ غلطیاں نہیں دہراؤں گا، میں اقتدار کو صرف اور صرف لوگوں کی بھلائی کیلئے استعمال کروں گا'' میاں صاحب کا کہنا تھا'' پاکستان کے سیاسی حالات میں بہت بڑی تبدیلی آنے والی ہے، انہیں محسوس ہوتا ہے وہ اور محترمہ بے نظیر بھٹو الیکشن سے پہلے پاکستان ہوں گے''

میں اب واپس اپنے دوست کی طرف آتا ہوں، میرا دوست نواز شریف کو'' نان سیریس'' سیاستدان سمجھتا تھا، میں نے نواز شریف کی تعریف کی تو اس نے قہقہہ لگایا اور مجھے تمسخرانہ نظروں سے دیکھنے لگا، میں نے اس سے کہا، میں تم سے سات سوال پوچھتا ہوں اگر تم ان میں سے کسی ایک سوال کا جواب نفی میں دے دو تو میں تمہاری بات مان لوں گا۔اس نے کہا'' او کے سوال پوچھو'' میں نے کہا'' پاکستان میں اڑھائی سو کے قریب بڑے کاروباری

خاندان ہیں، ان میں سے صرف ایک خاندان کے ایک فرد نے سیاست میں آنے کا فیصلہ کیا اور وہ شخص کامیاب ہوگیا' یہ شخص نواز شریف تھا' کیا کوئی نان سیریس بزنس مین سیاست میں آسکتا ہے اور کیا آ کر کامیاب ہوسکتا ہے؟'' میرا دوست خاموش رہا' میں نے پوچھا'' نواز شریف جب سیاست میں آیا تو اس وقت ملک میں پیر پگاڑا، غلام مصطفیٰ جتوئی، محمد خان جونیجو اور حامد ناصر چٹھہ کا طوطی بولتا تھا لیکن نواز شریف نے آتے ہی ان سب کو سیاست سے باہر پھینک دیا۔ تم بتاؤ کیا یہ کام کوئی نان سیریس شخص کر سکتا ہے؟'' میرا دوست خاموش رہا' میں نے پوچھا'' نواز شریف پاکستان میں دوبار وزیراعظم بنا، دوسری بار ایک بھائی وزیراعظم تھا اور دوسرا بھائی سب سے بڑے صوبے کا وزیراعلیٰ، کیا کوئی نان سیریس شخص اقتدار کے اس لیول تک پہنچ سکتا ہے؟'' میرا دوست خاموش رہا' میں نے کہا '' میاں نواز شریف نے دو صدور غلام اسحاق خان، سردار فاروق احمد لغاری، ایک چیف جسٹس سید سجاد علی شاہ اور تین سروسز چیفس گھر بھجوا دیے۔ اس نے نیول چیف منصور الحق اور آرمی چیف جنرل جہانگیر کرامت سے استعفے لیے' کیا یہ کام کوئی نان سیریس شخص کر سکتا تھا'' میرا دوست خاموش رہا' میں نے پوچھا'' نواز شریف پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کو لاہور لے آیا تھا۔ اس نے کشمیر کے مسئلے کو حل تک پہنچا دیا تھا۔ کیا کوئی نان سیریس شخص یہ کام کر سکتا تھا؟'' میرا دوست خاموش رہا' میں نے پوچھا'' نواز شریف نے پوری دنیا کے دباؤ کے باوجود ایٹمی دھماکہ کیا' یہ وہ کام تھا جو ذوالفقار علی بھٹو جیسا لیڈر اور جنرل ضیاء الحق جیسا بااختیار شخص نہیں کر سکا' کیا یہ کام بھی کوئی نان سیریس شخص کر سکتا تھا'' میرا دوست خاموش رہا اور میں نے اس سے آخری سوال پوچھا'' نواز شریف نے اس دور میں موٹر وے، پیلی ٹیکسیوں اور سستے گھروں کے منصوبے شروع کیے تھے جب یہ منصوبے خواب لگتے تھے، آج سترہ اٹھارہ برس بعد حکومت روڈ نیٹ ورک، کار فنانسنگ اور ہاؤس لوننگ کے فیز میں داخل ہوئی ہے۔ کیا یہ بھی کسی نان سیریس شخص کا کام ہے؟'' میرا دوست خاموش رہا' میں نے عرض کیا '' میاں نواز شریف کے سارے کام منجھے ہوئے اور دور اندیش سیاستدانوں جیسے تھے لیکن اس کے باوجود تم جیسے لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں'' میرے دوست نے بے چینی سے کروٹ بدلی' میں نے عرض کیا'' بس نواز شریف میں دو خامیاں ہیں' ایک وہ مشرقی روایات کے باحیاء انسان ہیں، وہ اردو اور پنجابی بولتے ہیں، لوگوں سے گلے ملتے ہیں اور ایک خاندانی انسان کی طرح لوگوں کی تواضع کرتے ہیں اور ان کی دوسری خامی پنجابی کلچر ہے' وہ منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی نہیں بولتے جبکہ ہم لوگ دو سو سال غلام رہے ہیں لہٰذا غلامی ہمارے خمیر میں شامل ہو چکی ہے۔ ہم لوگ صرف فاصلے پر رہنے والے سیاستدانوں کو لیڈر مانتے ہیں' ہم صرف انہیں سیاستدان سمجھتے ہیں جو انگریزی بولتے اور پائپ پیتے ہیں، مجھے یقین ہے اگر یہی نواز شریف واشنگٹن سے آیا ہوتا یا رومن انگریزی میں لکھی تقریریں کرتا تو ہم اسے ہمالیہ سے بلند لیڈر سمجھتے'' میرا دوست خاموش رہا۔ میں نے عرض کیا'' میں اب تمہیں مستقبل کے نواز شریف کے بارے میں بتاتا ہوں، تم لکھ لو نواز شریف اپنے سے پہلے بے نظیر بھٹو کو وزیراعظم بنوائے گا'' میرے دوست نے حیرت سے میری طرف دیکھا'' میں نے عرض کیا'' اس کی دو وجوہات ہیں، پاکستان کے اگلے

وزیراعظم کو جنرل پرویز مشرف کی روشن خیالی اور اعتدال پسندی سے سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔ اسے پاکستان میں شراب نوشی اور کلبوں کی اجازت دینا پڑے گی اور یہ اس وزیراعظم کی پہلی ناکامی ہو گی' دوسرا اگلے وزیراعظم کو فوج کے ساتھ بھی سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔ فوج موجودہ حکمرانوں کا احتساب نہیں کرنے دے گی چنانچہ نواز شریف کی کوشش ہو گی گھاٹے کا یہ سودا بے نظیر بھٹو کرے، یوں بے نظیر اقتدار میں آ کر ایک دو برسوں میں ناکام ہو جائے گی اور اس کے بعد نواز شریف پوری طاقت کے ساتھ پاکستانی سیاست میں آئے گا اور وہ کام کر دکھائے گا جو حسین شہید سہروردی سے ذوالفقار علی بھٹو تک کوئی نہ کر سکا"۔ میرے دوست نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولا "کیا مطلب" میں نے عرض کیا "نواز شریف اپنے لیے صدر کا عہدہ چنے گا اور شہباز شریف کو وزیراعظم بنائے گا" میرے دوست نے قہقہہ لگایا "لیکن کب" میں نے کہا "یہ صرف پانچ چھ سالوں کی گیم ہے"۔ میرے دوست نے قہقہہ لگایا اور میرے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولا "تم صحافی رہو نجومی بننے کی کوشش نہ کرو جب تک صدر پرویز مشرف ہیں نواز شریف اور بے نظیر بھٹو پاکستان نہیں جا سکتے' یہ گیم شروع نہیں ہو گی"

کوفتے

''کوفتہ'' انور مسعود صاحب کی تخلیق ہے۔

دنیا میں اس وقت پانچ ہزار بڑی زبانیں اور 25 ہزار بڑے لہجے ہیں' ان 25 ہزار لہجوں اور پانچ ہزار زبانوں میں ہزاروں لاکھوں لوگ شاعری کرتے ہیں لیکن ان لاکھوں ہزاروں شاعروں میں صرف دس بیس حضرات ایسے ہوں گے جنہیں اللہ تعالیٰ نے نئی زبان اور نیا لہجہ تخلیق کرنے کا اعزاز بخشا ہوگا' ان دس بیس لوگوں میں ایک نام انور مسعود ہیں' انور مسعود اردو زبان کے ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے پنجابی اردو اور انگریزی کو ملا کر نہ صرف ایک نئی زبان' ایک نیا لہجہ تخلیق کیا بلکہ یہ لہجہ اور یہ زبان ان کی زندگی میں رائج بھی ہوگئی' یہ زبان انور مسعود صاحب کی زبان کہلاتی ہے' یہ انور مسعود صاحب ہیں جن کی وجہ سے لوگ اب بھینس کو صرف بھینس نہیں کہتے وہ اسے ''بھولی مج'' کہتے ہیں اور بنیان کو صرف بنیان نہیں بلکہ بنین کہتے ہیں' انور مسعود صاحب نے پچھلے دنوں ''کوفتہ'' کے عنوان سے ایک خوبصورت نظم تخلیق کی' کوفتہ محض ایک نظم نہیں یہ ایک فلسفہ' ایک تاریخ اور ہماری قوم کی پوری نفسیات ہے' اس نظم میں انور مسعود صاحب کوفتے کی ہسٹری بیان کرتے ہیں' وہ بتاتے ہیں انسان پہلے بوٹی کا قیمہ بناتا ہے' پھر اس قیمے کو گوندھ کر دوبارہ بوٹی بناتا ہے اور اس بوٹی کو ایک بار پھر دانتوں میں کچل کر اس کا قیمہ بناتا ہے' بوٹی اور قیمے کا یہ کھیل کئی دنوں تک چلتا رہتا ہے' میں نے جب پہلی بار انور مسعود صاحب سے یہ نظم سنی تو میں نے ان سے عرض کیا ''یہ ایک خالصتاً سیاسی اور باغی نظم ہے'' انور صاحب نے قہقہہ لگا کر اس آبزرویشن کی تصدیق کر دی۔

ہم اور ہماری پالیسیاں بنیادی طور پر کوفتے ہیں' ہم لوگ پچھلے ساٹھ برسوں سے بوٹیاں کاٹتے' ان بوٹیوں کا قیمہ بناتے' اس قیمے کو گوندھ کر دوبارہ سخت کرتے اور پھر اس کوفتے کو دانتوں میں پیس کر دوبارہ قیمہ بناتے چلے آ رہے ہیں' ہماری ساری تاریخ ''کوفتہ تاریخ'' ہے' آپ ون ڈش کو لیجئے' حکومت نے 22 اگست 2006ء کو پارلیمنٹ میں شادی کی تقریب میں ون ڈش کی اجازت دینے کا بل پاس کرایا' یہ ون ڈش کا چوتھا کوفتہ تھا' نواز شریف نے 1997ء میں شادی کی تقریبات میں کھانا کھلانے پر پابندی لگائی تھی' پارلیمنٹ نے اس پابندی کی تصدیق کی تھی' پرویز مشرف کے دور میں اس پابندی پر عملدرآمد ختم ہوگیا' حکومت نے خلاف ورزی کا نوٹس لیتے ہوئے اسے ون ڈش کر دیا' کسی صاحب نے اس ون ڈش کو عدالت میں چیلنج کر دیا اور سپریم کورٹ نے

ون ڈش پر دوبارہ پابندی لگا دی' یہ پابندی قومی اسمبلی میں چیلنج ہو گئی' اس پر سال بھر بحث چلتی رہی یہاں تک کہ 22 اگست کو حکومت نے ون ڈش کو قانون کی شکل دے دی' یوں یہ بوٹی چوتھی بار کوفتہ بن گئی' ہم اب بھی دعوے سے نہیں کہہ سکتے ون ڈش کے بارے میں اگلی حکومت اور اگلی پارلیمنٹ کی کیا پالیسی ہو گی' وہ ولیمے اور نکاح کے کھانے پر مکمل پابندی لگائے گی یا پھر وہ اسے پوری طرح کھلا چھوڑ دے گی چنانچہ اس کوفتے کا سفر ابھی جاری ہے۔

ون ڈش ہمارے مزاج کی صرف ایک مثال ہے' آپ اگر ذرا سا غور کریں تو آپ کو ایسی سینکڑوں ہزاروں مثالیں ملیں گی جن میں ہم نے ایک ہی کام چار چار بار کیا' آپ ان تمام سیاسی اور سماجی کاموں کا جائزہ لیں تو آپ کو محسوس ہو گا' ہم پالیسیوں کے حوالے سے ''کوفتے'' ہیں' آپ حدود کو لیجئے' ذوالفقار علی بھٹو تک پاکستان میں ''حدود'' نام کا کوئی قانون نہیں تھا' جنرل ضیاء الحق آئے تو اچانک محسوس ہوا ملک میں فحاشی اور عریانی کا دور دورہ ہے اور اگر اس فحاشی کے سامنے بند نہ باندھا گیا تو یہ فحاشی ملک کو بہالے جائے گی' جنرل صاحب نے فحاشی کا راستہ روکنے کیلئے 1979ء میں حدود آرڈیننس نافذ کر دیا' اس وقت پاکستان کے تمام حلقوں نے اس آرڈیننس کو خوش آمدید کہا' اخبارات میں اس کے حق میں اداریئے لکھے گئے لیکن 2006ء میں اچانک یہ آرڈیننس ظلم اور زیادتی محسوس ہونے لگا' حکومت نے اس آرڈیننس کی کوکھ سے تحفظ حقوق نسواں بل نکالا اور پوری سرکاری مشینری اس کے نفاذ پر لگا دی' اب اخبارات میں اس نئے بل کے حق میں اداریئے لکھے جا رہے ہیں اور قوم اسے خوش آمدید کہہ رہی ہے' مجھے سمجھ نہیں آتی 1979ء کا آرڈیننس صحیح تھا یا 2006ء کا بل' جنرل محمد ضیاء الحق کی سوچ درست تھی یا جنرل پرویز مشرف کے افکار' جنرل ضیاء الحق کا کوفتہ ٹھیک تھا یا جنرل مشرف کی بوٹی' ایک جرنیل صحیح تھا یا دوسرا جرنیل' آپ 58 ٹو بی کو لیجئے' 1985ء کی اسمبلی نے صدر کو 58 ٹو بی کے اختیارات دیئے' ان اختیارات کے ذریعے صدر کسی بھی وقت' کسی بھی منتخب حکومت کو گھر بھجوا سکتا تھا' اس زمانے میں سیاستدانوں اور دانشوروں نے اس ترمیم کو جمہوریت کی بقاء قرار دیا' 1997ء میں نواز شریف نے دو تہائی اکثریت سے یہ ترمیم ختم کر دی' 1997ء میں سیاستدانوں اور دانشوروں نے اس اقدام کو جمہوریت کی فتح قرار دیا' صدر پرویز مشرف کی تخلیق کردہ اسمبلی نے 2003ء میں ایک بار پھر 58 ٹو بی کو آئین کا حصہ بنا دیا اور سیاستدانوں نے اسے بھی جمہوریت کی بقاء قرار دیا' مجھے سمجھ نہیں آ رہی 1985ء کی اسمبلی درست تھی' 1997ء کی اسمبلی نے صحیح فیصلہ کیا تھا یا پھر 2003ء کی اسمبلی کا موقف درست تھا اور اب آنے والی اسمبلی اس کے بارے میں کیا فیصلہ کرے گی سردست اس کے بارے میں کوئی پیشن گوئی نہیں کی جا سکتی کیونکہ کوفتہ سازی کا عمل ابھی تک جاری ہے' آپ اگر تحقیق کریں تو آپ کو ہماری تاریخ سے ایسی بے شمار مثالیں ملیں گی' ہم نے آج تک اس ملک میں کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جس میں بعد ازاں ترمیم نہ ہوئی ہو اور ہم نے آج تک کوئی ایسی پالیسی نہیں بنائی جس سے ہم نے 180 درجے کے زاویے پر اپنا رخ نہ بدلا ہو' بھارت سے لے کر افغانستان تک اور امریکہ سے لے کر ایران تک ہر دور میں ہماری خارجہ پالیسی مختلف تھی' ہر دور کی خارجہ پالیسی پچھلے دور سے الٹ تھی' ہماری کوفتہ سازی کی یہ حالت ہے ہم آج

تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے ہماری دفتری اور سرکاری زبان کیا ہوگی اور ہمارا قومی لباس کیا ہے' ہم لوگ سوٹ کو بھی قومی لباس کہتے ہیں اور شیروانی کو بھی' جناح کیپ ہمارے قومی لباس کا حصہ ہے لیکن صدر اسحاق سے صدر پرویز مشرف اور نواز شریف سے شوکت عزیز تک میں نے آج تک کسی کو جناح کیپ پہنے نہیں دیکھا' جناب ظفر اللہ جمالی صاحب نے تو اپنے پورے دور میں شیروانی تک نہیں پہنی لہٰذا ہم لوگ ہر لحاظ سے کوفتے ہیں۔

آپ بلوچ سرداروں کے ایشو کو لے لیجئے' ہم نے نواب اکبر خان بگٹی کو تاریخ میں پانچ بار محب وطن اور پانچ بار شرپسند اور علیحدگی پسند قرار دیا' 1947ء میں نواب اکبر خان بگٹی نے پاکستان میں شمولیت کا اعلان کیا تو وہ محب وطن تھے' 1958-1957ء میں وہ وزیر داخلہ اور دفاع کے وزیر مملکت بنے تو بھی وہ محب وطن تھے لیکن صدر ایوب کے دور میں جب ان کے فیلڈ مارشل سے اختلافات پیدا ہو گئے تو وہ مجرم بھی ہو گئے' غدار بھی اور ظالم بھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں وہ گورنر بنے تو وہ دوبارہ محب وطن ہو گئے' بھٹو کے ساتھ ان کے اختلافات پیدا ہوئے تو وہ ایک بار پھر ظالم بھی ہو گئے' علیحدگی پسند بھی اور غدار بھی' جنرل ضیاء الحق کے دور میں انہوں نے جنرل ضیاء الحق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو وہ ایک بار پھر غدار اور ظالم ہو گئے' بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کے ادوار میں وہ دوبارہ محب وطن بن گئے' 2003ء میں ان کے موجودہ حکومت سے اختلافات شروع ہوئے تو وہ ایک بار پھر ظالم' شرپسند اور علیحدگی پسند ہو گئے' آج جب بگٹی صاحب قتل ہو چکے ہیں تو معلوم ہو رہا ہے' وہ بلوچستان کے بلا کو خان تھے' انہوں نے اپنی ذاتی جیلیں بنا رکھی تھیں اور وہ اب تک سینکڑوں لوگوں کو قتل کر چکے ہیں' سوال یہ ہے' ایک ہی شخص 60 برسوں میں پانچ بار غدار اور پانچ بار محب وطن کیسے ہو سکتا ہے؟ سوال یہ ہے' اگر نواب اکبر خان بگٹی مسلم لیگ ق میں شامل ہو جاتے' وہ صدر پرویز مشرف کی حمایت کا اعلان کر دیتے تو وہ کیا ہوتے؟ اور آج کا سرکاری مورخ انہیں کیا لکھتا؟ میرا خیال ہے وہ اس وقت پاکستان کے سب سے بڑے محب وطن لیڈر ہوتے' وہ اس وقت بلوچستان کے گورنر ہوتے اور انہیں سرکاری پروٹوکول مل رہا ہوتا' غداری کے اس کوفتے کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا' پاکستان کا کوئی ذی شعور شخص آج یہ دعویٰ نہیں کر سکتا' صدر پرویز مشرف کے دور کا یہ ''شرپسند'' مستقبل قریب میں کیا ہوگا؟ ہو سکتا ہے مستقبل کی کوئی حکومت اس ''شرپسند'' کو شہید جمہوریت قرار دے دے اور ان کی قبر پر باقاعدہ فوجی گارڈ لگا دی جائے۔

یہ کیا ہے؟ کیا قومیں کوفتے بن کر ترقی کر سکتی ہیں؟ کیا پارہ صفت معاشرے آگے بڑھ سکتے ہیں؟ اور کیا گرگٹ اور معاشروں میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے؟ کیا سورج مکھی اور ملکوں میں کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیے؟ اور کیا ہم ایک رکعت میں پانچ پانچ بار قبلے بدل کر زیادہ دیر تک زندہ رہ سکیں گے؟ یہ وہ سوال ہیں جو آج ہر سوچنے والے ذہن کو پریشان کر رہے ہیں' خدا کے بندو! ہمیں کہیں تو رکنا چاہیے' ہمیں کچھ تو طے کرنا چاہیے' یہ تو کوئی بات نہ ہوئی جو شخص میرا دشمن ہے وہ شیطان ہے اور جو میری صفوں میں کھڑا ہے وہ شیطان ہو کر بھی نیک ہے! معاف کیجئے گا ایسی پالیسیوں سے صرف کوفتے بن سکتے ہیں' ملک نہیں۔

٭٭٭

اصل مشاہد حسین کون ہے

جناب مشاہد حسین کے ساتھ میری شناسائی آٹھویں سال میں داخل ہو چکی ہے' میری ان کے ساتھ پہلی ملاقات 1997ء میں ہوئی تھی' یہ ملاقات نسیم انور بیگ صاحب کے گھر ہوئی تھی' وہ ان دنوں میاں نواز شریف کی کابینہ میں ''کڑاکے'' نکال رہے تھے' اس کے بعد ان سے گاہے بگاہے ملاقاتیں ہوتی رہیں' 1999ء میں ان سے ملاقات ہوئی تو وہ میرے کسی کالم پر ذرا سے ناراض تھے' انہوں نے کالم کی ایک سطر دہرائی' یہ سطر کچھ یوں تھی ''آج کی حکومت کل کی اپوزیشن اور آج کی اپوزیشن کل کی حکومت ہوتی ہے لہٰذا سیاستدانوں کو اپنے معاملات میں توازن رکھنا چاہیے' اس کے بعد وہ اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگا کر بولے ''دیکھ لیں ہمارے دور میں پریس کتنا آزاد ہے'' میں نے ان کی مہربانی اور آزادی کا شکریہ ادا کیا' انہوں نے اس ملاقات کے دوران مجھ سے وعدہ کیا وہ کسی دن زیادہ وقت کیلئے میرے ساتھ بیٹھیں گے اور حکومت اور اپوزیشن کے معاملات پر کھل کر بات کریں گے لیکن یہ وعدہ ایفا نہ ہو سکا' چند دن بعد میاں نواز شریف کی حکومت ختم ہو گئی اور مشاہد حسین کابینہ کے دوسرے ارکان کے ساتھ قید ہو گئے' وہ ڈیڑھ سال بعد رہا ہوئے تو ان سے چند ایک مختصر سی ملاقاتیں ہوئیں' میں ان ملاقاتوں میں شاہ جی کا گرویدہ ہوتا چلا گیا' اس میں کوئی شک نہیں مشاہد حسین ایک انٹیلی جینٹ' پڑھے لکھے' مہذب اور روشن خیال انسان ہیں' ان کے دامن پر سر دست کرپشن کا بھی کوئی دھبہ نہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں میں زمانہ طالبعلمی سے ان کا فین چلا آ رہا ہوں' ہمارے درمیان تعلقات بھی اچھے ہیں لیکن بدقسمتی سے یہ تعلقات کبھی شناسائی سے آگے نہیں بڑھ سکے' وہ 12 اکتوبر 1999ء کو گرفتار ہوئے اور 25 دسمبر 2000ء کو انہیں رہائی نصیب ہوئی' رہا ہونے کے بعد انہوں نے امریکہ کے مشہور اخبار نیویارک ٹائمز میں اپنے قید کے دنوں کے بارے میں ایک مضمون تحریر کیا' میں نے جب یہ مضمون پڑھا تو میں نے یہ کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیا' یہ مضمون میرے پاس 4 سال تک پڑا رہا' چند روز پہلے میں نے کسی کاغذ کی تلاش میں اپنی فائلیں دیکھنا شروع کیں تو یہ مضمون میرے ہاتھ لگ گیا' میں نے یہ مضمون پڑھنا شروع کر دیا' میں اسے جوں جوں پڑھتا گیا' میں مشاہد حسین کی کیفیات میں ڈوبتا چلا گیا' مشاہد حسین کا یہ مضمون ایک ''ماسٹر پیس'' تھا' اس میں آپ کو ایک ایسے زندہ انسان کے سارے احساسات ملتے ہیں جسے

وزارت سے اٹھا کر کوٹھری میں پھینک دیا گیا تھا‘ جو اپنی بے گناہی کی سزا بھگت رہا تھا‘ اس مضمون کے مشاہد حسین اور آج کے مشاہد حسین میں بڑا فرق ہے‘ اس مضمون کا مشاہد حسین ایک دانشور‘ ایک صحافی اور ایک لکھاری تھا جبکہ آج کا مشاہد حسین ایک کامیاب سیاستدان اور روشن خیال اور اعتدال پسند حکومت کا ایک اعتدال پسند اور روشن خیال ”مشیر“ ہے‘ اس مضمون کا مشاہد حسین اندھیری کوٹھری میں روشنی کی کرن کا انتظار کرتا ہے اور اس کیلئے انسانی آواز دنیا کی عظیم ترین نعمت ہے جبکہ آج کا مشاہد حسین کیمروں کی روشنیوں اور آوازوں کے ہجوم میں رہنے والا ایک کامیاب سیاستدان ہے‘ ان دونوں میں اصل مشاہد حسین کون ہے؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے میں اس مضمون کے مشاہد حسین کا فین ہوں‘ آپ مضمون ملاحظہ کیجئے‘ میں یہ مضمون ترجمے کے ساتھ آپ کی نذر کرتا ہوں۔

”میں 12 اکتوبر 1999ء کی شام اپنے سرکاری گھر میں تھا‘ شام کے سات بج رہے تھے‘ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی‘ وہ میرا ٹیلیفون آپریٹر تھا‘ اس نے بتایا ”فوج نے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے فوجی اندر کودنے کی تیاری کر رہے ہیں“ میری بیوی اور گیارہ سالہ بیٹا مصطفیٰ دوسری منزل پر تھے۔ میں بھاگ کر اوپر گیا اور ان سے کہا ”باہر فوجی ہیں‘ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں“ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا مسلح فوجی ٹرکوں سے کود رہے تھے‘ اسی لمحے میں نے شیشے ٹوٹنے کی آواز سنی‘ وہ کھڑکیاں توڑ رہے تھے‘ اس کے بعد فوجیوں کے سیڑھیوں پر چڑھنے کی آواز آئی‘ میں باہر نکلا اور میں ان سے مخاطب ہوا ”ریلیکس رہیں‘ ہم سب غیر مسلح ہیں“ فوجی اس وقت ٹینس تھے‘ شاید ان کے چہروں پر فوجی بغاوت کے آثار تھے‘ وہ میرے کمرے میں گھس آئے‘ انہوں نے میرے کمرے کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ ٹیلیفون لائنوں کی تاریں کھینچ دی گئیں‘ اس لمحے ایک میجر آگے بڑھا اس نے ٹیلیفون اٹھایا اور پیغام دیا ”پرندہ پنجرے میں ہے“ اور میں ایک لمحے میں حکومتی وزیر سے حکومتی قیدی میں تبدیل ہو گیا۔ اس دن رات گئے جنرل پرویز مشرف اور دوسرے فوجی لیڈروں نے حکومت پر قبضہ کر لیا اور منتخب حکومت کو اقتدار کے ایوان سے باہر نکال دیا‘ میں نواز شریف حکومت میں شامل تھا۔ میرے سمیت بہت سے سرکاری عہدیداروں کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ آج فوجی حکمران پاکستان پر حکومت کر رہے ہیں جبکہ جنرل پرویز مشرف نے 2002ء میں جمہوریت بحال کرنے کا عندیہ دے دیا ہے۔ اکتوبر کی اس رات کے بعد مجھے ایک مکان میں دو ماہ تک قید رکھا گیا‘ اس دوران میری بیوی اور بچے میرے ساتھ رہے 14 دسمبر کو افطاری کے بعد ایک افسر میرے پاس آیا اور مجھ سے کہنے لگا ”آپ کو کسی دوسری جگہ منتقل کیا جا رہا ہے“ میں نے چند جوڑے کپڑے اور کتابیں پیک کیں اور ملٹری ٹرک میں چڑھ گیا۔ میں نے تہیہ کیا تھا میں ان کے سامنے اپنی کمزوری ظاہر نہیں ہونے دوں گا‘ مجھے اس وقت امریکی ناول نگار ہیمنگ وے کا قول یاد آ گیا ”ہمت والا وہی ہے جو بحران میں بھی اپنی عزت نفس قائم رکھے“ مجھے ایک گیسٹ ہاؤس میں لے جایا گیا اور وہاں مجھے کمرے میں بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی گئی۔ مجھے کسی نے یہ تک بتانا مناسب نہ سمجھا کہ میں وہاں کتنا عرصہ رہوں گا‘ اس وقت مجھے نیلسن منڈیلا یاد آ گئے‘ ایک سال قبل جب

نیلسن منڈیلا پاکستان کے دورے پر آئے تھے تو میں ان کا وزیر مہمان داری تھا' میں نے ان سے پہلی ملاقات کے دوران پوچھا تھا "27 سالہ قید کے دوران آپ کے لئے سب سے تکلیف دہ لمحات کون سے تھے' انہوں نے ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر جواب دیا تھا "قید تنہائی"۔ اس وقت میں بھی قید تنہائی کا شکار تھا' گو یہ ایک مختصر قید تھی لیکن اس کے باوجود آپ اس کی شدت کا اندازہ نہیں کر سکتے' مجھے اچانک دنیا سے الگ تھلگ کر دیا گیا تھا۔ مجھے قرآن پاک کے علاوہ کسی قسم کا ریڈنگ میٹریل دستیاب نہیں تھا۔ میرے بیرونی دنیا سے تمام رابطے منقطع تھے۔ میں ٹیلیفون' ٹیلیویژن یا ریڈیو کے بغیر زندگی گزار رہا تھا۔ میرے ملاقاتی بھی نہیں تھے۔ آزادی کے دنوں میں جو چیز کم اہم ہوتی ہے' قید کے دنوں میں وہی چیز انتہائی اہمیت اختیار کر جاتی ہے' قید کے دنوں میں کسی انسان سے گفتگو دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہوتی ہے۔ میں نے محسوس کیا تنہائی کی قید جسم سے زیادہ دماغ کی آزمائش ہوتی ہے۔ میرے خیال میں جب آپ تنہا ہوتے ہیں تو اس وقت خوف سے لڑنے کا سب سے بہترین طریقہ خدا پر یقین ہوتا ہے۔ مجھے زندگی کی بے شمار حقیقتوں کا علم قید میں جا کر ہوا' میں نے وہاں غم اور خوشی کو دو بہنوں کی طرح دیکھا' میں قید کے دنوں میں قرآن پاک پڑھتا اور سمجھتا تھا مجھے اپنی زندگی کے ان تاریک ترین دنوں میں قرآن پاک میں حضرت عیسیٰ کے واقعہ نے بہت متاثر کیا۔ اس واقعہ نے مجھے آنے والے اندیشوں سے بچائے رکھا۔ میں نے مستقبل کے بارے سوچنا بند کر دیا۔ میں آج کے دن پر نظر رکھتا اور اسے شیڈول کرتا رہتا تھا۔ قید تنہائی کے دنوں میں' میں پوری توجہ کے ساتھ قرآن پاک کی تلاوت کرتا تھا۔ ناشتہ کرتا تھا' اپنے کمرے میں 22 قدم واک اور ورزش کرتا تھا اور پھر قرآنی تعلیمات پر توجہ دیتا تھا۔ میں نے اپنے محافظوں سے گفتگو سے احتراز کیا۔ وہ لوگ تنہائی میں قید شخص سے درخواستوں کی توقع رکھتے تھے' یہ درخواستیں انہیں نفسیاتی تسکین دیتی تھیں۔ ان کا خیال تھا میں ان سے موجودہ حالات' قید کی مدت اور رہائی کے متعلق سوال کروں گا مگر میں نے کبھی ان سے کوئی سوال نہیں پوچھا' میری اس پالیسی کی وجہ سے وہ میرے خوف کو نہیں جان سکے تھے' یہی ایک وجہ تھی میں ہر رات گہری نیند سوتا تھا۔

پاکستان میں جمہوریت کی کمزوری اور جمہوری سسٹم میں خامیوں کی ایک بڑی وجہ لیڈرشپ کی ناکامی ہے' سیاسی لیڈروں کے غیر جمہوری رویوں اور عدم برداشت نے جمہوریت کی بنیاد کمزور کر دی ہے۔ ہمارے سیاستدان اقتدار حاصل کر کے اپنی شان و شوکت میں اضافہ کرتے ہیں' یہ لوگ سیاست میں مڈل کلاس اور لوئر کلاس کے لئے ترقی کے دروازے بند کر دیتے ہیں اور میرٹ کی دھجیاں اڑاتے ہیں۔ ہماری ایلیٹ کلاس اپنی ترقی اور دوسروں کو مرنے دو کی اپروچ پر کاربند ہے۔ یہاں پر بدلہ لینے کی سیاست بھی رواج پا چکی ہے۔ طاقتور خاندان اور افراد ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے خطرناک حد تک چلے جاتے ہیں' یہ لوگ ملک میں ایسی اقتدار کو ترویج دے رہے ہیں' جن میں نظر اندازی' معافی اور باہمی میل جول کی گنجائش نہیں نکلتی۔ پاکستان کا سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ یہاں ایسا سیاسی کلچر بنایا جائے جس میں فرد واحد' قبیلہ یا گروپ کے مفادات ملک پر ترجیح نہ رکھتے ہوں۔ میں یکم مارچ 2000ء تک قید تنہائی میں رہا' یہ تین ماہ بنتے ہیں' اس دوران میری فیملی نے ایک عدالتی حکم

نامہ حاصل کر لیا جس کے بعد مجھے میری بہن کے گھر شفٹ کر دیا گیا۔ 9 مہینوں کے بعد 25 دسمبر 2000 کو مجھے رہا کر دیا گیا۔ سیاسی قیدی کے طور پر میرا تجربہ دوسروں سے زیادہ تلخ نہیں تھا۔ میری فیملی نے میرے لئے سخت جدوجہد کی تھی۔ پاکستانی عدالتوں میں اپیلیں کی گئیں دوسرے لوگوں نے بھی میرا دفاع کیا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے مجھے "ضمیر کا قیدی" قرار دیا۔ میں 440 دن قید میں رہا لیکن مجھ پر کوئی الزام ثابت نہیں ہو سکا۔ میں اب آزاد ہو چکا ہوں لیکن میں جمہوری پاکستان کے لئے جدوجہد کی ذمہ داری سے آزاد نہیں ہوا۔ میرے ملک (عوام) کو یہ سب ضرور سیکھنا چاہیے اور اسے یاد رکھنا چاہیے کہ ایک شخص سیاسی طور پر دوسرے شخص کی مخالفت کر سکتا ہے لیکن اسے انسانی اقدار کی تکریم کرنا چاہیے۔ یہی صاف ستھرا قانونی راستہ ہے' 1400 سال قبل حضرت علیؓ نے فرمایا تھا 'معاف کر دینا انصاف سے بہتر ہے' ہمیں درگزر اور معافی کو اپنی سیاست کا حصہ بنانا چاہیے' اس ملک میں ان حالات میں انصاف اور سیاسی انتقام میں فرق ممکن نہیں لہٰذا ہمیں معافی اور سخاوت سے کام لینا چاہیے' اس کو فارمولا بنانا چاہیے۔"

آپ عجیب اتفاق دیکھئے' مجھے یہ تحریر 25 دسمبر 2005ء کو ملی اور یہ مشاہد حسین کی رہائی کی سالگرہ تھی اور جب میں نے یہ تحریر پڑھی تو میں نے سوچا اصل مشاہد حسین کون ہے' وہ جس نے یہ تحریر لکھی تھی یا وہ جو آج مسلم لیگ ق کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے باوردی صدر جنرل پرویز مشرف کا ساتھی ہے' وہ مشاہد حسین اصل ہے جو قید میں جمہوریت کے خواب دیکھ رہا تھا یا وہ مشاہد حسین جو قید سے باہر آتے ہی جمہوریت اور ضمیر فروشی کے کاروبار میں شریک ہو گیا' مجھے کوئی سمجھ نہ آئی لہٰذا میں نے مشاہد حسین کا یہ آرٹیکل فائل میں رکھا اور یہ فائل ایک بار پھر الماری میں بند کر دی۔

بزنس مینوں کیلئے بھی وقت نکالئے

آج سے 26 برس پہلے رونلڈ ریگن نے اپنی انتخابی مہم کا آغاز کیا تو ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام میں کمپیئر نے ان سے ایک عجیب سوال پوچھا۔ اس نے پوچھا ''مسٹر ریگن فرض کرتے ہیں' آپ امریکہ کے صدر منتخب ہو جاتے ہیں اور آپ کے سامنے ملاقات کے متمنی لوگوں کی فہرست رکھی جاتی ہے' اس فہرست میں امریکہ کے نائب صدر کا نام ہے' آپ کی کابینہ کے پانچ اہم وزیر ہیں' نیول چیف' چیف آف ائیر سٹاف اور آرمی چیف ہے' یورپین یونین کا سربراہ ہے' گلف کا ایک شاہ اور سات سفیر ہیں' روس کا ایلچی ہے اور امریکہ کا ایک درمیانے درجے کا بزنس مین ہے۔ آپ ان تمام شخصیات میں سب سے پہلے کس سے ملیں گے۔'' صدر ریگن نے شہادت کی انگلی سے ٹھوڑی رگڑی اور ہنس کر بولے'' امریکی بزنس مین سے!'' کمپیئر نے حیران ہو کر پوچھا'' کیوں؟'' صدر ریگن نے کندھے اچکا کر جواب دیا'' روس کا ایلچی' جاپان اور چین کے سفیر تھرڈ ورلڈ کے ہیڈ آف سٹیٹس' گلف کے شہزادے اور یورپین یونین کا سربراہ ریگن سے نہیں بلکہ امریکہ کے صدر سے ملنا چاہتا ہے اور امریکہ کا صدر اس درمیانے درجے کے بزنس مین کی وجہ سے صدر ہے' باقی رہے چیفس' کابینہ کے وزیر اور نائب صدر تو یہ لوگ بھی اس معمولی بزنس مین کی مہربانی سے نائب صدر' وزیر اور چیف ہیں۔'' صدر ریگن رکے اور مسکرا کر بولے'' اب میں آپ سے ایک اور سوال پوچھنا چاہتا ہوں'' وہ رکے اور پروگرام کے میزبان پر نظریں جما کر بولے'' آپ مجھے بتائیے اگر امریکہ کے تیسرے' دوسرے اور پہلے درجے کے بزنس مین کام چھوڑ دیں' اگر امریکی فیکٹریاں نہ چلیں' اگر سٹاک ایکسچینج کی سرگرمیاں دم توڑ جائیں اور اگر ہمارے بازار غیر آباد ہو جائیں تو کیا امریکہ امریکہ رہے گا' کیا امریکی صدر اتنا ہی باعزت اور اہم سمجھا جائے گا' کیا روس کا ایلچی' چین اور جاپان کے سفیر' گلف کے شہزادے' یورپین یونین کا سربراہ اور تیسری دنیا کے ہیڈ آف سٹیٹس امریکی صدر سے اسی طرح ملنا چاہیں گے؟'' کمپیئر نے گردن نفی میں ہلا دی' ریگن نے قہقہہ لگایا اور مائیک پر جھک کر بولے'' ملکوں کو سیاست نہیں بلکہ فیکٹریاں چلایا کرتی ہیں اور جن سربراہان کے پاس بزنس مینوں سے ملنے کا وقت نہیں ہوتا ان سربراہان کی زندگی میں جلد وہ وقت آ جاتا ہے جب ان سے کوئی نہیں ملتا۔''

اگر ہم کامیاب امریکی صدور کی فہرست تیار کریں تو ریگن کا شمار ان دو یا تین صدور میں ہوتا ہے جنہیں ہم امریکہ کے مقبول اور محبوب ترین صدر کہہ سکتے ہیں اور اگر ہم ان وجوہات کی فہرست بنائیں جن کے باعث ریگن کامیاب صدر قرار پائے تھے تو اس میں پہلے نمبر پر کاروباری طبقے سے خوشگوار تعلقات آتے ہیں' ریگن کی ترجیحات میں بزنس اور بزنس مین کی کیا حیثیت تھی اس کا اندازہ لگانے کے لئے آپ کریسلر اور ڈیلورین گروپ کی مثالیں لیجئے۔ 80ء کی دہائی میں کریسلر گروپ دیوالیہ ہوا تو ریگن جاپان کا دورہ منسوخ کر کے کریسلر کے ہیڈ آفس میں آ بیٹھے' خود حالات اور وجوہات کا جائزہ لیا اور پھر اپنا سارا اثر و رسوخ استعمال کر کے کریسلر گروپ کو دفاعی آلات کے بھاری ٹھیکے دلوائے جن کے نتیجے میں یہ گروپ دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ کچھ ایسی ہی صورتحال ڈیلورین گروپ کو بھی درپیش تھی۔ یہ گروپ آئرلینڈ میں ڈیفالٹ کر گیا' ریگن نے آئرلینڈ پر دباؤ ڈال کر گروپ کو اڑھائی سو ملین ڈالر کا اقتصادی پیکج دلایا بعدازاں گروپ کا سربراہ جان ڈیلورین منشیات کی سمگلنگ میں پکڑا گیا تو صدر ریگن نے گروپ کو بچانے کے لئے اسے باعزت بری کرا دیا۔ یہ تھی ریگن کی اقتصادی سوچ' وہ کہا کرتے تھے پورا امریکہ دو سو صنعتی اور کاروباری گروپوں پر استوار ہے' ان گروپوں میں معمولی سی گڑبڑ پورے امریکہ کو برباد کر سکتی ہے لہٰذا جو بھی امریکی صدر وقت کی کتاب میں اپنا نقش چھوڑنا چاہتا ہے اسے چاہیے وہ ان گروپوں کو اپنی ترجیحات کی فہرست میں رکھے۔ دنیا ریگن کے اس فارمولے کو ریگن کا فلسفہ معیشت کہتی ہے اور 80ء اور 90ء کی دہائی میں جن اقوام نے اس فلسفے پر عمل کیا وہ دیکھتے ہی دیکھتے بکری سے ٹائیگر بن گئیں جبکہ جو لیڈر بزنس مینوں کے مقابلے میں سرو سز چیفس' وزراء' سفراء اور ایلچیوں کو اہمیت دیتے رہے وہ لیڈر اور ان کی قومیں شیر سے بکری بن گئیں۔

میں جب بھی پاکستان کے کسی تاجر' کسی بزنس مین اور کسی کارخانے دار سے ملتا ہوں تو وہ مجھے حکومت سے نالاں اور ملک کے مستقبل سے مایوس دکھائی دیتا ہے' میں اس سے وجہ پوچھتا ہوں تو وہ اسلام آباد کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے ان لوگوں کے پاس ہمارے لئے وقت ہی نہیں' میں ان کی پریشانی دیکھ کر سوچتا ہوں یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوششوں اور محنتوں سے اس ملک کی معاشی رگوں میں تھوڑی بہت زندگی ہے' اگر ان لوگوں کی پریشانی مایوسی میں بدل گئی' اگر یہ لوگ بھی ہجرت پر مجبور ہو گئے تو پھر ہمارا اور ہمارے ملک کا کیا بنے گا؟ درست ہے کار سرکار بہت دراز ہیں اور حکمرانوں کی مصروفیات کا کوئی انت نہیں ہوتا لیکن یہ بھی حقیقت ہے یہ ساری مصروفیات اور یہ ساری سرکاری لش پش صرف اس ملک کی وجہ سے ہے' نواز شریف اس لئے وزیراعظم تھے کہ پاکستان سلامت تھا اور اب پرویز مشرف بھی اس لئے صدر اور جناب شوکت عزیز اس لئے وزیراعظم ہیں کہ یہ ملک قائم ہے اگر خدانخواستہ اس ملک کی سلامتی اندیشوں میں گھر گئی تو پھر پرویز مشرف کہاں ہوں گے اور دنیا شوکت عزیز کسے کہے گی لہٰذا حکومت کو ہر اس ستون پر توجہ دینی چاہئے جس پر اس ملک کی چھت استوار ہے اور بزنس مین کمیونٹی اس ملک کا مرکزی ستون ہے' یقین کیجئے مارکیٹ اکانومی کے اس دور میں اگر ایک ہیڈ آف سٹیٹ پریشان ہو تو اس کی پریشانی حکومت یا کابینہ کو متاثر کرتی ہے' ایک جنرل کی پریشانی کے اثرات صرف ایک کور تک

محدود رہتے ہیں لیکن اگر کسی ملک کی ایک انڈسٹری' ایک بڑا انڈسٹریل گروپ یا بزنس مینوں کا ایک بڑا حلقہ متفکر' پریشان یا مایوس ہو جائے تو پھر پورا ملک بخار کا شکار ہو جاتا ہے' پوری قوم اس شکایت' اس پریشانی اور اس فکر میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ مجھے چند روز پہلے کوئی صاحب بتا رہے تھے پاکستان کی 13 بڑی صنعتیں بند ہو چکی ہیں، اس وقت پاکستان میں چینی کے برتن بنانے والی تمام فیکٹریاں بند ہو چکی ہیں، پنکھا سازی کبھی پاکستان کی بہت بڑی صنعت ہوتی تھی لیکن یہ صنعت اب آخری سانسیں لے رہی ہے، سیالکوٹ کے 400 صنعت کار چین منتقل ہو چکے ہیں جبکہ کراچی کے تمام بڑے صنعت کار اور تاجر دوبئی میں اپنے دفتر کھول چکے ہیں لیکن حکومت کے ایوانوں تک کوئی سرگوشی نہیں پہنچتی، حکومت کے کسی کارندے کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی، یقین کیجئے صنعت کاروں اور بزنس مینوں کی پریشانیاں پانی کے کیڑوں کی طرح ہوتی ہیں اگر ان کا بروقت تدارک نہ کیا جائے تو یہ پورے شہر' پورے ملک کو بیمار کر دیتی ہیں اور ہم لوگ دن بدن بیماریوں کا شکار ہوتے جا رہے ہیں لہٰذا میری حکومت سے درخواست ہے وہ کبھی کبھی بزنس مینوں کو بھی تھوڑا سا وقت دے دیا کرے۔

خارجہ پالیسی

جلاوطن شہزادہ رک گیا، برہمن نے درخت کی جڑیں کھودیں، جڑیں پوری طرح ننگی ہو گئیں تو اس نے جڑوں میں کھولتا ہوا گرم پانی پھینکا، مٹی ڈالی اور ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہو گیا، حیران پریشان شہزادے نے برہمن کو پرنام کیا اور پھر بڑے ادب سے عرض کیا "گرو آپ کیا کر رہے تھے" برہمن نے ہنس کر اپنا ہاتھ گنجے سر پر پھیرا اور شرارتی لہجے میں بولا "کچھ نہیں مہاراج ذرا درخت سے انتقام لے رہا تھا، مجھے بچپن میں اس درخت سے ٹھوکر لگی تھی، میں نے آج اس کی جڑوں میں گرم پانی ڈال دیا اب یہ درخت سوکھ جائے گا اور میرا انتقام پورا ہو جائے گا۔" پریشان شہزادے نے حیرت سے پوچھا "گرو آپ اتنی مشقت کی بجائے سیدھا سادا درخت کاٹ دیں"۔ برہمن نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور خوفزدہ لہجے میں بولا "رام رام، میں برہمن ہو کر درخت کاٹوں گا؟" شہزادے نے قہقہہ لگایا، نیچے جھکا اور برہمن کے قدم چھو کر بولا "میں چندر گپت ہوں، پاٹلی پتر سے آیا ہوں، آج سے آپ میرے گرو بھی ہیں اور مشیر بھی۔" یہ برہمن وشنو گپت تھا، اس کے ماں باپ نے اس کا یہی نام رکھا تھا لیکن تاریخ نے اسے چانکیہ کوٹلیہ کے نام سے یاد رکھا، ٹیکسلا کے اس برہمن زادے کو قدرت نے بے شمار صلاحیتوں سے نواز رکھا تھا وہ آج تک اپنے فارمولوں اور اپنی شاطرانہ چالوں کے باعث دنیا میں زندہ ہے، آج بھی جب "مائیٹ از رائیٹ" کی بات آتی ہے یا اقتدار اور طاقت کا سوال اٹھتا ہے تو فوراً "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کی شکل میں چانکیہ سامنے آ جاتا ہے، چندر گپت موریہ نے چانکیہ کی مدد سے ہندوستان میں پہلی وسیع اور مستحکم سلطنت کی بنیاد رکھی، اس سلطنت کی سرحدیں شمالی ہندوستان کے شہر پاٹلی پتر (پٹنہ) سے کابل، کابل سے ہرات اور ہرات سے بنگال تک پھیلی تھیں، چندر گپت ہندوستان کا پہلا راجہ تھا جس کا سکہ بحیرہ عرب سے خلیج بنگال تک چلتا تھا، چانکیہ اس کا مشیر خاص تھا، وہ چندر گپت کی زندگی میں پوری طرح رچ بس چکا تھا، چانکیہ نے اس کیلئے ایک کتاب لکھی، تاریخ اس کتاب کو "ارتھ شاستر" کہتی ہے۔ یہ کتاب حکومت کاری کی قدیم ترین دستاویز ہے جس میں چانکیہ نے راجہ کے حرم سے لے کر سماجی جرم تک زندگی کے ہر زاویے پر حکمرانوں کی رہنمائی فرمائی۔ چندر گپت موریہ 296 قبل مسیح میں "سورگ باش" ہو گیا اور چانکیہ بھی مر گیا لیکن یہ دونوں اپنے پیچھے حکومت کاری کا ایک ایسا ماڈل چھوڑ گئے جسے

ہندوستان کے ہر ہندو راجے نے اپنایا اور کامیابی حاصل کی۔ ارتھ شاستر، چانکیہ اور چندر گپت موریہ ہندو نفسیات کی اصلی اور سچی تصویریں ہیں اور کوئی بھی شخص ان تینوں کے مطالعے کے بغیر ہندوستان کے ہندوؤں کو سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی ہندو سلطنت کو۔ تقسیم ہند کے بعد جواہر لال نہرو بھارت کے پہلے وزیر اعظم بنے تھے یہ چانکیہ کو اپنا روحانی گرو کہتے تھے، وہ شروع میں چانکیہ کے قلمی نام سے اخبارات میں کالم بھی لکھتے رہے تھے۔ 48-1947ء میں جب بھارت کی فارن پالیسی کے تعین کا مرحلہ آیا تو نہرو نے ارتھ شاستر کا ایک فقرہ لکھ کر اپنے دفتر خارجہ کے حوالے کر دیا۔ وہ فقرہ تھا ''ہمسایہ دشمن ہوتا ہے لیکن ہمسائے کا ہمسایہ دوست'' اس دن سے چانکیہ کا یہ فلسفہ بھارت کی فارن پالیسی بن گیا۔ اسی لئے شاید دہلی کے ''ڈپلومیٹک انکلیو'' کا نام چانکیہ پوری ہے اور مین بلیوارڈ ''کوٹلیہ مارگ'' کہلاتا ہے، بہر حال یہ بھارت کی فارن پالیسی ہے، بھارت نے ہر دور میں ہمسائے کو اپنا دشمن اور ہمسائے کے ہمسائے کو اپنا دوست سمجھا۔ آپ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں۔ بھارت نے چین کو ہمیشہ اپنا دشمن جانا اور روس کو دوست، پاکستان اس کا دشمن ہے اور افغانستان دوست اور نیپال، برما، سری لنکا، بھوٹان، مالدیپ اور بنگلہ دیش کے ساتھ پولیس مین جیسا سلوک کرتا ہے اور کوریا، تھائی لینڈ، فلپائن، سنگاپور اور جاپان سے دوستی کی پینگیں بڑھاتا ہے۔ آپ ذرا غور کیجئے آپ کو بھارت کی ساری فارن پالیسی اسی فلسفے پر استوار دکھائی دے گی۔ بھارت صرف فارن پالیسی میں چانکیہ کا معتقد نہیں بلکہ وہ ''آریہ کبھی غلام نہیں رہ سکتا'' کے فلسفے کے تحت سپر پاور کے خواب بھی دیکھتا ہے وہ ''ہندوستان ماں ہے اور ماں تقسیم نہیں ہو سکتی'' کے نظریے کے تحت اکھنڈ بھارت کی خواہش بھی رکھتا ہے اور وہ ''دشمن کو قتل نہ کرو، اس کی جڑوں میں گرم پانی ڈال دو'' کے فارمولے کے تحت برصغیر سے مسلمانوں کی بیخ کنی کا بھی تمنائی ہے۔ بہر حال یہ ایک تفصیل طلب مسئلہ ہے جبکہ ہمارا فوری مسئلہ بھارت کی افغان پالیسی ہے۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد بھارت نے ہمارے ہمسائے افغانستان کو گلے لگا لیا یہ افغان بھارت دوستی 1980ء تک قائم رہی۔ افغان وار شروع ہوئی تو پاکستان کو افغانستان میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔ 1990ء میں روس گیا تو پاکستان نے ربانی، مجددی اور حکمت یار کی شکل میں افغانستان پر قبضہ کر لیا، افغانستان کے یہ راہنما فارغ ہوئے تو پاکستان طالبان کی صورت میں افغانستان میں موجود رہا۔ اس دوران بھارت نے شمالی اتحاد پر سرمایہ کاری شروع کر دی، اکتوبر نومبر 2001ء میں شمالی اتحاد نے طالبان کو شکست دے دی، جس کے بعد امریکہ نے حامد کرزئی کو افغانستان کا حکمران بنا دیا، اس کے ساتھ ہی پاکستان افغانستان سے خارج ہونا شروع ہو گیا اور بھارت کو ایک بار پھر ہمسائے کے ہمسائے کو دوست بنانے کا موقع مل گیا 2001ء میں 21 برس بعد بھارت نے افغانستان کے وزیر داخلہ یونس قانونی کو دہلی بلایا، جسونت سنگھ، فرنانڈس اور ایڈوانی نے اس کے ساتھ ملاقات کی اور اسے افغانستان میں پولیس کا نظام ترتیب دینے کی پیشکش کی، بھارت نے افغانستان کیلئے 10 کروڑ ڈالر امداد کا اعلان بھی کیا، دہلی کابل پروازیں شروع کرنے کا عندیہ بھی دیا اور افغانستان کی تعمیر نو کیلئے اپنی خدمات بھی پیش کر دیں جس

کے ساتھ ہی افغانستان میں ایک نیا سفارتی کھیل شروع ہو گیا۔

پاکستان بھارت کی یہ سیاسی دست درازیاں دیکھتا رہا لیکن دہشت گردی کی جنگ میں ملوث ہونے کے خطرے اور امریکی دباؤ کے باعث کھل کر بھارت سے احتجاج نہ کر سکا، صدر کرزئی کو پاکستان کی نسبت بھارت زیادہ سوٹ کرتا تھا وہ بھی بازو پھیلا کر بھارت کی طرف بڑھے، یوں ہمسائے کا ہمسایہ بھارت کا دوست بن گیا، بھارت نے افغانستان میں 14 سفارتی اڈے بنائے اور صوبہ سرحد اور بلوچستان میں گڑبڑ شروع کر دی، بھارت نے وزیرستان میں لڑنے والے "مجاہدین" اور سردار اکبر خان بگٹی کو ہتھیار تک فراہم کیے، بھارت کی اس سفارتی مہربانی سے پاکستان کے اندرونی حالات خراب ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ نواب اکبر خان بگٹی انتقال فرما گئے اور بلوچستان میں آگ لگ گئی، بھارت اب اس آگ پر تیل پھینک رہا ہے، تیل پھینکنے کی وجہ سے حکومت کو پہلی بار تپش محسوس ہو رہی ہے، مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے 6 ستمبر 2006ء کو افغانستان کے دورے کے دوران صدر پرویز مشرف نے افغانستان کے صدر حامد کرزئی سے بھارت نوازی کا شکوہ کیا تھا جس کے جواب میں صدر کرزئی نے "لیس سر، نو سر" کے سوا کوئی جواب نہیں دیا تھا، مجھے اندیشہ ہے آنے والے دنوں میں افغانستان کی طرف سے بھارتی گڑبڑ میں اضافہ ہو جائے گا اور یہ اضافہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک ہم بھی بھارت کے کسی ہمسائے کو اپنا دوست نہیں بناتے، ہم بھی کسی خالصتان کو "تیل" فراہم نہیں کرتے کیونکہ چانکیہ نے کہا تھا "جب تک دشمن وار نہ کرے اس وقت تک اس کے پاؤں میں کانٹے چبھوتے رہو" اور یہ بھی بھارت کی خارجہ پالیسی ہے۔

پاکستان کا سوئٹزرلینڈ

میرا قیام مرغزار کے وائیٹ پیلس میں تھا۔

وائیٹ پیلس سوات کے پہلے والئی میاں گل عبدالودود نے بنوایا تھا، میاں گل عبدالودود کو لوگ بادشاہ صاحب کہتے تھے، بادشاہ صاحب کا محل مینگورہ میں تھا لیکن گرمیوں میں مینگورہ کا درجہ حرارت بڑھ جاتا تھا لہٰذا شاہی خاندان نے ایک گرمائی محل بنانے کا فیصلہ کیا، اس سلسلے میں مینگورہ سے چند میل کے فاصلے پر ایک خوبصورت جگہ کا انتخاب کیا گیا، اس جگہ کو بادشاہ صاحب نے مرغزار کا نام دیا، بادشاہ صاحب نے مرغزار میں سفید سنگ مرمر سے ایک چھوٹا سا خوبصورت محل بنایا، یہ محل 1941ء میں مکمل ہوا، اس محل کیلئے انہیں کانوں سے سنگ مرمر نکلوایا گیا جن سے تاج محل کیلئے ماربل حاصل کیا گیا تھا، بادشاہ صاحب نے سنا تھا انگریزوں کے غسل خانوں میں ٹھنڈے اور گرم پانیوں کی الگ الگ ٹونٹیاں ہوتی ہیں چنانچہ انہوں نے سفید محل کیلئے لندن سے فلش سسٹم اور ٹونٹیاں منگوائیں، یہ اس علاقے کا پہلا فلش سسٹم تھا، انہوں نے باتھ روم میں واش بیسن لگوایا اور اس واش بیسن پر ٹھنڈے اور گرم پانیوں کی ٹونٹیاں بھی لگوائیں، سفید محل کے لئے قدرتی چشموں کا پانی تین مختلف ٹینکوں میں جمع کیا گیا، یہ پانی بعدازاں محل کے مختلف لانوں اور مختلف فواروں تک لایا گیا، جب ہندوستان میں بجلی پہنچی تو سفید محل کیلئے "پاور پلانٹ" لگایا گیا، ٹیلی فون آیا تو ایکسچینج کی مدد سے سفید محل کو پورے ہندوستان کے ساتھ جوڑ دیا گیا، بادشاہ صاحب کی خواب گاہ مرکزی محل میں تھی جبکہ شہزادے، شہزادیوں اور ملکہ (یا ملکاؤں) کیلئے بائیں جانب تین سطحوں پر کمرے بنائے گئے، محل کے ایک پہلو میں ایک خوبصورت دریائی ندی گزرتی تھی اور دوسرے پہلو میں پھولوں اور پھلوں کے سینکڑوں ہزاروں پودے تھے، یہ محل چاروں طرف سے سرسبز پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا اور ملکہ الزبتھ سمیت برطانیہ، ہندوستان اور پاکستان کی بے شمار شخصیات کو اس محل میں ٹھہرنے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔

بادشاہ صاحب نے 1949ء میں سوات کا تخت اپنے صاحبزادے میاں گل جہاں زیب کے حوالے کر دیا تھا، میاں گل جہاں زیب کے تین بیٹے تھے، میاں گل امیر زیب، میاں گل اورنگزیب اور احمد زیب، صدر پاکستان ایوب خان نے اپنی ایک صاحبزادی جمیلہ میاں گل امیر زیب اور دوسری صاحبزادی نسیم میاں گل

اورنگ زیب کے عقد میں دے دیں، میاں گل اورنگزیب ایم این اے اور میاں نواز شریف کے دور میں بلوچستان کے گورنر رہے ہیں، میاں گل امیر زیب کے دو بیٹے ہیں، اسفندیار اور شہریار، ریاست سوات 1969ء میں پاکستان میں ضم ہوگئی جس کے بعد بادشاہ صاحب کی جائیدادان کی اولاد میں تقسیم ہونا شروع ہوگئی، اس تقسیم میں سفید محل میاں گل امیر زیب کے بیٹے اسفندیار کے حصے میں آ گیا، اسفندیار نے اس محل کو ہوٹل میں تبدیل کیا اور یہ ہوٹل لاہور کے کسی صاحب کو ٹھیکے پر دے دیا، یہ صاحب کوئی باذوق انسان ہیں لہٰذا انہوں نے ہوٹل میں تبدیل ہونے کے باوجود اس عمارت کی تاریخی حیثیت کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ بادشاہ صاحب کا بیڈروم اصل حالت میں موجود ہے جبکہ باقی کمرے بھی اسی فیصد تک اپنی اصل ہیت میں برقرار ہیں۔

مجھے اس محل میں دو دن ٹھہرنے کا موقع ملا، یہ واقعی ایک "لائف ٹائم" تجربہ تھا، اس جگہ میں ایک پراسرایت اور ایک تخلیقی اداسی ہے، آپ جب رات ایک اور دو بجے کے دوران وائیٹ پیلس کے لان میں بیٹھتے ہیں تو آپ ہندوستان کی تاریخ کو اپنے اردگرد چلتے پھرتے دیکھتے ہیں، آپ محسوس کرتے ہیں ہندوستان کے بے شمار وائسرائے اور ملکہ الزبتھ پورے کروفر کے ساتھ آپ کے سامنے بیٹھی ہیں اور آپ ان کی گفتگو سن رہے ہیں، میں نے زندگی میں بے شمار چاند دیکھے ہیں لیکن جو چاند میں نے مرغزار کے اس سفید محل میں دیکھا مجھے وہ چاند دنیا کے کسی ملک، کسی کونے میں دکھائی نہیں دیا، ایک چاند مجھے 2003ء کی گرمیوں میں بہاولپور کے ایک گاؤں میں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، اس گاؤں میں بجلی نہیں تھی، میں صحن کی ٹوٹی ہوئی چارپائی پر چت لیٹا تھا، میں نے اوپر دیکھا، اوپر ایک شفاف آسمان تھا جس پر ایک چاند اور اربوں ستارے ٹمٹمارہے تھے، میں نے اس سے پہلے کبھی اتنا شفاف آسمان، اتنا ٹھنڈا چاند اور اتنے خنک ستارے نہیں دیکھے تھے، اس منظر نے مجھے اتنا مبہوت کر دیا کہ میں اٹھا، میں نے مٹی کے ٹھنڈے کوزے سے وضو کیا اور شکرانے کیلئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جھک گیا، میرا خیال تھا اتنا قیمتی اور اچھوتا منظر میری زندگی میں دوبارہ نہیں آئے گا لیکن سفید محل کا چاند بہاولپور کے اس چاند سے سینکڑوں ہزاروں گنا خوبصورت اور نظر میں اترنے والا تھا، وہاں اس رات سفید محل تھا، لان میں نرم ہوا تھی اور ندی کی ہلکی ہلکی سرگوشیاں تھیں، مجھے محسوس ہوا میرے پورے بدن کا خون حلق میں جمع ہو گیا ہے اور بس ایک سانس لینے کی دیر ہے اور یہ سارا خون اور یہ سارا بدن فضا میں تحلیل ہو جائے گا اور میں مرغزار کی نرم ہواؤں کی نرم رگوں میں جذب ہو جاؤں گا، میں ختم ہو جاؤں گا۔

سوات میرا دوسرا رومان تھا، پہلا رومان اس ملک کے لاکھوں کروڑوں شرمیلے اور شریف بچوں کی طرح کھڑکیوں کے پٹوں، دروازوں کے دروں اور چھتوں کی درزوں کے پیچھے پروان چڑھا اور پروان چڑھتے ہی اس پر شرم و حیا اور سٹیٹس کی مہر لگ گئی، میں نے اپنے اندر ایک قبر کھودی اور اسے اس قبر میں دفن کر دیا، میں ایک مزدور تھا لہٰذا میں شاہجہاں اور جہانگیر کی طرح اس قبر کو سفید سنگ مرمر دے سکا اور نہ ہی اس پر تاج محل بنا سکا لیکن میں نے اسے اپنے دل کی سرخ دیواریں اور اپنی ٹوٹتی اور مرتی اور مرجھاتی خواہشوں کی سفیدی ضرور دے دی، میں نے اسے اپنی بینائی کے موتیوں کا تحفہ دے دیا، سوات میرا

دوسرا رومان تھا، میں نے بچپن میں کسی جگہ پڑھا تھا سوات پاکستان کا سوئٹزرلینڈ ہے، جس کے بعد سوات اور سوئٹزرلینڈ دونوں میری خواہشوں کی فہرستوں میں شامل ہو گئے لیکن قدرت کے ہیر پھیر سے اس فہرست کی ترتیب بدل گی، میں پہلے سوئٹزرلینڈ گیا اور اس کے بعد سوات، سوئٹزرلینڈ حقیقتاً ایک خوبصورت اور نظروں میں اتر جانے والا ملک تھا، اس ملک میں سمندر نہیں لیکن اس کے ملک کے لوگوں نے اپنی جھیلوں کو سمندروں کی شکل دے دی، ان کی جھیلیں فقط جھیلیں نہیں تھیں آئینہ تھے، میں ان کی تھن جھیل پر گیا، میں نے انٹرلاکن کی جھیلیں دیکھیں، میں نے یوشیتل کی جھیل پر لوگوں کو آتش بازی کرتے دیکھا اور میں جنیوا کی جھیل پر گھنٹوں بیٹھا رہا، میں نے ایسی جھیلیں، ایسا سبزہ اور ایسا پاک صاف ماحول کسی دوسری جگہ نہیں دیکھا، پوری دنیا میں گھاس کاٹی جاتی ہے لیکن سوئس دنیا کی واحد قوم ہے، جو قینچیوں سے گھاس کاٹتی ہے، جس کا صفائی میں کوئی جواب نہیں، آپ کو کسی فٹ پاتھ، کسی سڑک پر گھاس کا کوئی فالتو تنکا نہیں ملے گا، میں نے سوئٹزرلینڈ میں صفائی کو پورے ایمان کی شکل اختیار کرتے دیکھا، لوگ انتہائی مہذب، شائستہ اور دھیمے تھے، وہ اجنبیوں سے محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے اور پورے ملک میں صرف 16 سو پاکستانی تھے اور یہ سوئٹزرلینڈ کی تیسری بڑی خوبی تھی۔

میں سوئٹزرلینڈ کا یہ امیج لے کر پاکستان واپس آ گیا، اس کے بعد میں سوات جانے کے منصوبے بنانے لگا لیکن ہر گرمیوں میں یہ پروگرام التوا کا شکار ہو جاتا، کبھی وقت آڑے آ جاتا اور کبھی حالات اور مصروفیت ہمارے درمیان حائل ہو جاتی لیکن میں نے جولائی کے آخری ہفتوں میں مصروفیت کو شکست دے دی اور میں نے پاکستان کے سوئٹزرلینڈ میں قدم رکھ دیے۔

(کالم کا باقی حصہ اگلے صفحات میں ملاحظہ کیجئے)

سرحد حکومت سے درخواست

میں سوات میں داخل ہوا تو مجھے فوراً اس لہوریے کا واقعہ یاد آ گیا جس نے حج سے واپسی پر کہا تھا ''اس میں کوئی شک نہیں مکہ اللہ اور مدینہ رسول کا شہر ہے لیکن یار و لہور لہور ہے'' سوات کو دیکھ کر مجھے بھی سوئٹزر لینڈ یاد آ گیا اور میں نے بھی بے اختیار نعرہ لگایا ''سوات سوات ہے اور سوئٹزر لینڈ سوئٹزر لینڈ'' مجھے محسوس ہوا جس شخص نے سوات کو پاکستان کا سوئٹزر لینڈ کہا تھا یقیناً اس ستم ظریف نے سوئٹزر لینڈ نہیں دیکھا ہو گا ورنہ وہ یہ ''کلمہ حق'' کہنے سے پہلے سو بار سوچتا۔

میں نے محسوس کیا شاید اس شخص نے سوات کی قدرتی خوبصورتی، سبزے اور نظاروں کی وجہ سے اسے پاکستان کا سوئٹزر لینڈ قرار دیا ہو گا، اگر اس نقطے سے دیکھا جائے تو اس کی بات درست تھی، اللہ تعالیٰ نے سوات کو بھی سوئٹزر لینڈ جتنی خوبصورتی سے نواز رکھا ہے لیکن صرف قدرتی خوبصورتی کافی نہیں ہوتی ملکوں اور علاقوں کو انسان کی صناعی اور محنت بھی درکار ہوتی ہے اور یہ حقیقت ہے جب تک قدرت اور انسان کے درمیان ایک ''ورکنگ ریلیشن شپ'' پیدا نہیں ہوتا، اس وقت تک چیزیں مکمل نہیں ہوتیں۔ بیج کو لیجیے اللہ تعالیٰ نے بیج پیدا کیا، مٹی، ہوا اور پانی بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے لیکن جب تک انسان اس بیج، مٹی، ہوا اور پانی کو کھیت کی شکل نہیں دیتا انسان اناج میں خود کفیل نہیں ہوتا، اس کی بھوک ختم نہیں ہوتی لہٰذا دنیا کے جس خطے، جس کونے کے انسان نے اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کر لیا وہ انسان، وہ کونا اور وہ خطہ خوشحال ہو گیا، اس کا مقدر بدل گیا لیکن انسانوں کے جس گروہ نے سستی اور تاخیر کا مظاہرہ کیا وہ گروہ اور اس گروہ کا ملک ترقی کے عمل میں پیچھے رہ گیا، یہ تاریخ کا سب سے بڑا سچ ہے، پانی اللہ تعالیٰ دیتا ہے لیکن اس پانی کو ڈیم میں بدلنا، اس کی نہریں بنانا اور ان نہروں کو کھیتوں اور گھروں تک پہنچانا انسان کا کام ہوتا ہے، موسم، ماحول اور حالات بھی اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے لیکن ان حالات، اس ماحول اور ان موسموں کو اپنے لئے منفعت بخش بنانا انسان کا کام ہوتا ہے، آپ اس ریفرنس کو سامنے رکھ کر اصل سوئٹزر لینڈ اور پاکستانی سوئٹزر لینڈ کا تقابل کیجیے تو آپ کو دونوں میں زمین آسمان کا فرق محسوس ہو گا، قدرت نے دونوں خطوں کو خوبصورتی، موسم اور ایک جیسے جغرافیائی حالات بخشے تھے لیکن سوئٹزر لینڈ کے لوگوں نے ان حالات کے دامن

میں اپنا حصہ ڈال کر اسے دنیا کا خوبصورت ترین ملک بنا دیا جبکہ اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں سوات بخشا تو ہم نے اس کا خوبصورت چہرہ نوچ لیا، ہم نے اسے 21 ویں صدی کے جدید دور میں 9 ویں صدی کا پسماندہ قصبہ بنا دیا، ہم نے اسے بدترین شکل میں ڈھال دیا۔

آپ اگر اسلام آباد سے سوات جائیں تو اس کا فاصلہ پونے دو سو کلومیٹر بنتا ہے، جدید اور مہذب ممالک میں یہ فاصلہ ایک سے ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو ہے لیکن لوگ یہ فاصلہ ساڑھے سات گھنٹے میں طے کرتے ہیں، اس کی وجہ سڑک ہے، ملاکنڈ سے مینگورہ تک سڑک انتہائی خستہ اور کھنڈر ہے، تین چار جگہوں پر اس کھنڈر کی مرمت جاری ہے لیکن اس مرمت کی رفتار اور کوالٹی اتنی بری ہے کہ محسوس ہوتا ہے اول یہ سڑک دو سال سے پہلے مکمل نہیں ہوگی اور اگر یہ مکمل ہو بھی گئی تو اس کی میعاد چھ ماہ سے زائد نہیں ہوگی، میں نے اپنی آنکھوں سے مزدوروں کو مٹی پر تارکول بچھاتے دیکھا، آپ خود سوچئے یہ تارکول مٹی کو کتنی دیر سنبھال سکے گی' مینگورہ سوات کا ہیڈ کوارٹر ہے، اس کے موسم اور پشاور کے موسم میں کوئی فرق نہیں، شہر میں وہی رش، شور، گرد اور گرمی ہے۔ جس سے بھاگ کر لوگ سوات جیسی جگہوں کی تلاش میں نکلتے ہیں لہٰذا لوگوں کی کوشش ہوتی ہے وہ مینگورہ میں رکنے کی بجائے آگے اصل سوات کی طرف نکل جائیں، سوات کی اصل پہچان اس کے تین مقامات مالم جبہ، بحرین اور کالام ہیں لیکن بدقسمتی سے ان تینوں علاقوں کی سڑکیں بھی انتہائی خستہ ہیں، مینگورہ سے مالم جبہ اور کالام کا فاصلہ 50 اور 90 کلومیٹر ہے لیکن اگر ہم اپنی گاڑی سے وہاں جائیں تو ہمیں مالم جبہ پہنچنے کیلئے ساڑھے تین گھنٹے جبکہ کالام کیلئے ساڑھے پانچ گھنٹے سفر کرنا پڑتا ہے، اس سفر کے دوران ایسے ایسے مقامات بھی آتے ہیں جہاں دس کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے گاڑی چلانا پڑتی ہے۔ کالام اس وادی کا سب سے خوبصورت مقام ہے، اس مقام تک پہنچنا انتہائی دشوار اور مشکل ہے، مدین کے بعد کالام تک سڑک ٹوٹ چکی ہے' کالام سے آگے مہوڈنڈ جھیل ہے، یہ جھیل انتہائی خوبصورت اور پرسکون ہے، کالام جانے والے 95 فیصد لوگ مہوڈنڈ جاتے ہیں لیکن اس جھیل تک جانے کیلئے سڑک کی نعمت موجود نہیں، لوگوں کو اڑھائی سے ساڑھے تین ہزار روپے میں جیپ لینا پڑتی ہے اور یہ جیپ 35 کلومیٹر کا فاصلہ چار گھنٹے میں طے کرتی ہے، راستہ انتہائی غیر محفوظ اور پتھریلا ہے اس میں بے شمار ایسے موڑ آتے ہیں جہاں ہزاروں فٹ گہری کھائی اور جیپ کے ٹائروں کے درمیان ایک دو انچ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، مینگورہ سے کالام اور کالام سے مہوڈنڈ تک راستے میں کوئی ٹوائلٹ نہیں، مہوڈنڈ جھیل پر بھی اس قسم کی کوئی سہولت موجود نہیں، میں نے سارا راستہ خواتین اور بچوں کو مشکل میں دیکھا، مردان سے مینگورہ اور مینگورہ سے کالام اور کالام سے مہوڈنڈ تک ہر طرف گندگی کے ڈھیر لگے ہیں، ہر طرف ریپر، خالی بوتلیں، ٹین اور چھلکے پڑے ہیں۔ مسئلہ یہ گند اور راستوں کی یہ خستہ حالی نہیں اصل مسئلہ صوبہ سرحد کی اسلامی حکومت ہے' حیرت ہوتی ہے یہ سارا گند اور یہ ساری بدنظمی اسلامی حکومت کی ناک کے عین نیچے پھیل رہی ہے اور حکومت اس سلسلے میں کچھ نہیں کر رہی' مجھے سوات جا کر محسوس ہوا جو حکومت ایک سڑک اور ایک پکنک پوائنٹ درست نہیں کر سکتی کل کلاں کو اگر اسے پورے ملک کا نظم و نسق مل گیا تو وہ کیا کرے گی۔

کالم نگاروں کے بارے میں عموماً کہا جاتا ہے یہ لوگ مسئلہ تو بیان کر دیتے ہیں لیکن اس کا حل نہیں دیتے میں آج یہ گلہ بھی دور کرنا چاہتا ہوں، میں آج سرحد حکومت کو اس مسئلے کا حل بھی بتاتا ہوں، سوات کے تین بڑے مسئلے ہیں اول سڑکیں، دوم تفریحی مقامات پر گندگی اور سوم سیاحتی مراکز اور ان کے راستوں میں ٹوائلٹس کی دستیابی، ان تینوں مسئلوں کے ایسے حل موجود ہیں جن پر ایک پیسہ خرچ نہیں ہوگا، سب سے پہلے سڑکوں کو لیتے ہیں، سرحد حکومت وادی سوات کی ساری سڑکیں بینکوں سے فنانس کرالے، وہ مختلف بینکوں سے بات چیت کرے، بینکوں کو مہوڈنڈ جھیل تک سڑکیں اور چیئر لفٹس بنانے پر راغب کرے، بینک سڑکیں بنانے کے بعد انٹری اور ایگزٹ پوائنٹس پر ٹول پلازے بنا دیں اور ان تفریحی مقامات میں داخل ہونے والے لوگوں سے فی گاڑی تین سے پانچ سو روپے ٹول ٹیکس وصول کر لیں، اس رقم سے بینکوں کی قسط بھی پوری ہو جائے گی اور سیاحوں کو بھی جیپوں کے کرائے سے چھٹکارا مل جائے گا۔ اسی طرح حکومت مختلف ملٹی نیشنل کمپنیوں کو گندگی اٹھانے اور عارضی ٹوائلٹس بنانے کی ذمہ داری سونپ دے، اس وقت پاکستان میں مشروبات، سگریٹس، آئس کریم، ٹیلی کمیونیکیشن اور پیٹرول کی 900 قومی اور بین الاقوامی کمپنیاں کام کر رہی ہیں، حکومت ان میں سے صرف دس کمپنیوں کا انتخاب کرے اور پوری سوات ویلی ان کمپنیوں میں تقسیم کر دے، کمپنیاں اپنے اپنے علاقے میں ڈسٹ بن لگا دیں، وہاں اپنے باوردی سوپر تعینات کریں اور اس علاقے میں کوڑا اٹھانے اور جلانے والے ایک دو یونٹ لگا دیں تو اس سے سیاحوں کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور ان کمپنیوں کی نیک نامی میں بھی اضافہ ہوگا۔ اسی طرح کسی ٹیلی کمیونیکیشن کمپنی یا مشروبات کی کسی فرم سے سوات کے راستے میں عارضی ٹوائلٹس بھی بنوائے جا سکتے ہیں، یہ کمپنی ان ٹوائلٹس کی صفائی اور سیوریج کیلئے باوردی ورکر ملازم رکھ لے۔ اس بندوبست سے لوگوں کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا، حکومت کی جیب سے کوئی پیسہ بھی خرچ نہیں ہوگا اور ان کمپنیوں کو بھی اپنی نیک نامی اور ایڈورٹائزنگ کا موقع مل جائے گا لیکن آخر میں پھر وہی بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے، یہ سب کچھ کرے گا کون؟ کنفیوشس نے کہا تھا اگر انسان چلنا چاہے تو اس کے سامنے ہزار راستے ہوتے ہیں لیکن اگر وہ حرکت نہ کرنا چاہے تو اس کے پاس دو ہزار بہانے ہوتے ہیں، ہماری حکومتیں بھی ایسی شہنشاہ ہیں جن کے پاس کام نہ کرنے کے دس دس ہزار بہانے ہوتے ہیں' میں یہ حقیقت جانتا ہوں لیکن اس کے باوجود نہ جانے کیوں یہ دل چاہتا ہے ایک بار سرحد حکومت سے درخواست ضرور کی جائے' ان سے اتنا ضرور کہا جائے اگر وہ سوات کو اپنا ایک ''ورکنگ ڈے'' دے دیں تو سوات حقیقتاً پاکستان کا سوئٹزرلینڈ بن سکتا ہے۔

بلوچ قیادت بھی قصوروار ہے

علی کا تعلق بلوچستان کے علاقے ژوب سے تھا' وہ قائداعظم یونیورسٹی میں ایم فل کر رہا تھا۔ وہ گزشتہ روز میرے پاس آیا' اس کے پاس دو فائلیں تھیں' اس نے فائلیں کھولیں' کاغذ نکالے اور یہ سارے کاغذ میز پر پھیلا دیئے' میں خاموشی سے اس کی یہ کارروائی دیکھتا رہا۔

اس نے ایک کاغذ اٹھایا اور میری طرف لہرا کر بولا "سر یہ اسلام آباد کا بجٹ ہے' 22 جون 2006ء کو سی ڈی اے کے چیئرمین نے 21 ارب 23 کروڑ 80 لاکھ روپے کے بجٹ کا اعلان کیا تھا' چیئرمین نے وفاقی حکومت کے 15 پراجیکٹس کا ذکر بھی کیا' ان پراجیکٹس پر 19 ارب 12 کروڑ روپے خرچ ہوں گے۔ وفاقی حکومت یہ سوا 19 ارب روپے پبلک سیکٹر ڈویلپمنٹ پروگرام (پی ایس ڈی پی) سے دے گی' سی ڈی اے اس رقم سے ایوان صدر میں ایک نئی کالونی تعمیر کرے گا' ایوان صدر میں پولیس کے لئے رہائش گاہیں بنائے گا' قومی اسمبلی کے سپیکر کا گھر بنائے گا' پارلیمنٹ ہاؤس کا ایئر کنڈیشنڈ اپ گریڈ کرے گا' کلوز سرکٹ ٹی وی سسٹم لگائے گا' سیکرٹریٹ' فارن آفس اور پارلیمنٹ ہاؤس کے سنٹرل ایئر کنڈیشنر سسٹم کی مرمت کرائے گا' ایوان صدر' سینٹ ہال اور پارلیمنٹ ہاؤس کا فرنیچر بدلے گا اور پارلیمنٹ ہاؤس میں سٹینڈنگ کمیٹیوں کے چیئرمینوں کے لئے نئے دفاتر بنائے گا" میں خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا' اس نے کہا "سر اسلام آباد میں صرف دس لاکھ لوگ رہتے ہیں اور اس کا کل رقبہ 906 مربع کلومیٹر ہے' حکومت اگلے سال دس لاکھ لوگوں اور 906 مربع کلومیٹر کے اس چھوٹے سے شہر پر 21 ارب 23 کروڑ 80 لاکھ روپے لگائے گی جبکہ ایوان صدر سے پارلیمنٹ ہاؤس تک نصف کلومیٹر کے دائرے میں 19 ارب 12 کروڑ روپے خرچ کیے جائیں گے" میں خاموشی سے سنتا رہا' اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور دوسرا کاغذ اٹھا کر بولا "اس کے مقابلے میں بلوچستان کی حکومت 2006-2007ء میں پورے صوبے پر 59 ارب 69 کروڑ روپے خرچ کرے گی جس میں سٹیٹ بینک کا 17 ارب روپے کا قرضہ بھی شامل ہے۔ اگر ہم یہ 17 ارب روپے نکال دیں تو یہ رقم 42 ارب روپے بن جاتی ہے گویا اس سال پورے بلوچستان پر 42 ارب روپے جبکہ اسلام آباد پر 40 ارب 35 کروڑ 80 لاکھ (21 ارب 23 کروڑ 80 لاکھ + 19 ارب 12

کروڑ) روپے خرچ کیے جائیں گے" وہ رکا' اس نے کاغذ اٹھایا اور اس کے درمیان میں انگلی رکھ کر بولا "آپ بلوچستان کا ترقیاتی بجٹ دیکھئے' حکومت پورے بلوچستان کے ترقیاتی کاموں پر 10 ارب 82 کروڑ روپے خرچ کرے گی" میں خاموش رہا' وہ رک کر بولا "سر بلوچستان کا رقبہ 3 لاکھ 47 ہزار ایک سو 90 مربع کلومیٹر ہے' یہ پاکستان کا سب سے بڑا' محروم اور غریب صوبہ ہے۔ سر کیا یہ ظلم نہیں حکومت 906 مربع کلومیٹر کے اسلام آباد اور دس لاکھ لوگوں پر 40 ارب روپے خرچ کرے جبکہ تین لاکھ 47 ہزار ایک سو 80 مربع کلومیٹر کے بلوچستان اور ایک کروڑ بلوچوں کی ترقی پر صرف دس ارب 82 کروڑ روپے خرچ ہوں' کیا یہ ظلم نہیں ایوان صدر سے پارلیمنٹ ہاؤس تک نصف کلومیٹر کی ترقی پر 19 ارب روپے خرچ کیے جائیں اور گوادر سے لے کر ژوب تک اور حب سے لے کر چمن تک ساڑھے تین لاکھ مربع کلومیٹر پر صرف 10 ارب 82 کروڑ روپے؟" وہ رکا اس نے سانس لیا اور پھر مسکرا کر بولا "لیکن سر اس کے باوجود جب ہم لوگ بولتے ہیں تو آپ لوگ ہمیں غدار کہتے ہیں' آپ ہمیں قوم پرست کا خطاب دیتے ہیں۔" وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے اس کے ہاتھ سے اسلام آباد کا بجٹ لیا' ایک نظر اس پر ڈالی اور ایک جگہ انگلی رکھ کر کہا "یہ دیکھو چیئرمین نے اعلان کیا ہے' سی ڈی اے 21 ارب روپے میں سے 14 ارب 97 کروڑ 50 لاکھ روپے اپنے وسائل سے حاصل کرے گا جبکہ باقی رقم اس کے پاس پہلے سے موجود ہے" وہ خاموشی سے میری بات سنتا رہا' میں نے عرض کیا "اور جہاں تک ایوان صدر اور پارلیمنٹ ہاؤس پر 19 ارب روپے خرچ کرنے کا معاملہ ہے تو میں اس سلسلے میں تمہارے ساتھ متفق ہوں' واقعی حکومت کو چاہئے وہ پارلیمنٹ ہاؤس کے ائیر کنڈیشنر کی اپ گریڈیشن کی بجائے اس رقم سے بلوچستان کے لوگوں کے لئے پینے کے پانی' روزگار' ہسپتالوں اور سکولوں کا بندوبست کرے' اس میں کوئی شک نہیں 19 ارب روپے بہت بڑی رقم ہوتی ہے' اس رقم سے بلوچستان کے لاکھوں لوگوں کا مقدر بدل سکتا ہے لیکن تم جانتے ہو......" میں ایک لمحے کے لئے رکا اور اس کے بعد مسکرا کر بولا "بلوچستان کے عوام پر اس ظلم کے تمام تر ذمہ دار خود بلوچ ہیں' یہ بلوچستان کی سیاسی قیادت کا قصور ہے" اس نے چونک کر میری طرف دیکھا' میں نے عرض کیا "کیا تم بتا سکتے ہو پاکستان میں مہنگی ترین جگہ کون سی ہے" اس نے ذرا دیر سوچا اور اس کے بعد بولا "اسلام آباد کا ای سیون سیکٹر" میں نے انکار میں سر ہلا دیا "نہیں اس جگہ کا نام گوادر ہے' بھٹو کے دور میں روس اور جنرل ضیاء الحق کے دور میں امریکہ نے گوادر کی اتنی قیمت لگائی تھی جس سے اسلام آباد جیسے دس شہر بنائے اور خریدے جا سکتے ہیں پچھلے پانچ برسوں میں گوادر میں 80 ہزار ایکڑ سرکاری زمین خریدی اور بیچی گئی اور گوادر کی زمینوں سے سندھ' پنجاب اور بلوچستان کے دس ہزار پراپرٹی ڈیلر ارب پتی بن گئے' بلوچستان کی سیاسی قیادت ان ساری زمینوں کی خرید و فروخت میں شامل تھی' ان زمینوں کی تمام تر سودے بازی چیف منسٹر ہاؤس میں ہوئی تھی اور چیف منسٹر نے اس سے باقاعدہ حصہ وصول کیا تھا' مجھے پورٹس اینڈ شپنگ کی سٹینڈنگ کمیٹی کی ایک رپورٹ پڑھنے کا اتفاق ہوا' اس رپورٹ میں انکشاف ہوا حکومت نے بندرگاہ کے لئے 4 ہزار ایکڑ زمین چھوڑی تھی لیکن یہ زمین بھی

اچانک غائب ہو گئی لہٰذا اگر اسلام آباد کی انتظامیہ پلاٹس بیچ کر سال میں 15 ارب روپے جمع کر سکتی ہے تو کیا بلوچستان حکومت گوادر کی زمینوں سے سو دو سو ارب روپے نہیں حاصل کر سکتی تھی؟ کیا وہ گوادر کے پلاٹس بیچ کر بلوچستان کے لوگوں کا مقدر نہیں بدل سکتی؟'' میں رکا' میں نے غور سے نوجوان کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا کر عرض کیا ''بلوچستان کے چیف منسٹر جناب جام یوسف ہفتے میں تین دن اسلام آباد میں گزارتے ہیں' جناب شوکت عزیز سے پہلے بلوچ سردار میر ظفر اللہ جمالی پاکستان کے وزیر اعظم تھے' نواز شریف کے دور میں سردار اختر مینگل مسلم لیگ کے حلیف تھے اور بے نظیر بھٹو کی حکومت میں نواب ذوالفقار مگسی بلوچستان کے وزیر اعلیٰ اور پیپلز پارٹی کے اتحادی رہے' یہ لوگ بھی اسلام آباد آتے جاتے رہتے تھے' یہ لوگ خود اپنی آنکھوں سے ایوان صدر سے پارلیمنٹ ہاؤس کے نصف کلومیٹر پر اربوں روپے خرچ ہوتے دیکھتے تھے اور یہ لوگ آج بھی دیکھ رہے ہیں لیکن کیا انہوں نے آج تک اس پر احتجاج کیا؟ حقیقت تو یہ ہے ان لوگوں نے آج تک صدر اور وزیر اعظم سے اتنا عرض نہیں کیا' جناب عالی ہمارے پورے بلوچستان کا ترقیاتی بجٹ 10 ارب روپے ہے جبکہ آپ تین عمارتوں کی تزئین و آرائش پر 19 ارب روپے خرچ کر رہے ہیں، حضور مہربانی فرما کر یہ 19 ارب روپے ہمیں دے دیں، ہم اپنے لوگوں کو پانی، روٹی اور روزگار دینا چاہتے ہیں''۔

میں رکا، اس کی طرف جھکا اور مسکرا کر عرض کیا ''میر ظفر اللہ جمالی پورے پاکستان کے وزیر اعظم تھے، وہ اپنے دور میں وزیر اعظم ہاؤس کے پردے اور صوفے بدلتے رہے، وہ بھی قالین اور دیواروں کا رنگ تبدیل کرتے رہے مگر انہوں نے بلوچستان کیلئے کچھ نہ کیا'' وہ خاموشی سے میری بات سنتا رہا، میں نے اس سے عرض کیا ''میرے عزیز اگر آج بلوچستان غریب ہے' اگر آج بلوچستان محروم اور پسماندہ ہے تو اس کی قصوروار بلوچستان کی سیاسی قیادت ہے، تمہارے اصل قصوروار بلوچستان میں بیٹھے ہیں لیکن تم انہیں اسلام آباد میں تلاش کر رہے ہو'' اس نے تھوڑی دیر سوچا اور خوابیدہ آواز میں بولا ''سر ہمارا ظالم کون ہے میں آپ سے یہ نہیں پوچھنے آیا، میں تو آپ سے بس اتنا جاننا چاہتا ہوں، ظالم کوئٹہ میں ہو یا اسلام آباد میں' کیا اس کا ضمیر اسے ملامت نہیں کرتا'' میں نے قہقہہ لگایا اور اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا ''نہیں میرے عزیز، ظالموں کے ضمیر نہیں ہوا کرتے''۔

بس آنکھیں بند کریں

''تم پنجابی ہو اور ہمارے دشمن ہو'' اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا' کمرے میں سنسنی پھیل گئی' ہم سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے' مجھے پہلی بار احساس ہوا پنجابی ہونا بری بات ہے اور اس ملک کے بے شمار لوگ پنجابیوں کو دشمن سمجھتے ہیں' یہ کراچی شہر تھا اور ہم اس بلوچ سردار سے سو سال پرانی رائفل خریدنے آئے تھے' یہ رائفل کیپٹن سکاٹ نے اس بلوچ سردار کے پردادا کو دی تھی' یہ اس نوعیت کی تیسری رائفل تھی' پہلی دو رائفلیں لندن میوزیم میں ہیں' میرے ایک دوست کو پرانی رائفلیں' پرانی تلواریں اور پرانے خنجر جمع کرنے کا شوق ہے' اس نے اپنے گھر میں اسلحہ خانہ بنا رکھا ہے' اسے اس رائفل کے بارے میں علم ہوا تو اس نے ایک بروکر سردار کے پیچھے لگا دیا' بروکر نے بلوچ سردار کو ملاقات کیلئے تیار کر لیا اور یوں ہم تینوں کراچی پہنچ گئے' سودے کے دوران میں نے اور میرے دوست نے آپس میں پنجابی میں گفتگو شروع کر دی' ہمارے منہ سے پنجابی سن کر بلوچ سردار بھڑک گیا اور اس نے رائفل بیچنے سے انکار کر دیا' میرے دوست نے وجہ پوچھی تو سردار غصے سے بولا ''تم پنجابی ہو اور ہمارے دشمن ہو'' ہم حیران رہ گئے' اس کا کہنا تھا ''تم لوگوں نے بلوچستان پر حملہ کیا' ڈیرہ بگٹی پر بم اور میزائل پھینکے' ہمارے سردار کو قتل کیا' ہمارے سینکڑوں لوگ مارے اور اب تم لوگوں نے سردار اختر مینگل کو جیل میں بند کر رکھا ہے'' میں نے اس سے عرض کیا ''سردار صاحب ڈیرہ بگٹی پر حملہ پنجاب یا پنجابیوں نے نہیں کیا' یہ وفاقی حکومت کا فیصلہ تھا اور حکومت نے اس معاملے میں کسی سے مشورہ نہیں کیا تھا'' سردار نے نفرت سے سر مارا اور غصے سے بولا ''ملک پر پنجابیوں کی حکومت ہے' ہم بلوچستان آپریشن کو پنجابیوں کا حملہ سمجھتے ہیں' بلوچ قتل کو کبھی نہیں بھولتا' ہم پنجاب سے اپنے بچوں' عورتوں اور بوڑھوں کی موت کا بدلہ ضرور لیں گے'' میں نے عرض کیا ''صدر پرویز مشرف پنجابی نہیں ہیں' وہ مہاجر اور سندھی ہیں' وزیراعظم شوکت عزیز بھی خالص پنجابی نہیں ہیں' جام یوسف بھی بلوچی اور سندھی ہیں' اس سارے منصوبے میں صرف ایک پنجابی شامل تھا اور وہ پنجابی چودھری شجاعت حسین تھے لیکن ساری دنیا جانتی ہے چودھری صاحب نے حملے کی مخالفت کی تھی' وہ اس مسئلے کو مذاکرات کے ذریعے حل کرنا چاہتے تھے' چودھری شجاعت اور مشاہد حسین نہ صرف تین بار ڈیرہ بگٹی گئے تھے بلکہ انہوں نے حملے کو ٹالنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن آپ

اس کے باوجود پنجاب کو الزام دے رہے ہیں'' بلوچ سردار نے پہلو بدلا اور اسی لہجے میں بولا ''فوج ہو' پولیس ہو' انتظامیہ ہو یا سیاستدان ہوں یہ سب لوگ پنجابی ہیں اور ہمارے دشمن ہیں' آپ میرے مہمان ہیں' آپ چائے پئیں اور اللہ حافظ' میں آپ کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں اور نہ ہی سودا' بلوچ دشمنوں کے ساتھ حساب کرتے ہیں سودے نہیں'' ہم دونوں نے سردار کو منانے کی کوشش کی لیکن وہ رخ پھیر کر بیٹھ گیا' ہم نے چائے کے آخری گھونٹ بھرے' سلام کیا اور باہر آ گئے۔

ہم دونوں بری طرح شرمندہ اور پریشان تھے' میرے دوست کا کہنا تھا ہماری حکومت کی پالیسیاں بلوچستان' سرحد' سندھ اور پنجاب کو بہت فاصلے پر لے گئی ہیں' کوئی ان دیکھی طاقت ہمارے لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا کر رہی ہے' اگر حکومت نے اس نفرت پر توجہ نہ دی تو شاید ہمارے دشمنوں کو پاکستان کو نقصان پہنچانے کیلئے زیادہ تردد نہ کرنا پڑے' ہم سب ایک دوسرے کے ساتھ لڑ لڑ کر ختم ہو جائیں گے' میں نے اس سے وضاحت کی درخواست کی' وہ بولا ''حکومت نے بلوچستان پر لشکر کشی کی' اس حملے میں نواب اکبر بگٹی مارا گیا جبکہ بگٹی قبیلے کے بیسیوں لوگ ہلاک ہو گئے' حکومت نے اس کے بعد نواب اختر مینگل کو گرفتار کر لیا اور اس پر ہونے والے انسانیت سوز مظالم کی خبریں اخبارات میں شائع ہونے لگیں' کسی ان دیکھی طاقت نے لاکھوں کی تعداد میں پمفلٹ شائع کئے اور یہ پمفلٹ بلوچوں میں تقسیم کر دیئے' بلوچستان میں خفیہ ریڈیو بنے اور یہ ریڈیو بلوچوں کے غصے کو نفرت کی شکل دینے لگے' بلوچوں کا غصہ اب پنجاب اور فوج کی طرف منتقل ہو رہا ہے'' میرا دوست خاموش ہوا اور ذرا دیر رک کر بولا ''تم جنوبی وزیرستان کے آپریشن کو دیکھو' ہم نے امریکہ کی خواہش پر وزیرستان میں اپنے لوگوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی' ہم امریکہ کی غلط اطلاعات پر وانا میں میزائل داغ رہے ہیں' امریکہ کہتا ہے فلاں جگہ اتنے دہشت گرد چھپے ہیں' ہم اس جگہ میزائل داغ دیتے ہیں بعد ازاں بی بی سی اور سی این این انکشاف کرتے ہیں اس جگہ دہشت گردوں کی بجائے معصوم طالب علم تھے اور ہم نے تہجد پڑھتے بچوں کو بموں سے اڑا دیا' یہ انکشافات صوبہ سرحد کے عوام میں حکومت' فوج اور پنجاب کے خلاف نفرت پیدا کر دیتے ہیں' وانا میں سو سو بے گناہ لوگوں کے جنازے اٹھتے ہیں' یہ جنازے بھی نفرت کی ایک طویل لکیر ہیں' لوگ کہتے ہیں نیٹو فورسز بغیر اطلاع جنوبی وزیرستان پر حملہ کر دیتی ہیں اور ہماری حکومت اپنی کمزوری چھپانے کیلئے یہ بدنامی اپنے ذمہ لے لیتی ہے' ہم اگر جنوبی وزیرستان جا کر دیکھیں تو وہاں کے لوگ پنجاب اور فوج کو ذمہ دار سمجھتے ہیں'' میرا دوست رکا اور ذرا سا سوچ کر بولا ''ہم اب کشمیریوں کے دلوں میں بھی نفرت پیدا کر رہے ہیں' ہم نے 25 برس تک کشمیر میں آزادی کا الاؤ جلائے رکھا' پاکستان کے تمام شہروں سے سینکڑوں ہزاروں نوجوان کشمیر گئے اور آزادی کی جنگ کا ایندھن بنے' مقبوضہ کشمیر میں کوئی ایسا گھر' کوئی ایسا خاندان نہیں جس میں کوئی نہ کوئی شہید نہ ہو' 25 برسوں میں کوئی ایسا ہفتہ نہیں گزرا جب سرینگر' ڈوڈا اور جموں میں ہڑتال نہ ہوئی ہو لیکن پھر ہم نے کشمیر پر یوٹرن لے لیا' کشمیر اب دو ماہ کا مسئلہ محسوس ہوتا ہے' دو ماہ میں آزاد اور مقبوضہ کشمیر کی سرحدیں کھل جائیں گی' جس کے بعد پاکستان اپنے موقف سے کئی

کوس پیچھے ہٹ جائے گا' کشمیر سے ہماری یہ پسپائی بھی نفرت کی بنیاد بنے گی' آزاد اور مقبوضہ کشمیر کے وہ لاکھوں خاندان جو آزادی کا راستہ دیکھ رہے تھے اور پاکستان کے وہ ہزاروں خاندان جنہوں نے کشمیر کی آزادی کیلئے اپنے بچوں کی قربانی دی تھی وہ حکومت کے خلاف ہو جائیں گے' یہ نفرت بھی کسی نہ کسی شکل میں باہر آئے گی اور ہمیں اس کا تاوان بھی ادا کرنا پڑے گا"

میرا دوست ذرا دیر کیلئے رکا اور دوبارہ گویا ہوا" یہ ملک بہت مضبوط تھا' ہمارے لوگوں میں جذبہ' ایمان اور حب الوطنی تھی' پاکستان کے پاس دنیا کی بہترین فوج تھی اور ہماری فوج پاکستان کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کی محافظ تھی لیکن حکومت کی چند سیاسی غلطیوں کی وجہ سے ہماری فوج کا امیج بھی خراب ہوا اور ہمارے لوگ فوج سے بھی نفرت کرنے لگے' تم خود سوچو دانا کے جن گھروں پر میزائل گرے اور جن لوگوں کے بچے شہید ہوئے اگر انہیں بدلہ لینے کا موقع ملے تو وہ کیا کریں گے؟' یہ کس پر حملہ کریں گے؟ اور اس حملے میں کون لوگ مارے جائیں گے؟ ذرا سوچو' اگر بلوچستان کے لوگ انتقام کا فیصلہ کر لیں تو یہ کس سے انتقام لیں گے اور اگر کشمیر میں شہید ہونے والے بچوں کے لواحقین خون بہا کا مطالبہ کریں اور اگر کشمیری اپنی پچیس تیس سال کی قربانیوں کا تاوان وصول کرنا چاہیں تو وہ کس کا گریبان پکڑیں گے؟" وہ رکا اور مسکرا کر بولا" تم خود سوچو ہم نے دو بڑی سیاسی جماعتوں کی قیادت کو جلاوطن کر رکھا ہے' ہم افغانستان کی سرحد کو غیر محفوظ بنا چکے ہیں' ہم ایران کے دشمنوں کی صف میں شامل ہو کر ایرانیوں کا دل توڑ چکے ہیں' ہم روز مذہبی طبقے کا دل دکھاتے ہیں اور ہم نے یہ ملک ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا ہے جو کبھی قرآن مجید کے چالیس سیپارے بنا دیتے ہیں اور کبھی سال میں دو دو حجوں کا انکشاف فرما دیتے ہیں لہٰذا میرا خیال ہے اب اس ملک کو نقصان پہنچانے کیلئے کسی بیرونی طاقت کی ضرورت نہیں' ہم سب ایک دوسرے سے لڑ لڑ کر ختم ہو جائیں گے' بلوچ پنجابیوں کا گلہ پکڑ لیں گے اور سندھی اور پشتون ایک دوسرے کا گریبان پھاڑ دیں گے' ہم ان سے فارغ ہوں گے تو کشمیری ہماری ٹانگ توڑ دیں گے' مولوی کلین شیو کو مارے گا اور کلین شیو مولوی پر حملہ کر دے گا' تم یقین کرو ہمارے درمیان نفرتوں کے بیج بو دیئے گئے ہیں اور اب ان بیجوں کو قد آور درخت بنتے زیادہ دیر نہیں لگے گی"

میرا دوست خاموش ہو گیا' میں نے ایک لمبا سانس لیا اور سر پشت کے ساتھ ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں' میں نے سوچا ان حالات میں کبوتر پالیسی سب سے اچھی حکمت عملی ہے' بس آنکھیں بند کریں اور بلی کا انتظار کریں۔

بلوچوں کے ساتھ زیادتی ہوتی رہی

بس تھوڑی سی عقل مندی اور دور اندیشی کی ضرورت تھی اگر ہم پچاس یا ساٹھ کی دہائی میں یہ فیصلے کر لیتے تو آج بلوچستان میں پنجابیوں کے گھر جلتے ' علیحدگی کے نعرے لگتے اور نہ آج وہاں وفاق مخالف عناصر پیدا ہوتے۔

بلوچستان میں 1952ء میں قدرتی گیس نکلی تھی ' اگر حکومت اس وقت گیس کی ڈسٹری بیوشن بلوچوں کو دے دیتی تو آج صورتحال مختلف ہوتی ' حکومت بلوچستان کے بارہ بڑے قبائل لیتی ' ان بارہ قبائل کی بارہ کمپنیاں بناتی اور ہر کمپنی کو گیس کی ترسیل اور فروخت کے حقوق دے دیتی ' یہ کمپنیاں پاکستان کے مختلف علاقوں کو گیس فروخت کرتیں ' گیس کی اس ڈسٹری بیوشن سے بلوچ قبائل خوشحال ہو جاتے جس سے انہیں گیس اور گیس سپلائی کی افادیت کا اندازہ ہوتا ' انہیں معلوم ہوتا اگر گیس کی سپلائی اور فروخت بند ہو گئی تو ان کی آمدنی بند ہو جائے گی لیکن ہم نے ایسا نہ کیا ' ہم نے گیس کی ترسیل اور ڈسٹری بیوشن وفاقی حکومت کے حوالے کر دی ' اس دوران مائع گیس کی 30 سے 40 کمپنیاں بنیں ' یہ کمپنیاں بھی پنجابی اور سندھی بزنس مینوں کی ملکیت تھیں ' یہ کمپنیاں سوئی گیس سے مائع گیس لیتیں اور اسے سلنڈروں میں بھر کر ملک میں فروخت کر دیتیں جس سے بلوچوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ' ان کی گیس سندھی اور پنجابی لے جاتے ہیں اور بلوچوں کے حصے صرف پائپ لائن آتی ہے ' ہماری اس پالیسی کے باعث بلوچوں کی اس گیس کے ساتھ کوئی وابستگی پیدا نہیں ہو سکی لہٰذا وہ پچھلے چالیس برس سے اس پائپ لائن کو بموں سے اڑاتے چلے آ رہے ہیں ' گیس کی اس نفرت سے بھی بلوچ سرداروں اور اینٹی پاکستان اسٹیبلشمنٹ نے خوب فائدہ اٹھایا ' انہوں نے لوگوں کو پنجاب کے خلاف بھڑکایا ' اس پروپیگنڈے کی وجہ سے بلوچ پنجاب سے مزید دور ہوتے چلے گئے گو اس میں پنجاب اور پنجابیوں کا براہ راست کوئی قصور نہیں تھا اور یہ سب کچھ دارالحکومت میں بیٹھی ہوئی سول اور ملٹری بیوروکریسی کر رہی تھی لیکن اس کا نقصان پنجاب اور پنجابیوں کو پہنچا۔

بلوچستان انڈسٹری کے حوالے سے بھی محروم ہے۔ بلوچستان کی گیس سے پنجاب ' سندھ اور سرحد میں ایک لاکھ اٹھارہ ہزار چھوٹے بڑے صنعتی یونٹ چلتے تھے ' کھاد اور سیمنٹ بنانے والی تمام فیکٹریاں گیس سے چلتی تھیں لیکن بلوچستان میں کوئی فیکٹری ' کوئی مل اور کوئی صنعت نہیں تھی ' حکومت بھی جب کوئی سرکاری صنعتی یونٹ

لگائی تھی تو وہ بلوچستان سے گیس لیتی تھی اور یونٹ پنجاب یا سندھ میں لگائی تھی' اگر حکومت اس معاملے میں تھوڑی سی وسعت قلبی کا مظاہرہ کرتی اور وہ بلوچوں کے ساتھ پارٹنرشپ کی بنیاد پر بلوچستان میں فیکٹریاں لگاتی تو آج وہاں کی صورتحال یکسر مختلف ہوتی' اگر ہم بلوچستان میں صرف کھاد کے چھ کارخانے لگا دیتے تو بلوچوں کے حالات بدل جاتے لیکن ہم نے ہر دور میں بلوچوں سے فاصلہ رکھا' ہم نے ان کے وسائل تو استعمال کئے لیکن ان وسائل کے بدلے میں انہیں دیا کچھ نہیں' ہم نے بلوچوں کو ہمیشہ برطانوی حکمرانوں کی طرح ڈیل کیا' قیام پاکستان سے پہلے وائسرائے دہلی میں بیٹھ کر بلوچوں پر حکومت کرتا تھا اور کوئٹہ' جیکب آباد اور فورٹ سنڈیمن (ژوب) میں اس کے کارندے ہوتے تھے جو ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے سرکاری احکامات پر عملدرآمد کراتے تھے لیکن پاکستان بنا تو پاکستان بننے کے بعد بلوچستان پر فوج' پنجابی اور سندھی حکومت کرنے لگے' انہوں نے پنجابی اسسٹنٹ کمشنروں' ڈپٹی کمشنروں اور پولیس افسروں کی مدد سے بلوچوں کو دبانا شروع کر دیا' اگر ہم بلوچوں کو بلوچ افسر دے دیتے تو شاید ان کے دل میں ہمارے لئے اتنی نفرت پیدا نہ ہوتی۔

صوبائی خودمختاری چھوٹے صوبوں کا ازلی مطالبہ ہے' چھوٹے صوبے یہ کہتے ہیں وفاق دفاع اور امور خارجہ اپنے پاس رکھے اور باقی سارے اختیارات ہمارے حوالے کر دے' شیخ مجیب الرحمان بھی وفاقی حکومت سے یہی مطالبہ کرتا تھا' میں جب بھی اس مطالبے پر غور کرتا ہوں تو مجھے اس میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا' میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا ہم لوگ صوبوں کو وفاق کی زنجیر میں کیوں جکڑ کر رکھنا چاہتے ہیں' اگر ہم ایک خوبصورت سی فیڈریشن بنائیں اور صوبوں کو داخلی خودمختاری دے دیں' صوبے اپنے حالات' کلچر اور آبادی کے مطابق پالیسیاں بنالیں' وہ خود فیصلہ کریں انہوں نے کس طرح تجارت کرنی ہے' انہوں نے کس طرح ٹیکس جمع کرنا ہے' انہیں کون سا نظام تعلیم چاہئے اور وہ اپنے معاشرے میں کس طرح انصاف قائم کر سکتے ہیں' ہم یہ سب ان پر چھوڑ دیں اور انہیں اپنے ٹیکس خود لگانے اور خود وصول کرنے کی اجازت دے دیں' انہیں دوسرے ممالک کے ساتھ تجارت کرنے کی آزادی بھی دے دیں تو میرا خیال ہے اس سے ملک میں مثبت تبدیلیاں آئیں گی' اس سے صوبوں کی معاشی اور اقتصادی حالت بھی بدل جائے گی۔ لوگوں میں اعتماد بھی پیدا ہو گا اور ان کے تمام گلے شکوے بھی اپنی مقامی قیادت کی طرف منتقل ہو جائیں گے' اس قسم کی داخلی خودمختاری امریکہ تک میں موجود ہے' امریکہ کی 50 ریاستوں کا قانون تک ایک دوسرے سے مختلف ہے' وہاں صنعت کار فیکٹریاں لگانے کیلئے ریاستوں سے سہولتوں کے ٹینڈر مانگتے ہیں اور ریاستیں بزنس مینوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے ان کے ساتھ باقاعدہ ڈائیلاگ کرتی ہیں' اگر ہم بھی ایسا کر لیں تو سرحد' بلوچستان' سندھ اور پنجاب میں ایک صحت مندانہ ترقیاتی مقابلہ شروع ہو سکتا ہے جس کے بعد پنجاب بھارتی پنجاب سے فائدہ اٹھا سکتا ہے' بلوچستان ایران کے بلوچ علاقوں کے وسائل اور صوبہ سرحد کے عوام افغانستان کے پشتون علاقوں کے قدرتی ذرائع سے استفادہ کر سکتے ہیں' اسی طرح سندھ عرب کی ریاستوں کے ساتھ کاروبار کر سکتا ہے لیکن شاید یہ انتظام ہمارے حکمرانوں کو "سوٹ" نہیں کرتا کیونکہ صوبائی خودمختاری کے بعد

ملک پر مارشل لاء لگانا مشکل ہو جائے گا' الیکشنوں میں دھاندلی اور لوٹا کریسی کا سلسلہ بند ہو جائے گا اور وفاقی حکومت کے لئے اپنے شاہی اخراجات پورے کرنا مشکل ہو جائے گا اور شاید اس سے فوجی بجٹ میں بھی کمی لانا پڑے جو سردست ممکن نہیں۔ مشرقی پاکستان میں بھی یہی ہوا تھا اگر ہم مشرقی پاکستان کو داخلی خودمختاری دے دیتے تو سارے تنازعے ختم ہو جاتے لیکن اس وقت سوال پیدا ہوا تھا اگر داخلی خودمختاری دے دی گئی تو جنرل یحییٰ خان کا کیا بنے گا؟ نئے نظام میں باوردی صدر کی گنجائش مشکل تھی چنانچہ ہماری وفاقی قوتوں نے جنرل یحییٰ خان کی گنجائش نکالتے نکالتے پورا پاکستان خارج کر دیا' ہم آج بھی یہی کر رہے ہیں ہم کچھ لوگوں کی گنجائش پیدا کرنے کے لئے چھوٹے صوبوں کے احساس محرومی کو آگ لگا رہے ہیں' ہم انہیں 1971ء کی طرح سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں۔

بلوچستان اور بلوچوں کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے' یہ ایک سلگتی ہوئی حقیقت ہے' ہمیں نہ صرف اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے بلکہ بلوچوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا ازالہ بھی کرنا چاہیے' ہم ساٹھ برس لیٹ ہیں اگر ہم نے مزید 60 مہینوں کی تاخیر کر دی تو مجھے خدشہ ہے ہم وہاں پہنچ جائیں گے جہاں واپسی کے سارے راستے بند ہو جاتے ہیں اور جہاں پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

❂.....❂.....❂

پنجابی قصوروار ہیں

مہاتیر محمد نے 16 جولائی 1981ء میں ملائشیا کے وزیراعظم کا حلف اٹھایا' اس وقت ملائشیا دو بڑے نسلی گروہوں میں تقسیم تھا' ملائشیا میں 60 فیصد ملائی مسلمان تھے اور 32 فیصد چینی' ان دونوں گروہوں میں صدیوں سے آویزش چلی آ رہی تھی' چینی باشندے فطرتاً سرمایہ کار اور بزنس مین تھے لہٰذا وہ ملائشیا کی 70 فیصد فیکٹریوں' فرموں' کمپنیوں' منڈیوں' بازاروں اور کاروبار پر قابض تھے جبکہ ان کے مقابلے میں ملائی باشندے انتہائی ناگفتہ بہ حالت کا شکار تھے' ان کے پاس تعلیم تھی' روزگار تھا اور نہ ہی اچھی اور خوبصورت زندگی لہٰذا ملائی مسلمان چینیوں سے شدید نفرت کرتے تھے' وہ ان کی املاک پر حملے بھی کرتے رہتے تھے اس کے ردعمل میں چینی ملائی مسلمانوں کو اپنی فیکٹریوں اور کمپنیوں میں نوکری نہیں دیتے تھے' مہاتیر محمد آیا تو اس نے ایک عجیب قانون بنایا' اس نے قانون بنایا جس چینی بزنس مین کا کاروبار 5 ملین رنگٹ تک پہنچ جائے گا وہ کسی ملائی مسلمان کو اپنے کاروبار میں 30 فیصد کا حصہ دار بنائے گا' چینیوں نے شروع شروع میں اس قانون کی بھرپور مخالفت کی' انہوں نے اسے ظلم' زیادتی اور سرمایہ کاری کی توہین بھی قرار دیا لیکن بہت جلد وہ مہاتیر محمد کے وژن کے قائل ہو گئے' مہاتیر محمد کا خیال تھا ملائی مسلمان بے روزگار' غریب' ناآسودہ اور ان پڑھ ہیں لہٰذا ملائشیا میں ان کے "دستیکس" نہیں ہیں اور یہ اسے اپنا ملک نہیں سمجھ رہے' یہ لوگ جب کاروبار میں شریک ہوں گے اور جب ملائی اور چینی ایک ساتھ بیٹھیں گے تو دونوں کی دوری ختم ہو جائے گی اور ملائی مسلمانوں کی ملائشیا کے ساتھ دلچسپی اور محبت پیدا ہو جائے گی' مہاتیر محمد کا خیال درست نکلا' آج آپ ملائشیا جائیں تو آپ کو وہاں کے چینی خود کو چینی اور ملائی خود کو ملائی کہتے نہیں ملیں گے' یہ سب لوگ خود کو ملائشین شہری کہیں گے۔

اگر ہم ملائشیا کی صورتحال کو سامنے رکھ کر پاکستان کا جائزہ لیں تو ہمیں دونوں میں بڑی مماثلت دکھائی دیتی ہے' 1971 تک پاکستان پانچ قومیتوں کا ملک تھا' اس میں بنگالی' پشتون' بلوچ' سندھی اور پنجابی تھے' ان پانچوں میں پنجابی زیادہ خوشحال تھے' اس خوشحالی کی چار بڑی وجوہات تھیں' ایک' پنجاب دوسرے صوبوں کی نسبت ایک ہموار اور زرخیز صوبہ تھا' اس کے پاس زمین' پانی اور دوسرے قدرتی وسائل تھے' دوسرا یہ صوبہ ہزاروں سال برصغیر کا دروازہ رہا تھا' دنیا بھر کی اقوام پنجاب میں آئیں اور اس میں رچ بس گئیں' قوموں کے اس "انٹرایکشن"

کے نتیجے میں اس خطے کی ذہانت میں اضافہ ہوا اور پنجابی دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ ذہین اور معاملہ فہم ہو گئے' تیسرا پنجاب انگریزوں کا ''مین فوکس'' تھا انگریز نے یہاں تعلیمی ادارے بنائے جن کی وجہ سے پنجاب کی شرح خواندگی زیادہ ہو گئی اور بیورو کریسی میں پنجاب کے لوگوں کی تعداد بڑھ گئی اور چار پنجاب فوجی بھرتی کیلئے بڑا آئیڈیل صوبہ تھا' یہاں کے لوگ قد کاٹھ' اور ڈسپلن میں دوسرے صوبوں سے بہتر تھے چنانچہ انگریزی فوج میں ان کی تعداد زیادہ تھی' پاکستان کے قیام کے بعد جب بھارت اور پاکستان کی فوج الگ الگ ہوئی تو پاکستانی فوج میں پنجابی جوانوں کی تعداد 72 فیصد تھی' ان چار وجوہات کے باعث قیام پاکستان کے بعد سول اور ملٹری بیورو کریسی پر پنجاب کا قبضہ ہو گیا' یہ لوگ اچھے کاروباری بھی تھے' یہ لوگ 50 اور 60 کی دہائی میں پنجاب سے نکلے اور انہوں نے بلوچستان' سندھ' سرحد اور بنگال کی منڈیوں پر قبضہ کر لیا' آپ اس معاملے میں مشرقی پاکستان کی مثال لیجئے' 1971ء تک بنگلہ دیش کی 80 فیصد فیکٹریاں پنجاب کی چنیوٹی اور منوں فیملی کے پاس تھیں' پٹ سن بنگالی پیدا کرتے تھے لیکن اس کا منافع پنجابی بزنس مین کی جیب میں جاتا تھا' مچھلی بنگالی پکڑتا تھا لیکن اسے مارکیٹ میں پنجابی بیچتے تھے' بیورو کریسی میں بھی یہی صورتحال تھی' بنگلہ دیش کے 90 فیصد افسروں کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا' اس دور میں بلوچستان' سندھ اور سرحد کا بھی یہی حال تھا' ایوب خان کے عہد میں پنجابی کاشتکار پنجاب سے نکلا' حکومت نے اس کی سرپرستی کی اور اس کاشتکار نے سندھ اور بلوچستان میں کوڑیوں کے مول زمین خرید لی' اسے زمین کاشت کرنا آتی تھی لہٰذا وہ چند برسوں میں کاشتکار سے زمیندار اور زمیندار سے جاگیردار بن گیا جبکہ اس کے مقابلے میں مقامی لوگ غریب سے غریب تر اور بے بس سے بے بس تر ہوتے چلے گئے' جس کے نتیجے میں مقامی لوگوں نے پنجابیوں کو غاصب اور لٹیرے سمجھنا شروع کر دیا' موقع پرست لیڈروں اور بیرونی طاقتوں نے اس نفرت کا فائدہ اٹھایا' پنجاب سے یہ نفرت 60ء کی دہائی کے آخر تک مشرقی پاکستان میں بنگلہ دیش' سرحد میں پشتونستان' بلوچستان میں گریٹر بلوچستان اور سندھ میں سندھو دیش کی تحریک بن گئی' اس وقت سول اور ملٹری بیورو کریسی پر پنجابیوں کا اثر و رسوخ تھا' اسٹیبلشمنٹ نے ان تحریکوں کو طاقت سے دبانے کی کوشش کی' یوں یہ تحریکیں جنگ کی شکل اختیار کر گئیں' اس جنگ کے نتیجے میں 1971ء میں ہمارا اکثریتی صوبہ ہم سے الگ ہو گیا اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ میرا دعویٰ ہے اگر 1979ء میں افغانستان میں امریکی جہاد اور ایران میں انقلاب نہ آتا تو ہمیں شاید صوبہ سرحد اور بلوچستان میں بھی مشرقی پاکستان جیسی صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا۔

1971ء تک جب بنگالی عوام صوبائی خود مختاری اور پنجاب کی افسر شاہی سے چھٹکارے کے مطالبے کرتے تھے تو ہم ''ساڑھے چار فٹ کے کالے بنگالی'' کہہ کر ان کا مذاق اڑاتے تھے' ہم نے بنگالیوں کی فوج میں بھرتی پر بھی پابندی لگا رکھی تھی' ہم کہتے تھے ان کی چھاتی کا سائز ٹھیک نہیں' ان کے قد چھوٹے ہیں لیکن جب یہ لوگ ہم سے آزاد ہوئے اور انہیں اپنا ملک خود چلانے کا موقع ملا تو انہوں نے ہم سے کہیں بہتر طریقے سے ملک چلا کر دکھایا' آج آپ ان کی کرنسی دیکھئے' ان کی کرنسی ہم سے زیادہ مضبوط ہے' آپ ان کی ایکسپورٹ' ان کی صنعت' ان کی تجارت دیکھئے وہ ہم سے دو تین گنا ہے اور آپ ان کا نظام دیکھئے' ان کی جمہوریت دیکھئے اور ان کے ملک میں

لاء اینڈ آرڈر کی صورتحال دیکھیے وہ "ساڑھے چار فٹ کے کالے بنگالی" ہم سے ہر لحاظ سے بہتر ہیں' بنگلہ دیش کے بعد ہمیں سنبھل جانا چاہیے تھا لیکن ہم نے بلوچستان' سندھ اور سرحد میں اپنی زیادتیوں کا سلسلہ جاری رکھا' آپ آج تینوں چھوٹے صوبوں کے کاروبار دیکھ لیجئے' زراعت اور باغبانی دیکھ لیجئے اور آپ ان صوبوں کی بیوروکریسی دیکھ لیجئے' آپ کو ان میں پنجاب نظر آئے گا لہٰذا آج یہ اس اثر ورسوخ کا نتیجہ ہے ہمارے چھوٹے صوبے شدید احساس محرومی کا شکار ہیں' آج جب بلوچی یہ دیکھتا ہے' تیل' گیس اور کوئلہ بلوچستان سے نکلتا ہے لیکن یہ استعمال پنجاب میں ہوتا ہے' جب سندھی یہ دیکھتا ہے زمینیں ہماری ہیں لیکن ان پر فصلیں پنجابی کاشت کرتا ہے' سمندر ہمارا ہے لیکن اس سے ڈالر پنجابی کماتا ہے' جب پشتون دیکھتا ہے سیکرٹریٹ ہمارا ہے لیکن سیکرٹری پنجابی ہے' پولیس ہماری ہے لیکن ایس ایس پی سے آئی جی تک پنجابی ہیں تو اس کے دل میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ان پنجابی افسروں کو اپنی محرومی کا ذمہ دار قرار دینے لگتا ہے' ہمارے علاقائی لیڈر اور بیرونی طاقتیں اس صورتحال کا فائدہ اٹھاتی ہیں چنانچہ یہ معمولی سی معاشی کشمکش علیحدگی تک جا پہنچتی ہے' ہم اگر غور کریں تو چھوٹے صوبوں کے شکوے سو فیصد درست نہیں ہیں تو یہ سو فیصد غلط بھی نہیں ہیں' ان میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے' اگر میں اقلیت میں ہوتا اور میرے ساتھ ایسا برتاؤ ہوتا تو یقیناً میرا ردعمل بھی یہی ہوتا' آپ گوادر کو دیکھ لیجئے' گوادر بلوچوں کی ملکیت تھا' پنجاب کے سرمایہ کاروں نے وہاں جا کر ہزاروں روپے میں زمین خریدی' کروڑوں میں بیچی اور ارب پتی ہو کر واپس آ گئے لیکن اس کے باوجود آپ کہتے ہیں بلوچی آپ سے بلاوجہ نفرت کرتے ہیں' ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیے کیا اس ظلم کے بعد بھی بلوچ آپ سے نفرت نہ کریں۔

اگر ماضی کی حکومتیں تھوڑی سی عقل مندی کا مظاہرہ کرتیں' اگر وہ مہاتیر محمد کی طرح محروم علاقوں اور ان علاقوں کے وسائل کا تخمینہ لگاتیں اور مقامی آبادی کو کاروبار میں حصہ دے دیتیں تو آج یہ صورتحال نہ ہوتی' اگر حکومت 50یا60 کی دہائی میں یہ قانون بنا دیتی جو کمپنی جس علاقے میں کاروبار کرے گی وہ مقامی بلوچوں' سندھیوں اور پشتونوں کو کاروبار میں بیس یا چالیس فیصد شیئر دے گی تو آج یہ حالت نہ ہوتی' ہمارے سامنے عربوں کا ماڈل ہے' عربوں نے پچاس برس پہلے قانون بنایا تھا بیرون ملک سے آنے والا ہر کاروباری مقامی بدو سے مل کر بزنس کرے گا' اس قانون کا یہ نتیجہ نکلا آج اونٹ چرانے والے بدو بزنس مین بن چکے ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں ہمارے مینگل' مری اور بگٹی گیس نکلنے سے پہلے بھی ان پڑھ اور بے روزگار قبائلی تھے اور آج جب ان کی زمین سے کھربوں روپے کی گیس نکل رہی ہے تو وہ آج بھی بے روزگار اور ان پڑھ قبائلی ہیں' اس صورتحال میں اگر ہم پنجابی یہ دعویٰ کریں ہم پنجابیوں کا کوئی قصور نہیں تو یہ غلط ہوگا' ہم مانیں یا نہ مانیں لیکن یہ حقیقت ہے پنجابی اس میں قصوروار ہیں۔

کام چور

میرے دوست کی ناک سے خون نکل رہا تھا' میں نے اس کے ہاتھ میں تولیہ دیا' اس نے تولئے سے اپنی ناک دبائی' ہم لوگ تیزی سے ہسپتال کی طرف دوڑے' ہسپتال قریب ہی تھا' میں نے گاڑی پارک کی اور اسے لے کر اندر داخل ہو گیا' سامنے ایمر جنسی میں کوئی شخص نہیں تھا' بیڈ خالی پڑے تھے' کاؤنٹر پر کرسیاں اور میز اوندھی پڑی تھی اور ڈاکٹر کے آفس پر تالا لگا تھا' ہم دونوں حیران رہ گئے' میرے دوست کی نکسیر بند نہیں ہو رہی تھی' میں نے اسے کرسی پر بٹھایا اور کسی وارڈ بوائے' نرس یا ڈاکٹر کی تلاش میں نکل گیا' مجھے باہر کوریڈور میں ایک سویپر ملا' میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور اس سے پوچھا "ایمر جنسی میں کس کی ڈیوٹی ہے" اس نے سر اٹھا کر ایمر جنسی کی طرف دکھا اور ہنس کر بولا "آج چھٹی ہے" میں نے پوچھا "لیکن کس چیز کی" اس نے قہقہہ لگایا "آج چودہ اگست ہے سب لوگ گھروں میں آزادی کا جشن منا رہے ہیں" مجھے یہ چھٹی عجیب لگی' میں نے اپنے دوست کو اٹھایا اور پرائیویٹ کلینک کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

میں نے راستے میں سوچا ہسپتال ہو یا پرائمری سکول یا سٹاک ایکسچینج ہم مجموعی طور پر ایک چھٹی پسند قوم ہیں۔ پاکستان میں بارش ہو جائے تو ہم بارش کو بہانہ بنا کر چھٹی کر لیتے ہیں' بارش نہ ہو تو ہم خشک سالی کو عذر بنا کر گھر بیٹھ جاتے ہیں۔ سردی ہو جائے تو ہم درخواست لکھ بھیجتے ہیں۔ گرمی ہو جائے تو عرضی آ جاتی ہے۔ بسنت آ جائے تو دفتر کے دفتر ویران ہو جاتے ہیں۔ عید آ جائے تو خوشی میں چھٹی کر لیتے ہیں۔ محرم ہو تو سوگ میں گھر جا بیٹھتے ہیں اور پاکستان میچ جیت جائے تو چھٹی ہو جاتی ہے' ہار جائے تو تعطیل عام سی محسوس ہوتی ہے۔ آپ عید سے ایک ہفتہ پہلے کسی دفتر چلے جائیں آپ کو جواب ملے گا عید کے بعد آیئے گا۔ ذرا عید کا رش نکال لیں۔ بس جی عید کی وجہ سے کام رکے ہوتے ہیں ان شاء اللہ عید کے بعد کام ہو جائے گا وغیرہ۔ آپ عید کے بعد چلے جائیں وہی صاحب کہیں گے عید کی وجہ سے سارے کام رکے ہوئے تھے' اب ان شاء اللہ ہفتے دس دن میں آپ کا کام ہو جائے گا۔ یہ تو ہیں روٹین کے کام! اگر خدانخواستہ آپ نے کسی سے رقم لینی ہو یا آپ کا کوئی بل کسی دفتر میں پھنسا ہوا ہے تو بس پھر آپ ناک سے لکیریں نکال کر ہی رقم وصول کریں گے۔ کبھی بارشوں کی وجہ سے آپ کا بل پاس نہیں

ہوگا' کبھی میئر اس بل کے سامنے کھڑا ہو جائے گا' کبھی بینکوں کی کلوزنگ اسے روک کر کھڑی ہو جائے گی اور کبھی دھوپ' سردی' خزاں اور بہار اس کا راستہ روک لے گی' آپ ہفتوں بلکہ مہینوں ایک دفتر سے دوسرے اور ایک صاحب کے دربار سے دوسرے صاحب کے دربار میں دھکے کھاتے رہیں گے لیکن آپ کو رقم نہیں ملے گی۔

اس وقت شاید ہم دنیا میں سب سے زیادہ چھٹیاں کرنے اور کام چوری کے سب سے زیادہ عذر تلاش کرنے والی قوم ہیں۔ ہنگامی چھٹیاں' میڈیکل لیوز' ارن لیوز اور ڈیپارٹمنٹل لیوز تو رہیں ایک طرف ہماری قومی چھٹیوں کی تعداد بھی ہوش ربا حد تک زیادہ ہے۔ اس وقت بھارت میں سالانہ چھ قومی تعطیلات ہوتی ہیں۔ چین 10' روس 8' سنگاپور 6' نیوزی لینڈ 7' امریکہ 12' برطانیہ 8 اور ہانگ کانگ میں قومی سطح پر 12 چھٹیاں منائی جاتی ہے۔ اسلامی ممالک کی صورتحال بھی کچھ ایسی ہی ہے' بحرین میں یکم جنوری اور 16 دسمبر' کویت یکم جنوری' 25 فروری اور یکم ستمبر' عمان یکم جنوری' 16 دسمبر' 18 اور 19 نومبر' الجزائر یکم جنوری' یکم مئی' 5 جولائی اور یکم نومبر' عراق یکم اور چھ جنوری' 8 فروری' 21 مارچ' یکم مئی' 14 اور 17 جولائی' قطر یکم جنوری' 22 فروری' 3 ستمبر اور 25 دسمبر' سعودی عرب 30 مئی' 4 جون' عید الفطر اور عید الاضحیٰ' متحدہ امارات یکم جنوری' یکم مئی' 7 اگست' 14 اکتوبر اور 2 دسمبر' شام یکم جنوری' 8 مارچ' 17 اپریل' یکم مئی اور 25 دسمبر' یمن یکم جنوری' یکم مئی' 13 جون' 22 جون' 24 ستمبر' 14 اکتوبر' 30 نومبر اور 31 دسمبر' سوڈان یکم جنوری' 3 مارچ' 18 اپریل' 25 مئی' 13 اکتوبر اور 25 دسمبر اور اردن میں یکم اور 15 جنوری' 22 مارچ' یکم مئی' 25 مئی' 13 اکتوبر اور 25 دسمبر کو قومی سطح پر چھٹی ہوتی ہے جبکہ پاکستان میں ہر سال 17 سے 23 قومی تعطیلات منائی جاتی ہیں جبکہ ہم جو چھٹیاں ان چھٹیوں کے ساتھ ملا کر کرتے ہیں ان کی تعداد ان سے دوگنی بلکہ تگنی ہے۔ جب بھی کوئی قومی تعطیل ہوتی ہے تو ہمارے سرکاری اور نیم سرکاری ملازم اس کے ساتھ ایک آدھ چھٹی لے کر اس چھٹی کو تین چار دن میں بدل لیتے ہیں اور اس ''سازش'' کی مہربانی سے اس سرکاری ملازم کا کام دو تین ہفتے پیچھے چلا جاتا ہے۔

ہماری چھٹیوں کی روایات بھی بہت دلچسپ ہیں مثلاً ایک بار میں ایک سرکاری دفتر گیا تو میں نے دیکھا دن کے گیارہ بجے سارا عملہ دفتر سے نکل کر بسوں میں سوار ہو رہا تھا۔ میں نے وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا محکمے کے چیف کو اللہ تعالیٰ نے تیس سال کی ازدواجی دوڑ دھوپ کے بعد چاند سا بیٹا دیا ہے اور اب سارا عملہ مبارک باد دینے ان کے گھر جا رہا ہے۔ ہمارے گاؤں میں ایک بار ماسٹر صاحب کی بھینس ''انتقال'' کر گئی۔ یقین کیجئے مرحومہ کے سوگ میں سکول میں تین دن چھٹی رہی۔ سوگ کے دن پورے ہونے کے بعد بھی سال چھ مہینے تک ماسٹر صاحب ریاضی کے مسائل سمجھانے کی بجائے مرحومہ کی باتیں سناتے رہے تھے۔ مرحومہ بھینس کو یاد کرتے ہوئے ماسٹر صاحب کی آنکھیں بھر آجاتی تھیں جس کے جواب میں احتیاطاً بچوں کی گھگھی بھی بندھ جاتی تھی۔ ہم میں سے جو زیادہ سیانے تھے وہ ماسٹر صاحب سے اظہار یکجہتی کیلئے ایک آدھ چیخ بھی جڑ دیتے تھے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک مرحومہ کی صاحبزادی ''کٹی'' نے بالغ ہو کر دودھ دینا شروع نہ کر دیا۔ میں اس واقعے کو اپنی زندگی کا

حیران کن واقعہ سمجھتا تھا لیکن جب جوان ہوا تو پتہ چلا ہمارے ملک میں صاحبوں کے کتے مرنے پر بھی دفتر بند ہو جاتے ہیں جبکہ بھینس اور گائے تو پھر بھی نجیب الطرفین جانور ہیں۔

میں نے یورپ بھی دیکھا ہے' وہاں آندھی ہو' طوفان ہو' صاحب کا کتا مرے یا والد محترم' قوم میچ جیت جائے یا برف پڑنے لگے' سورج سوا نیزے پر آ جائے یا دن بارہ بجے اندھیرا چھا جائے وہاں دفتر کھلے رہتے ہیں اور لوگ اپنی اپنی میزوں پر اپنا اپنا کام کر رہے ہوتے ہیں۔ وہاں چھٹی کرنے' آج کا کام کل پر چھوڑنے یا خارش کرنے' کان کھجانے یا سگریٹ پینے کا کوئی تصور نہیں۔ یہ ہوتے ہیں ملک' ایسے کرتی ہیں قومیں ترقی۔ مرحوم اختر حمید خان فرمایا کرتے تھے جب تک ملک سے چوروں اور کام چوروں کا خاتمہ نہیں ہوتا ملک ترقی نہیں کر سکتا لہٰذا ہمیں چوروں کے ساتھ ساتھ کام چوروں سے بھی نپٹنا ہوگا' ہمیں چھٹی مافیا سے بھی جان چھڑانا ہوگی۔

کرپٹ

ابراہام لنکن رات تین بجے سوتا تھا اور صبح چھ بجے جاگ جاتا تھا، وہ رات بارہ بجے کے قریب فائلیں پڑھنا شروع کرتا تھا اور دو بج کر 55 منٹ تک نوٹس لیتا رہتا تھا، سونے سے ایک منٹ پہلے تک اس کے ہاتھ میں قلم ہوتا تھا اور وہ کسی فائل کے کسی فقرے کے نیچے لکیر کھینچ رہا ہوتا تھا، وہ بتی بجھانے کے بعد اس فائل کو سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیتا تھا، صبح چھ بجے جونہی اس کی آنکھ کھلتی تھی اس کا ہاتھ بے اختیار سائیڈ ٹیبل کی طرف جاتا تھا اور وہ فائل اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیتا تھا، وہ امریکا کا پہلا اور شاید واحد صدر تھا جس نے اپنے وقت کا ایک ایک لمحہ کام میں صرف کیا، اس نے زندگی بھر تفریح نہیں کی لہٰذا اس نے ولیم شیکسپیر کے ڈراموں سے دس گنا زیادہ صفحے لکھے اور ہارورڈ یونیورسٹی کی ایک چوتھائی کتابوں جتنے صفحات پڑھے، اس نے زندگی بھر تین گھنٹوں سے زیادہ نیند نہیں لی، لنکن کو 15 اپریل 1865ء کو فرصت کے دو گھنٹے ملے اور اس نے یہ دو گھنٹے تھیٹر میں گزارنے کا فیصلہ کیا لیکن فرصت کے ان دو گھنٹوں کے دوران وہ قتل ہو گیا۔ اس کی موت کے بعد کسی امریکی مورخ نے لکھا تھا ”کام لنکن کی زندگی تھا وہ جونہی کام سے باہر نکلا اس کی زندگی ختم ہو گئی“، لنکن سے ایک بار کسی نے اس شب بیداری کے بارے میں پوچھا تو لنکن نے اسے جواب دیا تھا ”میرے لیے تین گھنٹے کی نیند کافی ہے لہٰذا میں سمجھتا ہوں میں اس کے علاوہ جو وقت پلنگ پر گزاروں گا وہ بددیانتی ہوگا، وہ کرپشن ہوگی“ ابراہام لنکن نے مزید کہا ”جو لوگ قدرت کی دی ہوئی صلاحیتوں سے پورا کام نہیں لیتے وہ کرپٹ ہوتے ہیں، وہ بھی قدرت کے سامنے جوابدہ ہیں“۔

مجھے نہیں معلوم ہمارے دانشور، علماء کرام اور ہمارے مسٹر کلین وزیراعظم جناب شوکت عزیز ابراہام لنکن کے اس فلسفے سے کہاں تک متفق ہیں لیکن مجھے لنکن کی بات میں بڑا وزن محسوس ہوتا ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کرپشن صرف رشوت، لوٹ کھسوٹ اور کالے دھن تک محدود نہیں، کرپشن کی تعریف میں مالی بددیانتی ایک انتہائی چھوٹا اور معمولی جرم ہے اصل جرم اس کے بعد شروع ہوتے ہیں اور بدقسمتی سے ہم نے آج تک ان جرائم پر غور کیا اور نہ ہی ہم نے کبھی ان کے تدارک کے لیے کوشش کی۔ اصل کرپشن نیت اور صلاحیتوں سے پورا کام نہ لینا ہوتی ہے مثلاً اگر طالب علم 45 منٹ کے پریڈ میں 30 منٹ تک دماغی طور پر غیر حاضر رہتا ہے تو یہ بھی کرپشن ہے، استاد تیاری

کے بغیر کلاس میں آ جاتا ہے تو یہ بھی کرپشن ہے، ایک ڈاکٹر کو اللہ تعالیٰ نے روزانہ تیس مریض دیکھنے کی ہمت اور صلاحیت دے رکھی ہے لیکن وہ پانچ دس مریضوں کے بعد کلینک سے اٹھ جاتا ہے تو یہ بھی کرپشن ہے، انجینئر سائیٹ کا دورہ نہیں کرتا، پٹواری کاغذ پر غلط لکیر کھینچ دیتا ہے، کانسٹیبل چوک میں کسی شریف شہری کی پگڑی اچھال دیتا ہے۔ ایس ایچ او کسی کو بلاوجہ پکڑ لیتا ہے، چپڑاسی ایک میز کی فائل دوسری میز پر چھوڑ آتا ہے، دودھ والا دودھ میں پانی ملا دیتا ہے، سائیس گھوڑے کو وقت پر پانی نہیں پلاتا، تندورچی تنور میں روٹیاں جلا دیتا ہے، باورچی سالن میں نمک نہیں ڈالتا، موذن وقت پر اذان نہیں دیتا، امام صاحب رکعت لمبی کر دیتے ہیں، گاڑی چلانے والا ٹریفک کے قوانین کی پابندی نہیں کرتا، کسان فصل کو پانی نہیں دیتا، ایم اے پاس نوجوان خود کو چپڑاسی اور کلرک کی نوکری تک محدود کر لیتا ہے، کمپنی کا مالک ملازمین کی تعداد میں اضافہ نہیں کرتا، بیمار بازار سے دوا نہیں خریدتا، پروفیسر کتابیں نہیں پڑھتا، سریلے گلے کا مالک گانا نہیں گاتا، کھلاڑی میدان میں نہیں اترتا، مسلمان نماز، روزے اور زکوۃ کی پابندی نہیں کرتا، مستری اینٹ نہیں لگاتا، مزدور مسالے میں پورا سیمنٹ نہیں ڈالتا، کیمسٹ دواؤں میں اجزاء کی ترتیب درست نہیں رکھتا' ایم این اے اسمبلی نہیں جاتا، وزیر وزارت کا کام نہیں کرتا اور وزیراعظم دفتر نہیں بیٹھتا تو یہ بھی کرپشن ہے۔ وزیراعظم صاحب اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن کیا پاکستان جیسے غریب ملک میں 70 وزراء کی کابینہ کرپشن نہیں؟ کیا وزیراعظم نامزد ہونے کے بعد الیکشن لڑنا کرپشن نہیں؟ کیا سال میں ستر ستر غیر ملکی دورے کرنا اور ہر دورے میں سو سو لوگوں کو ساتھ لے جانا کرپشن نہیں؟ کیا زلزلہ زدگان کے فنڈز سے دو ارب روپے نکال کر فوج کے حوالے کر دینا کرپشن نہیں؟ کیا 728 سول عہدوں پر ریٹائرڈ فوجی افسر تعینات کر دینا، کیا 78 سیکرٹریوں کو ڈیڑھ ارب روپے کے پلاٹ دے دینا اور کیا لینڈ مافیا کو نوازنے کے لیے پنڈی گھیب میں ایئرپورٹ کی اجازت دے دینا کرپشن نہیں، کیا باوردی جمہوریت اور نیب زدہ سیاستدانوں کو اقتدار سونپ دینا کرپشن نہیں، کیا رچرڈ آرمیٹیج کا حکم اور اس حکم پر سر تسلیم خم کر دینا کرپشن نہیں، کیا وزیراعظم ٹونی بلیئر کے اعزاز میں اذان رکوا دینا، کیا امریکہ کے حکم پر حدود آرڈیننس میں ترمیم کر دینا اور کیا نصاب سے آیتیں حذف کر دینا کرپشن نہیں اور کیا اسلامی ملک میں شراب اور بدکاری کی اجازت دے دینا کرپشن نہیں، وزیراعظم صاحب ایک لمحے کیلئے سوچیں اور جواب دیں۔

9 دسمبر کو پوری دنیا میں کرپشن کا عالمی دن تھا۔ اس دن ہمارے وزیراعظم صاحب نے فرمایا تھا "صدر پرویز مشرف اور میں مالی کرپشن سے پاک ہیں" وزیراعظم صاحب نے درست فرمایا ہوگا اس میں کوئی شک نہیں آج تک صدر پرویز مشرف اور وزیراعظم شوکت عزیز پر مالی کرپشن کا کوئی الزام نہیں لگا لیکن پچھلے دس برسوں سے جو کچھ ملک میں ہو رہا ہے ہم اسے کس خانے میں رکھیں گے! وزیراعظم کی توجہ کے لیے عرض ہے پاکستان میں آج تک جنرل ضیاء الحق سے بڑا کوئی مسٹر کلین نہیں گزرا تھا۔ انہوں نے پوری زندگی ایک پیسے کی ہیرا پھیری نہیں کی تھی لیکن اپنی تمام تر ایمانداری کے باوجود انہوں نے پاکستان میں تاریخ کی سب سے بڑی کرپٹ کلاس پیدا کی تھی، انہوں نے عمروں اور حج تک کو رشوت کی شکل دے دی تھی، وہ نظریہ ضرورت سے مغلوب ہو کر اپنے

مخالف سیاستدانوں کے منہ موتیوں سے بھر دیتے تھے۔ ان کے دور میں غیر مستحق لوگوں کو جتنے پلاٹ ملے اس کی تاریخ میں کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ جنرل ضیاء الحق پہلے حکمران تھے جن کے دور میں ہیروئن کے سمگلروں کی کلاس پیدا ہوئی جن کے دور میں سرکاری جہازوں میں ہیروئن سمگل ہوتی رہی اور ان کے پروردہ لوگ نعشوں کے پیٹوں اور حج کے احراموں میں ہیروئن رکھ کر سعودی عرب لے جاتے رہے۔ جناب وزیراعظم صاحب کی توجہ کے لیے عرض ہے سردار فاروق احمد لغاری ایک تہجد گزار صدر تھے، ان پر آج تک مالیاتی کرپشن کا کوئی الزام نہیں لگا لیکن انہوں نے اقتدار کے دوران کیا کیا؟ انہوں نے ذاتی عناد پر ایک منتخب حکومت کو گھر بھجوا دیا، کیا یہ کرپشن نہیں تھی؟ پاکستان کی بیوروکریسی کی تاریخ میں غلام اسحاق خان جیسا کوئی دوسرا ایماندار افسر نہیں گزرا لیکن انہوں نے کیا کیا انہوں نے اپنی انا کی تسکین کے لیے دو منتخب اسمبلیاں توڑ دیں' کیا یہ کرپشن نہیں؟ پیچھے رہ گئے ہمارے موجودہ صدر جنرل پرویز مشرف تو، ہمارے صدر معظم نے خود فرمایا تھا ''اگر نواز شریف مجھے نہ چھیڑتے تو وہ آج بھی وزیراعظم ہوتے'' ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دیجئے' کیا یہ کرپشن نہیں! یقین کیجئے صرف رشوت لینے والا شخص کرپٹ نہیں ہوتا بلکہ ہر وہ شخص جو اللہ کی دی ہوئی نعمت اور قابلیت سے پورا کام نہیں لیتا اور ہر وہ شخص جو اپنے اختیار کو دوسروں کی ناک تک وسیع کر دیتا ہے، جو اپنی ٹانگیں دوسرے کی چادر تک پھیلا دیتا ہے' جو شوربے والی پلیٹ میں بوٹیاں ڈال دیتا ہے اور ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی بینائی سے شیطان کی سوئی میں دھاگہ ڈالتا ہے وہ شخص بھی کرپٹ ہوتا ہے' وہ شخص بھی بے ایمان ہوتا ہے لیکن افسوس ہم نے کرپشن کو صرف مال' دولت اور زیب تک محدود کر دیا۔ افسوس ہماری نظر میں پیسے لے کر کام کرنے والا تو کرپٹ ہے لیکن وہ شخص جو دفتر آ کر کام نہیں کرتا اور جو دفتر کے اے سی اور ہیٹر میں بیٹھ کر سارا سارا دن مکھیاں مارتا ہے ہم اسے ایماندار سمجھتے ہیں' ہم اسے مواخذے اور احتساب سے مبرا سمجھتے ہیں' ہم کیسے لوگ ہیں۔

ایماندار

میں نے عرض کیا ''سر وہ بہت ایماندار افسر ہے'' وہ مسکرائے اور نرم آواز میں بولے ''کیا آپ پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں'' میں نے عرض کیا ''سر وہ ایک پیسے کا روادار نہیں، اس پر آج تک رشوت، لوٹ کھسوٹ، ہیرا پھیری اور خرد برد کا کوئی الزام نہیں لگا اور اس کے گھر میں صرف دو نوکر ہیں۔'' انہوں نے قہقہہ لگایا اور ہنستی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگے'' ایمانداری کے معاملے میں ہماری اپروچ قطعی غلط ہے، ہم صرف اس شخص کو ایماندار سمجھتے ہیں جو روپے پیسے میں خرد برد نہ کرے، جو رشوت نہ لے، جو سرکاری فنڈز میں ہیرا پھیری نہ کرے اور جو مال نہ بنائے جبکہ ایمانداری ایک وسیع تر اصطلاح ہے۔ مالیاتی گڑبڑ اس کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے ایمانداری اور بے ایمانی کے تعین سے پہلے ہمیں بے شمار دوسری چیزیں دیکھنا پڑتی ہیں''

میرے لئے یہ فلسفہ انوکھا تھا، میں نے ان سے عرض کیا ''جناب عالی ہم تو آج تک صرف اس شخص کو ایماندار سمجھتے آئے ہیں جو لین دین میں کھرا ہو، جو مالیاتی معاملات میں درست ہو لیکن آپ نے ہمارے اس تصور کی شکل ہی بدل دی'' وہ مسکرائے اور مسکرا کر بولے ''تم میرے چند سوالوں کا جواب دو'' میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ وہ بولے ''کیا وہ صاحب قانون بنا سکتے ہیں'' میں نے ہاں میں سر ہلا دیا، وہ بولے ''کیا وہ صاحب اس قانون پر عملدرآمد بھی کرا سکتے ہیں'' میں نے ہاں میں سر ہلا دیا، وہ بولے ''کیا وہ صاحب لوگوں کو انصاف دلا سکتے ہیں، لوگوں کی تعلیم کا بندوبست کر سکتے ہیں اور لوگوں کو دوا، پانی اور اچھا ماحول دے سکتے ہیں'' میں نے ہاں میں سر ہلا دیا، وہ بولے ''کیا وہ صاحب معاشرتی انصاف قائم کر سکتے ہیں، وہ لوگوں کیلئے جاب کا بندوبست کر سکتے ہیں، وہ ملک سے وی آئی پی کلچر ختم کر سکتے ہیں، وہ ملک میں قطار کا نظام نافذ کر سکتے ہیں، کیا وہ میرٹ کو قطعی بنا سکتے ہیں اور کیا وہ مہنگائی کنٹرول کر سکتے ہیں'' میں نے ہاں میں سر ہلا دیا، وہ بولے ''کیا وہ اس ملک کے صدر یا وزیراعظم ہیں'' میں نے نفی میں سر ہلا کر عرض کیا ''نہیں سر وہ صدر، وزیراعظم یا وزیراعلیٰ نہیں ہیں لیکن وہ اقتدار کے اس کوریڈور میں ضرور موجود ہیں جہاں لوگوں کے مقدر کا فیصلہ ہوتا ہے، جہاں قوم کی سمت طے ہوتی ہے'' انہوں نے قہقہہ لگایا اور اس قہقہے کے درمیان پوچھا ''کیا ان صاحب نے اقتدار کے کوریڈور میں رہ کر وہ تمام کام کر دیے جن کی اللہ تعالیٰ

نے انہیں صلاحیت بخشی تھی، کیا انہوں نے لوگوں کو انصاف دے دیا، میرٹ قائم کر دیا، مہنگائی کنٹرول کی، وی آئی پی کلچر ختم کر دیا، کیا انہوں نے مریضوں کو دوا، شہریوں کو پانی اور نئی نسل کو صاف ماحول دے دیا، کیا انہوں نے اچھے قوانین بنائے، کیا ان کے عہد میں لا اینڈ آرڈر کی صورتحال بہتر ہوئی، کیا ان کے دور میں قتل، ڈاکے، چوریاں، ہیرا پھیری، لوٹ کھسوٹ اور فراڈ بند ہو گئے، کیا ان کے دور میں پولیس اور شہری انتظامیہ ٹھیک ہو گئی، کیا ان کے دور میں سرخ فیتہ ٹوٹ گیا، کیا ان کے اقتدار میں سائل کی افسر تک رسائی آسان ہو گئی، کیا ان کے دور میں ملک سے بھکاری ختم ہو گئے اور کیا ان کی وجہ سے ملک میں امیر غریب کا فرق مٹ گیا" میں نے انکار میں سر ہلا دیا، وہ بولے" جب حالات جوں کے توں ہیں، جب دس سال پہلے اور آج کے پاکستان میں کوئی فرق نہیں، جب لوگ گارڈز کے بغیر گھروں سے نہیں نکلتے، جب اخبارات جرائم کی خبروں سے آلودہ ہیں اور جب عام شخص کیلئے اس ملک میں سانس لینا مشکل ہے تو پھر تم کس بنیاد پر انہیں ایماندار کہہ رہے ہو، میرے بچے ایمانداری کا تعلق صرف مال و دولت اور رشوت اور لوٹ کھسوٹ سے نہیں، اس کا تعلق صلاحیت اور اختیار کے استعمال سے ہوتا ہے، وہ حاکم جو ایک شلوار، ایک قمیض، ایک دری اور بیس بائی بارہ فٹ کے ایک کمرے میں پوری زندگی گزار دے لیکن اس کے اختیار، اس کے اقتدار سے کس شخص کو کوئی فائدہ نہ پہنچے، اس حاکم سے وہ چپڑاسی ہزار درجے بہتر اور ایماندار ہے جو صاحب کے کمرے سے نکل کر سائلوں کو خوش خبری سناتا ہے، جس کے وجود، جس کے اختیار سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے"

میں خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا، وہ بولے" اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا" اے نبیؐ یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں ہم اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں آپ ان سے فرما دیجئے جو ان کی ضرورت سے زائد ہو، اس آیت کا کیا مطلب ہے" وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگے، میں نے عرض کیا" یقیناً صدقہ اور خیرات" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور فرمانے لگے" لیکن صدقے اور خیرات کا تعلق صرف مال اور دولت سے نہیں، اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہر صلاحیت، ہر انعام، ہر خوبی، ہر اختیار، ہر عہدہ اور ہر قسم کا اقتدار بھی اس دائرے میں آتا ہے اور ان کے سلسلے میں بھی اللہ تعالیٰ کا یہی حکم ہے۔ اقتدار، اختیار، خوبی، انعام اور صلاحیت میں جو تمہاری ضرورت سے زائد ہو وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں تقسیم کر دو، یقین کرو حشر کے دن ایمانداری کا تعین اسی تقسیم کی بنیاد پر ہوگا" میں نے پوچھا" مثلاً" وہ بولے" مثلاً جس ڈاکٹر کو اللہ تعالیٰ نے علاج کی سکت بخشی ہے لیکن وہ مریضوں کا علاج نہیں کرتا وہ ڈاکٹر بے ایمان ہے، جس جج کو اللہ نے عدل کا اختیار دے رکھا ہے لیکن وہ لوگوں سے انصاف نہیں کرتا وہ جج بے ایمان ہے، جس پولیس افسر کو اللہ نے جرم اور بے گناہی کے فیصلے کی اتھارٹی دے رکھی ہے لیکن وہ یہ اختیار استعمال نہیں کرتا وہ پولیس افسر بے ایمان ہے اور جس ووٹر کو اللہ نے اچھے نمائندے منتخب کرنے کا اختیار دے رکھا ہے لیکن وہ جان بوجھ کر ایک بد کردار اور بے ایمان سیاستدان کو منتخب کرتا ہے وہ ووٹر بھی بے ایمان ہے، جو کار سوار سائیکلوں اور موٹر سائیکلوں کو راستہ نہیں دیتا، جو شخص اپنا گند بیچ سڑک پر پھینک جاتا ہے، جو استاد شاگردوں کو اپنا سارا علم ٹرانسفر نہیں کرتا، جو ممتحن غور سے پرچے نہیں پڑھتا اور جو لائین مین کھمبے پر پوری تار نہیں لگاتا وہ لائن مین، وہ ممتحن، وہ استاد اور وہ کار

سوار بھی بے ایمان ہے، میرے بچے اللہ نے ہمیں آنکھیں، ناک، کان، ہاتھ، پاؤں، دل، دماغ اور پھیپھڑے دے رکھے ہیں جو لوگ اپنے ان اعضاء سے پورا کام نہیں لیتے، جو ان اعضاء کو لوگوں کی بھلائی میں صرف نہیں کرتے، وہ لوگ بھی بے ایمان ہیں، وہ لوگ بھی غاصب ہیں"

وہ خاموش ہو گئے، میں نے عرض کیا" آپ کو اپنی زندگی میں کوئی ایماندار شخص ملا" انہوں نے مسکرا کر سر ہلا دیا" میں نے زندگی میں سندھ کے ایک ہندو کو جتنا دیانت دار پایا تھا مجھے آج تک اس جیسا کوئی دوسرا شخص نہیں ملا، بھٹو کے دور میں راشن ڈپو ہوتے تھے، لوگوں کو چینی اور آٹا ان ڈپوؤں سے ملتا تھا، اس ہندو کے پاس راشن ڈپو تھا، جب تک آٹے کی آخری مٹھی اور چینی کا آخری دانہ اس کے ڈپو میں رہتا تھا وہ اپنے ڈپو کا دروازہ بند نہیں کرتا تھا، اس کا کہنا تھا، یہ راشن لوگوں کی امانت ہے اور اگر وہ یہ امانت ادا کئے بغیر مر گیا تو وہ اپنے بھگوان کو کیا منہ دکھائے گا، میں نے پوری زندگی اس ہندو سے بڑا دیانت دار شخص نہیں دیکھا تم بتاؤ کیا تمہاری زندگی میں بھی کوئی ایسا شخص ہے"

میں نے ذرا سا سوچا اور پھر انکار میں سر ہلا دیا۔

شاید ہم کبھی

میں اور شاہ جی لندن میں چند دن اکٹھے رہے تھے' شاہ جی کا تعلق حکمران کلاس سے تھا' وہ تیسری نسل سے اس خطے کے بادشاہ چلے آ رہے ہیں' ان کے دادا برطانوی دور میں وزیر تھے' والد ایوب خان سے ذوالفقار علی بھٹو تک گورنر' وزیر اعلیٰ اور سینئر وزیر رہے جبکہ شاہ جی بے نظیر بھٹو سے میر ظفر اللہ جمالی کی حکومت تک مختلف حیثیتوں سے اقتدار کے ایوانوں میں آتے جاتے رہے' وہ اس وقت بھی جوڑ توڑ کے بادشاہ کہلاتے ہیں اور پنجاب کی دائیوں کی طرح سیاست کے پیٹ میں جھانکنے کا ملکہ رکھتے ہیں' میری ان کے ساتھ پرانی یاد اللہ ہے' آج سے تین سال پہلے ہم دونوں لندن گئے' اس سفر کا مقصد گپ شپ اور چند دن عافیت میں گزارنا تھا' ہم دونوں نے یہ دن سیر و تفریح اور لمبی لمبی بحثوں میں گزارے تھے' ایک دن شاہ جی اور میں آکسفورڈ سٹریٹ میں گھوم رہے تھے' شاہ جی اچانک میری طرف مڑے اور انہوں نے مجھ سے پوچھا ''یار کبھی ہم لوگ بھی گوروں کی طرح ترقی کر سکیں گے'' میں نے سٹریٹ میں گھومتے پھرتے ہجوم کی طرف دیکھا اور ذرا دیر رک کر جواب دیا ''شاہ جی شاید کبھی نہیں'' شاہ جی کا دوسرا سوال تھا ''کیوں'' میں نے ہنس کر جواب دیا ''اس کا جواب میں آپ کو پاکستان جا کر دوں گا'' شاہ جی خاموش ہو گئے۔

ہم چند دن بعد پاکستان واپس آ گئے' بات آئی گئی ہو گئی' شاہ جی سیاست بازی میں مصروف ہو گئے اور میں اپنی محنت مزدوری میں لگ گیا' ایک دن ایک سفارتی تقریب میں شاہ جی سے ملاقات ہو گئی' شاہ جی کے پاس اس دن بہت وقت تھا لہٰذا ہم دونوں صوفے پر بیٹھ گئے' ہمارے سامنے مختلف ایمبیسیوں کے سفارتکار نیچی آواز میں ایک دوسرے سے گپ شپ کر رہے تھے' محفل میں سفارتی تکلف اور شائستگی تھی' شاہ جی کو اچانک آکسفورڈ سٹریٹ یاد آ گئی اور وہ میری طرف مڑ کر بولے ''میں نے تم سے لندن میں ایک سوال پوچھا تھا اور تم نے وعدہ کیا تھا تم اس کا جواب پاکستان میں دو گے'' میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ان سے عرض کیا ''شاہ جی ہمارے ملک کی پسماندگی کی وجہ آپ لوگوں کے دوہرے معیار ہیں'' شاہ جی نے مجھے گھور کر دیکھا' میں نے عرض کیا ''شاہ جی ہم لوگ جب لندن میں تھے تو آپ گوروں کی طرح زندگی گزار رہے تھے' آپ قطار میں کھڑے ہوتے تھے' لوگوں کو

مسکرا کر دیکھتے تھے' دوسروں کیلئے دروازہ کھولتے تھے' ہمارے فلیٹ میں کوئی ملازم نہیں تھا' آپ میرے اور اپنے لئے ناشتہ خود بناتے تھے' آپ نے 7 دن اپنے برتن بھی خود دھوئے تھے' آپ اپنا سامان خود اٹھاتے تھے اور آپ ٹائی اور کوٹ کے بغیر زندگی گزارتے تھے اور آپ اس وقت ایک عام' مہذب اور پڑھے لکھے شخص کی طرح اٹھ بیٹھ رہے تھے' لندن میں آپ کا رویہ مکمل طور پر ترقی یافتہ اور مہذب تھا'' شاہ جی بڑے غور سے میری بات سنتے رہے' میں نے عرض کیا'' لیکن شاہ جی جوں ہی آپ اسلام آباد میں اترے آپ نے تہذیب اور شائستگی کا لبادہ اتار کر ایک طرف رکھ دیا اور آپ کے اندر سے نوآبادیاتی نظام کا ایک ظالم اور اکھڑ جاگیردار باہر آ گیا' میں نے دیکھا آپ جوں ہی جہاز سے باہر آئے پروٹوکول کا ایک افسر آپ کا انتظار کر رہا تھا' آپ نے پاسپورٹ اور سامان کے'' ٹیگ'' اس کے حوالے کر دیئے' شاہ جی آپ نے دوسرے مسافروں کے ساتھ امیگریشن کی قطار تک میں کھڑا ہونا پسند نہیں کیا تھا' آپ وی آئی پی لاؤنج میں بیٹھ گئے اور آپ کا سامان کسٹم کلیئرنس کے بغیر باہر آ گیا' شوفر نے آپ کیلئے گاڑی کا دروازہ کھولا' آپ پچھلی نشست پر بیٹھے اور آپ نے موبائل پر اپنے عملے کو جھاڑنا شروع کر دیا'' شاہ جی میری بات سنتے رہے' میں نے عرض کیا'' آپ لوگوں کی یہ سماجی منافقت اس ملک کی ترقی کے راستے کی واحد رکاوٹ ہے' آپ لوگ باہر سے تہذیب' شائستگی اور اخلاقی اقدار سیکھ کر آتے ہیں لیکن جوں ہی آپ کے قدم پاکستان کی زمین کو چھوتے ہیں تو آپ کے اندر کا جاگیردار جاگ جاتا ہے' آپ فوراً آقا بن جاتے ہیں اور آپ ساری شائستگی' ساری تہذیب بھلا دیتے ہیں'' شاہ جی خاموشی سے میری گفتگو سنتے رہے' میں نے عرض کیا' مجھے میاں نواز شریف نے جناب شوکت عزیز کے بارے میں ایک واقعہ سنایا تھا' مجھے میاں صاحب نے بتایا تھا 1998ء میں جب حکومت نے ایٹمی دھماکہ کیا اور اس کے ردعمل میں اقوام متحدہ نے پاکستان پر معاشی پابندیاں لگا دیں تو حکومت شدید دباؤ میں آ گئی' اس وقت دنیا بھر سے پاکستانی اسلام آباد آتے تھے اور ملک کو اس صورتحال سے نکالنے کیلئے نئی نئی معاشی تکنیک سمجھاتے تھے اور وہ ان کی باتیں غور سے سنتے تھے' ایک دن جناب شوکت عزیز امریکہ سے پاکستان تشریف لائے اور لاہور کے گورنر ہاؤس میں ان کی نواز شریف سے ملاقات ہوئی' شوکت عزیز نے نواز شریف کو بتایا' پاکستان میں حکمرانوں اور عوام کے معیار میں بڑا فرق ہے' پاکستان کے پچاس فیصد عوام خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں جبکہ حکمران سو سو ایکڑ کے ایوانوں میں عیش کر رہے ہیں' جناب شوکت عزیز نے گورنر ہاؤس پر نظر ڈال کر میاں نواز شریف کو مشورہ دیا' میاں صاحب آپ یہ گورنر ہاؤس خالی کرا دیں' آپ وزیراعظم ہاؤس اور ایوان صدر چھوڑ دیں اور یورپ کے حکمرانوں کی طرح دو دو تین تین بیڈ روم کے فلیٹس میں شفٹ ہو جائیں اور اس کے بعد عوام سے محنت اور جدوجہد کی درخواست کریں' مجھے یقین ہے لوگ آپ کا ساتھ دیں گے اور ملک اس معاشی مشکل سے باہر آ جائے گا' میاں نواز شریف نے مجھے بتایا ان کو شوکت عزیز کی بات نے بہت اپیل کیا اور انہوں نے ان لائنوں پر سوچنا شروع کر دیا لیکن کسی عملی نتیجے سے پہلے ان کی حکومت ختم ہو گئی اور وہ مختلف قسم کے حالات سے گزرتے ہوئے جلاوطن ہو گئے' ان کے بعد جناب شوکت عزیز پاکستان کے وزیراعظم

بنے اور انہوں نے اسی شاہانہ وزیراعظم ہاؤس میں رہنا شروع کر دیا' مجھے نواز شریف نے بتایا جب شوکت عزیز صاحب سوا ایکڑ کے وزیراعظم ہاؤس میں شفٹ ہوئے اور انہوں نے نواز شریف سے تین گنا پروٹوکول انجوائے کرنا شروع کیا تو وہ حیران رہ گئے' نواز شریف نے بتایا ان کی خواہش ہے' کبھی ان کی ملاقات شوکت عزیز صاحب سے ہو تو وہ ان سے پوچھیں ''جناب اب آپ وزیراعظم ہاؤس کیوں نہیں چھوڑ دیتے'' شاہ جی میری بات سنتے رہے' میں نے عرض کیا'' شاہ جی 2004ء کے رمضان میں مجھے وزیراعظم شوکت عزیز کے افطار ڈنر میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا' ڈنر کے آخر میں جب سوال و جواب شروع ہوئے تو میں نے انہیں نواز شریف کا یہ پیغام پہنچا دیا' وزیراعظم صاحب نے قہقہہ لگایا اور مسکرا کر جواب دیا'' 1998ء اور 2004ء کے حالات میں بڑا فرق ہے' اس وقت ملک ڈیفالٹ کر رہا تھا جبکہ اب ہم نے خزانہ بھر دیا ہے'' میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

میرے اور شاہ جی کے درمیان خاموشی کا طویل وقفہ حائل ہو گیا' اس وقفے کے آخر میں شاہ جی نے کھنگار کر گلا صاف کیا اور غصے سے لرزتی آواز میں بولے ''تمہارے اندر مڈل کلاس کا کمپلیکس بول رہا ہے' تم اشتراکی دور کی فلموں اور ناولوں سے باہر نہیں نکل سکے'' میں نے قہقہہ لگا کر عرض کیا'' شاہ جی لندن اور پاکستان میں آخری فرق آپ کا یہ ردعمل ہے' لندن میں آپ میری بڑی سے بڑی بدتمیزی کو اختلاف رائے سمجھ کر برداشت کر جاتے تھے لیکن یہاں اس ملک میں آپ میرے اختلاف رائے کو بھی بدتمیزی سمجھ رہے ہیں' وہاں لندن میں آپ اور میں محض دو انسان تھے اور ہم دونوں ٹام اور ہنری کی طرح برابری کی سطح پر گفتگو کرتے تھے لیکن یہاں آپ اپر کلاس اور میں مڈل کلاس ہوں' شاہ جی آپ لوگوں کی یہی وہ اخلاقی اور معاشرتی منافقت ہے جو اس ملک کو آگے نہیں بڑھنے دے رہی' میں نے آپ لوگوں کی اس منافقت کو سامنے رکھتے ہوئے آپ سے عرض کیا تھا شاید ہم کبھی گوروں جتنی ترقی نہ کر سکیں'' شاہ جی اٹھے' انہوں نے غصے سے میری طرف دیکھا اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔

سوا تین دن میں

یہ جاوید ہاشمی کے آزاد دنوں کی بات تھی۔ وہ اس وقت میاں نواز شریف کی کابینہ میں وفاقی وزیر صحت تھے۔ وہ شام کو مارگلہ کی پہاڑیوں میں واک کرتے تھے، میں بھی ان دنوں روزانہ مارگلہ کی پہاڑیوں میں جاتا تھا اور اکثر جاتے ہوئے اور بعض اوقات واپس آتے ہوئے ان کے ساتھ ٹکراؤ ہو جاتا تھا، ہم چند منٹ گپ شپ کرتے تھے اور پھر اپنے اپنے راستے پر چل پڑتے تھے، ہم بعض اوقات اکٹھے واپس بھی چلے جاتے تھے، مجھے وہ دن تو یاد نہیں لیکن اس دن کی تمام یادیں ابھی تک مجھے یاد ہیں، اس دن ہماری گپ شپ ذرا سی لمبی ہو گئی تھی، میں نے گفتگو میں جاگیرداروں کو مسائل کی اصل جڑ قرار دے دیا تھا، میں نے ان سے عرض کیا تھا "یہ آپ لوگ ہیں جن کی وجہ سے ملک آگے نہیں بڑھ رہا" جاوید ہاشمی نے قہقہہ لگایا اور اپنے مخصوص سرائیکی لہجے میں بولے "یار جاگیرداریاں تو کب سے ختم ہو چکی ہیں، ان کی جگہ اب بے شمار دوسری جڑیں لے چکی ہیں" میں ان کی بات سنتا رہا، ہاشمی صاحب نے انکشاف کیا "میں کئی نسلوں سے جاگیردار ہوں لیکن چند سال پہلے میں نے اسلام آباد میں ایک گھر خریدا، یہ گھر خریدنے کے لیے مجھے اپنی پانچ مربعے آبائی زمین بیچنا پڑی تھی" یہ بات سنانے کے بعد جاوید ہاشمی نے مجھ سے پوچھا "تم جانتے ہو وہ مکان کس کا تھا" میں نے انکار میں سر ہلا دیا، ہاشمی صاحب بولے "یہ مکان ایک ریٹائرڈ فیڈرل سیکرٹری کا تھا" میں خاموشی سے سنتا رہا، وہ بولے "سیکرٹری صاحب کو یہ پلاٹ سی ڈی اے نے ریٹائرمنٹ کے بعد 26 ہزار روپے میں الاٹ کیا تھا انہوں نے اس پلاٹ پر چند لاکھ روپے لگائے تھے اور کروڑوں روپے جیب میں ڈال کر اپنے دوسرے مکان میں شفٹ ہو گئے تھے" ہاشمی صاحب بولے "تم خود فیصلہ کرو کیا وہ جاگیردار برا ہے جسے ایک مکان خریدنے کے لیے اپنی ساری زمین بیچنا پڑی یا وہ فیڈرل سیکرٹری جو چند ہزار روپے لگا کر کروڑوں روپے کا مالک بن گیا، تم خود فیصلہ کرو کیا قوم اور ملک کے لیے میری خدمات زیادہ ہیں یا پھر اس سیکرٹری کی جس نے ٹھنڈے کمرے میں نوکری شروع کی اور ماتحتوں کی ہتھیلیوں پر بیٹھ کر تیس سال گزار دیئے" وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگے۔

میرے پاس ان کے اس سوال کا جواب نہیں تھا، جواب تو میرے پاس موجودہ حکومت کے اس اقدام کا بھی نہیں جس کے ذریعے ہمارے امپورٹڈ وزیراعظم شوکت عزیز نے 22 گریڈ کے 86 افسروں کو دو دو کروڑ

روپے کا مالک بنا دیا، یہ اقدام بھی یقیناً وزیراعظم کی دوسری پالیسیوں کی طرح معیشت سے بھر پور ہوگا اور اس سے بھی پاکستان سے غربت ختم کرنے میں بڑی مدد ملے گی، وزیراعظم نے پچھلے ماہ 48 وفاقی سیکرٹریوں کو اسلام آباد کے ایک مہنگے سیکٹر ڈی 12 میں چھ چھ سو گز کے پلاٹ دینے کا اعلان کیا، یہ پلاٹ فیڈرل سیکرٹریوں کی اعلیٰ کارکردگی کے صلے میں دیے گئے، سیکرٹری حضرات کو ان پلاٹوں کے ساتھ بیس فیصد اضافی تنخواہ اور تاحیات دو ملازم بھی ملیں گے، وزیراعظم کے اس اعلان کے فوراً بعد سمری بنی، وزیراعظم نے اس سمری کی منظوری دی اور نومبر کے شروع میں سیکرٹریوں کو پلاٹ الاٹ کر دیئے گئے، یہ خبر جب عام ہوئی تو مختلف صوبوں میں کام کرنے والے 22 گریڈ کے دوسرے افسروں نے سپریم کورٹ سے رجوع کی دھمکی دے دی، سیکرٹریوں نے وزیراعظم صاحب سے رابطہ کیا اور وزیراعظم نے محروم رہ جانے والے ان 38 افسروں کو بھی پلاٹ دے دیے، ان افسروں میں 9 ایسے افسر بھی شامل تھے جو ریٹائرمنٹ کے بعد کنٹریکٹ پر دوبارہ بھرتی ہوئے تھے، یہ پاکستان کی تاریخ کا پہلا فیصلہ تھا جس پر ریکارڈ تیزی سے عملدرآمد ہوا، یہ سارا عمل محض سوا تین دنوں میں مکمل ہو گیا اور 86 سیکرٹری اور چیف سیکرٹری دو دو اڑھائی اڑھائی کروڑ روپے کے مالک بن گئے، یہ موجودہ حکومت کا ایک شاہکار فیصلہ تھا، اس فیصلے کے مطابق یہ پلاٹ ان تمام پلاٹوں کے علاوہ ہوں گے جو سیکرٹری حضرات مختلف اوقات میں فیڈرل گورنمنٹ ایمپلائز ہاؤسنگ سکیم کے تحت لیتے رہے ہیں اور یہ پلاٹ خالصتاً وزیراعظم صاحب نے سیکرٹریوں کی کارکردگی سے متاثر ہو کر عنایت کئے تھے۔

اگر ہم اپنے موجودہ سیکرٹریوں کا ٹریک ریکارڈ دیکھیں تو یہ سیکرٹریوں کا تیسرا اور چوتھا پلاٹ ہے، اسلام آباد میں پچھلے تیس برس سے فیڈرل گورنمنٹ ایمپلائز ہاؤسنگ سکیم کام کر رہی ہے، یہ سکیم ہر سیکٹر میں سرکاری ملازموں کو پلاٹ دیتی ہے اور ہمارے تمام سینئر افسر اس سکیم کے ذریعے پلاٹ لے چکے ہیں۔ حکومت نے ان لوگوں کو آئی ایٹ سیکٹر میں تین تین لاکھ روپے میں پلاٹس دیئے تھے، سیکرٹریوں نے یہ پلاٹ آسان قسطوں پر حاصل کیے تھے اور آج ان پلاٹس کی مالیت دو دو کروڑ روپے ہے۔ اس کے علاوہ وفاق کی تمام وزارتوں اور ڈویژنوں کی اپنی اپنی ہاؤسنگ سکیمیں بھی ہیں، ہمارے تمام سیکرٹری ان ہاؤسنگ سکیموں میں بھی پلاٹ لے چکے ہیں، ہمارے فیڈرل سیکرٹریوں کی اکثریت کا تعلق ''ڈی ایم جی'' سے ہے، یہ لوگ زندگی میں بے شمار ضلعوں اور ڈویژنوں میں ڈپٹی کمشنر اور کمشنر رہ چکے ہیں اور انہوں نے اپنے اپنے دور میں وہاں بے شمار ہاؤسنگ سکیمیں بھی بنوائی تھیں، انہوں نے ان سکیموں میں بھی پلاٹ لئے تھے، ہمارے ایک سیکرٹری صاحب نے جب ترقی پائی تھی تو ملک کے نامور کالم نگار جناب اجمل نیازی نے انکشاف کیا تھا ''یہ صاحب 64 پلاٹوں کے مالک ہیں'' سیکرٹری صاحب نے قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دی لیکن جب اجمل نیازی نے اپنے نیازی ہونے کا ثبوت دیا تو وہ خاموش ہو گئے، یہ صاحب بھی حکومت کی اس نوازش سے استفادہ کرنے والوں لوگوں میں شامل ہیں اور اس نئے پلاٹ کے بعد وہ اب 65 پلاٹوں کے مالک بن چکے ہیں، ہمارے سیکرٹریوں میں بے شمار ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو پانچ سے دس برس بیرون ملک ملازمت ''کاٹ'' کر آئے ہیں، یہ لوگ بیرون ملک ڈالروں اور پاؤنڈوں میں تنخواہ لیتے رہے تھے اور وہاں

سے کروڑ پتی ہو کر واپس آئے تھے لہٰذا اگر ان لوگوں کے اثاثوں کی پڑتال کی جائے' اگر ان کے اکاؤنٹس چیک کیے جائیں یا ان کے پلاٹوں کی تفصیل جمع کی جائے تو یہ لوگ ارب پتی ہوں گے لہٰذا میرا دعویٰ ہے ہمارے اکثر سیکرٹریوں کے پاس برادرم ہمایوں اختر عبدالرحمن اور ہمارے امیر ترین وزیر خارجہ جناب خورشید محمود قصوری سے زیادہ دولت ہے چنانچہ پھر ایسے متمول حضرات کی دولت میں بیک جنبش قلم دو اڑھائی کروڑ روپے کا اضافہ فرما دینا کہاں کی نیکی ہے۔

ہمارے محبوب وزیراعظم نے سیکرٹریوں کو پلاٹ پیش کرتے ہوئے بڑی خوبصورت دلیل دی تھی، میں پچھلے کئی دنوں سے ان کی اس دلیل کے نشے میں مبتلا ہوں' وزیراعظم نے فرمایا ''ہم نے یہ پلاٹ ایفی شینسی کی بنیاد پر الاٹ کیے ہیں'' میں نے جب سے یہ بیان پڑھا ہے میں ایفی شینسی کے لفظ سے لطف اندوز ہو رہا ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے اگر ہم ان کروڑ پتی سیکرٹریوں کی پانچ سال کی کارکردگی دیکھیں گے تو ہمیں ان کی پرفارمنس شیٹس میں ایک بھی ایسی فائل نہیں ملے گی جس پر انہوں نے وزیراعظم، صدر، وزیراعلیٰ، گورنر یا وزیر کے احکامات سے اختلاف کیا ہو گا لہٰذا اگر وزیر' وزیراعلیٰ، گورنر، وزیراعظم اور صدر صاحب کے احکامات سے اتفاق کرنا ایفی شینسی ہے تو یہ لوگ اس میں واقعی باکمال اور ہنرمند ہیں اور ان کی ''ایفی شینسی'' کا گراف حقیقتاً اس حد کو چھو رہا ہے جس کے صلے میں اگر انہیں اسلام آباد کا ایک پورا سیکٹر الاٹ کر دیا جائے تو بھی ان کا حق نمک ادا نہیں ہوتا، ویسے بھی ان لوگوں نے وزیراعظم کی اس سمری پر سوا تین دنوں میں عملدرآمد کر کے اپنی ایفی شینسی کا ثبوت دے دیا لہٰذا یہ لوگ اس انعام کے پورے پورے حقدار ہیں' ہم خوش قسمتی سے ایک ایسے اسلامی ملک میں رہ رہے ہیں جس میں حاکم وقت زمین پر اللہ کا نائب ہوتا ہے اور جو افسر اس کی بیعت میں دوسروں سے سبقت لے جاتا ہے صرف وہی ایفی شینسی کے معیار پر پورا اترتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں جو لوگ ضابطوں اور اصولوں کو اپنا مقصد حیات بنا لیتے ہیں اس ملک میں ان کی حیثیت فقیر کے گلے چیتھڑوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ لوگ حقیقتاً معاملہ فہم اور سمجھدار ہیں' یہ جانتے ہیں حکومت حضرت موسیٰؑ کی ہو یا فرعون کی ان کا کام بس ''ایفی شینسی'' ہے' انہوں نے بس حاکم وقت کو خوش رکھنا ہے' وہ صبح کہہ دے تو صبح ہے اور اگر وہ شام کہہ دے تو بس شام ہے' باقی سب بکواس ہے' یہ لوگ واقعی بڑے ''ایفی شینٹ'' اور کاریگر ہوتے ہیں' بس ان میں ایک خامی ہوتی ہے یہ کسی کے نہیں ہوتے' میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا بھٹو صاحب جن لوگوں کی ''ایفی شینسی'' کی تعریف کیا کرتے تھے وہی لوگ بعد ازاں نہ صرف جنرل ضیاء الحق کے مقرب افسروں میں شامل ہوئے بلکہ انہی نے بھٹو صاحب کے ''ڈیتھ وارنٹ'' پر دستخط بھی کئے' میں دعویٰ سے کہتا ہوں جو لوگ آج ''ایفی شینسی'' کی بنیاد پر جناب شوکت عزیز سے پلاٹ لے رہے ہیں اگر خدانخواستہ ان لوگوں کو من موہن سنگھ کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل گیا تو یہ ان سے بھی ایک دو پلاٹ اینٹھ لیں گے' یہ انہیں بھی اپنی ایفی شینسی سے متاثر کر لیں گے۔

۞......۞......۞

علیحدگی کی وجہ

اس کا کہنا تھا "یہ جدائی ہمارے لئے اچھی تھی' ہم نے الگ ہو کر ہر شعبے میں ترقی کی اور ہم بڑی تیزی سے پسماندہ ممالک کی فہرست سے نکل کر ترقی پذیر قوموں میں شامل ہو رہے ہیں" وہ سانس لینے کے لئے رکا' ہمارے سامنے "ڈیم سکوائر" کی رونق تھی' ایمسٹرڈیم سیاحوں سے لبالب بھرا تھا' لوگ دھوپ سینک رہے تھے' تصویریں کھینچ رہے تھے اور ٹرام کے پیچھے بھاگ رہے تھے جبکہ ہم دونوں ریستوران کے شیشے سے ایمسٹرڈیم کینال اور کینال میں ڈولتی بھاگتی موٹر بوٹس دیکھ رہے تھے۔ وہ بنگلہ دیش کا صحافی تھا' اس کا نام مظہر السلام تھا اور ہم دونوں چند دن کے لئے ایمسٹرڈیم میں اکٹھے ہو گئے تھے' میں پاکستان سے سیر کے لئے گیا تھا اور وہ پن چکیوں پر تحقیق کے لئے ہالینڈ پہنچا تھا' میں نے ہالینڈ کے محکمہ سیاحت سے "پے انگ گیسٹ" کیلئے درخواست کی اور گیسٹ ریلشنگ افسر نے مجھے مظہر السلام کا ٹیلی فون نمبر دے دیا' مظہر ڈیم سکوائر کے قریب ایک سٹوڈیو فلیٹ میں رہ رہا تھا' فلیٹ کا کرایہ زیادہ تھا لہٰذا اسے کسی ایسے مسلمان سیاح کی تلاش تھی جو اس کے ساتھ فلیٹ اور کچن شیئر کر سکے یوں میں اس کے پاس پہنچ گیا اور ہم دونوں کی دوستی ہو گئی' وہ سارا دن پن چکیوں کے جنگل میں گھومتا رہتا تھا اور میں کبھی ڈیلف چلا جاتا تھا' کبھی ہیگ' کبھی اوترش اور کبھی ڈیم سکوائر کے سینکڑوں ہزاروں سیاحوں میں گم ہو جاتا تھا' وہ شام کو واپس آتا تو ہم چرسیوں کے قہوہ خانوں میں جھانکنا شروع کر دیتے' وہ بھی میری طرح سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن اسے چرسی دیکھنے کا بہت شوق تھا' وہ جب کسی حسینہ کو چرس کے نشے میں دھت دیکھتا تھا تو اس پر ایک عجیب سرشاری سی طاری ہو جاتی تھی اور وہ گردن ہلا کر کہتا تھا "یہ ہوئی نہ بات' شالی اب آسمان پر گھوم رہی ہے"۔

یہ 14 اگست کی بات تھی' میں نے اسے جلدی بلایا اور ہم دونوں ریستوران کی تیسری منزل سے ایمسٹرڈیم میں جھانکنے لگے' میں نے اس سے اچانک پوچھا "یار مظہر السلام اگر بنگلہ دیش پاکستان کا حصہ ہوتا تو آج تم بھی میرے ساتھ آزادی منا رہے ہوتے' آج ہم دونوں بہت خوش ہوتے" اس نے گرم کافی کا لمبا سا گھونٹ بھرا اور مسکرا کر بولا "لیکن شاید ہم دونوں بیک وقت خوش نہ ہوتے' ہم بنگالی آپ لوگوں کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتے تھے' ہماری ثقافت' ہماری سوچ اور ہماری ذہنیت میں بڑا فرق تھا' ہم دونوں نے کبھی نہ کبھی الگ ہونا

ہی تھا" میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا' وہ بولا "مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں روایات اور ثقافت کا بہت فرق تھا' آپ پر "فیوڈل لارڈز" حاوی تھے آپ کے کلچر میں ایک وڈیرا' سردار یا چودھری ہوتا ہے اور باقی سب کمی' کمین اور ہاری' آپ کا وڈیرا تمام ہاریوں اور کمیوں پر حکومت کرتا ہے' یہ کلچر جب دیہات سے نکل کر شہروں میں داخل ہوتا ہے تو وہاں بیوروکریٹ' سیاستدان اور جرنیل وڈیرے بن جاتے ہیں اور عوام ہاری' کمین اور کمی' آپ لوگ اس کلچر میں پروان چڑھے تھے' آپ لوگ دو طبقوں میں بھی تقسیم تھے' ظالم یا مظلوم' آپ کے مظلوم پوری زندگی ظالم کلاس میں شامل ہونے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ ظالم اپنی پوزیشن برقرار رکھنے کی سعی کرتے رہتے ہیں جبکہ ہم لوگ مچھرا کلاس کے لوگ ہیں' مچھرے آزاد منش ہوتے ہیں' یہ زندگی بھر سردار بنتے ہیں اور نہ ہی کسی کی سرداری قبول کرتے ہیں' یہ آزاد رہتے ہیں اور دوسروں کو آزاد رکھتے ہیں' یہ لوگ ٹیم ورک کے عادی ہوتے ہیں' ان میں سے ہر شخص اپنا رول متعین کر لیتا ہے اور اس کے بعد چپ چاپ کام کرتا رہتا ہے' ہمارے ہاں اگر کوئی شخص ایک بار چپو تھام لے تو وہ زندگی بھر چپو نیچے نہیں رکھتا' ہمارے معاشرے میں کوئی کسی کا باس نہیں ہوتا' سب مل کر کوشش کرتے ہیں اور آخر میں نتائج آپس میں بانٹ لیتے ہیں' ہمارے برعکس آپ لوگوں کو ہر وقت ایک لیڈر' ایک جاگیردار' ایک جرنیل اور ایک ڈکٹیٹر کی ضرورت ہوتی ہے' آپ لوگ ڈکٹیٹر کے بغیر ترقی نہیں کر سکتے جبکہ ہم لوگ ڈکٹیٹر کے ساتھ ترقی نہیں کر سکتے' آپ اور ہمارے درمیان یہ بہت بڑا فرق تھا"۔

وہ بولتا رہا اور میں سنتا رہا' اس نے بتایا' "آپ لوگ دو باتوں سے ہماری آزاد منش فطرت کا اندازہ لگا لیجئے۔ ہندوستان کی تاریخ میں کوئی فاتح، کوئی طالع آزما ہمیں زیادہ دیر تک غلام نہیں رکھ سکا۔ جو بھی جرنیل بنگال پہنچا وہ بالآخر وہاں سے پسپا ہوا۔ مغل بنگال آئے لیکن انہیں بنگال چھوڑنا پڑا۔ انگریزوں کے خلاف پہلی جنگ آزادی بنگالی رجمنٹ نے شروع کی، وائسرائے کی گاڑی پر پہلا حملہ بنگالیوں نے کیا، ہندوستان میں کانگریس اور مسلم لیگ دو بڑی سیاسی جماعتیں ہیں۔ ان دونوں سیاسی جماعتوں نے بنگال میں جنم لیا اور انگریزوں نے بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کیا لیکن بنگالیوں نے انگریزوں کو یہ فیصلہ واپس لینے پر مجبور کر دیا وغیرہ۔ ہم حقیقتاً آزاد لوگ ہیں، ہم کسی جرنیل، کسی جاگیردار اور کسی وڈیرے کو برداشت نہیں کرتے۔" وہ رکا، اس نے سانس لیا اور اس کے بعد بولا "آپ ظلم کرنے اور ظلم سہنے کے عادی ہیں لیکن ہم لوگ ظلم کرتے ہیں اور نہ ہی ظلم سہتے ہیں چنانچہ ہم لوگ آپ سے الگ ہو گئے، ہمیں اس جدائی کا فائدہ ہوا، ہم نے پچھلے 35 برسوں میں ہر شعبے میں ترقی کی، ہم نے فوج اور سیاست کو الگ الگ کر دیا۔ ہمارے سیاستدانوں کے درمیان یہ اتفاق ہو چکا ہے۔ بنگلہ دیش میں حالات جیسے بھی ہوں وہ فوج کو اقتدار میں نہیں آنے دیں گے۔ ہم نے فوج کا سائز چھوٹا کر دیا' اس وقت پوری اسلامی دنیا میں بنگلہ دیش کا فوجی بجٹ سب سے کم ہے۔ ہماری کرنسی پاکستان کے مقابلے میں مضبوط ہے۔ ہمارا کمیونیکیشن نیٹ ورک پاکستان سے بڑا اور مضبوط ہے۔ ہمارے تمام دیہات میں سڑکیں، بجلی، سکول، ہسپتال اور ٹیلی فون موجود ہیں۔ ہم بڑی تیزی سے ورآمدی ملک سے برآمدی ملک بن رہے ہیں، ہم ہر سال پاکستان کے مقابلے میں

چالیس گنا زیادہ گارمنٹس برآمد کرتے ہیں، ہم نے گرامین بینک بنایا، یہ بینک اب تک دو کروڑ بنگالیوں کا مقدر بدل چکا ہے۔ یہ دنیا کا پہلا بینک ہے جو کسی پسماندہ ملک سے ترقی یافتہ ممالک میں ایکسپورٹ ہوا۔ دنیا کے 68 ممالک نے اپنے شہروں میں گرامین بینک کے ماڈل کو کاپی کیا۔ نمکول (او آر ایس) بنگلہ دیش کی ایجاد ہے۔ ہماری یہ ایجاد اس وقت پوری دنیا میں استعمال ہو رہی ہے۔ ہماری ایک ''این جی او'' بریک نے بنگلہ دیش کی آخری سرحد تک سکول کھول دیئے۔ ہم لوگ تعلیم میں تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں، ہمارے تمام دیہات میں ڈاکٹرز اور ڈسپنسریاں موجود ہیں۔ ہماری یونیورسٹیاں، کالج اور سکول سال میں تین سو دن کھلتے ہیں اور بنگلہ دیش کا شمار دنیا کے ان دس ممالک میں ہوتا ہے جن کی طرف ملٹی نیشنل کمپنیاں تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ آج حالت یہ ہے آپ کا ''نادرا'' گاڑیوں کا ٹریکنگ سسٹم بناتا ہے لیکن یہ ٹریکنگ سسٹم پاکستان سے پہلے بنگلہ دیش میں نصب ہوتا ہے۔ بنگلہ دیش دنیا کا واحد اسلامی ملک ہے جس میں شیعہ اور سنی کی لڑائی نہیں، جس میں دہشت گردی نہیں ہو رہی اور جس میں خودکش حملہ آور پیدا نہیں ہو رہے، ہمارے بازار بھی آباد ہیں اور تعلیمی ادارے بھی جبکہ آپ لوگ 06-2005ء میں بھی انہی مسائل کا شکار ہیں جن میں آپ 1947ء میں مبتلا تھے۔ آپ سے جدائی کا دکھ ہمیں بھی ہوا تھا۔ آج بھی بنگلہ دیش کے ایسے ہزاروں لاکھوں لوگوں کی گھڑیاں پاکستانی وقت بتاتی ہیں لیکن اگر ان لوگوں کو بھی پاکستان میں شامل ہونے کا موقع دیا جائے تو شاید یہ لوگ بنگلہ دیش چھوڑنا پسند نہ کریں؟ کیونکہ یہ لوگ پاکستان سے محبت کرتے ہیں، پاکستان کے فیوڈل لارڈز اور ڈکٹیٹروں سے نہیں'' وہ رکا اور لمبا سانس بھر کر بولا ''ہم لوگوں نے 1971ء میں فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم ڈکٹیٹروں کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتے، ہم نے جب 1971ء میں آپ کو چھوڑا تھا تو اس وقت پاکستان میں ایک باوردی جرنیل کی حکومت تھی، آج 35 برس بعد بھی آپ کے ملک میں یونیفارم حکومت کر رہی ہے، میں آج یہاں ایمسٹرڈیم میں بیٹھ کر دعویٰ کرتا ہوں، بنگلہ دیش میں کبھی مارشل لاء نہیں لگے گا لیکن کیا تم یہ دعویٰ کر سکتے ہو'' میں خاموش رہا، وہ بولا ''تمہاری یہ چپ ہماری علیحدگی کی وجہ تھی، ہم بول پڑتے تھے لیکن تم لوگ خاموش رہتے تھے اور خاموش رہتے ہو، ہم اس وقت بھی تم لوگوں سے آگے تھے اور ہم لوگ آج بھی تم سے آگے ہیں''۔

کیا پوری اسلامی دنیا میں

رانا خاندان 1965ء میں برطانیہ منتقل ہوا' وہ لوگ اپنے بچوں کو بہتر اور خوشحال مستقبل دینا چاہتے تھے' رانا سجاد کی عمر اس وقت پانچ سال تھی' یہ لوگ سکاٹ لینڈ کے شہر گلاسکو میں اقامت پذیر ہو گئے' رانا سجاد کو مقامی سکول میں داخل کرا دیا گیا' رانا صاحب نے کالج تک تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد ذاتی کاروبار شروع کر دیا' 1984ء میں ان کی ملاقات لوئیس کیمپبل سے ہوئی' لوئیس ایک سولہ سالہ خوبصورت سکاٹش لڑکی تھی' لوئیس رانا سجاد کی محبت میں گرفتار ہوئی' اس نے اپنا مذہب اور گھر بار چھوڑا' مسلمان ہوئی اور دونوں نے شادی کر لی' اللہ تعالیٰ نے انہیں چار بچوں سے نوازا' سب سے بڑا بیٹا عمر تھا' عمر 1986ء میں پیدا ہوا' 1988ء میں تہمینہ پیدا ہوئی' آدم 1990ء میں پیدا ہوا اور 1994ء میں مصباح ارم نے آنکھ کھولی۔ مصباح ارم اس کہانی کا مرکزی کردار ہے۔

2000ء میں لوئیس اور رانا سجاد کے درمیان اختلافات شروع ہو گئے' لوئیس مسلمان ہونے کے باوجود اسلامی تعلیمات پر عمل نہیں کر رہی تھی جبکہ رانا سجاد تیزی سے اسلام کی طرف مائل ہو رہا تھا' یہ اختلاف بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ لوئیس نے گھر چھوڑ دیا اور وہ اپنے ایک کزن کینی کیمپبل کے ساتھ رہنے لگی' کینی مغربی معاشرے کا نمائندہ شخص تھا' اس میں وہ سارے عیب موجود تھے جسے ہم عیب کہتے اور عیب سمجھتے ہیں' لوئیس کینی کی گرل فرینڈ بن گئی لہٰذا رانا سجاد نے 2001ء میں لوئیس کو طلاق دے دی' لوئیس نے بچے رانا سجاد کے پاس چھوڑ دیئے' اس وقت مصباح کی عمر صرف سات سال تھی' رانا سجاد اکثر سفر پر رہتا تھا لیکن وہ جہاں بھی جاتا تھا اپنے بچوں کو ساتھ رکھتا تھا' بچے اس دوران والد کے بہت قریب آ گئے' رانا سجاد نے 2002ء میں مستقل طور پر پاکستان شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا' بچے بھی اس کے ساتھ پاکستان آ گئے' یہ لوگ لاہور میں رہنے لگے' چند ماہ بعد تہمینہ اور آدم نے مستقل طور پر لاہور میں رہنے کا فیصلہ کیا جبکہ بڑا بیٹا عمر تعلیم مکمل کرنے کے لئے واپس گلاسکو چلا گیا' مصباح کی عمر اس وقت آٹھ برس تھی اور برطانوی قانون کے مطابق اسے اپنی ماں کے پاس واپس جانا تھا لہٰذا مصباح اپنی ماں کے پاس سکاٹ لینڈ چلی گئی' لوئیس اپنے بوائے فرینڈ اور مصباح کے ساتھ گلاسکو سے سٹینرر (Stranraer) شفٹ ہو گئی۔ لوئیس کثرت شراب نوشی اور منشیات کی عادی ہو چکی تھی' وہ نشے کے عالم میں مصباح پر تشدد کرتی تھی'

مصباح رانا سجاد کے ساتھ رہ کر عبادت کی عادی ہو چکی تھی' وہ نماز پڑھنا چاہتی تھی لیکن لوئیس اور اس کا بوائے فرینڈ اسے نماز سے روکتے تھے' وہ اسے حرام گوشت کھانے اور شراب پینے پر بھی مجبور کرتے تھے' ان لوگوں نے اس کا نام بھی بدل دیا تھا' وہ اسے مصباح کی بجائے مولی بلاتے تھے' مصباح اس ماحول میں شدید گھٹن کا شکار ہو گئی۔ مصباح کا اپنے بھائیوں اور بہن تہمینہ کے ساتھ رابطہ تھا' وہ انہیں اپنے اوپر ہونے والے مظالم کے بارے میں بتاتی رہتی تھی' بچے یہ باتیں اپنے والد کو بتا دیتے تھے چنانچہ رانا سجاد نے اپنی بیٹی کو پاکستان لانے کا فیصلہ کیا' رانا سجاد اور تہمینہ اگست 2006ء میں سکاٹ لینڈ گئے' تہمینہ مصباح کے سکول گئی اور اسے لے کر والد کے پاس ہوٹل آ گئی' یہ لوگ Stranraer سے گلاسکو آئے اور اسی روز گلاسکو سے پاکستان آ گئے' لوئیس نے جب مصباح کو غائب پایا تو اس نے فوراً پولیس سٹیشن میں رپٹ لکھوا دی' لوئیس کا کہنا تھا اس کے سابق خاوند نے اس کی نابالغ بچی کو اغوا کر لیا ہے اور وہ اسے پاکستان لے جا کر کسی بوڑھے کے ساتھ بیاہ دے گا' برطانوی میڈیا نے اس خبر کو ایشو بنا دیا اور لوئیس 24 گھنٹے ٹیلی ویژن سکرین پر دکھائی دینے لگی' وہ سکاٹ لینڈ کے اخبارات کی ''لیڈ سٹوری'' بھی بن گئی' یہ معاملہ فوراً انٹرپول کے پاس گیا اور انٹرپول نے حکومت پاکستان کو مطلع کر دیا' گلاسکو کے ایم پی اور پاکستانی برطانوی سیاستدان چودھری سرور نے مداخلت کی' وہ پاکستان آ گئے۔

چودھری سرور 28 اگست کو مصباح سے ملے' انہوں نے ملاقات کے بعد میڈیا کو بتایا ''مصباح اپنی مرضی سے پاکستان آئی ہے اور اس پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں تھا'' دو دن بعد رانا سجاد نے پریس کانفرنس کی اور مصباح کو میڈیا کے سامنے بٹھا دیا' مصباح نے پوری دنیا کے میڈیا کو بتایا' وہ اپنی والدہ اور اس کے بوائے فرینڈ کے ساتھ خوش نہیں تھی' وہ اپنی مرضی سے والد کے پاس آئی ہے اور وہ اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ پاکستان رہنا چاہتی ہے' اسی دوران لوئیس کے وکیل نے سکاٹ لینڈ حکومت کو مصباح کی تحویل کی درخواست دے دی' وکیل نے 2003ء میں برطانیہ اور پاکستان کے درمیان ہونے والے سمجھوتے کو جواز بنایا' سکاٹ لینڈ نے حکومت پاکستان کو لکھ دیا اور حکومت رانا سجاد پر دباؤ ڈالنے لگی' رانا سجاد نے مصباح کی تحویل کیلئے لاہور ہائی کورٹ میں رٹ کر دی' ہائی کورٹ نے 2 ستمبر 2006ء کو مصباح کو رانا سجاد کی عارضی تحویل میں دے دیا لیکن مصباح کا پاسپورٹ جمع کر لیا گیا اور اسے عدالت کی حدود میں رہنے کا حکم دے دیا گیا' ستمبر میں مصباح ارم کا کیس قومی اور عالمی شکل اختیار کر گیا' تمام پاکستانی اخبارات' ریڈیو اور ٹیلی ویژن چینلز پر مصباح کی خبریں اور انٹرویوز چلنے لگے' لوئیس نے پاکستان میں کیس لڑنے کا فیصلہ کر لیا' اس کے بعد عدالتی جنگ شروع ہو گئی رانا سجاد 29 ستمبر کو یہ جنگ ہار گیا' ہائی کورٹ نے مصباح کو 7 دن کے اندر برٹش ہائی کمیشن کے حوالے کرنے کا حکم دے دیا' رانا سجاد نے فیڈرل شریعت کورٹ میں اپیل کر دی' اسی دوران چیف جسٹس آف پاکستان نے ذاتی دلچسپی لی اور مقدمہ سپریم کورٹ میں چلا گیا' سپریم کورٹ کا فل بینچ تشکیل پایا اور کیس کی سماعت شروع ہو گئی لیکن فیصلے سے پہلے لوئیس کی وکیل ناہیدہ محبوب الٰہی نے ''آؤٹ آف کورٹ'' سمجھوتے کا عندیہ دے دیا جس کے بعد لوئیس اور رانا سجاد کے درمیان چار نکاتی سمجھوتہ طے

پا گیا' یوں مصباح کو پاکستان میں رہنے کی اجازت مل گئی' میں نے دس جنوری 2007ء کو مصباح کو خوشی سے روتے اور اپنے والد کے گلے لگتے دیکھا تو مجھے بہت خوشی ہوئی' یہ پاکستان کے ساتھ ساتھ اسلامی ثقافت کی بھی فتح تھی' مصباح ہماری اخلاقی برتری ثابت ہوئی تھی لیکن پھر 6 فروری کا دن آ گیا' اس دن نے مجھ سمیت بے شمار پاکستانیوں کا دل دہلا دیا۔

چھ فروری 2007ء کو پاکستانی اخبارات میں مصباح ارم کے حوالے سے ایک چھوٹی سی خبر شائع ہوئی ''پاکستانی نژاد سکاٹش بچی مصباح ارم کانونٹ سکول میں داخلہ لے گی'' یہ خبر بین الاقوامی نیوز ایجنسی اے ایف پی نے جاری کی تھی اور یہ پاکستان سمیت دنیا کے تمام اخبارات میں شائع ہوئی تھی' نیوز ایجنسی نے اس خبر میں دعویٰ کیا ''مصباح ارم کے والد سجاد احمد رانا نے بتایا' وہ کسی اچھے سکول کے متلاشی تھے جس پر ان کے دوستوں نے انہیں مشورہ دیا وہ مصباح کو کیتھولک سکول میں داخل کرا دیں کیونکہ وہاں کا تعلیمی معیار اور نظم و ضبط شاندار ہے'' ایجنسی نے دعویٰ کیا ''مصباح ارم کے والد کا کہنا ہے' وہ اپنی بیٹی کو کیتھولک سکول میں بھجوانے کے معاملے میں متعصب نہیں ہیں'' میں نے جب یہ خبر پڑھی تو میرا سر شرم سے جھک گیا اور میں نے سوچا کیا ہم لوگ مصباح جیسی بچی کو پاکستان میں ایک معیاری تعلیمی ادارہ بھی فراہم نہیں کر سکتے' وہ بچی جو اسلام کی محبت میں سکاٹ لینڈ کی تہذیب چھوڑ کر آئی تھی کیا ہم اس بچی کو معیار کے نام پر ایک بار پھر کیتھولک تہذیب میں دھکیل دیں گے' میں نے سوچا' اس ملک میں ایک ہزار کے قریب ارب پتی ہیں' کیا یہ ارب پتی لوگ پاکستان میں کانونٹ معیار کا ایک اسلامی سکول بھی قائم نہیں کر سکتے؟ میں نے سوچا' وہ کون لوگ تھے جنہوں نے پوری دنیا میں کانونٹ جیسے تعلیمی ادارے قائم کئے اور بچے عالمی معیار کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور کیا ایک ارب 55 کروڑ مسلمانوں میں کوئی ایک بھی ایسا مسلمان نہیں جو اسلامی ممالک میں اسلامی کانونٹ سکول بنا سکے' جو 58 اسلامی اور 109 عیسائی ممالک میں مدینہ سکول' مکہ سکول یا اسلامک ایجوکیشنل سکول بنا سکے اور یہ سکول معیار اور نظم و ضبط میں ہارورڈ یونیورسٹی' کیمبرج سکول اور کانونٹ کا مقابلہ کر سکیں' میں نے سوچا مصباح کا امتحان دس جنوری کو ختم ہو گیا لیکن ہمارا امتحان فروری سے شروع ہوا اور یہ کبھی ختم نہیں ہو گا۔

دل کے ارب پتی

خاور نقوی صاحب میرے ایک مہربان ہیں۔ خاور صاحب نے پچھلے دنوں میانوالی کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے ایک ہیڈ ماسٹر کا ذکر کیا' یہ ہیڈ ماسٹر صاحب سادات سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے اپنے اخلاص' محبت اور محنت سے پورے علاقے کی تقدیر بدل دی' انہوں نے اس گاؤں میں علم اور تعلیم کی ایک ایسی کھیتی تیار کی جس کی فصل اب پورا ملک کھا رہا ہے' نقوی صاحب کا کہنا تھا یہ ہیڈ ماسٹر صاحب دل کے ارب پتی تھے اور اگر اس ملک کو دل کے ایسے چند ارب پتی مل جائیں تو یہ ملک ترقی کی قطار میں سر اٹھا کر کھڑا ہو سکتا ہے' نقوی صاحب کا فرمانا تھا " آپ نے اپنے کالم بعنوان "پوری اسلامی دنیا میں" پاکستانی نژاد سکاٹش بچی مصباح ارم کے حوالے سے جو معلومات بہم پہنچائی ہیں وہ واقعی ایک لمحہ فکریہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس بچی نے مغربی تہذیب کے منفی رویوں سے جان چھڑا کر پاکستان کو اپنا مسکن بنایا۔ اس منزل پر آپ نے بجا طور پر دکھ کا اظہار کیا کہ اس بچی کے سچے جذبے کو ایک معیاری تعلیمی ادارہ بھی نصیب نہ ہو سکا جس میں وہ یہاں کی تہذیب وثقافت کے مطابق تعلیم حاصل کر سکے، یہاں بھی اسے کیتھولک سکول کا رخ کرنا پڑا، اسے کیتھولک تہذیب کو اپنانا پڑا۔ آپ نے یہ المناک سوال اٹھایا ہے، کیا اس ملک کے ایک ہزار کے قریب ارب پتی لوگ کا نونٹ معیار کا ایک سکول بھی قائم نہیں کر سکتے؟ آپ سے عرض ہے ارب پتی لوگ معیاری ادارہ قائم کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں مگر آپ جانتے ہیں تعلیم ان کی ترجیحات میں شامل نہیں، ان کی ترجیحات امارت' مزید امارت اور لامتناہی امارت ہے' ان لوگوں نے تعلیم کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔ آپ نے اس طبقے کا ذکر کیا ہے۔ جس کے بچے سہولیات سے آراستہ سکولوں میں یا بیرون ملک تعلیمی اداروں میں تعلیم پاتے ہیں لہٰذا یہ لوگ اس ملک میں کسی معیاری تعلیمی ادارے پر اپنی جیب سے پیسہ کیوں خرچ کریں گے؟ اس سے انہیں یہ خطرہ لاحق ہوگا کہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو عام لوگوں کے بچے ان کے بچوں کے مقابلے میں آ جائیں گے جس کے نتیجے میں ان کی اولاد غریب عوام کی اولاد پر حکمرانی نہیں کر سکے گی۔ اس کے علاوہ ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ کوئی فلاحی کام کرنے کے لئے دولت مند یا ارب پتی ہونا ضروری نہیں' دل کا ارب پتی ہونا ضروری ہوتا ہے"

خاور نقوی صاحب نے مزید لکھا "میں آپ کو دل کے ایک ارب پتی کی کہانی سنانا چاہتا ہوں' اس نے ایک دور افتادہ اور پسماندہ گاؤں میں بے سروسامانی کے عالم میں فقط دل کی دولت کے بل بوتے پر ایک سکول کھول دیا۔ دل کے اس ارب پتی کا نام سید عطا محمد شاہ تھا۔ انہوں نے 1952ء میں گورنمنٹ پرائمری سکول نورنگا ضلع میانوالی میں جے وی ٹیچر کی حیثیت سے تدریسی زندگی کا آغاز کیا' انہوں نے اس کے بعد مسلسل محنت سے ایس وی' فاضل فارسی' ایف اے' سی ٹی' بی اے اور بی ایڈ کے امتحانات پاس کیے۔ انہوں نے کچھ عرصہ گورنمنٹ پرائمری سکول نورنگا کے ہیڈ ماسٹر کے طور پر بھی کام کیا اور جب اس ادارے کو مڈل سکول کا درجہ ملا تو انہوں نے اس کے سربراہ کی حیثیت سے بھی فرائض سرانجام دیے۔ انہوں نے ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے ایسی بے لوث' پرخلوص اور مثالی خدمت کی کہ پورے علاقے میں ان کا نام ہیڈ ماسٹر صاحب مشہور ہو گیا۔ ان کے قریبی رشتہ دار بھی انہیں ہیڈ ماسٹر صاحب کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب فنافی التدریس تھے۔ کڑکڑاتے جاڑے کی طویل راتوں اور چلچلاتی گرمی کے لمبے دنوں میں بھی ان کا سلسلہ تدریس جاری رہتا تھا۔ نورنگا دریائے سندھ کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے کئی بار دریا کی زد میں آ جاتا تھا۔ موسم گرما میں دریا بپھر کر کناروں سے امڈ آتا تھا اور نورنگا جھیل کی شکل اختیار کر لیتا تھا' جس کے نتیجے میں اہل نورنگا کے کچے مکان اور چھپر پانی کی نذر ہو جاتے تھے' سیلاب کے دنوں میں علاقے کی فصلیں پانی میں تیرتی نظر آتی تھیں' کبھی دریا غیض و غضب میں زمین کے کٹاؤ کا شغل اختیار کرتا تھا تو پانی گھروں کو بنیادوں اور درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ دیتا تھا۔ دریا کی اس منہ زور طغیانی اور ہیبت ناک جولانی میں بھی ہیڈ ماسٹر صاحب کسی درخت کی چھاؤں میں خشکی کا کوئی ٹکڑا تلاش کر لیتے تھے اور وہاں بیٹھ کر غریب کسانوں' شتربانوں' چرواہوں اور محنت کشوں کے خاک نشین بچوں کو علم کے نور سے منور کرنے کی بھرپور کوشش کرتے رہتے تھے اس لگن اور انتھک محنت کی وجہ سے دور دور تک ان کی شہرت ہوئی اور دور دراز سے لوگ اپنے بچوں کو ان کے ہاں داخل کروانے آنے لگے' وہ اپنی جیب سے نادار طلباء کے اخراجات بھی برداشت کرتے تھے' ان کے قیام و طعام کا بندوبست بھی کرتے تھے اور وہ رات کو اٹھ اٹھ کر ان کی دیکھ بھال بھی کرتے تھے' تعلیم کے ساتھ تربیت اور نظم و ضبط بھی ان کے طریق تدریس کے اہم اجزاء تھے۔ جب ان کے ہونہار طلباء اس ادارے سے فارغ التحصیل ہو جاتے تو وہ ان کی آئندہ تعلیم اور عملی زندگی کے بارے میں شہروں میں مقیم اپنے دوستوں اور عزیز و اقارب سے مشورہ کرتے تھے اور اس طرح اپنے طلباء کی مکمل رہنمائی کرتے تھے۔ خوش قسمتی سے ہیڈ ماسٹر صاحب کو ٹیم بھی محنتی ملی تھی لیکن وہ ان سے فقط ڈیوٹی ٹائم میں کام لیتے تھے جبکہ انہوں نے اضافی وقت صرف اپنے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔

اس محنت اور جانفشانی کا یہ ثمر نکلتا تھا کہ اس سکول کا نتیجہ نہ صرف سو فیصد رہتا تھا بلکہ اس سکول کے جتنے طلبہ پرائمری اور مڈل کے وظیفے کے امتحانات میں شریک ہوتے تھے وہ سب کامیابی حاصل کرتے تھے' ان کے بعض طلباء ضلع اور ریجن کی سطح پر اول پوزیشن بھی حاصل کرتے تھے۔ اس ادارے کے طلباء نے نصابی سرگرمیوں

کے علاوہ اہم ہم نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس مثالی کارکردگی کی بناء پر یہ سکول ضلع کا بہترین سکول قرار پایا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو کئی بار ڈپٹی کمشنر ضلع میانوالی سے نقد انعامات اور تعریفی اسناد بھی ملیں تھیں۔ بلاشبہ یہ سب اعزازات اپنی جگہ قابل قدر ہیں لیکن ان کا سب سے بڑا اعزاز ان کے وہ شاگرد ہیں جو آج نہایت اہم سرکاری عہدوں پر فائز ہیں، ہیڈ ماسٹر صاحب دار فانی سے کوچ کر چکے ہیں مگر وہ آج بھی اپنے شاگردوں کی صورت میں زندہ ہیں۔ بات کانونٹ سکول سے شروع ہوئی تھی۔ شہروں میں دیکھا جائے تو ایک طرف بڑے بڑے ناموں والے اور تمام جدید سہولیات سے آراستہ و پیراستہ تعلیمی ادارے ہیں جبکہ دوسری طرف نورنگا جیسا گاؤں ہے اور اس گاؤں میں بے سروسامان' بے درودیوار' مشکلات و مسائل میں گھرا ہوا ایک تعلیمی ادارہ ہے جس میں دل کے ایک ارب پتی نے قابل قدر اور یادگار کام کر دکھایا۔ میں جب بھی اس سکول کو ملک کے بڑے تعلیمی اداروں کے ساتھ تقابلی نگاہ سے دیکھتا ہوں تو مجھے یہ مراعات یافتہ ادارے اس بے خانماں سکول کے مقابلے میں ہیچ نظر آتے ہیں۔ آج سرزمین وطن سید عطا محمد شاہ صاحب جیسے دل کے ارب پتیوں کے انتظار میں ہے جو ملک کے کسی حصے میں نادار عوام کے بچوں کے لئے دل سوزی اور تندہی کے ساتھ گورنمنٹ مڈل سکول نورنگا جیسے تعلیمی اداروں کی بنیاد رکھیں۔"

خاور نقوی صاحب سے سید عطا محمد شاہ صاحب کے بارے میں سن کر دل سے ہوک سی اٹھی اور مجھے اپنے وہ تمام استاد یاد آ گئے جو ہمیں شاہ صاحب مرحوم کی سپرٹ سے پڑھاتے تھے' ہمارے پاس اچھے سکول نہیں تھے' سکولوں میں کمرے' بینچ اور تختہ سیاہ بھی نہیں ہوتے تھے' ہم لوگ ننگی اور ٹھنڈی زمین پر بیٹھتے تھے اور ہمیں اس وقت کانونٹ کے سپیلنگ تک نہیں آتے تھے لیکن ہمارے پاس شاہ صاحب جیسے استادوں کی شکل میں اللہ کی نعمت موجود تھی۔ آج یہ اس نعمت کا اعجاز ہے' میں اور میرے طبقے کے لوگ نہ صرف اس معاشرے میں پورے قد سے کھڑے ہیں بلکہ کانونٹ سکولوں سے فارغ التحصیل کلاس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لوگوں کا حق بھی مانگ رہے ہیں۔ یہ سب دل کے ان ارب پتیوں کی مہربانی تھی جنھوں نے خود بھوکے رہ کر ہم جیسے لوگوں کو علم اور فکر کا رزق دیا تھا' جنھوں نے علم کو کاروبار نہیں بلکہ عبادت بنایا تھا۔

ریڈ زون

شیخ صاحب نے کھانس کر جواب دیا "میں ہسپتال شفٹ ہو رہا ہوں" میں نے انہیں غور سے دیکھا' وہ ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک صحت مند دکھائی دے رہے تھے' ان کے چہرے کی سرخی اور آواز کی کھنک بھی قائم تھی' وہ مسکرائے "مجھے معلوم ہے تم وجہ پوچھو گے" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا' انہوں نے اپنے گنج پر ہاتھ پھیرا اور پراسرار لہجے میں بولے "یار کل صدر بش پاکستان کے دورے پر آ رہے ہیں" وہ خاموش ہو گئے' یہ حیرت کا دوسرا بم تھا' میں نے عرض کیا "حضور صدر بش کا آپ کے ساتھ کیا تعلق" شیخ صاحب نے قہقہہ لگایا "یار میں 55 برس کا ہو چکا ہوں' ڈاکٹر کہتے ہیں پاکستان جیسے ممالک میں 55 برس ہائی رسک عمر ہے اور اس عمر کے بابوں کو کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے' انہیں ہارٹ اٹیک ہو سکتا ہے' انہیں برین ہیمبرج' فالج اور شوگر ہو سکتی ہے اور کسی بھی وقت ان کے گردے فیل ہو سکتے ہیں" وہ سانس لینے کیلئے رکے' انہوں نے پانی کے جگ کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ گویا ہوئے "صدر بش پاکستان آ رہے ہیں' وہ جتنی دیر اسلام آباد میں رہیں گے' پورا شہر سیز رہے گا' تمام سڑکوں پر ٹرانسپورٹ معطل رہے گی' تمام ٹریفک بند کر دی جائے گی' اس دوران اس شہر میں پرندہ تک پر نہیں مار سکے گا" وہ رکے' جگ کی طرف دیکھا اور پھر گویا ہوئے "میں 55 سال کا بڈھا ہوں' میں سوچتا ہوں اگر ان دنوں مجھے کچھ ہو گیا تو میں ہسپتال کیسے پہنچوں گا' قریب ترین ہسپتال بھی میرے گھر سے 25 کلو میٹر دور ہے اور اس ہسپتال کے راستے میں بھی ٹھیک ٹھاک ریڈ زون پڑتا ہے"

مجھے شیخ صاحب کا مسئلہ سمجھ آ گیا' میں نے ان سے عرض کیا "ماشاء اللہ آپ کی پلاننگ تو لاجواب ہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے اگر ان دنوں خدانخواستہ آپ کے گھر کا کوئی دوسرا فرد بیمار ہو گیا تو کیا بنے گا' یہ تمام بیماریاں آپ کی بیگم صاحبہ' آپ کے دونوں بیٹوں اور آپ کی بہوؤں کو بھی تو لگ سکتی ہیں" شیخ صاحب نے میری طرف دیکھا اور قہقہہ لگا کر بولے "میں پورے خاندان کا بندوبست کر کے ہسپتال جا رہا ہوں' میری ایک بہو امید سے ہے میں نے اسے اس کے میکے بھجوا دیا ہے' میں نے پوتوں اور پوتیوں کو سکول سے چھٹی کرا دی ہے اور وہ اپنے ننھیال چلے گئے ہیں' میرے دونوں بیٹوں کو دفتروں سے چھٹی ہے' ان کے دفتر ریڈ زون میں آتے ہیں اور حکومت

نے جمعرات کو یہ سارا علاقہ خالی کرا لیا تھا' وہ یہ دن مری میں گزاریں گے' میری بیگم میرے ساتھ ہسپتال رہے گی جبکہ تمام نوکر اپنے اپنے گھروں میں رہیں گے'' ان کا منصوبہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اور میں نے ان سے عرض کیا ''آپ ایک صحت مند شخص ہیں' ڈاکٹر آپ کو ہسپتال کیوں داخل کریں گے'' شیخ صاحب نے قہقہہ لگایا ''مجھے یہ راستہ ڈاکٹر ہی نے دکھایا تھا' ڈاکٹر قصوری میرے پرسنل فزیشن ہیں' انہوں نے گزشتہ روز مجھے فون کیا اور مجھے یہ اطلاع دی اسلام آباد کے تمام صاحب ثروت دو دن کیلئے ہسپتال داخل ہو رہے ہیں' ہمارے پاس ایک کمرہ اور دو بیڈ خالی ہیں' اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں یہ بیڈ اور یہ کمرہ آپ کیلئے بک کرا سکتا ہوں' آپ تیس ہزار روپے جمع کرائیں اور دو دن ہسپتال میں موج کریں' میں نے ڈاکٹر سے سوچنے کیلئے وقت مانگا تو اس نے کہا شیخ صاحب ہمارے پاس ایک لمبی چوڑی ویٹنگ لسٹ ہے اگر آپ نے فوراً فیصلہ نہ کیا تو شام تک آپ کو یہ کمرہ ایک لاکھ روپے میں بھی نہیں ملے گا لہٰذا میں ڈر گیا اور میں نے فوراً بکنگ کرا دی' میں ابھی ابھی تیس ہزار روپے جمع کرا کر آیا ہوں'' میرے لیے یہ بات انکشاف کی حیثیت رکھتی تھی' میں نے ان سے پوچھا ''ہسپتال میں آپ کے علاوہ کون کون ہے'' شیخ صاحب نے قہقہہ لگایا ''وہ تمام لوگ جو تیس چالیس ہزار روپے افورڈ کر سکتے ہیں' لوگوں نے تو اپنے باورچی اور بچن تک ہسپتالوں میں شفٹ کر لیے ہیں' آج کل ہسپتال' ہسپتال کم اور پکنک پوائنٹ زیادہ لگ رہے ہیں''

میں خاموشی سے ان کی طرف دیکھتا رہا' وہ مسکرائے ''یار میں اس بات پر حیران ہوں بش ہماری عزت میں اضافے کیلئے پاکستان آ رہے ہیں یا پھر اس ملک کے لوگوں کو سزا دینے' ان کی آمد سے چار دن پہلے پورا شہر سیز کر دیا گیا' مارگلہ کی پہاڑیوں پر توپیں لگا دی گئیں' تمام گاڑیوں کی تلاشی شروع ہو گئی' جمعرات تک امریکہ کے 730 کمانڈوز اسلام آباد پہنچ گئے تھے' وہ اپنے ساتھ اپنی گاڑیاں' سکیورٹی آلات اور سکیورٹی سسٹم بھی لائے تھے' انہیں سیٹلائٹ کی سہولت بھی حاصل تھی' وہ لوگ اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر اسلام آباد کا چپہ چپہ دیکھ رہے تھے' ہماری فوج اور ہماری پولیس بھی ہماری جیبوں' ہمارے کپڑوں کی تلاشی لے رہی تھی' میرا بیٹا راول ڈیم پر واک کرنے جاتا ہے' کل شام اسے راستے میں روک لیا گیا' اس کا شناختی کارڈ چیک کیا گیا' اس سے اس کا رینک پوچھا گیا' اس نے بتایا' وہ ایک پرائیویٹ فرم میں اکاؤنٹنٹ ہے تو سکیورٹی افسر نے اس سے کہا آپ اگلے چار دن اس جگہ واک نہیں کر سکتے' یار میں پچھلے تیس برس سے اس شہر میں رہ رہا ہوں لیکن میں نے پچھلے دو دنوں میں خود کو اس شہر میں جتنا اجنبی اور مشکوک پایا ہے اتنا میں نے کبھی محسوس نہیں کیا' مجھے محسوس ہوتا ہے' اس شہر' اس ملک کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں' میں ایک اعتدال پسند اور روشن خیال پاکستانی نہیں ہوں' میں ایک دہشت گرد اور شدت پسند شخص ہوں' یار میں گھر سے نکلتا ہوں تو مجھے اس ملک کا وہ سپاہی بھی مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے جو مجھے دس برسوں سے جانتا ہے' یار مجھے امریکی گاڑیاں اور امریکی سیٹلائٹ تک گھورتے ہیں' یار مجھے یوں محسوس ہوتا ہے یہ بش صاحب صرف مجھے میری اوقات سمجھانے آ رہے ہیں اور وہ صرف مجھے ذلیل کرنے کیلئے پاکستان آ رہے ہیں' یار میں افورڈ کر سکتا ہوں اس لیے میں یہ دو دن ہسپتال میں لیٹ کر بش صاحب کا عتاب جھیل لوں گا لیکن یار تم ان لوگوں کے بارے

میں سوچو جو یہ دو دن گھروں میں گزاریں گے یار سوچو اگر ان لوگوں کو ایمرجنسی میں ہسپتال جانا پڑ جائے' کسی نے ایمرجنسی میں شہر سے باہر جانا ہو یا کسی نے ہنگامی حالت میں شہر میں آنا ہو تو اس کا کیا بنے گا' وہ کہاں جائے گا' یار کیا دنیا کے کسی دوسرے ملک میں بھی ایسا ہوتا ہے' یار اس سے تو اچھا ہے جب بھی ہمارے حکمرانوں کو بش صاحب کی زیارت کی حاجت ہو تو وہ پوری کابینہ کو ساتھ لیں اور امریکہ چلے جائیں' بش صاحب سے ہاتھ ملائیں' تصاویر کھینچوائیں اور مسکراتے مسکراتے واپس آ جائیں' کم از کم ہماری جان تو بچ جائے" مجھے محسوس ہوا شیخ صاحب ذرا سے جذباتی ہو گئے ہیں اور وہ جذبات کی رو میں بہہ کر یہ تک بھول گئے ہیں وہ ایک پاکستانی شہری ہیں' وہ جذبات کی رو میں خود کو کسی اچھے ملک کا اچھا شہری سمجھنے لگے ہیں' ان کا خیال ہے جس طرح برطانیہ' فرانس اور جاپان کے شہری ایسے دوروں کے دوران حکومتوں کو اپنے شہری حقوق سلب کرنے کی اجازت نہیں دیتے' بالکل اسی طرح اس ملک کے حکمران اپنے شہریوں کی ضروریات اور مجبوریوں کا بھی خیال رکھیں گے' مجھے محسوس ہوا شیخ صاحب کی دماغی حالت خراب ہو چکی ہے لہٰذا انہیں یہ دو دن واقعی ہسپتال میں گزارنے چاہئیں انہیں واقعی ہسپتال شفٹ ہو جانا چاہیے۔

مہنگائی

جناب سلیمان شاہ وزیراعظم شوکت عزیز کے مشیر ہیں ان کا شمار پاکستان کے نامور اقتصادی ماہرین میں ہوتا ہے چند روز پہلے ''جیو'' کے ایک پروگرام میں مجھے ان سے گفتگو کا شرف حاصل ہوا ان کے ساتھ خزانے کے وزیر مملکت عمر ایوب بھی تھے عمر ایوب پاکستان کے سابق صدر ایوب خان کے پوتے ہیں یہ پروگرام ''مہنگائی'' کے حوالے سے تھا' پروگرام کے شروع میں عمر ایوب نے مہنگائی کی دو ایسی حیران کن وجوہات بیان کیں جنہوں نے میرے چھکے چھڑا دیئے انہوں نے فرمایا ''پاکستان اقتصادی لحاظ سے ترقی کر رہا ہے اور دنیا میں جو ملک ترقی کرتے ہیں ان میں مہنگائی کا سیلاب آتا ہے دوسرا دنیا میں پٹرول کی قیمتیں بڑھی ہیں جس کا اثر پوری دنیا کی معیشت پر ظاہر ہو رہا ہے'' میں نے ان سے عرض کیا ''حضور اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں'' انہوں نے مہربانی فرما کر مجھے امان دے دی' میں نے عرض کیا ''پٹرول کی قیمتیں تو پوری دنیا میں بڑھی ہیں لیکن مہنگائی صرف پاکستان میں آئی ہے برطانیہ میں دودھ اور ڈبل روٹی کی قیمتیں 1967ء میں طے ہوئی تھیں ان میں آج تک کوئی اضافہ نہیں ہوا امریکہ میں کھانے پینے کی اشیاء کی قیمتیں وہی ہیں جو آج سے پانچ برس پہلے تھیں اسی طرح مڈل ایسٹ میں بھی قیمتیں مستحکم ہیں حتیٰ کہ بھارت تک میں پٹرول کی قیمتیں اشیائے ضرورت پر اثر انداز نہیں ہوئیں جبکہ پاکستان میں پچھلے پانچ برسوں میں ضروریات زندگی کی قیمتوں میں تین گنا اضافہ ہوا دوسرا دنیا میں صرف پاکستان واحد ملک نہیں جو ترقی کر رہا ہے اس وقت دنیا میں ایسے 30 ممالک ہیں جن کی معیشت مستحکم ہو رہی ہے لیکن ان میں سے کسی ملک میں مہنگائی نہیں ہوئی'' جناب سلیمان شاہ نے میری بات کاٹی اور پوری اقتصادی قوت سے بولے فرمایا ''پاکستان میں مہنگائی ہے ہی نہیں آپ غلط کہہ رہے ہیں'' ان کے اس دعوے سے وہاں سراسیمگی پھیل گئی اور ہم ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

جناب سلیمان شاہ کی بات درست تھی اگر ان کے زاویے سے دیکھا جائے تو پاکستان نہ صرف ایک سستا ملک ہے بلکہ اس میں چیزوں کے نرخ تیزی سے گر رہے ہیں لیکن یہ الگ بات ہے اس سستے پن کا فائدہ کسی عام شخص کو نہیں پہنچ رہا دنیا میں چیزیں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک وہ جنہیں ہم ضروریات زندگی کہتے ہیں یہ وہ چیزیں ہوتی

ہیں جن کے بغیر کوئی ذی روح زندہ نہیں رہ سکتا' مثلاً آٹا' دالیں' گھی' دودھ اور سبزیاں جبکہ دوسری چیزوں کو ہم سامان تعیش کہتے ہیں' یہ چیزیں زندگی کو آرام دہ بناتی ہیں لیکن ان کی کمی یا غیر موجودگی سے زندگی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا' مثلاً ریفریجریٹر' ٹیلی ویژن' گاڑیاں اور ڈائننگ ٹیبل وغیرہ' پوری دنیا میں حکومتیں اشیائے ضرورت پر نظر رکھتی ہیں وہ ان کی قیمتیں بڑھنے نہیں دیتیں کیونکہ وہ جانتی ہیں ایک عام غریب آدمی سے لے کر صدر تک سب کی زندگی کا دارومدار انہی اشیاء پر ہوتا ہے جبکہ حکومتیں ان کے مقابلے میں سامان تعیش کی قیمتوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتیں' ان کی قیمتیں خواہ دس گناہ بڑھ جائیں حکومتوں کو پرواہ نہیں ہوتی لیکن بدقسمتی سے پاکستان میں اس سے الٹ ہے' پاکستان میں سامان تعیش کی قیمتیں تو تیزی سے گر رہی ہیں جبکہ اشیائے ضرورت کے نرخ آسمان کو چھو رہے ہیں' مثلاً آپ ایک سال کی قیمتیں نکال کر دیکھ لیں آپ کو معلوم ہو گا 60 انچ کا وہ ٹیلی ویژن جو سال پہلے تین ساڑھے تین لاکھ روپے میں ملتا تھا وہ آج لاکھ سے ڈیڑھ لاکھ روپے میں دستیاب ہے' اسی طرح دو لاکھ کا فریج ایک لاکھ روپے میں اور 85 لاکھ کی گاڑی 60 لاکھ روپے میں مل رہی ہے اس کے برعکس اشیائے صرف میں سے کبھی گھی غائب ہو جاتا ہے' کبھی دالیں' کبھی چینی اور کبھی آلو' کبھی پیاز ناقابل خرید ہو جاتے ہیں' کبھی چینی مہنگی ہو جاتی ہے اور کبھی گھی' جناب سلیمان شاہ اور ان کی حکومت جب تعیشات کی قیمتوں پر نظر ڈالتی ہے تو انہیں یہ ملک سستا لگتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں جب ایک عام شہری ضروریات زندگی کی تلاش میں باہر نکلتا ہے تو اسے روپیہ چھوٹا اور آلو بڑے دکھائی دیتے ہیں اور اس کے منہ سے چیخ نکل جاتی ہے' وہ دہائی دینے لگتا ہے۔

سوچنے کی بات ہے یہ مہنگائی ہے کیوں؟ اور دنیا نے اسے کس طرح کنٹرول کیا تھا؟ پوری دنیا میں حکومتیں ضروریات زندگی پر ٹیکسوں کی شرح کم رکھتی ہیں' وہ ٹیکس کا یہ خسارہ سامان تعیش پر بھاری ٹیکس لگا کر پوری کرتی ہیں لیکن پاکستان میں حکومت سرمایہ حاصل کرنے کیلئے ان ڈائریکٹ ٹیکس بڑھا دیتی ہے' اس وقت حکومت 32 فیصد ڈائریکٹ ٹیکس لے رہی ہے جبکہ ان ڈائریکٹ ٹیکس 68 فیصد تک ہیں' اس ان ڈائریکٹ ٹیکس کا نتیجہ مہنگائی کی شکل میں نکل رہا ہے' اب سوال یہ ہے پاکستان میں ڈائریکٹ ٹیکس وصول کیوں نہیں کئے جاتے؟ اس کی وجہ بڑی دلچسپ ہے' دنیا بھر میں حکومتیں جن لوگوں سے ڈائریکٹ ٹیکس وصول کرتی ہیں پاکستان میں وہ لوگ یا تو حکومت کا حصہ ہوتے ہیں یا پھر وہ حکومت سے کہیں زیادہ مضبوط ہوتے ہیں لہٰذا حکومت اپنا خسارہ پورا کرنے کیلئے اندھا دھند ان ڈائریکٹ ٹیکس لگا دیتی ہے جس کے نتیجے میں ضروریات زندگی قوت خرید سے باہر ہو جاتی ہیں' آپ حکومت سے پوچھئے وہ لوگوں کو 20 روپے لیٹر پٹرول کیوں نہیں دیتی' حکومت پٹرول کے ہر لیٹر پر 24 روپے ٹیکس کیوں لیتی ہے؟ اگر حکومت عوام کو پٹرول کے ہر لیٹر پر 24 روپے کی چھوٹ دے اور یہ خسارہ بالائی طبقے سے وصول کرے تو پاکستان کے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے لیکن حکومت ایسا کبھی نہیں کرے گی کیونکہ اس کے نتیجے میں حکومت میں شامل لوگوں کو اپنی جیبیں خالی کرنا پڑیں گی اور یہ ممکن نہیں۔

میں نے اس پروگرام کے دوران اپنے معزز ساتھیوں سے پوچھا تھا' کیا آپ لوگوں کو دودھ کی قیمت

معلوم ہے وہ گھبرا گئے' میں ہنس پڑا اور میں نے ان سے کہا آپ ہماری بدقسمتی ملاحظہ کیجئے' ہماری اقتصادی پالیسیاں وہ لوگ بنا رہے ہیں' جنہیں دودھ کے نرخ تک معلوم نہیں ہیں اور یہ وہ جنس ہے جو پاکستان کے 15 کروڑ لوگ روزانہ استعمال کرتے ہیں' میں نے انہیں بتایا مہاتما گاندھی نے نہرو کو وصیت کی تھی ''نہرو دیکھو تم جب تک بھارت میں آٹے' سائیکل اور سینما کے ٹکٹ کی قیمت نیچے رکھو گے تمہاری حکومت چلتی رہے گی' نہرو نے گاندھی سے وجہ پوچھی تھی تو انہوں نے فرمایا تھا' یہ وہ اشیاء ہیں جو اس ملک کا غریب شہری استعمال کرتا ہے'' نہرو نے یہ بات پلے باندھ لی تھی لہذا وہ موت تک بھارت کا وزیراعظم رہا لیکن ہمارے حکمران قیامت تک حکمران رہنا چاہتے ہیں مگر وہ غریب کو اس کا حق دینے کیلئے تیار نہیں ہیں۔

سات سوالوں کے سات جواب

دنیا میں یہودی دکاندار اور گجراتی بنئے منافع خوری میں ید طولیٰ رکھتے ہیں' ان لوگوں کے نفع اور نقصان کے اپنے ہی پیمانے ہوتے ہیں' یہ لوگ منافع میں کمی کو نقصان تصور کرتے ہیں مثلاً ایک گجراتی بنیا گلی میں بیٹھ کر رو رہا تھا' کسی نے رونے کی وجہ پوچھی تو وہ روتے ہوئے بولا ''مجھے دو لاکھ روپے نقصان ہو گیا'' پوچھنے والے نے نقصان کی تفصیل دریافت کی' وہ آنکھیں پونچھ کر بولا ''مجھے پچھلے ہفتے مرچوں میں دس لاکھ روپے منافع ہوا تھا لیکن اس بار صرف آٹھ لاکھ روپے بچے ہیں''

مجھے نفع نقصان کا یہ پیمانہ قومی اسمبلی میں جناب عمر ایوب کی تقریر سن کر یاد آ گیا' خزانہ کے وزیر مملکت نے 22 مارچ کو قومی اسمبلی میں پٹرول کی قیمتوں کے حوالے سے اپوزیشن سے سات سوال پوچھے' ان کا فرمانا تھا ''ان سوالوں کا دیانتدارانہ جواب ساری قوم کو صحیح فیصلے تک پہنچنے میں مدد دے گا'' ان سات سوالات کو آج سات دن ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک اپوزیشن کی طرف سے ان کے جواب نہیں آئے لہٰذا قوم ایک ہفتہ گزرنے کے باوجود صحیح فیصلے تک نہیں پہنچ سکی چنانچہ میں نے اس سلسلے میں برادرم عمر ایوب کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ ایک پاکستانی ہونے کی حیثیت سے قوم کو صحیح فیصلے تک پہنچانا میری بھی اتنی ہی ڈیوٹی ہے جتنی ذمہ داری اپوزیشن ارکان کے نازک کندھوں پر استوار ہوتی ہے' برادرم عمر ایوب کا پہلا سوال تھا ''کیا پاکستان 80 فیصد تیل عالمی منڈی سے نہیں خریدتا'' عمر ایوب کا سوال درست ہے واقعی پاکستان اپنی ضرورت کا 80 فیصد تیل درآمد کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سچ ہے پاکستان دنیا میں تیل درآمد کرنے والا واحد ملک نہیں' دنیا کے 180 ممالک میں 91 ممالک سو فیصد پٹرول درآمد کرتے ہیں' 32 ممالک 70 سے 90 فیصد' 11 ممالک 50 فیصد اور 27 ممالک اپنی ضرورت کا 30 سے 50 فیصد تیل درآمد کرتے ہیں' دنیا میں 6 ممالک تیل کے معاملے میں خود کفیل ہیں جبکہ 13 ممالک تیل برآمد کرتے ہیں' پوری دنیا عالمی منڈی سے روزانہ 84 اعشاریہ 3 ملین بیرل تیل خریدتی ہے اور پاکستان بھی تیل خریدنے والے ان 161 ممالک میں سے ایک ملک ہے' ان کا دوسرا سوال تھا ''کیا حکومت نے 2004ء میں پٹرول کی قیمتیں برقرار رکھنے کیلئے 39 ارب روپے خرچ نہیں کئے'' عمر ایوب

کے اس سوال کا جواب ہے ''نہیں'' حقیقت یہ ہے حکومت پٹرول پر 45 سے لے کر 55 فیصد تک ٹیکس وصول کرتی ہے' اس وقت بھی حکومت عالمی منڈی سے 432 ڈالر میٹرک ٹن خام تیل خرید رہی ہے' اس خام تیل سے پٹرولیم کی دس مصنوعات حاصل کی جاتی ہیں' سب سے پہلے فضائیہ کے طیاروں کیلئے جیٹ آئل نکالا جاتا ہے' اس کے بعد ہائی آکٹین' پھر پٹرول' ہائی سپیڈ ڈیزل' لائیٹ ڈیزل' فرنس آئل' بیوٹمن' گریس' لوبریکنٹ آئل اور سڑکوں پر بچھانے والی تارکول' اس ایک میٹرک ٹن خام تیل سے ایک ہزار 3 سو 62 لیٹر پٹرول نکلتا ہے' اگر ایک میٹرک ٹن خام تیل سے صرف پٹرول نکالا جائے اور باقی 9 اشیاء ضائع کر دی جائیں تو بھی یہ پٹرول 18 روپے 39 پیسے لیٹر پڑتا ہے' یہ 18 روپے 39 پیسے لیٹر پٹرول بازار میں 45 روپے 60 پیسے لیٹر بیچا جا رہا ہے' آپ خود فیصلہ کریں حکومت اس پر کتنا ٹیکس لے رہی ہے جبکہ اس خام تیل سے حاصل ہونے والی دوسری مصنوعات اس منافع کے علاوہ ہیں' اب آتے ہیں ان 39 ارب روپے کی طرف' یہ درست ہے حکومت نے 2004ء میں اپنے ٹیکس میں کمی کی تھی جس کے نتیجے میں تیل کی مد میں حاصل ہونے والے ٹیکس میں 39 ارب روپے کم ہو گئے تھے' حکومت ان 39 ارب روپوں کو نقصان قرار دے رہی ہے' ان کا تیسرا سوال تھا ''اگر حکومت عوام کو تیل کی مد میں 70 سے 80 ارب روپے سبسڈی دے تو کیا ملک مالی طور پر تباہ نہیں ہو جائے گا'' اس کا جواب بھی ہے ''نہیں'' کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے یہ سبسڈی دراصل سبسڈی ہے ہی نہیں' آپ خزانے میں سے ایک پیسہ نہیں دیں گے' آپ تیل کے منافع میں سے 70 سے 80 ارب روپے کی قربانی دیں گے' دوسرا اگر مان لیا جائے یہ سبسڈی ہے تو بھی آپ یہ سبسڈی کسی دشمن کو نہیں دے رہے' آپ یہ اپنے عوام' اپنے ملک کے لوگوں کو دے رہے ہیں' ان لوگوں کو جو آپ کی رعایا ہیں اور آپ نے جن کے حقوق کی حفاظت کا حلف اٹھایا ہے' چوتھا سوال تھا '' کیا حکومت کے مخالفین پاکستان کو مالی طور پر تباہ نہیں کرنا چاہتے'' اس کا جواب بھی ہے ''نہیں'' سوال یہ ہے تیل کے معاملے میں حکومت کی مخالفت کون لوگ کر رہے ہیں؟ یہ لوگ بھی ارکان اسمبلی ہیں' یہ بھی عوام کے نمائندے ہیں اور انہیں بھی پاکستان کے عوام نے اپنی بات ایوان اقتدار تک پہنچانے کیلئے اسمبلی بھیجا ہے لہٰذا یہ لوگ مخالفت کر کے اپنا فرض ادا کر رہے ہیں' اپنی آئینی ذمہ داری نبھا رہے ہیں' پانچواں سوال تھا '' کیا شوکت عزیز حکومت تیل پر ٹیکس لگانے والی پہلی حکومت ہے؟'' عمر ایوب کا یہ سوال درست ہے واقعی تیل پر ٹیکس لگانے والی یہ پہلی حکومت نہیں' ماضی میں بھی تیل پر ٹیکس لگتا رہا تھا لیکن سوال یہ ہے اگر ماضی کی حکومتیں عوام پر ظلم کرتی رہی ہیں تو کیا آنے والی حکومت پر یہ ظلم جاری رکھنا فرض ہو چکا ہے' کیا ماضی کی زیادتیاں حال اور مستقبل کی زیادتیوں کا جواز بن سکتی ہیں' اگر ماضی میں سو قتل ہوتے تھے تو کیا آج بھی سو قتل ہونے چاہئیں'' ان کا چھٹا سوال تھا '' اگر حکومت تیل پر ٹیکس نہیں لگائے گی تو کیا وہ یہ کمی دوسرے ٹیکسوں کے ذریعے پوری نہیں کرے گی'' عمر ایوب کا یہ سوال' دراصل سوال نہیں' جواب ہے ہاں حکومت پٹرول پر ٹیکس ختم کر دے اور یہ کمی انکم ٹیکس جیسے دوسرے ڈائریکٹ ٹیکسوں سے پوری کرے' حکومت تمام بڑی گاڑیوں پر پٹرول ٹیکس لگا دے' ایک کینال سے بڑے پلاٹوں پر ٹیکس لگا دے اور دوسری گاڑی اور دوسرے گھر

پر بھاری ٹیکس لگا دے تو یہ کمی بڑی آسانی سے پوری ہو جائے گی ان کا ساتواں سوال تھا "کیا بھارت میں پٹرول کی قیمتیں پاکستان سے زیادہ نہیں ہیں" عمر ایوب کی بات درست ہے واقعی بھارت میں پٹرول کی قیمتیں زیادہ ہیں وہاں پٹرول پچاس روپے لیٹر بک رہا ہے لیکن اس وقت میکسیکو اور برازیل میں پٹرول کی قیمتیں بھارت سے بھی زیادہ ہیں وہاں پٹرول پاکستانی کرنسی میں 92 روپے لیٹر ملتا ہے لہٰذا اگر دنیا کے کسی ملک میں کوئی چیز مہنگی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں آپ بھی اپنے ملک میں اس کی قیمت بڑھا دیں' دوسری بات بھارت میں پٹرول مہنگا ہے لیکن وہاں دودھ' آٹا' سبزیاں' گھی' چینی اور دالیں سستی ہیں' اگر آپ کا معیار بھارت ہے تو آپ نے اس کی پیروی میں یہ چیزیں سستی کیوں نہیں کیں؟ کیا یہ زیادتی نہیں؟ اگر یہ زیادتی نہیں تو صدر پرویز مشرف نے حکومت کو مہنگائی کم کرنے کا حکم کیوں دیا' وزیراعظم نے اس سلسلے میں 3 رکنی کمیٹی کیوں بنائی؟"

یہ تو تھے برادر عمر ایوب کے سات سوال اور ان کے جواب' اب میں ان سے صرف ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں "حکومت 143 وفاقی وزراء' وزرائے مملکت' سٹینڈنگ کمیٹیوں کے چیئرمینوں اور پارلیمانی سیکرٹریوں کو مفت پٹرول فراہم کرتی ہے' ان میں سے 70 وزراء مہینے میں جتنا پٹرول چاہیں مفت حاصل کر سکتے ہیں جبکہ باقی لوگوں کی حد مقرر ہے' سوال یہ ہے' پٹرول کی قیمتوں میں اضافے کے بعد جب پوری قوم بحران کا شکار ہے تو ان 143 لوگوں میں سے وہ کون سا شخص ہے جس نے یہ اعلان کیا ہو' میں آج سے مفت پٹرول نہیں لوں گا' میں قوم کے مفاد میں اپنی یہ مراعات واپس کرتا ہوں"

قوم کو صحیح فیصلہ کرنے کیلئے اب عمر ایوب کے جواب کا انتظار رہے گا۔
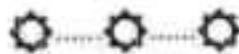
ذمہ داری

1956ء میں لال بہادر شاستری بھارت میں ریلوے کے وزیر تھے' ان کے دور میں جنوبی بھارت میں ریل کا حادثہ ہوا' اس حادثے میں 33 لوگ مارے گئے' لال بہادر شاستری نے حادثے کی ذمہ داری قبول کی اور وزارت سے استعفیٰ دے دیا' ان کے استعفیٰ سے ایک برس بعد 29 ستمبر 1957ء کو ساہیوال میں بھی ریل کا ایک حادثہ ہوا جس میں اڑھائی سو لوگ جاں بحق ہو گئے' اس دور میں ایک مشہور مسلم لیگی رہنما پاکستان ریلوے کے وزیر تھے' قومی اسمبلی میں کسی رکن نے لال بہادر شاستری کا واقعہ بیان کیا اور وفاقی وزیر سے مستعفی ہونے کی درخواست کی' محترم وزیر اس وقت ایوان میں موجود تھے' وہ فوراً اپنی نشست پر کھڑے ہوئے اور مسکرا کر بولے "میں الحمد اللہ مسلمان ہوں اور کسی مسلمان کو کسی ہندو کی پیروی نہیں کرنی چاہیے" ایوان میں ایک فلک شگاف قہقہہ گونجا اور ساہیوال کے اڑھائی سو مظلوموں کا خون انکوائری کمیٹی کی فائلوں میں جذب ہو گیا۔

پاکستان دو لحاظ سے بدقسمت ملک ہے' اس ملک میں جب بھی ریلوے کا کوئی حادثہ ہوتا ہے حکومت اور میڈیا اسے تاریخی حادثہ قرار دیتے ہیں اور دوم آج تک پاکستان کی کسی اہم شخصیت نے ریلوے کے کسی تاریخی حادثے کی ذمہ داری قبول نہیں کی' 1947ء سے 2005ء تک ریلوے کے کسی وزیر' کسی مشیر' کسی چیئرمین اور کسی ڈائریکٹر جنرل نے کسی حادثے کے بعد استعفیٰ نہیں دیا' آج تک ریلوے کے کسی بڑے ذمہ دار کو سزا نہیں ہوئی' پاکستان میں ریلوے کے حادثے میں دو افراد جاں بحق ہو جائیں یا پانچ سو لوگ آج تک سزا کا عمل کانٹا بدلنے والوں' ڈرائیوروں اور سٹیشن ماسٹروں سے اوپر نہیں گیا' آپ دلچسپ امر ملاحظہ کیجئے 1990ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت تھی' 3 جنوری 1990ء کو سانگی کے مقام پر ریلوے کا حادثہ ہوا' اس حادثے میں 307 لوگ جاں بحق ہو گئے' اس وقت یہ پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ تھا' ظفر لغاری ریلوے کے وزیر تھے' لوگ مطالبہ کر رہے تھے وفاقی وزیر اس حادثے کی ذمہ داری قبول کریں اور استعفیٰ دے دیں' ظفر لغاری بھی خود کو حادثے کا ذمہ دار سمجھتے تھے لہٰذا انہوں نے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کر لیا' کابینہ کے اجلاس میں انہوں نے بے نظیر بھٹو کے کان میں سرگوشی کی "میں استعفیٰ لکھ کر لے آیا ہوں" ابھی ان کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ کسی دوسرے وزیر نے محترمہ کو

اپنی طرف متوجہ کر لیا' محترمہ اس وزیر سے فارغ ہوئیں تو وہ ریلوے' حادثے اور ظفر لغاری تینوں کو بھول چکی تھیں' ظفر لغاری نے استعفیٰ پھاڑا' پاؤں کے قریب پڑی ٹوکری میں ڈالا اور سر جھٹک کر دوبارہ کاروبار سلطنت میں مصروف ہو گئے۔

پاکستان میں پچھلے پندرہ برسوں میں ریل کے 25 بڑے حادثے ہو چکے ہیں' ان حادثوں میں اب تک تین ہزار لوگ مر چکے ہیں' یہ حادثے اور ان حادثوں میں مرنے والوں کی تعداد دنیا میں سب سے زیادہ ہے' کل 13 جولائی کو گھوٹکی میں تین مسافر ٹرینیں ٹکرا گئیں' یہ پاکستان کا پہلا ''ملٹی پل ریلوے ایکسیڈنٹ'' ہے' یہ ایکسیڈنٹ ثابت کرتا ہے ریلوے کا نظام انتہائی نااہل اور سفاک لوگوں کے ہاتھوں میں ہے' دنیا کہتی ہے اگر دو ٹرینیں ٹکرا جائیں تو یہ حادثہ ہو سکتا ہے لیکن اگر ایک ہی جگہ تین ٹرینیں ٹکرا جائیں تو یہ حادثہ نہیں غفلت' نااہلی اور سفاکی ہوتی ہے لہٰذا 13 جولائی کے اس حادثے نے وفاقی وزیر سے لے کر گھوٹکی سٹیشن کی انتظامیہ تک سب کی سفاکی' نااہلی اور غفلت ثابت کر دی لیکن مجھے یقین ہے اس حادثے کی ذمہ داری بھی پاکستان کا کوئی بڑا شخص قبول کرے گا اور نہ ہی استعفیٰ دے گا' یہ حادثہ بھی ڈرائیور' کانٹا بدلنے والے کلرک یا سگنل دینے والوں کے کھاتے میں ڈال دیا جائے گا' دو چار مہینے تک اس کی انکوائریاں ہوں گی اور اس کے بعد اسے بھی داخل دفتر کر دیا جائے گا اور اس کے بعد مزید دو چار ہزار مسافروں کو موت کی پٹڑی پر چڑھا دیا جائے گا' یہ ہیں ہماری روایات' ہم نے آج تک پاکستان کے کسی حادثے کو جرم قرار نہیں دیا' ہم نے آج تک کسی وزیر کو ان حادثوں کا مجرم قرار نہیں دیا' مجھے یقین ہے اگر ہم ایک بار سرحد کے اس پار دیکھ لیں تو ہم شرم سے پانی پانی ہو جائیں' بھارت میں بھی یہی ریلوے ہے' وہاں بھی یہی پٹڑی ہے لیکن آپ بھارت جا کر دیکھ لیں آپ کو وہاں کے ریلوے سٹیشنوں اور پاکستان کے سٹیشنوں کے کلچر' عمارتوں' زبان اور نظام میں کوئی فرق محسوس نہیں ہو گا' دہلی ریلوے سٹیشن اور لاہور کے سٹیشن کے پنکھے تک ایک ہی برانڈ اور ایک ہی شکل کے ہیں لیکن جہاں تک حادثوں اور ان کے ردعمل کی بات ہے تو پاکستان اور بھارت کے رویوں میں زمین آسمان کا فرق ہے' وہاں اگر اس قسم کا کوئی حادثہ ہو جائے تو ریلوے وزیر پہلا شخص ہوتا ہے جو اپنا استعفیٰ پیش کرتا ہے' اگست 99ء کو مغربی بنگال کے علاقے دیناج پور میں دو ٹرینیں ٹکرا گئی تھیں' اس حادثے میں بھارت کے 500 مسافر مارے گئے تھے' اس وقت نتیش کمار بھارت کے وزیر ریلوے تھے' انہوں نے فوراً اپنا استعفیٰ وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کو پیش کر دیا' پوری قوم نے ان کے اس اقدام کو سراہا جبکہ ہمارے ملک میں کئی بار ایسے حادثے ہوئے' کئی بار سینکڑوں مسافر جاں بحق ہوئے لیکن کسی نے ہمارے کسی وزیر سے استعفیٰ طلب کیا اور نہ ہی کسی نے پیش کش کی۔

میں نے گزشتہ روز ایک وفاقی وزیر کو لال بہادر شاستری کا واقعہ سنایا اور ان سے عرض کیا ''آپ ریلوے کے وزیر کو مستعفی ہونے کا مشورہ دیں'' انہوں نے فرمایا ''یہ ٹرینیں وفاقی وزیر نہیں چلا رہا تھا'' میں نے ان سے عرض کیا ''حضور 1956ء میں لال بہادر شاستری اور 1999ء میں نتیش کمار بھی ٹرینیں نہیں چلا رہے تھے' عوام نے

ان سے استعفیٰ کا مطالبہ بھی نہیں کیا تھا لیکن اس کے باوجود ان لوگوں نے عوام کا مقدمہ اپنے ضمیر کی عدالت میں پیش کیا‘ ضمیر نے ان کے خلاف فیصلہ دیا اور یہ لوگ مستعفی ہو گئے“ میرے مہربان وزیر نے قہقہہ لگایا اور میری آنکھوں میں جھانک کر بولے ”بھارت اور پاکستان میں بڑا فرق ہے‘ ہمیں ہمیشہ اپنے زمینی حقائق کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا چاہیے“ میں نے ہاں میں گردن ہلا دی‘ وہ صحیح فرما رہے تھے‘ واقعی ہمارے اور بھارت کے زمینی حقائق میں بڑا فرق ہے‘ ہم مضبوط اور روشن خیال لوگ ہیں‘ ہم ہر قسم کا وار سہہ جاتے ہیں جبکہ بھارت کے سیاستدان کمزور اور بے بس ہیں وہ عوام کی نظروں کی تپش برداشت نہیں کر سکتے لہٰذا ان میں اور ہم میں بڑا فرق ہے‘ میں وہاں سے واپس آ گیا لیکن راستے میں مجھے بار بار لال بہادر شاستری کے وہ الفاظ یاد آ رہے تھے جو اس نے 1956ء میں استعفیٰ دیتے ہوئے لوک سبھا میں کہے تھے‘ انہوں نے کہا تھا ”میں جسمانی طور پر ایک کمزور شخص ہوں‘ لوگ میرے نرم لہجے کو بھی میری کمزوری سمجھتے ہیں لیکن میں آج یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں‘ میں صرف ظاہری طور پر کمزور ہوں میرے اندر توانائی بھی ہے‘ طاقت بھی اور ضمیر بھی‘ میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں‘ میں قوم کے سامنے یہ اعتراف کرتا ہوں‘ ریلوے کے وزیر کی حیثیت سے مسافروں کی جان اور مال کی حفاظت میری ذمہ داری تھی اور میں یہ ذمہ داری نبھانے میں ناکام رہا‘ اس حادثے نے ثابت کر دیا میں اس عہدے کے اہل نہیں تھا لہٰذا میں اپنا استعفیٰ پیش کرتا ہوں اور قوم سے درخواست کرتا ہوں وہ یہ ذمہ داری کسی ایسے اہل اور ذمہ دار شخص کو سونپ دے جو ان کی حفاظت کر سکے جو انہیں تحفظ دے سکے“

اللہ کے سفیر

احمد علی سید میرے دوست ہیں' وہ پیشے کے لحاظ سے ٹیلی ویژن پروڈیوسر ہیں اور ان کی ساری زندگی پی ٹی وی میں گزری' ان کی بیگم بھی ریڈیو پاکستان کی منجھی ہوئی پروڈیوسر تھی' یہ دونوں میاں بیوی چند ماہ قبل برطانیہ شفٹ ہو گئے' میرے لئے یہ خبر انتہائی حیران کن تھی' میں دونوں میاں بیوی کو بڑے قریب سے جانتا ہوں' یہ دونوں محب وطن اور سچے فنکار تھے اور الیکٹرانک میڈیا میں بھی دونوں کا بڑا نام تھا' یہ دونوں مالی اور خاندانی لحاظ سے بھی بڑے خوشحال اور مضبوط تھے لہٰذا ان کے باہر منتقل ہونے کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی' مجھے جب ان کی ہجرت کی خبر ملی تو میں نے ایک مشترکہ دوست سے اس کی وجہ پوچھی' میرے یہ دوست شاہ جی سے برطانیہ میں مل کر آئے تھے' انہوں نے بتایا شاہ جی کا ایک بچہ معذور ہے' دونوں میاں بیوی پچھلے دس بارہ سال سے اس بچے کی نگہداشت کر رہے تھے' دونوں اپنی ڈیوٹی کا شیڈول اس طرح مرتب کرتے تھے کہ ان میں سے کوئی ایک ہر وقت بچے کے ساتھ رہے' بچہ ان برسوں میں بڑا ہو گیا لہٰذا اب ان دونوں کیلئے اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا' بچہ ابنارمل تھا چنانچہ اسے اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا' شاہ جی اور ان کی بیگم نے پاکستان میں ابنارمل بچوں کے تمام ادارے دیکھے لیکن وہ کسی ادارے سے مطمئن نہ ہوئے' ایک آدھ ادارہ اچھا لگا لیکن اس ادارے کے اخراجات بھی بہت زیادہ تھے اور وہ دونوں خوشحال ہونے کے باوجود اس ادارے کی فیسیں ادا نہیں کر سکتے تھے' شاہ جی لندن آتے جاتے رہتے تھے' انہوں نے وہاں ابنارمل بچوں کے ادارے دیکھے تو انہیں ان کا ماحول بہت اچھا لگا لہٰذا دونوں میاں بیوی بچوں سمیت برطانیہ منتقل ہو گئے' وہ جب برطانیہ پہنچے تو برطانوی حکومت نے نہ صرف اس ابنارمل بچے کا وظیفہ لگا دیا بلکہ حکومت نے بچے کے میڈیکل' تعلیم اور تربیت کے اخراجات بھی اپنے ذمے لے لئے' حکومت نے اس ابنارمل بچے کی وجہ سے شاہ جی اور ان کے خاندان کو بعض ایسی رعایتیں بھی دے دیں جو عام شہریوں یا امیگرینٹس کو نہیں ملتیں' شاہ جی کا کہنا تھا سپیشل بچوں کے ادارے کی ایک وین روزانہ ان کے گھر آتی ہے' ان کے بچے کو سکول لے جاتی ہے' وہاں وہ اس بچے کو دوسروں کے سہارے کے بغیر زندگی گزارنا اور اپنا مطمع نظر سمجھانے کا طریقہ سکھاتے ہیں' وہ اسے کھیلنے' کودنے اور تفریح کرنے کے طریقے بھی بتاتے ہیں' ہر تیسرے دن ایک نرس ان کے گھر آتی ہے

اور بچے کو اپنا کمرہ درست کرنے' باتھ روم صاف کرنے اور کپڑے پہننے کے طریقے سکھاتی ہے' وہ بچے کے ساتھ گپ شپ بھی کرتی ہے' شاہ جی کا کہنا تھا جب سے وہ برطانیہ آئے ہیں یوں محسوس ہوتا ہے ان کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ حل ہو گیا اور ان دونوں میاں بیوی نے زندگی میں پہلی بار آزادی اور فراغت کے ساتھ کام کرنا شروع کیا ہے اور اب انہیں گھر واپس جانے کی فکر نہیں ہوتی' میرے دوست نے شاہ جی سے واپسی کے بارے میں پوچھا تو شاہ جی نے فوراً جواب دیا ''ہم اپنے بچے کیلئے یہاں آئے ہیں لہٰذا جب تک پاکستان میں ہمارے بچے کو ایسی سہولتیں نہیں ملتیں ہم برطانیہ ہی میں رہیں گے''

کل 3 دسمبر کو معذور بچوں کا عالمی دن تھا' میں نے جب صبح کے اخبارات میں معذور بچوں کے بارے میں رپورٹیں دیکھیں تو مجھے بے اختیار شاہ جی اور ان کا بچہ یاد آ گیا اور میں نے سوچا کیا ہماری حکومت' ہمارا معاشرہ اور ہمارے لوگ معذوروں کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریاں پوری کر رہے ہیں اور کیا ہمارے ملک میں معذوروں کو ان کے حقوق مل رہے ہیں' مجھے محسوس ہوا ہم لوگ معذوروں کو ایک فیصد سے بھی کم توجہ دیتے ہیں اور یہ ان لوگوں کا رویہ ہے جنہوں نے دنیا میں معذوروں کے حقوق کی بنیاد رکھی تھی' جنہوں نے دنیا کی تاریخ میں پہلی بار معذوروں کو سٹیٹ کی ذمہ داری قرار دیا تھا' حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں معذوروں کیلئے بیت المال سے نہ صرف خصوصی وظیفہ جاری ہوتا تھا بلکہ معذور بچوں کے والدین کو بھی ریاست کی طرف سے خاص رعایتیں دی جاتی تھیں' ان کے دور میں اندھوں کو حکومت کی طرف سے خصوصی خادم مہیا کئے جاتے تھے' یہ خادم روزمرہ کے کاموں میں ان کی مدد کرتے تھے' حضرت عثمانؓ کے دور میں حکومت معذوروں کو گھر تک بنا کر دیتی تھی جبکہ مساجد میں ان کیلئے خصوصی وضو خانے بنائے جاتے تھے' خلفائے راشدین کے بعد بھی تمام اسلامی حکمرانوں اور ریاستوں نے ابنارمل اور خصوصی بچوں کیلئے خاص قسم کے قوانین پاس کئے' ہسپانیہ اور ہندوستان میں معذوروں کو بعض ملازمتوں میں ترجیح دی جاتی تھی' شاہ جہاں اور اورنگزیب کے دور میں 80 فیصد سرکاری منشی اور وثیقہ نویس ٹانگوں سے معذور تھے جبکہ زیادہ تر ہرکارے بازوؤں یا آنکھ سے محروم ہوتے تھے لیکن آج اسلام کے نام سے بننے والی ریاست میں معذوروں کی بحالی کا کوئی قانون ہے اور نہ ہی ان کیلئے فنڈ جبکہ آپ اس کے مقابلے میں غیر اسلامی ممالک میں جا کر دیکھ لیں' آپ کو محسوس ہوگا وہ لوگ معذوروں' ابنارمل اور خصوصی شہریوں کو انتہائی پروٹوکول دیتے ہیں' آج یورپ میں اس وقت تک کسی عمارت کا نقشہ منظور نہیں ہوتا جب تک اس عمارت میں خصوصی افراد کی نقل و حمل کا بندوبست نہ ہو جائے' تمام ترقی یافتہ ممالک کے پبلک ٹوائلٹس میں خصوصی افراد کیلئے ٹوائلٹ ہوتے ہیں اور یہ ٹوائلٹ دوسرے ٹوائلٹس کے مقابلے میں سائز اور خوبصورتی میں کہیں اچھے ہوتے ہیں' یورپ کے تمام ممالک کے شاپنگ سنٹروں میں خصوصی افراد کیلئے ''ریمپ'' بنے ہوتے ہیں' تمام سینما ہاؤسز' کلبوں' بار رومز' کیسینوز' چرچ' ہوٹلوں' ٹرینوں اور جہازوں میں خصوصی لوگوں کیلئے خصوصی راستے اور نشستیں ہوتی ہیں' تمام پارکنگ میں ان کی گاڑیوں کیلئے جگہ مخصوص ہوتی ہے' برطانیہ میں غلط پارکنگ بہت بڑا جرم ہے اور ملکہ سے لے کر وزیراعظم تک کوئی شخص اس

قانون سے مبرا نہیں لیکن معذور افراد برطانیہ کے جس مقام اور جس شاہراہ پر چاہیں گاڑی کھڑی کر دیں' کوئی شخص ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا' ڈنمارک کے تمام سگنلز میں اندھوں کیلئے گھنٹیاں لگی ہیں جونہی سگنل گرین ہوتا ہے یہ گھنٹیاں بجنا شروع ہو جاتی ہیں جبکہ دیگر ترقی یافتہ ممالک میں معذوروں کا علاج' تعلیم' تربیت اور نگہداشت مفت ہے اور حکومت پیدائش سے لے کر انتقال تک ان کی تمام ضرورتوں کی ذمہ دار ہوتی ہے' اس کے مقابلے میں آپ اپنے ملک کا جائزہ لیں تو اس ملک میں خصوصی شہری اور معذور بچے انتہائی افسوسناک صورتحال کا شکار ہیں' چند سال پہلے تک اسلام آباد جیسے شہر میں معذوروں کیلئے پارکنگ اور ریمپ نہیں تھے اللہ تعالیٰ سی ڈی اے کے موجودہ چیئرمین کامران لاشاری کا بھلا کرے انہوں نے آ کر شہر میں ان لوگوں کیلئے ریمپ اور پارکنگ بنوائیں' پورے ملک میں خصوصی افراد کی بحالی کیلئے کوئی اچھا سنٹر نہیں' حکومت نے آج تک معذوروں کیلئے کسی خصوصی پیکج کا اعلان نہیں کیا لہٰذا پاکستان کے تمام معذور بچے والدین کی ذمہ داری ہو کر رہ گئے ہیں اور حکومت نے آج تک ان کی ذمہ داری نہیں اٹھائی۔

ہم جب ایک مسلم معاشرے کا غیر مسلم اور لادین معاشروں سے تقابل کرتے ہیں تو ہمارا سر شرم سے جھک جاتا ہے اور ہم سوچتے ہیں وہ لوگ ہم سے ہزار درجے بہتر ہیں جو بے دین ہونے کے باوجود شہ رگ تک خوف خدا سے لبریز ہیں' ہمارے ملک میں لوگ سجدے کر کر کے ماتھے پر محراب ڈال لیتے ہیں لیکن ان کے خصوصی افراد سڑکوں پر بھیک مانگ رہے ہوتے ہیں' میں جب بھی یورپ کی ترقی دیکھتا ہوں تو مجھے اس کے پیچھے ان معاشروں کے معذوروں' غریبوں اور لاچاروں کی دعائیں نظر آتی ہیں' میرا ایمان ہے زندگی کی نعمتوں اور صلاحیتوں سے محروم لوگ بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ کے سفیر ہوتے ہیں' یہ لوگ معاشروں میں اللہ کا پیغام لے کر اترتے ہیں اور جو معاشرے اللہ تعالیٰ کے ان سفیروں سے محبت سے پیش آتے ہیں' جو ان کو علاج معالجے' تعلیم اور نگہداشت کی سہولت فراہم کرتے ہیں اور جو ان پر اپنا تن' من اور دھن قربان کر دیتے ہیں' اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی ترقی' خوشحالی' عروج' رزق اور خوشی میں اضافہ فرما دیتے ہیں' وہ ان پر نعمتوں اور انعامات کے دروازے کھول دیتے ہیں' وہ انہیں برطانیہ' جاپان اور امریکہ بنا دیتے ہیں اور جو جو ملک اللہ تعالیٰ کے ان سفیروں کو پاگل خانوں' سڑکوں اور چوکوں میں کھڑا کر دیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان قوموں کے ہاتھ میں کشکول دے کر انہیں اقوام عالم کی دہلیز پر لا بٹھاتے ہیں' اللہ تعالیٰ ان ملکوں سے نعمتیں چھین لیتا ہے اور اللہ انہیں بھکاری بنا دیتا ہے۔

جس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہے

''اوئے سائیڈ پر ہو جاؤ'' ایک نہایت کھردری، غیر مہذب اور بھدی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں غصے سے پیچھے مڑا لیکن میرے پیچھے ایک مہذب، پڑھا لکھا اور خوبصورت شخص کھڑا تھا۔ اس نے قیمتی اطالوی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے بالوں پر جیل لگا تھا، اس کی آنکھوں پر دھوپ کا مہنگا چشمہ تھا اور اس کے بدن سے اعلیٰ درجے کی خوشبو آ رہی تھی، میں ایک لمحے کیلئے ٹھٹک گیا۔ میں ابھی مخمصے میں تھا کہ دوسری مرتبہ وہی کھردری آواز آئی ''سائیڈ پر ہو ناں'' میں نے دیکھا اس مہذب شخص کے پیچھے انتہائی آٹھ دس اجڈ، غیر مہذب اور بدمعاش قسم کے لوگ کھڑے تھے، ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوفیں تھیں۔ انہوں نے لمبے گھیرے کی شلواریں اور کھلے کرتے پہن رکھے تھے اور ان کے گلے میں چادریں لٹک رہی تھیں ان سب نے اس مہذب شخص کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا، میں چند لمحوں کے لیے سکتے میں آ گیا اور میں نے گھبرائی آواز میں پوچھا ''کیا مطلب'' بدمعاشوں میں سے ایک نے اپنا کھردرا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا اور مجھے ایک طرف دھکیل کر بولا ''میں کہہ رہا ہوں ڈاکٹر صاحب کو راستہ دو، سائیڈ پر ہو جاؤ'' میں نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن وہ کھردرا ہاتھ مجھ سے زیادہ طاقتور تھا۔ میں سائیڈ پر ہو گیا، اس مہذب شخص نے کلینک میں پاؤں رکھا۔ آگے بڑھا اور وہ سارے بدمعاش اسے حصار میں لے کر چل پڑے۔

مجھے اس سارے معاملے کی سمجھ نہیں آ رہی تھی، میں تھوڑی دیر گیٹ پر کھڑا رہا اور اس کے بعد میں بھی اندر آ گیا اور اپنے دوست کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا' وہ سارے بدمعاش میرے دوست کے کمرے کے باہر کھڑے تھے، وہ مونچھوں پر تاؤ دیتے تھے، کلاشنکوفیں لہراتے تھے اور دائیں بائیں دیکھتے تھے، میں اندر داخل ہونے لگا تو ایک بدمعاش نے آگے بڑھ کر دروازے کے فریم پر ہاتھ رکھ دیا، میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو وہ کھردری آواز میں بولا ''تم ابھی اندر نہیں جا سکتے'' میں نے وجہ پوچھی تو بولا ''اندر ہمارے ڈاکٹر صاحب ہیں جب تک وہ باہر نہیں آتے' کوئی اندر نہیں جا سکتا'' مجھے غصہ آ گیا اور میں نے طیش میں دروازے پر دستک دے دی۔ وہ لوگ آگے بڑھے اور انہوں نے مجھے جکڑ لیا، میں ان کے ساتھ الجھ پڑا جس کے بعد کلینک میں شور ہو گیا' میرا شور اندر گیا تو میرا دوست باہر آ گیا' وہ میری حالت دیکھ کر گھبرا گیا اور بھاگ کر اندر واپس چلا گیا ذرا دیر بعد اندر سے وہی مہذب آواز باہر آئی ''بھئی انہیں اندر آنے دیں، یہ ہمارے دوست ہیں'' بدمعاشوں نے فوراً میرا

گریبان چھوڑا، میری شرٹ کی سلوٹیں درست کیں اور مجھے بڑے آرام سے اندر دھکیل دیا۔ اندر وہی مہذب شخص کرسی پر بیٹھا تھا اور میرا دوست اس کے پہلو میں کھڑا ہو کر شرمندگی اور خفت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میرا منہ سرخ تھا اور میرے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ مہذب شخص اٹھا، اس نے انگریزی میں میرے ساتھ معذرت کی اور مجھے ساتھ والی کرسی پر بٹھا دیا۔ ہم تینوں چپ چاپ بیٹھ گئے، میرے دوست کی نظریں نیچی تھیں۔

کمرے کی فضا بوجھل تھی، میرے دوست نے حالات بہتر بنانے کیلئے قہقہہ لگایا اور ان صاحب کی طرف اشارہ کر کے بولا "آپ ہیں ڈاکٹر عزیز، ملک کے مشہور کارڈیالوجسٹ" وہ ساتھ ہی میری طرف مڑا اور مسکرا کر بولا "آپ کو کون نہیں جانتا، آپ ہیں........." میں خاموش رہا، چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد ڈاکٹر عزیز بولے "میرے گارڈز نے آپ کے ساتھ بدتمیزی کی، میں معافی چاہتا ہوں، یہ گنوار لوگ ہیں، یہ کسی کے سٹیٹس سے واقف نہیں ہیں" میں نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا، ڈاکٹر عزیز بولے "میں نے یہ لوگ اپنی حفاظت کیلئے رکھے ہیں اور میرا تجربہ ہے آپ کے گارڈز جتنے گنوار، اجڈ اور غیر مہذب ہوں گے اس معاشرے میں آپ کو اتنی ہی عزت ملے گی" میں نے پہلی مرتبہ ڈاکٹر صاحب کی طرف دلچسپی سے دیکھا، ڈاکٹر صاحب مسکرائے "میں ایک کامیاب ڈاکٹر ہوں، کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں میرے کلینک ہیں، میں ہفتے میں دو دن دبئی بھی جاتا ہوں لہٰذا یہ گارڈز میری جان، میری پریکٹس اور میرے سٹیٹس کی حفاظت کرتے ہیں، اگر یہ میرے ساتھ نہ ہوں تو میں اغواء ہو جاؤں، جان سے جاؤں یا دس بیس کروڑ دے کر جان چھڑاؤں" میں چپ چاپ سنتا رہا، وہ بولے "گارڈز سے پہلے ملک میں میری کوئی عزت نہیں تھی، میں بینک میں اکاؤنٹ کھلوانے جاتا تھا تو گھنٹہ گھنٹہ لائن میں کھڑا رہتا تھا اور میری باری نہیں آتی تھی۔ مریضوں کے لواحقین میرے کلینک میں میری بے عزتی کر جاتے تھے، لوگ میری گاڑی پر سکریچ ڈال دیتے تھے، کارپوریشن کا عملہ دس دس دن میرے گھر کے سامنے سے کچرا نہیں اٹھاتا تھا اور لوگ سڑک پر مجھے راستہ نہیں دیتے تھے لیکن جس دن سے میں نے گارڈز رکھے ہیں پورا ملک میری عزت کر رہا ہے، میں بینک جاتا ہوں تو منیجر مجھے ریسیو کرنے کیلئے باہر آ جاتا ہے، میرے گارڈز کی ایک گاڑی میرے آگے اور دوسری پیچھے چلتی ہے لہٰذا ساری گاڑیاں ہمیں راستہ دے دیتی جاتی ہیں اور ٹریفک پولیس تک اشارہ توڑنے پر مجھے نہیں روکتی چنانچہ مجھے محسوس ہوتا ہے میں زندگی میں اس سے پہلے جھک مارتا رہا ہوں"

میں نے کرسی پر پہلو بدلا اور ان سے عرض کیا "آپ نے یہ سب کہاں سے سیکھا" ڈاکٹر صاحب مسکرائے "میں نے یہ فارمولا اس ملک کے حکمرانوں سے سیکھا، میرے ملک کے حکمرانوں نے مجھے سکھایا اس ملک میں صرف وہی شخص کامیاب اور محفوظ ہے جس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہے۔ حکمرانوں نے مجھے بتایا اس ملک کا سب سے بڑا قانون، سب سے بڑا آئین اور سب سے بڑا دستور ڈنڈا ہے۔ ڈنڈا پاکستان کی ہر روایت، ہر قانون اور ہر ضابطہ بدل سکتا ہے اور اس ملک میں جس شخص کے پاس ڈنڈا نہیں وہ دو تہائی اکثریت کے باوجود بے بس اور لاچار ہے۔ اس شخص کا اس ملک میں کوئی ٹھکانہ نہیں" میں خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا، وہ بولے "آپ صدر ایوب خان سے صدر پرویز مشرف تک پاکستان کے تمام فوجی سربراہوں کو دیکھئے، یہ لوگ کس قانون کے تحت صدر بنے

تھے" وہ رکے اور دوبارہ بولے "ان لوگوں کا قانون ڈنڈا تھا، ان کے پاس طاقت تھی لہٰذا محترمہ فاطمہ جناح ہوں، شیخ مجیب الرحمٰن ہوں، ذوالفقار علی بھٹو ہوں پھر یا نواز شریف کوئی سیاسی لیڈر ان کے سامنے نہیں ٹھہر سکا، انہوں نے اسے اٹھا کر ڈسٹ بین میں پھینک دیا" میں خاموش رہا، وہ بولے "جبکہ ان کے مقابلے میں ڈنڈے والے اس وقت تک حکمران رہے جب تک زندگی اور صحت نے انہیں مہلت دی اور پارلیمنٹ سے لے کر عدالت اور مذہب سے لے کر عوام تک کوئی ادارہ، کوئی قانون ان کا بال تک بیکا نہ کر سکا۔ ان لوگوں نے ذاتی اقتدار کے لیے اسمبلیاں توڑیں، آئین منسوخ کیے، اپنی مسلم لیگیں بنائیں اور اپنی مرضی کے الیکشن کرائے مگر کسی نے ان کا ہاتھ نہ روکا، یہ لوگ پوری زندگی اپنی مرضی کرتے رہے اور جب ان کا انتقال ہوا تو انہیں پورے اعزاز سے دفن کیا گیا، کیوں؟ کیونکہ ان کے پاس ڈنڈا تھا" وہ رکے اور تھوڑی دیر بعد بولے "ڈنڈے کا یہ فلسفہ اس ملک کے جس شخص کو سمجھ آ گیا وہ سکھی ہو گیا، آپ یقین کریں اس ملک کی پولیس عوام کی حفاظت کیلئے معرض وجود میں نہیں آئی یہ صرف ڈنڈے والوں کی سکیورٹی اور ان کے دشمنوں کو کچلنے کے لیے بنائی گئی ہے، اس ملک کی عدالتیں کمزوروں اور مظلوموں کو انصاف فراہم کرنے کے لیے نہیں بنیں۔ یہ ڈنڈے والوں کے ناجائز اقتدار کو قانونی شکل دینے کیلئے بنی ہیں اور سی بی آر سے لے کر ریلوے تک اس ملک کا کوئی ادارہ عوام کے لیے نہیں بنا، یہ تمام ادارے حکمران کلاس کی عیاشی کے لیے پیسے جمع کرنے کے لیے بنے ہیں چنانچہ میں جان گیا اگر میں نے اس معاشرے میں زندہ رہنا ہے تو مجھے بھی ہاتھ میں ڈنڈا اٹھانا ہوگا"

میں حیرت سے انہیں دیکھتا رہا، وہ بولے "تم مدرسہ حفصہ کی مثال لو، اس مدرسے کی پانچ ہزار طالبات نے ہاتھوں میں ڈنڈے اٹھا رکھے تھے۔ تم ان ڈنڈوں کی طاقت دیکھو، ان طالبات نے 21 جنوری سے چلڈرن لائبریری پر قبضہ کر رکھا ہے لیکن حکومت کو جولائی تک قبضہ چھڑانے کی جرأت نہیں ہوئی' ان ڈنڈوں کے پیچھے بیٹھ کر مولانا عبدالعزیز اور مولانا عبدالرشید غازی نے اپنی پولیس اور اپنی عدلیہ بنا لی، انہوں نے اسلام آباد کے دس مربع کلومیٹر میں شریعت نافذ کر دی لیکن تاریخ کے طاقتور ترین صدر جنرل پرویز مشرف بھی خاموش بیٹھے رہے' وہ کبھی علماء کرام سے مدد کی اپیل کر رہے تھے اور کبھی سول سوسائٹی کو مداخلت کی دعوت دے رہے تھے' کیوں؟ کیونکہ مدرسہ حفصہ کی طالبات کے پاس پانچ ہزار ڈنڈے تھے" وہ رکے اور میری طرف مڑ کر بولے "ان طالبات کو ڈنڈے اٹھانے پر کس نے مجبور کیا تھا؟" میں خاموش رہا، وہ گویا ہوئے" ان کے ہاتھ میں بارہ اکتوبر نے ڈنڈے دیے تھے' یہ لوگ سمجھ گئے تھے اگر ایک ڈنڈے سے سارا آئین اور قانون فارغ ہو سکتا ہے تو پانچ ہزار ڈنڈے حکومت کی ساری رٹ بھی لپیٹ سکتے ہیں" وہ رکے اور دوبارہ بولے "اب تم بتاؤ حکومت نے دس جولائی 2007ء تک ان کے خلاف ایکشن کیوں نہیں لیا" میں خاموش رہا، وہ بولے "حکومت جانتی تھی ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے ہیں اور اس ملک میں جس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہو کوئی شخص اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا" ڈاکٹر اٹھے' سلام کیا اور گارڈز کے جلو میں کلینک سے باہر نکل گئے۔

✿......✿......✿

میں جانتا ہوں یہ پاگل ہے

ڈاکٹر رشید چودھری ملک کے مشہور نفسیات دان تھے' انہوں نے لاہور میں "فونٹین ہاؤس" کے نام سے ایک شاندار ادارہ بنایا' یہ دماغی امراض کا ادارہ ہے' جس میں شیزوفرینیا' پاگل پن اور ٹینشن کا علاج ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک دلچسپ اور شاندار انسان تھے' ان کی باتوں میں بڑی گہرائی اور دانائی تھی' میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کیلئے کبھی کبھی لاہور جاتا تھا' ایک دن میں ان کے پاس گیا تو ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میری زندگی کا رخ بدل دیا' یہ میری زندگی کا واحد واقعہ ہے جو مجھے روز یاد آتا ہے اور یہ ہر بار مجھے کسی نہ کسی بحران' کسی نہ کسی خرابی سے بچا جاتا ہے' میں ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچا تو وہاں ایک صاحب بیٹھے تھے' ان کی عمر پچاس اور پچپن کے درمیان تھی اور وہ شکل سے اچھے خاصے معزز انسان دکھائی دیتے تھے' ڈاکٹر صاحب نے میرا حال احوال پوچھا' ہم نے آپس میں چند جملوں کا تبادلہ کیا' اس دوران وہاں موجود صاحب نے نہایت خفگی سے ہم دونوں کی طرف دیکھا اور درشتگی سے بولے "ڈاکٹر صاحب میں آپ سے گفتگو کر رہا تھا' آپ نے مجھے چھوڑ کر اس لونڈے سے باتیں شروع کر دیں' آپ دونوں کو میری موجودگی میں ایک دوسرے سے سلام لینے کی جرات کیسے ہوئی" میں اس صاحب کے طرز تکلم اور بدتمیزی پر حیران رہ گیا لیکن ڈاکٹر صاحب بڑے پیار سے بولے "یہ نوجوان میرا دوست ہے اور میں آپ سمیت اپنے تمام دوستوں کا احترام کرتا ہوں" وہ صاحب مزید غصے میں آ گئے اور انہوں نے اونچی آواز میں ڈاکٹر صاحب کو گالیاں دینا شروع کر دیں' انہوں نے پہلے انگریزی میں بکواس کیا' اس کے بعد نہایت نستعلیق اردو میں مغلظات بکیں اور آخر میں وہ پنجابی پر اتر آئے' میں نے زندگی میں اتنی غلیظ گالیاں کبھی نہیں سنی تھیں لیکن ڈاکٹر صاحب مسکرا مسکرا کر ان کی طرف دیکھتے رہے' وہ صاحب گالیاں دے دے کر ہف گئے تو ڈاکٹر صاحب نے چپراسی کو بلایا اور ان کی طرف اشارہ کر کے بولے "آپ مرزا صاحب کو اندر لے جائیں' میں ابھی آتا ہوں" مرزا صاحب نے فوراً چپراسی کو بھی مغلظات میں شامل کر لیا' ڈاکٹر صاحب نے قہقہہ لگایا اور میری طرف دیکھ کر بولے "ہور کی حال اے" میں نے ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا "اس شخص نے آپ کو اتنی گالیاں دیں لیکن آپ کو غصہ نہیں آیا" ڈاکٹر صاحب آگے جھک کر بولے "کیونکہ میں جانتا ہوں یہ شخص پاگل ہے اور کسی پاگل

شخص کی بات کا برا منانا بے وقوفی ہوتی ہے" میرے ذہن میں ایک فلیش سا ہوا اور وہ لمحہ وہ دفتر، وہ سارا منظر اور ڈاکٹر صاحب کے خیالات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرے دماغ میں نقش ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب بعد ازاں انتقال کر گئے لیکن آج بھی جب کوئی شخص میرے ساتھ نامعقول بات کرتا ہے' کوئی مجھے غیر ضروری بحث میں گھسیٹنے کی کوشش کرتا ہے یا پھر کوئی شخص بلاوجہ میرے ساتھ الجھنے لگتا ہے تو مجھے فوراً ڈاکٹر رشید چودھری کا دفتر یاد آ جاتا ہے اور مجھے محسوس ہوتا ہے میرے سامنے مرزا صاحب بیٹھے ہیں اور اگر میں نے ان کی بات کا برا منایا تو اس کرہ ارض پر مجھ سے بڑا بے وقوف کوئی نہیں ہوگا۔

میرے ایک دوست اس معاملے میں ڈاکٹر رشید چودھری سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ میں نے انہیں کبھی غصے میں نہیں دیکھا، میں نے ایک بار ان سے پوچھا "آپ کو غصہ نہیں آتا" وہ مسکرا کر بولے "غصہ انسانی فطرت ہے، میں انسان ہوں لہٰذا مجھے بھی غصہ آتا ہے" میں نے عرض کیا "لیکن میں نے آپ کو کبھی غصے میں نہیں دیکھا" وہ دوبارہ مسکرائے "میں نے اپنے غصے کو سولائزڈ کر لیا ہے، میں نے اسے مہذب شکل دے دی ہے" میں نے عرض کیا "مجھے بات سمجھ نہیں آئی" وہ بولے "ہمیں زندگی میں دو قسم کے لوگ غصہ دلاتے ہیں، ایک وہ لوگ ہیں جو جان بوجھ کر پوری منصوبہ بندی سے ہمارے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں جبکہ دوسرے لوگ حادثاتی ہوتے ہیں، پہلی قسم کے لوگ ہمارے دشمن ہوتے ہیں' یہ لوگ ہمیں تنگ کر کے نفسیاتی لطف لیتے ہیں، مجھے جب پہلی قسم کا کوئی شخص تنگ کرتا ہے تو میں فوراً اپنے آپ سے پوچھتا ہوں' کیا یہ دکھ، یہ تکلیف اور یہ توہین اس اذیت سے زیادہ تھی جو ابو جہل اور ابولہب نبی کریم ﷺ کو پہنچاتے رہے، میں فوراً توبہ کرتا ہوں اور میری ساری ٹینشن اور ساری اینگزائٹی دور ہو جاتی ہے۔ دوسری قسم کے لوگ حادثاتی ہوتے ہیں، یہ غصہ لے کر گھر سے نکلتے ہیں اور کوئی ایسا شخص تلاش کرتے ہیں جس کے سر پر اپنے غصے کی گٹھڑی رکھ سکیں، مجھ سے جب بھی کوئی ایسا شخص الجھتا ہے تو میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں' کیا یہ شخص علم، عقل، سماجی رتبے اور تہذیب میں مجھ سے بہتر ہے؟ کیا میرے جیسے پڑھے لکھے، نفیس، شائستہ اور معزز شخص کو ایک ریڑھی بان' رکشے والے، کریانہ مرچنٹ، کنڈیکٹر، ڈرائیور، مزدور، چپڑاسی یا کلرک سے الجھنا چاہیے لہٰذا میں فوراً مسکرا کر آگے بڑھ جاتا ہوں" مجھے ان کی بات ادھوری لگی' میں نے پوچھا "لیکن آپ کو برا تو لگتا ہوگا، آپ کو غصہ بھی آتا ہوگا، آپ اس کا کیا کرتے ہیں" وہ مسکرائے "میں نے اپنے غصے کو پریکٹیکل بنا دیا ہے" میں خاموشی سے سنتا رہا، وہ بولے "میں نے ایک غریب طالب علم کو اعلیٰ تعلیم دلائی، اسے یونیورسٹی میں ملازمت لے کر دی اور وہ اب طالب علموں کو شائستگی کی تعلیم دیتا ہے، وہ انہیں برداشت کرنے اور مسکرانے کا آرٹ سکھاتا ہے' یہ میرے غصے کی ایک پریکٹیکل شکل ہے' اس کی اور بھی بے شمار صورتیں ہیں مثلاً میں اپنے دوستوں کو برداشت کرنے کا ہنر سکھاتا رہتا ہوں، میں ہر مہینے سیرت کی کتابیں خریدتا ہوں اور لوگوں کو تحفہ دیتا ہوں، میں سلمان رشدی جیسے لوگوں کی گستاخیوں کا جواب دینے کے لیے عالمی سطح کے پانچ سکالر تیار کر رہا ہوں، میں بش کو گالی دینے کی بجائے لوگوں کو امریکی معاشرے کی خامیاں بتاتا ہوں اور میں لوگوں کو ورزش کرنے، معیاری کتابیں پڑھنے اور روزے رکھنے کی

جواب دیتا ہوں، میری یہ کوششیں میرے غصے کو کھا جاتی ہیں'' میں نے ان سے عرض کیا ''اگر کوئی شخص آپ کی فکری، نظریاتی اور اخلاقی غیرت پر حملہ کرے تو بھی آپ کو غصہ نہیں آتا'' انہوں نے قہقہ لگایا ''آتا ہے لیکن میں گالی کا جواب گالی اور دھمکی کا جواب دھمکی میں دینے کی بجائے اپنی غیرت' اپنی عزت کو مزید مضبوط بنا لیتا ہوں' میں اپنے نظریات' اپنی فکر اور اپنے اخلاق کو مزید قوت دے دیتا ہوں' میں یہ سمجھتا ہوں وہ نظریہ' نظریہ اور وہ فکر' فکر نہیں جو ایک بداخلاق اور بدلحاظ شخص کی گالی سے متاثر ہو جائے میں یہ سمجھتا ہوں دھمکی' گالی اور غصہ کمزور لوگوں کے ہتھیار ہوتے ہیں اور اگر ہماری شخصیت کے قلعے مضبوط ہیں تو یہ ہتھیار کنکر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔''

اگر ہم انسانی تاریخ کو نکال کر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے دنیا کی تمام لڑائیوں' کشمکشوں' اختلافات اور جنگوں کا آغاز کسی ایک نامعقول بات یا کسی ایک گالی سے ہوا تھا' کسی پاگل شخص نے ایک احمقانہ بات کی ہے' دوسرے نے اس بات کا جواب دیا اور اس کے بعد فرد سے لے کر قوموں تک کی زندگی عذاب ہو گئی۔ خاندان سے لے کر ملک تک قتل و غارت گری کا شکار ہو گئے۔ اگر لوگ ڈاکٹر رشید چودھری کی طرح ایک لمحے کے لیے اپنے مخاطب کو پاگل سمجھ لیں اور اس کی بات یا گالی کا جواب نہ دیں' اگر وہ دوسروں کے ساتھ الجھنے سے پرہیز کریں گے تو یقین کیجئے غصے اور بدتمیزی کی یہ چنگاری فوراً بجھ جائے' ہم اگر غصے کا نفسیاتی تجزیہ کریں تو معلوم ہوتا ہے ہماری زندگی میں جب بھی کوئی شخص بدتمیزی کرتا ہے' کوئی ہمارے ساتھ درشتگی سے مخاطب ہوتا ہے تو ہم اسے سمجھدار' عاقل اور ذہین شخص سمجھ بیٹھتے ہیں اور اس کے ساتھ بحث میں الجھ جاتے ہیں' ہم اسے سمجھانے' بجھانے یا سبق سکھانے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں چنانچہ اس کا وہی نتیجہ نکلتا ہے جو ایک پاگل اور سمجھدار شخص کی بحث کا نکلے گا' میرا دعویٰ ہے عام گلی محلے کی لڑائی سے لے کر عالمی جنگیں تک کسی ایک ردعمل، کسی ایک جواب سے شروع ہوتی ہیں' ہم کسی ایک نامعقول اعتراض، کسی ایک واہیات بات یا کسی ایک گالی کا جواب دیتے ہیں اور اس کے بعد دو لوگوں کا اختلاف پورے شہر یا پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے' اگر ہم خود کو کسی نامعقول رویئے' کسی فضول بات کا جواب دینے سے روک لیں تو ہماری پوری زندگی بحران سے بچ جائے کیونکہ گالی کا جواب دینا بہادری نہیں ہوتا' گالی پر مسکرا دینا بہادری ہوتا ہے۔

شاید ہمیں

خاتون اردو سپیکنگ تھی مگر اس نے مضمون پنجابی میں لکھنا تھا' اس کا خیال تھا میں ایک پکا ٹھکا پنجابی ہوں لہٰذا میں اس کی مدد کر سکتا ہوں' اس نے مجھ سے پوچھا ''سرجزیرے کی پنجابی کیا ہوگی'' میری ہنسی نکل گئی۔ وہ پنجابی کے بارے میں غلط فہمی کا شکار تھی۔ پچھلے پچاس برسوں میں پنجابی زبان نے دوسری زبانوں کا جتنا اثر لیا اس ملک کی کوئی دوسری علاقائی زبان اتنی متاثر نہیں ہوئی' اس وقت اردو اور انگریزی سب سے زیادہ پنجاب میں بولی جا رہی ہیں لہٰذا اگر دیکھا جائے تو پنجابی زبان میں جس قدر اردو اور انگریزی کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں اتنے سندھی' پشتو' بلوچی' براہوی' ہندکو اور سرائیکی میں نہیں ہوتے' ہم شہروں میں رہنے والے پنجابی لوگ اس ثقافتی یلغار سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں' انگریزی ہماری کاروباری مجبوری ہے جبکہ اردو ہماری قومی زبان ہے لہٰذا ان دونوں مجبوریوں نے مل کر پنجابی زبان کا حلیہ بگاڑ دیا' آج عالم یہ ہے ایک پنجابی لڑکے کی شادی پنجابی لڑکی کے ساتھ ہوتی ہے تو دونوں پہلے دن اردو بولنا شروع کرتے ہیں اور پوری زندگی بولتے چلے جاتے ہیں' اگر آپ اردو بولنے والے پنجابی گھرانوں میں جا کر دیکھیں تو آپ کو وہاں عجیب منظر دکھائی دے گا آپ دیکھیں گے خاتون اپنی ساس اور سسر کے ساتھ پنجابی میں گفتگو کر رہی ہے اور خاوند اپنے دوست احباب' پڑوسیوں اور دکانداروں سے پنجابی بول رہا ہے لیکن جوں ہی دونوں کا آمنا سامنا ہوتا ہے دونوں اردو بولنا شروع کر دیتے ہیں' یہی صورتحال بچوں کے ساتھ ہے بعض گھرانوں میں میاں بیوی آپس میں پنجابی بولتے ہیں لیکن بچوں کے ساتھ وہ اردو میں گفتگو کرتے ہیں' پنجابیوں کے مقابلے میں پشتونوں' بلوچوں اور سندھیوں کا رویہ یکسر مختلف ہے' یہ لوگ گھروں سے لے کر دفتروں اور کاروباری مراکز تک احساس کمتری کے بغیر اپنی زبان میں گفتگو کرتے ہیں لہٰذا ان لوگوں کی زبانیں بڑی حد تک بیرونی اثرات سے محفوظ ہیں جبکہ ہم پنجابیوں کو عام روزمرہ کے الفاظ تک نہیں ملتے اور ہم پنجابی میں اردو اور انگریزی کے لفظ جوڑتے چلے جاتے ہیں۔ میں واپس خاتون کی طرف آتا ہوں' خاتون نے مجھ سے ''جزیرہ'' کی پنجابی پوچھی تھی مجھے معلوم نہیں تھی' میں نے اپنے چند پنجابی دان دوستوں سے رابطہ کیا لیکن انہیں بھی معلوم نہیں تھا' ذرا سا غور و فکر اور بحث و تمحیص کے بعد معلوم ہوا پنجابی زبان میں ''جزیرہ'' کا لفظ ہی نہیں اور

اس کی وجہ پنجاب کا جغرافیہ ہے' پنجاب کی سرحدیں کیونکہ سمندر سے بہت دور ہیں چنانچہ پنجابی زبان کو سمندر اور جزیرے جیسے الفاظ کی ضرورت نہیں پڑی لہٰذا پنجابی زبان ان الفاظ سے محروم ہے۔

زبانیں کیسے بنتی ہیں اور کن کن مراحل سے ہو کر پختہ ہوتی ہیں' یہ ایک مکمل سائنس ہے' میں اس سائنس سے ناواقف ہوں لیکن میں ایک بات جانتا ہوں زبانوں کا جغرافیے' ثقافت اور لوگوں کے مزاج سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے' زبانیں ہمیشہ ماحول سے جنم لیتی ہیں اور لوگوں کا مزاج ان میں رنگ بھرتا ہے پچھلے دنوں ملک کے نامور ادیب' شاعر اور صف اول کے کالم نگار جناب عطاء الحق قاسمی صاحب کے ساتھ میری گپ شپ ہو رہی تھی' اس گپ شپ کے دوران ہم لوگوں نے ''ڈسکور'' کیا پوری پنجابی زبان میں شکریہ اور معافی کے الفاظ نہیں ہیں' ان دو بنیادی الفاظ کی کمی ہماری تاریخ اور ہماری ثقافت کو ظاہر کرتی ہے' ہم لوگ کیونکہ کسی کے مشکور ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی سے معافی مانگتے ہیں لہٰذا ہماری زبان میں یہ دونوں لفظ موجود نہیں ہیں' ہم لوگ کندھا مارنے کے ماہر ہیں اور کندھا مارنے کے بعد اس کی زد میں آنے والے شریف انسان کی طرف آنکھ تک اٹھا کر نہیں دیکھتے لہٰذا آج تک ہماری زمین میں شکریہ اور معافی جیسے الفاظ کاشت نہیں ہوئے' میرے ایک دوست کہا کرتے ہیں اگر اسلام میں شکریہ ادا کرنا نیکی نہ ہوتا تو پنجابی اسلام قبول کرنے کے بعد بھی کسی کے مشکور نہ ہوتے۔ عطاء الحق قاسمی صاحب کا کہنا تھا' پنجابی کی طرح اردو میں ''کھرے'' کا لفظ نہیں ہے' وہ انتظار حسین جیسے سکہ بند اردو دان تک سے پوچھ چکے ہیں لیکن آج تک کوئی اردو دان کھرے کا مترادف نہیں پیش کر سکا' اس کی وجہ اردو دان طبقے کا ''لیونگ سٹینڈرڈ'' تھا' یہ لوگ نلکے کے ساتھ کھرا نہیں بناتے تھے جبکہ پنجاب میں ہر نلکے کے ساتھ کھرا ہوتا تھا چنانچہ پنجابی کھرے کے لفظ سے واقف ہیں' اس کے بعد وہاں بحث چھڑ گئی جس میں ہم لوگوں نے ''ڈسکور'' کیا انگریزی زبان میں غیرت کا لفظ نہیں ہے اس کی وجہ انگریزی ثقافت ہے انگریزی ثقافت میں کیونکہ غیرت کا جذبہ نہیں ہوتا لہٰذا انگریزی زبان کو آج تک لفظ غیرت کی ضرورت نہیں پڑی۔

اس بحث کے بعد میں نے محسوس کیا جس طرح زبانیں نئے جذبوں، نئی روایات اور نئے ماحول کے مطابق نئے الفاظ ایجاد کرتی رہتی ہیں بالکل اسی طرح زبانوں سے غیر ضروری الفاظ خارج بھی ہوتے رہتے ہیں۔ زبانوں کے لفظ مرتے بھی رہتے ہیں مثلاً آپ جمہوریت کو لے لیجئے، یہ لفظ ہمارے معاشرے میں بڑی تیزی سے غیر ضروری اور بے وقعت ہوتا جا رہا ہے لہٰذا عوام نے اس پر توجہ دینا بند کر دی ہے میرا خیال ہے اگلے دس پندرہ برسوں میں یہ لفظ ہماری لغات سے خارج ہو جائے گا، اسی طرح انصاف، قانون اور مساوات کے الفاظ ہیں یہ بھی بڑی تیزی سے بے وقعت اور پھیکے ہوتے جا رہے ہیں، یہ لفظ بھی بہت جلد ہمارا ساتھ چھوڑ دیں گے، اسی طرح بعض الفاظ وقت کے ساتھ ساتھ اپنے معانی بھی بدل لیتے ہیں۔ مثلاً آپ سیاست کو لے لیجئے یہ لفظ 1930ء سے 1978ء تک مقدس سمجھا جاتا تھا لیکن 1979ء کے بعد اس لفظ کے تقدس میں بڑی تیزی سے کمی آئی یہاں تک کہ 2006ء تک پہنچ کر اس کے معنی سمجھوتہ، منافقت، ابن الوقتی اور بے اصولی ہو گئے، روشن خیالی کا

مطلب کبھی وسعت قلبی، برداشت اور دوسرے کی رائے کا احترام ہوتا تھا لیکن اب اس کا مطلب بے حیائی، فحاشی اور عریانی ہو چکا ہے، اعتدال کا لفظ کبھی توازن کے لیے استعمال ہوتا تھا لیکن اب اس کا مطلب امریکہ نوازی اور اسلام دشمنی بن چکا ہے، دہشت گردی کبھی ڈکیتی اور قتل و غارت گری کے لیے استعمال ہوتا تھا لیکن آج یہ لفظ اہل ایمان کے لیے استعمال ہوتا ہے، آج اس کا مطلب قرآن و سنت پر عمل کرنے والے لوگ ہیں، حکومت کی نظر میں مجاہد کا لفظ کبھی انتہائی محترم ہوتا تھا اور ہمارے ملک میں "اے جاگ ذرا مرد مجاہد جاگ" جیسے ملی ترانے تک بنائے اور سنائے جاتے تھے لیکن اب یہ لفظ بھی متروک ہو چکا ہے اور حکومت کی ڈکشنری میں اس کے معانی بھی بدل چکے ہیں لہٰذا اگر ہم اپنے معاشرے میں آنے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیں تو یوں محسوس ہوتا ہے شاید آنے والے دنوں میں ہماری ڈکشنریوں سے ماں اور باپ کے الفاظ بھی ختم ہو جائیں، شاید ہمیں آنے والے دنوں میں ایمانداری، دیانت، خودداری، انا، عزت نفس، وقار، احساس، ہمدردی اور عقل جیسے الفاظ کی بھی ضرورت نہ رہے اور شاید آنے والے دنوں میں ہماری ہر ڈکشنری کا آغاز ضرورت سے ہو اور ہماری ہر لغت نظریہ ضرورت پر ختم ہو۔

لوڈشیڈنگ

دنیا میں طوفان نوحؑ سے پہلے عقاب زمین پر رہتے تھے' یہ چھوٹی قامت کے پرندے تھے' یہ درختوں پر گھونسلے بناتے تھے' مرغیوں کی طرح زمین پر چلتے تھے اور بطخوں کی طرح ''نو سے پانچ'' جیسی روٹین لائف گزارتے تھے' طوفان سے پہلے حضرت نوحؑ نے عقابوں کو کشتی میں سوار ہونے کی دعوت دی لیکن عقابوں نے یہ پیش کش مسترد کر دی' ان کہنا تھا دنیا میں کتنا بڑا طوفان آ جائے گا' پانی زیادہ سے زیادہ سمندر سے باہر نکلے گا' لوگوں کی فصلیں زیر آب آئیں گی اور بات ختم ہو جائے گی! اور ہم اس دوران درختوں پر چڑھ جائیں گے' حضرت نوحؑ نے انہیں سمجھانے کی بڑی کوشش کی لیکن جب یہ نہ مانے تو انہوں نے عقابوں کے چند انڈے کشتی میں رکھے اور سفر پر روانہ ہو گئے' طوفان کے بعد زندگی کا نیا سفر شروع ہو گیا' انڈوں سے عقابوں کے بچے نکلے اور انہوں نے جب اپنے آباؤ اجداد کی بے وقوفی کا قصہ سنا تو انہوں نے عبرت پکڑی اور پہاڑوں کو اپنا بسیرا بنا لیا' وہ دن ہے اور آج کا دن ہے عقاب بلندی پر اڑتے ہیں اور پہاڑوں پر رہتے ہیں' برسوں پہلے کسی نے عقاب کو سمجھایا طوفان گزر چکا ہے' اب یہ واقعہ دوبارہ پیش نہیں آئے گا لہٰذا تم واپس اپنی روٹین کی طرف آ جاؤ' عقاب نے یہ مشورہ سنا اور اسے بڑا دلچسپ جواب دیا' اس نے کہا ''قدرت کسی کی پابند نہیں ہوتی' اگر اللہ تعالیٰ نے کسی دن ''پلے بیک'' کا ارادہ کر لیا تو ہمارا کیا بنے گا''

ماہرین حیاتیات جانداروں کے مزاج کی ان تبدیلیوں کو ''فراست'' کہتے ہیں' ان کا خیال ہے قدرت کے اقدامات سے استفادہ نہ کرنے والے جاندار زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہتے' ماہرین کا کہنا ہے دنیا میں وہ قومیں اور وہ ملک بھی زوال پذیر ہو جاتے ہیں جو اپنے بحرانوں اور تجربوں سے سبق نہیں سیکھتے' ماہرین اس سلسلے میں مصر سے موہنجوداڑو تک دنیا کی بے شمار قدیم تہذیبوں کی مثال دیتے ہیں' وہ بتاتے ہیں ان تہذیبوں نے بھی عقابوں جیسی غلطیاں کی تھیں چنانچہ آج یہ مٹی کے ڈھیر بن کر رہ گئی ہیں' ماہرین ہاکڑا کی تہذیب کی مثال دیتے ہیں' یہ لوگ دریائے سرسوتی کے کنارے آباد تھے اور ان لوگوں نے آباد ہوتے وقت یہ فراموش کر دیا تھا اگر دریا نے اپنا رخ پھیر لیا تو ان کا کیا بنے گا' مصر کے لوگوں نے بھی یہ بھلا دیا تھا اگر ریت کا بہت بڑا طوفان آ گیا اور آن واحد میں کھربوں ٹن ریت ان کی بستیوں پر آ گری تو ان کا کیا بنے گا' اسی طرح قدیم تبت کے لوگ یہ بھول گئے تھے اگر پہاڑوں کے گلیشیر پگھل گئے اور یہ گلیشیر ان کے شہروں پر آ گرے تو ان کا کیا بنے گا' بابل کے لوگوں نے بھی یہ

فراموش کر دیا تھا اگر حملہ آوروں نے شمال سے حملہ کر دیا تو وہ شہر کی حفاظت کیسے کریں گے اور قسطنطنیہ کے لوگوں نے بھی یہ نہیں سوچا تھا اگر کسی نے خشکی پر جہاز چلا دیئے تو ان کا کیا بنے گا' ماہرین کا خیال ہے دنیا کی بے شمار قدیم تہذیبوں نے شہر آباد کرتے ہوئے قدرتی وسائل کے بارے میں بھی نہیں سوچا تھا' انہوں نے قدرتی آفات کے امکانات کو بھی فراموش کر دیا اور انہوں نے انسانی مسائل اور وسائل میں بھی توازن برقرار نہیں رکھا تھا لہٰذا یہ ملک ٹوٹ گئے یا پھر فنا ہو گئے' ماہرین نو آبادیاتی دور کی مثال بھی دیتے ہیں' ماہرین کا کہنا ہے یورپی اقوام ایشیا' افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک پر قبضہ کرتے ہوئے یہ بھول گئی تھیں' ہم اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ان ممالک کو سمندر پار سے کیسے کنٹرول کریں گی' یورپی اقوام کی اس غلطی نے انہیں نہ صرف یورپ میں واپس دھکیل دیا بلکہ وہ اپنے اصل علاقوں سے بھی محروم ہو گئیں' آج یہ اقوام ان لوگوں کے شدید دباؤ میں ہیں جن پر کبھی یہ لوگ حکومت کرتے تھے' ماہرین کا کہنا ہے قدرت ہر انسان کو ایک یا دو بار اپنی غلطی کی اصلاح کا موقع دیتی ہے لیکن اللہ کسی قوم کو غلطیاں کرنے یا دہرانے کا چانس نہیں دیتا لہٰذا قوموں کی ایک آدھ غلطی انہیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اقوام کی فہرست سے خارج کر دیتی ہے' ماہرین کا خیال ہے قوموں کو ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اٹھانا چاہیے' انہیں ہزار سال تک کی منصوبہ بندی کرنی چاہیے اور انہیں اس منصوبہ بندی سے ایک لمحے کیلئے دائیں بائیں نہیں ہونا چاہیے۔

حیاتیات کا یہ فلسفہ سو فیصد درست ہے' قوموں کے پاس غلطیوں کی گنجائش بھی نہیں ہوتی اور قوموں کی زندگیوں میں بہت کم ایسی غلطیاں ہوتی ہیں جن کی اصلاح ممکن ہوتی ہے' تاریخ کے لگائے اکثر زخموں کو سینا ممکن نہیں ہوتا' آپ مشرقی پاکستان کی مثال لیجئے' ہم آج لاکھ کوشش کر لیں لیکن ہم بنگلہ دیش کو دوبارہ مشرقی پاکستان نہیں بنا سکیں گے اسی طرح پوری اسلامی دنیا مل کر بھی خلافت کا دور واپس نہیں لا سکتی اور دنیا کی کوئی طاقت آج روس کو دوبارہ سوویت یونین نہیں بنا سکتی' ہم لوگ یہ حقیقت جانتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم غلطی پر غلطی کرتے چلے جا رہے ہیں اور ہم کسی غلطی سے سبق نہیں سیکھتے' آپ بجلی کے موجودہ بحران کو لیجئے' پاکستان میں بجلی کا سب سے بڑا بحران 1994ء میں پیدا ہوا تھا' اس دور میں حکومت نے بجلی بچانے کیلئے ٹیلی ویژن نشریات تک کی ''لوڈ شیڈنگ'' شروع کر دی تھی' مجھے اچھی طرح یاد ہے اس دور میں ''پیک آورز'' میں ٹیلی ویژن کی نشریات دو گھنٹے کیلئے بند کر دی جاتی تھیں' اس دور میں حکومت نے غیر ملکی کمپنیوں کو بجلی کی صنعت میں سرمایہ کاری کی دعوت بھی دی تھی' حکومت نے سرمایہ کاری کے رولز نرم کر دیئے' جس کے نتیجے میں بے شمار چھوٹی بڑی کمپنیاں پاکستان آئیں اور انہوں نے بجلی کے بزنس میں سرمایہ کاری کی' حکومت کی اس پالیسی کے باعث 1996ء تک نہ صرف بجلی کا یہ بحران ختم ہو گیا بلکہ پاکستان کے پاس بجلی زائد ہو گئی' یہ بے نظیر بھٹو کی حکومت تھی اور آصف علی زرداری بدقسمتی سے اس اچھے کام میں فرنٹ پر تھے' جب 1997ء میں نواز شریف کی حکومت آئی اور سیف الرحمٰن خان کو احتساب کی ذمہ داری سونپ دی گئی تو خان صاحب نے اپنے احتساب کا آغاز بجلی سے کیا' وہ ''آئی پی پی'' کو ملک سے غداری ثابت کرنے میں جت گئے تھے' انہوں نے تمام کمپنیوں کے نمائندوں کو بلایا اور انہیں نئے نرخ پر مجبور کر دیا' اس دور میں فالتو بجلی بھارت کو فروخت کرنے کا فیصلہ بھی ہوا تھا' یہ سلسلہ 2000ء تک جاری رہا تھا' 2000ء میں حکومت

کو اچانک محسوس ہوا پاکستان میں بجلی کی مانگ میں اضافہ ہو رہا ہے اور اگر پیداوار میں اس کے مطابق اضافہ نہ ہوا تو مستقبل قریب میں ملک بجلی کے شدید بحران کا شکار ہو جائے گا چنانچہ حکومت نے 2002ء میں پاور پالیسی بنائی اور غیر ملکی کمپنیوں کو ایک بار پھر پاکستان میں تھرمل پلانٹس لگانے کی دعوت دے دی' یہ پالیسی تو بن گئی لیکن 2007ء تک اس پالیسی پر عملدرآمد نہ ہو سکا' اس دوران گیارہ کمپنیوں نے پاور پلانٹس لگانے کی اجازت بھی لی لیکن اس اجازت اور عملدرآمد کے درمیان بیورو کریسی حائل ہو گئی اور 2007ء تک ایک بھی کمپنی پاکستان میں پاور پلانٹ نہ لگا سکی' اس وقت صرف ایک کمپنی نے پاور پلانٹ کی تعمیر شروع کی ہے' یہ پلانٹ لاہور کے مضافات میں لگ رہا ہے اور اس کی پیداوار بھی 2009ء میں شروع ہو گی' حکومت جانتی تھی چھوٹے سائز کے ہائیڈل پاور پلانٹ لگانے کیلئے پانچ سے چھ سال کا عرصہ چاہیے جبکہ تھرمل پلانٹس کو تعمیر سے پیداوار کیلئے دو سے اڑھائی سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے' حکومت کے نوٹس میں یہ حقیقت ساڑھے سات برس پہلے آ گئی تھی لیکن حکومت نے ان ساڑھے سات برسوں میں بجلی کے شعبے میں ایک پیسے کی سرمایہ کاری نہیں کی' 2007ء اپریل میں جب بجلی کا بحران شروع ہوا تو حکومت نے اس کے حل کیلئے روایتی طریقہ استعمال کرنا شروع کر دیا' حکومت نے لوڈ شیڈنگ اور شام آٹھ بجے تمام دوکانیں اور شاپنگ سنٹر بند کرنے کا حکم دے دیا' اس حکم سے بجلی تو بچ گئی لیکن معیشت کو دس کھرب روپے کا نقصان پہنچ گیا' حکومت اب دن رات پاور پلانٹس لگانا شروع کر دے گی اور ان کے نتیجے میں دو تین برسوں میں ہماری ضرورت سے زائد بجلی پیدا ہونے لگے گی اور اس کے بعد یقیناً آنے والی حکومت آصف علی زرداری کی طرح جناب سلیمان شاہ کا احتساب بھی شروع کر دے گی لہٰذا وقت ثابت کرے گا ہم 2007ء میں ٹھیک تھے اور نہ ہی 2010ء میں ہمارا رویہ درست ہو گا۔

یہ بحران بھی ثابت کر رہا ہے ہم ایک عجیب قوم ہیں' ہم گرمی میں پانی کی کمی کے باعث مرتے ہیں اور مون سون میں ہم سیلاب میں غرق ہو جاتے ہیں' ہم نے آج تک قحط سے بچنے کی کوئی لانگ ٹرم پلاننگ کی اور نہ ہی ہم عوام کو سیلاب سے بچانے کا کوئی جامع منصوبہ تیار کر رہے ہیں' ہم عجیب قوم ہیں' ہم کبھی بھارت کو فالتو بجلی بیچتے ہیں اور کبھی لوڈ شیڈنگ پر مجبور ہو جاتے ہیں' ہم کبھی تھرمل پاور پلانٹس کو ملک سے غداری قرار دیتے ہیں اور کبھی یہ ہماری سب سے بڑی ضرورت بن جاتے ہیں' ہم کیسے لوگ ہیں' ایسی قوموں کے بارے میں ٹوئن بی نے کہا تھا'' یہ برف پر کھڑی قومیں ہیں جن کی بنیادیں پگھل رہی ہیں'' جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے ہم لوگ خود کو نالائق اور کوتاہ فہم ثابت کرتے جا رہے ہیں لہٰذا اگر دیکھا جائے تو ہم میں اور موہنجوداڑو کے لوگوں میں کوئی فرق نہیں وہ لوگ پانی کی کمی کے باعث مر گئے تھے اور ہم لوگ لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے دم توڑ رہے ہیں۔

منافقت

ان کی آواز میں تلخی تھی' میں نے عرض کیا' میں ڈرائیونگ کر رہا ہوں' آپ کا فون نہیں سن سکتا اگر آپ کل فون کر لیں تو بہتر ہو گا لیکن انہوں نے انکار کر دیا' میں نے گاڑی فوراً سائیڈ پر کھڑی کر دی۔

مجھے اکثر محسوس ہوتا ہے ہم موبائل فون کے سلسلے میں انتہائی سفاک ہیں' ہم میں ابھی فون کی اخلاقیات پیدا نہیں ہوئیں' پوری دنیا میں موبائل کو ''پرائیویٹ پراپرٹی'' سمجھا جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں لوگ وزیٹنگ کارڈز پر موبائل فون کا نمبر درج نہیں کرتے وہاں اگر کوئی شخص کسی کو موبائل نمبر دے تو وہ اس سے یہ ضرور پوچھتا ہے ''کیا میں آپ کے موبائل پر فون کر سکتا ہوں'' امریکہ میں لوگ پہلے گھر یا دفتر کے نمبر پر فون کرتے ہیں اگر مطلوبہ شخص وہاں دستیاب نہ ہو تو وہ موبائل پر مختصری کال کرتے ہیں جبکہ ہمارے ملک میں لوگ موبائل کو ''پبلک پراپرٹی'' سمجھتے ہیں' ہم لوگ کسی بھی وقت کسی کے موبائل پر کال کر دیتے ہیں اور اس کی مجبوری کا خیال کئے بغیر بلا تکان بولتے چلے جاتے ہیں۔ میں بھی موبائل فون کے متاثرین میں شامل ہوں' میں نے ایک دن اپنے موبائل کا پروفائل نکال کر دیکھا تو معلوم ہوا مجھے سات گھنٹوں میں ایک سو نو کالیں آئی تھیں اور یہ تمام کالیں شکوؤں اور شکایتوں سے لبریز تھیں' میں نے اس دن اپنے لئے موبائل کی اخلاقیات وضع کیں اور ان پر سختی سے کاربند ہو گیا' میں نے کسی کے موبائل فون پر کال کرنی ہو تو میں پہلے ''ایس ایم ایس'' کرتا ہوں' اسے اپنا تعارف کراتا ہوں اور اس سے فون کرنے کی اجازت مانگتا ہوں' اگر اس کا مثبت جواب ملے تو میں اسے کال کر لیتا ہوں بصورت دیگر اس کے جواب کا انتظار کرتا ہوں۔ میں جب بھی کسی کے موبائل پر فون کرتا ہوں تو میں اس سے یہ ضرور پوچھتا ہوں ''آپ مصروف تو نہیں ہیں' آپ ڈرائیونگ تو نہیں کر رہے؟ اور کیا میں آپ سے اتنے منٹ بات کر سکتا ہوں؟'' میں ہمیشہ کوشش کرتا ہوں میں دوسروں کو ٹیلی فون پر بری خبر نہ سناؤں' اس کی وجہ میرے ایک دوست ہیں' میرے یہ دوست کہا کرتے ہیں ''ہم نے ٹیلی فون کو ڈیپریشن پھیلانے والا آلہ بنا دیا ہے'' وہ کہتے ہیں ''آپ دن میں پچاس بار فون اٹھائیں' آپ کو دوسری طرف سے ہمیشہ بری خبر ملے گی' کوئی نہ کوئی شخص آپ کی ٹینشن اور ڈیپریشن میں اضافہ کرے گا'' میں اپنے دوست کی بات سے اتفاق کرتا ہوں' ہم لوگ حقیقتاً اپنا ڈیپریشن' اپنی ٹینشن اور اپنی

فرسٹریشن فون کے ذریعے دوسروں تک منتقل کرتے رہتے ہیں' موبائل فون کا ایک مسئلہ ہماری آواز بھی ہے' ہم جب بھی فون کرتے ہیں تو ہم اپنی آواز میں دنیا جہان کی بدتمیزی' کرختگی' تکبر اور غصہ بھر لیتے ہیں' ہم یوں ظاہر کرتے ہیں جیسے دوسری طرف صدر بش بیٹھا ہے اور ہم نے ٹیلی فون کے ذریعے اس سے افغانستان اور عراق کے تمام شہداء کا بدلہ لینا ہے' لوگوں کی اس عادت کا مجھے ذاتی طور پر تجربہ ہو چکا ہے' پچھلے دنوں بعض علماء کرام مجھ سے ناراض ہو گئے اور ان حضرات نے پاکستان کے طول وعرض پر پھیلے اپنے ہزاروں شاگردوں کو ٹیلی فون پر تعینات کر دیا' یہ مومنین مجھے فون کرتے اور میرے السلام علیکم کے جواب میں انتہائی غلیظ گالیاں دیتے' علماء دین کا یہ پہلو میری نظروں سے اوجھل تھا لہٰذا میں حیران رہ گیا' بعدازاں پتہ چلا اس ٹیلی فونک کمپین کے روح رواں میرے ایک سابق جاسوس دوست تھے' انہوں نے علماء دین کو بتایا تھا میرے عقائد میں ملاوٹ آ گئی ہے اور جب تک میری ماں' بہن کو گالی نہیں دی جائے گی میرا فکری اور نظریاتی قبلہ درست نہیں ہو گا چنانچہ مہربانوں نے مجھے دس دن میں چار ہزار کالز کیں اور جب تک میں نے اپنے عقائد کی درستی کا اعتراف نہ کر لیا' ان لوگوں کا ٹیلی فونک جہاد جاری رہا لہٰذا کہنے کا مطلب ہے' ہم لوگوں نے موبائل کو اذیت رسانی کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔

میں ان صاحب کی طرف واپس آتا ہوں' میں نے گاڑی سائیڈ پر روک لی' وہ صاحب بڑے غصے سے فرما رہے تھے' آپ نے پچھلے دنوں پاکستان کے نشان کے بارے میں کالم لکھا تھا' آپ نے لکھا تھا 51 برس تک پاکستان کا سرکاری نشان ''ایمان' اتحاد اور تنظیم'' کی بجائے ''اتحاد' ایمان اور تنظیم'' رہا' میں نے فوراً اپنا جرم تسلیم کر لیا' وہ غصے سے بولے ''ہمارے سرکاری نشان میں ایمان پہلے نمبر پر آئے یا دوسرے درجے پر؟ آپ مجھے بتائیے اس ملک میں ایمان ہے کہاں'' میں نے معذرت کی اور ان سے درخواست کی میں نے کسی جگہ پہنچنا ہے اور اگر وہ مجھے کل فون کر لیں تو میں زیادہ تفصیل سے گفتگو کر سکوں گا' انہوں نے غصے سے فون بند کر دیا' میں آگے چل پڑا لیکن ان کے بتائے نقطے پر سوچنا شروع کر دیا' ان کی بات درست تھی' ہمارا سرکاری نشان ایمان' اتحاد اور تنظیم پر مشتمل ہے' ہماری تمام سرکاری دستاویزات پر یہ قومی کمٹمنٹ درج ہے لیکن اس ملک میں ان تینوں چیزوں کا انتہائی فقدان ہے' ہم سب سے پہلے ایمان کی طرف آتے ہیں' ایمان کے تین درجے ہوتے ہیں' برائی کو قوت بازو سے روکنا' برائی کو زبان سے روکنا اور دل میں برائی کو برائی سمجھنا' ہم بدقسمتی سے ان میں سے کسی درجے میں نہیں آتے' ہم نے برائی کو نظریہ ضرورت کی شکل دے دی ہے۔ ہم برائی کو زمینی حقائق کہنے لگے ہیں' مسجد ایمان کا مرکز اور داڑھی اور نماز ایمان کا لباس ہوتے ہیں لیکن ہماری مسجدیں نفاق اور فرقہ پرستی کا میدان بن چکی ہیں۔ ہماری مسجدوں میں فرقہ پرستی کا فساد کاشت ہوتا ہے' ہم خانہ خدا میں بیٹھ کر دوسرے مسلمانوں کو کافر ثابت کرتے ہیں' ہم پولیس کے بغیر اپنی مسجدوں میں نماز ادا نہیں کر سکتے اور ہم نے اس ملک میں اہل ایمان کو دہشت گرد بنا دیا ہے' ہماری ایمانداری کا یہ حال ہے اس ملک میں دودھ' دوا اور پانی تک خالص نہیں ملتا' لوگ عمروں اور حجوں کے نام پر فراڈ کرتے ہیں اور گدھوں کی اون سے جائے نمازیں بناتے ہیں' لوگ جعلی رنگ اور گھٹیا کپڑا بیچنے کیلئے قسم اٹھا لیتے ہیں' لوگ قرآن

اٹھا کر جھوٹی گواہیاں دیتے ہیں' ہمارے ڈاکٹر مریضوں کے گردے چوری کر لیتے ہیں اور ہمارے سیاستدان پارلیمنٹ میں حلف اٹھا کر لوٹے ہو جاتے ہیں اور ہمارے ایمان کی یہ حالت ہے ہم بش کو خوش کرنے کے لئے اپنے سینکڑوں ہزاروں لوگوں پر بم برسا دیتے ہیں' ہم وانا میں توپیں گاڑ دیتے ہیں، ہماری دوسری کمٹمنٹ اتحاد تھا۔ آپ کراچی سے لے کر لنڈی کوتل تک اتحاد کا مطالعہ کر لیجئے' ہم 60 برس بعد بھی پٹھان، بلوچی، سندھی اور پنجابی ہیں' ہم آج تک پاکستانی نہیں بن سکے، ہم آج تک کسی مسئلے پر ایک نہیں ہو سکے، ہم آج بھی ڈیم بنانے پر ایک دوسرے سے الجھ رہے ہیں، ہمارے بلوچ کو پنجابی نہیں آتی اور ہمارا پنجابی پشتو اور سندھی نہیں سمجھ سکتا۔ ہمارے اتحاد کا یہ عالم تھا ہم نے 1971ء میں اپنا آدھا ملک کاٹ کر پھینک دیا تھا اور آج تک اس کارنامے پر فخر کر رہے ہیں، ہماری اپوزیشن جماعتیں تک کسی مشترک ایجنڈے پر متفق نہیں ہو پاتیں۔ ہماری ایم ایم اے چار سال میں استعفوں پر اتفاق رائے قائم نہیں کر سکی اور ہماری ہر سیاسی جماعت کئی کئی بار سکیورٹی رسک اور غدار قرار دی جا چکی ہے اور ہماری تیسری کمٹمنٹ نظم تھا، آپ اس ملک کی سڑکوں پر نظم وضبط کا مظاہرہ دیکھ لیجئے ،اس ملک میں 61 برس بعد بھی قطار نہیں بن سکی، آج بھی لوگ ایک دوسرے کے کندھے پر چڑھ کر بجلی کا بل ادا کرتے ہیں، لوگ حج کے فارم کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ دست وگریبان ہوتے ہیں اور افطاری کی کھجور کے لیے دوسرے کو کہنی مارتے ہیں، سڑکوں پر ہر گاڑی دوسری گاڑی سے آگے نکلنا چاہتی ہے، ہر چوک پر درجنوں گاڑیاں سگنل توڑتی ہیں اور لوگ فائر بریگیڈ اور ایمبولینسوں کے راستے میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہمارے ملک میں نظم وضبط کا یہ عالم ہے یہاں کوئی بھی شخص کسی بھی وقت، کسی بھی ادارے کا سربراہ بن سکتا ہے اور اسے کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔

مجھے ان صاحب کی بات میں بڑا وزن محسوس ہوا' مجھے لگا ہم اخلاقی' سیاسی اور سماجی ہر شعبے میں منافقت کا شکار ہیں' ہم لوگ اپنے ہر شعبے میں منافقت کا بیج بوتے ہیں' اس بیج کو منافقت کا پانی اور کھاد دیتے ہیں اور اس کے بعد توقع کرتے ہیں اس پر ترقی اور خوشحالی کے پھل اور پھول لگیں گے' ہم اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دیتے ہیں اور اس کے بعد اس سے کرم اور رحم کی دعائیں کرتے ہیں' ہم لوگ منافقت کے زمیندار ہیں' ہم بیریوں پر سیب اگانا چاہتے ہیں اور ہم بانسوں کے رس سے گڑ بنانا چاہتے ہیں۔

کمیونیکیشن ایج

''یہ ہمارے دوست ہیں، ثاقب صاحب، آپ سے ملنے کیلئے امریکہ سے آئے ہیں'' اسد نے ثاقب صاحب کا تعارف کرایا اور میں نے ان کی طرف ہاتھ بڑھا دیا، ابھی میرا ہاتھ ان کے ہاتھ تک نہیں پہنچا تھا کہ ان کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ ثاقب صاحب نے ایکسکیوزمی کہا، موبائل کی سکرین دیکھی اور ہیلو کا نعرہ لگا کر موبائل کان سے لگا لیا، میں نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا، ثاقب صاحب بڑی دیر تک امریکی لہجے میں گفتگو کرتے رہے اور ہم دونوں ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرتے رہے، فون بند ہوا تو انہوں نے صدر بش کے سٹائل میں سوری کہا اور ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن ہاتھ کے ہاتھ تک پہنچنے سے پہلے میرا موبائل بج گیا۔ میں نے جلدی جلدی ہاتھ ملایا اور میز کی طرف بھاگ کھڑا ہوا، میرا فون مسلسل چیخ رہا تھا، فون پر جنرل صاحب کا نام چمک رہا تھا۔ میں جنرل صاحب کی کال ''اگنور'' نہیں کر سکتا تھا لہٰذا میں نے فوراً فون اٹھایا اور اس کے بعد ہم دونوں صدام حسین کی پھانسی اور اس کے مابعد اثرات پر گفتگو کرنے لگے۔ جنرل صاحب کو میرے نظریات اور خیالات سے شدید اختلاف تھا جبکہ میں انہیں قائل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ ہماری گفتگو 15 منٹ تک جاری رہی۔ اس دوران اسد اور ثاقب کھڑے رہے اور میں کمرے میں ٹہل ٹہل کر فون سنتا رہا۔ جنرل صاحب نے تھک کر فون بند کیا تو میں دوبارہ ان کی طرف متوجہ ہوا۔ ثاقب صاحب اس وقت موبائل پر کسی فیڈرل سیکرٹری سے لاٹری کے نمبر ڈسکس کر رہے تھے اور اسد دبی دبی آواز میں اپنی بیوی سے چھوٹی بیٹی کی طبیعت پوچھ رہا تھا۔ وہ دونوں کمرے کے مختلف کونوں میں موبائل کان سے لگائے کھڑے تھے اور میں کبھی ایک کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی دوسرے کی طرف، وہ دونوں بڑی بے چارگی سے میری طرف دیکھتے تھے لیکن دوسری طرف موجود لوگ ان کا پیچھا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اسد نے اپنی بیوی کو جھاڑ پلائی، غصے سے فون بند کیا اور میری طرف چل پڑا، وہ ابھی بمشکل میرے قریب پہنچا تھا کہ ثاقب صاحب نے موبائل مٹھی میں دبایا اور دبی آواز میں کہا ''تم نے سیکرٹری صاحب سے بات کرنی تھی'' اسد نے فوراً اثبات میں گردن ہلائی اور واپس پلٹ گیا، ثاقب صاحب نے سیکرٹری سے اسد کا تعارف کرایا اور فون اس کے ہاتھ میں دے کر میری طرف متوجہ ہو گئے، انہوں نے گرم جوشی سے دوبارہ ہاتھ ملایا اور بولے ''میں آپ کا بہت بڑا فین ہوں'' میں نے خوش دلی سے انہیں بتیسی دکھانا شروع

کر دی۔ ثاقب صاحب نے ابھی بمشکل میرے دانت دیکھے ہوں گے کہ میرا موبائل بج اٹھا، میں نے سکرین پر نظر ڈالی، یہ میری بیوی کا فون تھا، میں نے ایکسکیوزمی کہا اور فون اٹھا لیا، میں نے بیوی سے پانچ منٹ میں رنگ بیک کا وعدہ کیا لیکن بیوی نے میری بات سنی ان سنی کر دی اور مجھے بتانا شروع کر دیا "اباجی کی شوگر بہت بڑھ گئی ہے اور انہیں فوراً ہسپتال پہنچانا ہو گا" میں ہاں ہاں، اچھا اچھا اور ٹھیک ہے ٹھیک ہے قسم کے جواب دینے لگا۔ اس دوران ثاقب صاحب مجھے بے چارگی سے دیکھتے رہے، میں نے اپنی بیوی سے بڑی مشکل سے دس منٹ مانگے، فون بند کیا اور ثاقب صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ثاقب صاحب نے جیب سے اپنا وزٹنگ کارڈ نکالا لیکن ابھی یہ کارڈ ان کے ہاتھوں ہی میں تھا کہ اسد نے زور سے سرگوشی کی "ثاقب سیکرٹری صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں" ثاقب صاحب کارڈ لے کر اسد کی طرف چلے گئے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کان جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

میں نے موقع غنیمت جانا اور فوراً بیوی کو فون ملانے لگا، میری بیوی دس منٹ سے پہلے "رنگ بیک" وصول کر کے حیران رہ گئی اور اس نے ایک بار پھر اباجی کی شوگر کی رام کہانی سنانا شروع کر دی۔ اس دوران ثاقب صاحب اور اسد نے فون بند کیا اور آ کر میرے سر پر کھڑے ہو گئے، میں شرمندگی اور خفت کے ملے جلے احساس سے انہیں دیکھنے لگا، وہ میری خفت پہچان گئے چنانچہ اسد نے فون پر دوبارہ بیٹی کا حال پوچھنا شروع کر دیا اور ثاقب صاحب "ایس ایم ایس" کرنے لگے۔ میری بیوی کی کہانی ختم ہوئی تو درمیان میں زیدی صاحب کا فون آ گیا، زیدی صاحب ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے "کنٹری ہیڈ" ہیں اور ہماری کمپنی ان کے ساتھ بڑے لیول پر کام کرتی ہے چنانچہ میں ان کی کال بھی "اگنور" نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے شدید پریشانی میں ان دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ابھی تک اپنے اپنے فون کے ساتھ مگن تھے۔ میں نے فوراً فون اٹھا لیا، زیدی صاحب میرے سٹاف کی کوتاہیوں کی طویل فہرست لے کر بیٹھے تھے، ہم نے ڈاکومنٹری پچھلے ہفتے مکمل کر لی تھی لیکن وہ ابھی تک کراچی نہیں پہنچی تھی۔ ہم نے ان کے لیے چار سیمینار کرنے تھے اور ان سیمیناروں کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ میں نے زیدی صاحب سے دس منٹ کا وقت مانگا اور اس کے بعد لاہور اور کراچی میں رابطے شروع کر دیے، فلم ٹیکنیک کے لوگوں سے رابطہ کیا، ایونٹ مینجمنٹ کے لوگوں کو فون کیے اور ساری اپ ڈیٹ لے کر زیدی صاحب کو رپورٹ دے دی۔ میں اس کام سے فارغ ہوا تو اسد واش روم جا چکا تھا جبکہ ثاقب صاحب لیپ ٹاپ کھول کر "ای میلز" کا جواب دے رہے تھے۔ مجھے واش روم سے اسد کے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں' وہ پانی اور کموڈ کے شور کے ساتھ ساتھ موبائل پر کسی کے ساتھ جھگڑ رہا تھا۔ میں نے کھنکار کر گلہ صاف کیا اور ثاقب صاحب سے مخاطب ہوا "آپ امریکہ میں کیا کرتے ہیں" ثاقب صاحب نے چونک کر سر اٹھایا، مسکرا کر ہاتھ میں دبے کارڈ کی طرف دیکھا اور دوبارہ لیپ ٹاپ کی سکرین کی طرف مڑ کر بولے "آئی نیڈ اونلی ون منٹ" میں مسکرا کر رہ گیا۔ ثاقب صاحب کی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ سے کھیلنے لگیں۔ میں نے موبائل فون اٹھا لیا، مجھے اس وقت تک 13 ایس ایم ایس مل چکی تھیں۔ میں نے ایس ایم ایس پڑھنا شروع کر دیں۔ اسد واش روم سے نکلا تو وہ ایک ہاتھ سے بیلٹ باندھنے کی کوشش کر رہا تھا اور

دوسرے ہاتھ سے اس نے موبائل کان کے ساتھ لگا رکھا تھا، اس کا جرمن کتا کسی آوارہ کتیا کے ساتھ بھاگ گیا تھا اور وہ موبائل پر اپنے ملازموں کو کتا تلاش کرنے کی ہدایات دے رہا تھا۔ اس نے بمشکل بیلٹ باندھی لیکن زپ بدستور کھلی رہی۔ میں دوبارہ ایس ایم ایس پڑھنے لگا، ثاقب صاحب ای میل کے جواب دیتے رہے اور اسد موبائل پر کتا تلاش کرتا رہا، اس کھیل میں ایک گھنٹہ گزر گیا میں نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا، شام کے چار بج چکے تھے، اوریا مقبول جان کا جہاز لینڈ کر چکا تھا اور میں نے اسے ایئرپورٹ سے لینا تھا۔ میں نے اسد کو اشارہ کیا، اس نے فون ہولڈ کرایا اور میرے منہ پر جھک گیا، میں نے اسے اپنا مسئلہ بتایا، اس نے مجھے اشارے سے جانے کی اجازت دے دی۔ میں نے ثاقب اور اسد دونوں کی طرف ہاتھ ہلایا اور دفتر سے باہر آ گیا۔

گاڑی تک آتے آتے میرا فون مزید دو مرتبہ بج چکا تھا۔ یہ دونوں کالز بھی یقیناً ارجنٹ ہوں گی لیکن میرا گاڑی میں بیٹھنا زیادہ ضروری تھا لہٰذا میں نے کالز "اگنور" کیں اور دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں نے چابی گھماتے گھماتے "مسڈ کالز" دیکھیں، اف خدایا یہ دونوں کالز انتہائی اہم تھیں، میں نے ایک ہاتھ میں سٹیئرنگ پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے فون ڈائل کرنے لگا۔ دونوں فون "بزی" مل رہے تھے، میں نے ٹھیک اس لمحے سوچا، کمیونیکیشن کے اس زمانے نے دور بیٹھے لوگوں کے مابین فاصلے تو مٹا دیئے ہیں لیکن اس نے سامنے موجود لوگوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیا ہے۔ اس کمیونیکیشن ایج کی وجہ سے سات براعظموں پر پھیلی دنیا ہماری ایک ہیلو کے فاصلے پر آ گئی ہے لیکن ہمارے پاس سامنے بیٹھے شخص کے لئے وقت نہیں بچا اور ہم دوری اور نزدیکی کے ایک ایسے گورکھ دھندے میں پھنس گئے ہیں جس میں دور رہنے والے ہمارے نزدیک آ گئے ہیں لیکن نزدیک رہنے والے لوگ ہم سے بہت دور چلے گئے ہیں، ہم جب چاہیں پوری دنیا سے رابطہ کر سکتے ہیں لیکن ہمیں سامنے بیٹھے شخص کے سلام کا جواب دینے میں گھنٹہ لگ جاتا ہے میں نے سوچا کمیونیکیشن ایج کی یہ دنیا کیسا گلوبل ولیج ہے جس میں قطب شمالی کا باشندہ تو میرے کان کے ساتھ لگ رہا ہے لیکن میرے ہمسائے اور میری چھت کے نیچے رہنے والے میرے بھائی کو میری "ہیلو" کیلئے سال انتظار کرنا پڑتا ہے"۔

پروٹوکول

میرے آگے پیچھے دائیں بائیں سینکڑوں گاڑیاں تھیں' بمپر سے بمپر اور لائٹ سے لائٹ جڑی تھی' ہر طرف ہاہا کار مچی تھی' ڈرائیور نے تھوڑی دیر انجن سٹارٹ رکھا پھر گاڑی بند کر کے نیچے اترا اور صورتحال جاننے کیلئے گاڑیوں کے ہجوم میں گم ہو گیا' میں نے شیشہ کھولا اور پریشانی میں آگے پیچھے دیکھنے لگا' ہر طرف دھواں ہی دھواں اور شور ہی شور تھا' ڈرائیور نے واپس آ کر اطلاع دی "روٹ لگا ہے کوئی وی آئی پی گزرنے والا ہے" میں نے پیچھے ٹیک لگا لی' مجھے یقین تھا میں اب وقت پر ایئرپورٹ نہیں پہنچ سکوں گا' میرے آگے ایک پرانی فوکسی کھڑی تھی' گاڑی کی پچھلی سیٹ پر درمیانی عمر کی ایک خاتون بیٹھی تھی' میں نے اس خاتون کو بار بار بے چینی سے کروٹیں بدلتے دیکھا' وہ شیشے سے باہر جھانکتی' پہلو بدلتی' آگے جھکتی' ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بزرگ کے کان میں کچھ کہتی' ساتھ بیٹھی بوڑھی خاتون سے مشورہ کرتی اور پھر پیچھے گر جاتی' پانچ سات منٹ کے وقفے سے وہ دوبارہ سیدھی ہوتی اور یہ سارا عمل دہراتی' اس کی بے چینی اتنی نمایاں تھی کہ تمام گاڑیوں میں بیٹھے لوگ اسے نوٹ کر رہے تھے' ذرا دیر بعد میں نے محسوس کیا وہ خاتون چیخ رہی ہے اور اس گاڑی میں بیٹھے لوگوں کے چہروں پر سراسیمگی پھیل رہی ہے' میرے ساتھ میری بیوی تھی' وہ بھی اس خاتون کی پریشانی نوٹ کر رہی تھی' اس نے میری طرف دیکھا' میں نے ہاں میں گردن ہلا دی' وہ نیچے اتری' اس گاڑی کا شیشہ بجایا' خاتون سے بات کی' اس کی والدہ اور خاتون کو نیچے اتارا' ساتھ والی گاڑی میں بیٹھی تیسری عورت کے کان میں سرگوشی کی' وہ خاتون بھی نیچے اتری اور وہ چاروں عورتیں سڑک سے نیچے اتر کر اور درختوں میں گم ہو گئیں' تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئیں تو وہ خاتون کسی حد تک شانت تھی' میں نے بیوی سے مسئلہ پوچھا' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے' اس نے بتایا' خاتون کو ہسپتال لے جایا رہا ہے' اس کے گردے خراب ہیں' اسے اس وقت ٹوائلٹ کی شدید ضرورت تھی' ہم تینوں عورتوں نے اپنی اپنی چادروں سے اس کیلئے عارضی ٹوائلٹ بنا دیا تھا' یہ اب ٹھیک ہے لیکن یہ افاقہ عارضی ہے آدھ گھنٹے بعد اس کے گردوں میں دوبارہ درد اٹھے گا۔

میں نے اگلی گاڑی کی طرف دیکھا' ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بزرگ آنکھوں پر رومال رکھ کر سٹیئرنگ پر جھکے ہوئے تھے اور مریضہ نے خفت سے بچنے کیلئے چہرے پر چادر تان رکھی تھی' میں نے آگے پیچھے نظریں دوڑائیں تمام گاڑیوں میں اس سے ملتی جلتی صورتحال تھی' سکول سے واپس آنے والے بچوں کے ہونٹ خشک اور زبانیں لٹک رہی تھیں' عورتیں سراسیمگی کے عالم میں دائیں بائیں دیکھ رہی تھیں' میری طرح وقت کے پابند لوگ بار بار

گھڑیاں دیکھ رہے تھے اور پریشانی میں پیشانیوں پر دستک دے رہے تھے' تمام لوگوں نے کانوں سے موبائل لگا رکھے تھے اور فون پر اپنے اپنے پیاروں کو اپنی مصیبت کی روداد سنا رہے تھے' میں نے گھڑی دیکھی' جہاز چھوٹنے میں صرف پینتالیس منٹ باقی تھے' مجھے یقین ہو گیا میں ایئر پورٹ نہیں پہنچ سکوں گا' میں وہاں سے واپس بھی نہیں جا سکتا تھا لہذا میرے پاس صبر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا' پورے 35 منٹ بعد ''سائرن'' کی آواز آئی' پانچ منٹ تک پولیس اور پروٹوکول کی گاڑیاں گزرتی رہیں اور اس کے بعد ٹریفک رینگنا شروع ہوئی' چند بے صبرے ڈرائیوروں نے مہارت کا مظاہرہ کیا اور ٹریفک پھنس گئی' گاڑیاں گاڑیوں سے الجھ گئیں' ٹریفک کانسٹیبلوں نے معاملہ سنبھالنے کی کوشش کی لیکن جب وہ ٹریفک کی الجھی ڈوریاں سلجھانے میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے اپنے اپنے موٹر سائیکل کو کک ماری اور میدان چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ ہم سب لوگ پورا گھنٹہ ایک دوسرے کے ساتھ الجھتے رہے' جب گاڑی کھلی سڑک تک پہنچی تو ایک گھنٹہ 45 منٹ ہو چکے تھے' راستے میں میری بیوی نے مجھ سے پوچھا ''ان لوگوں میں مریض بھی ہوں گے'' میں نے جواب دیا ''یقیناً'' اس نے پوچھا ''وہ مریض جو موت سے پانچ منٹ کے فاصلے پر ہوتے ہیں اگر وہ اس صورتحال کا شکار ہو جائیں تو ان کا کیا بنتا ہو گا'' میں نے اوپر کی طرف دیکھا' اس نے پوچھا ''امتحان کیلئے جانے والے طالب علموں کی کیا حالت ہوتی ہو گی'' میں نے کندھے اچکائے اور اس نے آخری سوال پوچھا ''اگر کسی نے تمہاری طرح ایئر پورٹ جانا ہو تو وہ کیا کرتا ہو گا'' میں نے فوراً جواب دیا ''ایسے تمام لوگوں کو اپنی اپنی چھت پر رن وے بنا لینا چاہیے''۔

یہ اسلام آباد کا روز کا معمول تھا' میں دن میں بیسیوں مرتبہ یہ کھیل دیکھتا تھا اور سوچتا تھا ''کیا حکمرانوں کے کانوں تک روٹ کے شکار ان لوگوں کی سسکیاں نہیں پہنچتیں' کیا ان لوگوں کو خبر نہیں ہوتی وہ جن سنسان سڑکوں سے گزر رہے ہیں ان کے دائیں بائیں سینکڑوں گاڑیاں کھڑی ہیں اور ان گاڑیوں میں اس وقت ہزاروں لوگ جھولیاں پھیلا پھیلا کر آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں'' مجھے ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں ملتا تھا لیکن چند روز قبل میں نے اخبارات میں پڑھا صدر نے ایوان صدر میں اعلیٰ سطحی میٹنگ بلائی ہے اور سیکرٹری داخلہ کو روٹ کا وقت کم کرنے کا حکم دے دیا ہے' مجھے یہ خبر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی' مجھے محسوس ہوا اس حکم سے عام شخص کی زندگی میں تھوڑا بہت سکون آ جائے گا اسے اس سے ضرور ریلیف ملے گا' اگلے دن خبر ملی' صدر نے اس فیصلے پر عملدرآمد کا حکم بھی جاری کر دیا ہے' میری خوشی دوچند ہو گئی' میں نے سوچا دیر ہی سے سہی مگر عام آدمی کی آواز بالآخر حکمرانوں کے کانوں تک پہنچ گئی ہے اور اب لوگوں کے مسائل حل ہو جائیں گے لیکن میں اس حکم کے اگلے دن کلب روڈ پر نکلا تو میں دوبارہ اس صورتحال میں پھنس گیا پتہ چلا صدر کا حکم محض کاغذی تھا اور یہ حکم پیدائش کے فوراً بعد فائلوں میں گم ہو گیا' یہ انتہائی خوفناک بلکہ سنگدلانہ بات تھی' پروٹوکول اور سیکورٹی پوری دنیا میں ہوتی ہے لیکن سیکورٹی اور پروٹوکول کے مورچے شہری زندگی پر نہیں کھودے جاتے' اس کی عمارت عام آدمی کے معمول پر تعمیر نہیں ہوتی لیکن ہمارے ملک میں سارے نظام الٹ ہیں یہاں حکومت اور حکمرانوں کی کوئی آسائش اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جاتی جب تک اس آسائش کو دو چار سو لوگوں کا لہو نہ پلا دیا جائے' جب تک لوگوں کو اذیت نہ پہنچے ہمارے حکمرانوں کا پروٹوکول مکمل نہیں ہوتا' ہمارے ملک میں حکمران خدمت کرنے کیلئے اقتدار میں نہیں آتے وہ عوام کو تکلیف اور اذیت دینے کیلئے مسند اقتدار پر جلوہ افروز ہوتے ہیں۔

رن لاہور رن

اس نے میکسیکن لوگوں کے سٹائل میں سر کھجانا شروع کر دیا' میں نے اس سے کہا ''ٹام دیکھو ہم لوگ امریکہ سے زیادہ روشن خیال اور اعتدال پسند ہیں' ہم پچھلے دو برسوں سے میراتھن کرا رہے ہیں' تم بتاؤ کیا امریکہ میں میراتھن ہوتی ہیں'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا' میں نے کہا ''ہم نے نہ صرف میراتھن کرائی بلکہ ہماری ریس میں خواتین اور مرد دونوں نے حصہ لیا' یہ تماشا دیکھنے کے لئے پورا لاہور سڑکوں کے کنارے کھڑا تھا اور باقی ملک ٹیلی ویژن کی سکرین پر یہ کھیل دیکھ رہا تھا' تم بتاؤ کیا تمہاری زندگی میں کبھی رن نیویارک رن یا رن واشنگٹن رن یا رن شکاگو رن ہوا؟'' اس نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلا دیا' میں نے کہا ''امریکہ میں جب عوامی سطح پر کسی اقدام کی مخالفت ہوتی ہے تو گورنمنٹ اپنی پالیسی بدل لیتی ہے' وہاں ہمیشہ اکثریت کی رائے کو اقلیت پر فوقیت حاصل ہوتی ہے لیکن پاکستان میں حکومت روشن خیالی پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کر رہی' یہاں حکومت عوامی ردعمل پر کالا باغ ڈیم جیسے ایشو پر پیچھے ہٹ جاتی ہے لیکن جب روشن خیالی کی بات آتی ہے تو حکومت پوری قوت سے ڈٹ جاتی ہے' تم ہماری میراتھن ریس دیکھو' دونوں مرتبہ اپوزیشن جماعتوں نے احتجاج کیا' عوام کی اکثریت نے اس احتجاج کا ساتھ دیا لیکن اس احتجاج کے باوجود نہ صرف یہ ریس ہوئی بلکہ کامیابی کے ساتھ پایہ تکمیل تک بھی پہنچی' تم بتاؤ' کیا تمہارے ملک میں ایسا ہوتا ہے؟'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا' میں نے کہا ''اب تم امریکہ سے باہر نکلو اور ذرا سوچ کر بتاؤ کیا برطانیہ' جرمنی' فرانس' اٹلی' سپین' بلجیئم' ناروے' سویڈن اور آسٹریا میں بھی میراتھن ہوتی ہے؟ کیا جاپان' چین' فلپائن' تھائی لینڈ' ملائشیا اور سنگاپور میں میراتھن ہوتی ہے؟ کیا روس' یوکرائن' پولینڈ اور بوسنیا میں میراتھن ہوتی ہے؟ اور کیا آسٹریلیا' کینیڈا اور برازیل میں میراتھن ہوتی ہے؟'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا' میں نے کہا ''لیکن اس کے باوجود تم ہمارے ملک' ہمارے معاشرے کو پسماندہ' قدامت پسند اور ایکسٹریمسٹ کہتے ہو؟'' میں خاموش ہو گیا۔

ٹام نے دونوں ہاتھوں سے سر کھجایا' ایش ٹرے کے کونے پر رکھا سگریٹ اٹھایا' کش لیا اور ناک سے دھواں اگل کر بولا ''میں جب بھارت میں تھا تو میں نے وہاں ایک بڑی دلچسپ فلم دیکھی تھی' اس فلم کا ایک سین میرے دماغ میں ریکارڈ ہو کر رہ گیا' میں جب بھی بھارت کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے فوراً وہ فلم اور اس فلم کا وہ سین یاد آ جاتا ہے' اس فلم کی ہیروئن غریب اور ہیرو امیر تھا' ہیرو اپنے والدین پر زور دے کر ہیروئن کے ساتھ

شادی کر لیتا ہے' جس کے بعد ہیروئن کچے مکان سے محل میں آ جاتی ہے' اس محل میں اسے ہر قسم کا آرام ملتا ہے لیکن اسے عزت اور خوشی نہیں ملتی' وہ وہاں بے چین اور پریشان رہتی ہے' ایک دن ہیروئن کا باپ اپنی بیٹی سے ملنے آتا ہے' بیٹی اپنے باپ کو دیکھ کر بڑی خوش ہوتی ہے وہ اس کے ساتھ ڈھیر ساری باتیں کرتی ہے لیکن باپ ان باتوں میں چھپا ہوا کرب محسوس کر لیتا ہے' وہ اس سے پوچھتا ہے' تم یہاں خوش تو ہو؟ بیٹی فوراً اٹھ کر ڈرائینگ روم کے پردے کھینچ دیتی ہے اور کھڑکی سے باہر کی طرف اشارہ کر کے کہتی ہے' ڈیڈی یہاں سے باہر دیکھیں آپ کو پورا سمندر دکھائی دے گا' باپ اس کی بات سنی ان سنی کر دیتا ہے اور اس سے دوبارہ پوچھتا ہے' تم یہاں خوش تو ہو' وہ قہقہہ لگا کر جواب دیتی ہے' میرا بیڈ روم سو فٹ لمبا اور سو فٹ چوڑا ہے' اس میں واٹر بیڈ ہے' اس کی دیواروں کا رنگ ہلکا گلابی ہے اور اس کی کھڑکی باغ کی طرف کھلتی ہے' باپ اس سے تیسری مرتبہ پوچھتا ہے' بیٹی تم یہاں خوش تو ہو' وہ پھر مسکرا کر جواب دیتی ہے' اس گھر میں بھارت کا سب سے بڑا ریفریجریٹر' سب سے بڑا ٹی وی اور سب سے مہنگی گاڑیاں ہیں' جس قالین پر آپ کھڑے ہیں اس کی قیمت تیس لاکھ روپے ہے اور یہ صوفے ان لوگوں نے اٹلی سے خریدے تھے' باپ اسے کندھے سے پکڑ کر ہلاتا ہے اور سخت آواز میں کہتا ہے۔ میں تم سے پوچھ رہا ہوں' تم یہاں خوش تو ہو' وہ باپ کی طرف غور سے دیکھتی ہے۔ اس کے کندھے پر سر رکھتی ہے اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیتی ہے'' نام خاموش ہو گیا۔

ہمارے درمیان بڑی دیر تک خاموشی رہی۔ وہ اس وقفے کے دوران سر کھجاتا رہا یا پھر سگریٹ پیتا رہا' جب وقفہ طویل ہو گیا تو میں نے اس سے پوچھا'' تم کہنا کیا چاہتے ہو'' وہ مسکرایا' اس نے ناک سے دھواں اگلا اور سوچے ہوئے لہجے میں بولا'' صرف ریس سے خوشحالی اور روشن خیالی نہیں آتی' صرف میراتھن ترقی کا جواز نہیں ہوتی' معاشروں کیلئے قانون' انصاف' حقوق' تعلیم اور صحت بھی ضروری ہوتی ہے' رن لاہور رن سے پہلے ہیلتھ لاہور ہیلتھ کا مرحلہ آتا ہے' اس کے بعد ایجوکیشن لاہور ایجوکیشن کی ریس ہوتی ہے' اس کے بعد رائٹس لاہور رائٹس کی دوڑ ہوتی ہے' اس کے بعد جسٹس لاہور جسٹس کی باری لگتی ہے' اس کے بعد پولیس لاہور پولیس کی میراتھن ہوتی ہے اور اس کے بعد کہیں جا کر رن لاہور رن کی باری آتی ہے'' میں خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا'' وہ بولا'' کیا تم لوگوں کے پاس پینے کے لئے صاف پانی ہے؟'' اس وقت پاکستان کے 80 فیصد عوام گندہ اور مضر صحت پانی پی رہے ہیں' کیا تمہارے عوام کو دوا' ہیلتھ کیئرز اور ہسپتال مل رہے ہیں؟'' تم لاہور کے کسی ہسپتال میں چلے جاؤ تمہیں باہر گیٹ تک مریض ہی مریض ملیں گے'' میں نے اپنی آنکھوں سے ایک ایک بیڈ پر دو دو مریض دیکھے ہیں' تمہارے ملک میں ایک ایک سرجن سو' سو آپریشن کرتا ہے' زکام سے لے کر کینسر تک تمام بیماریوں کی دوائیں مریض کو اپنی جیب سے خریدنی پڑتی ہے اور لوگ ڈاکٹروں کے نسخے اٹھا کر سڑکوں پر بھیک مانگتے ہیں' تم تعلیم کی حالت دیکھ لو تمہارے ملک کا ایک بھی تعلیمی ادارہ دنیا کے ہزار بڑے تعلیمی اداروں میں شامل نہیں' تم لوگ اچھا ڈاکٹر' اچھا انجینئر' اچھا منیجر اور اچھا سائنسدان کسے کہتے ہو؟ وہ شخص جو فارن کوالیفائیڈ ہو' تمہارے ملک میں انسانی حقوق کی صورتحال بھی انتہائی خراب ہے' تم لوگ سونیا ناز اور مختاراں مائی جیسے واقعات کی وجہ سے پوری دنیا میں بدنام ہو رہے ہو' تمہارے ملک میں چائلڈ لیبر ہے' مزدوروں کی تنخواہیں کم ہیں' تمہاری جیلوں میں مجرموں کے

ساتھ انتہائی اخلاق سوز سلوک ہوتا ہے اور تمہارے ملک میں کسی ملازم کو سوشل سکیورٹی حاصل نہیں' تم لوگ انصاف کی پانچویں فہرست میں آتے ہو' تمہاری عدالتوں میں لاکھوں مقدمات زیر التوا ہیں' تمہارے نظام عدل میں لوگوں کو اپنی بے گناہی ثابت کرنے میں تیس تیس سال لگ جاتے ہیں' آج بھی سینکڑوں ہزاروں بے گناہ لوگ تمہاری جیلوں میں بے گناہی کی سزا بھگت رہے ہیں' تمہارے ملک میں ججوں کے کردار پر انگلی اٹھائی جاتی ہے' تمہارے ملک میں ایک کورٹ دوسری کورٹ پر کرپشن کا الزام لگاتی ہے' تمہارے ملک میں عدالتوں کے رجسٹرار جیلوں میں بند ہیں اور تمہارے ملک میں قانون نام کی کوئی چیز نہیں' تم لوگ قتلوں میں ساری دنیا سے آگے ہو' تمہارے ملک میں ڈکیتیاں اور چوریاں معمول بن چکی ہیں' تمہارے ملک میں ہر گھر کے سامنے مسلح گارڈ کھڑے ہیں' تمہارے ملک میں کوئی امیر شخص گارڈز کے بغیر گھر سے نہیں نکلتا' تمہارے ملک کی پولیس غیر معیاری اور غیر انسانی ہے' تمہارے ملک میں بااختیار شخص کے لئے کوئی قانون نہیں اور تمہارے ملک میں مضبوط اور بااختیار شخص ٹریفک کے اشارے پر رکنا اپنی توہین سمجھتا ہے میرا خیال ہے تم لوگوں کو میراتھن ریس سے پہلے ایک سماجی میراتھن کی ضرورت ہے ایک قانونی' عدلی اور اخلاقی میراتھن کی ضرورت ہے لیکن تم لوگ اس پر توجہ دینے کی بجائے رن لاہور رن جیسے کاموں میں مصروف ہو" وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے پوچھا" لیکن ہم روشن خیالی اور اعتدال پسندی کی طرف بڑھ رہے ہیں" اس نے قہقہہ لگایا "جس ملک میں صحت' تعلیم' روزگار' انصاف' قانون اور انسانیت کا احترام نہ ہو' جس میں بڑے اور چھوٹے کے لئے الگ الگ معیار ہوں' جس میں انسانی حقوق نہ ہو' جس میں ٹریفک سگنل کا احترام نہ ہو اور جس میں خالص دوائیاں نہ ملتی ہوں' وہ معاشرہ صرف میراتھن ریس سے روشن خیال اور اعتدال پسند نہیں ہو سکتا' اعتدال پسندی انصاف کی کوکھ سے جنم لیتی ہے اور وہ قانون کے ہاتھوں میں پل کر جوان ہوتی ہے اور تب کہیں جا کر روشن خیالی کی شکل اختیار کرتی ہے لیکن تم لوگ اس فلم کی ہیروئن کی طرف قالین' کھڑکی' ہنڈرڈ بائی ہنڈرڈ فٹ کے بیڈروم' بڑے فریج' بڑے ٹیلی ویژن اور سمندر کے کنارے موجود محل کو روشن خیالی سمجھ رہے ہو' تم اسے اعتدال پسندی سمجھ رہے ہو' بھائی میرے جب تک لوگ دائیں ہاتھ سے دایاں کان اور بائیں ہاتھ سے بایاں کان نہیں پکڑیں گے وہ اعتدال پسند نہیں ہوں گے' ڈائننگ ٹیبل اور چھری کانٹوں سے پہلے تمہارے پاس روٹی ہونی چاہیے' میراتھن سے پہلے تمہارے پاس انصاف اور تعلیم ہونی چاہیے' تم لوگوں کے پاس جا کر تک تو ہیں نہیں اور تم رن لاہور رن کے نعرے لگاتے ہوئے سڑک پر آ گئے ہو' واٹ ٹائپ آف کنٹری یو آر' واٹ ٹائپ آف پیپل یو آر"

ترجیحات

دوسری جنگ عظیم کے دوران جب نازی فوجیں یورپ کو تاراج کرتی ہوئی دنیا کے دوسرے کونے تک پہنچ چکی تھیں۔ اس دور میں ہٹلر نے چرچل کو پیشکش کی ”اگر اتحادی فوج جرمنی کے دو بڑے تعلیمی اداروں ہائیڈل برگ اور گوٹن جن پر بم نہ گرانے کا وعدہ کرے تو نازی فوج برطانیہ کی دو یونیورسٹیوں آکسفورڈ اور کیمبرج پر بمباری نہیں کرے گی“ چرچل نے یہ آفر قبول کر لی۔ اس دور میں برطانوی وزیراعظم کے ایک ساتھی نے آفر قبول کرنے کی وجہ پوچھی تو چرچل نے مسکرا کر جواب دیا ”اگر پورا برطانیہ تباہ ہو گیا لیکن آکسفورڈ اور کیمبرج بچ گئیں تو ہم سمجھیں گے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا لیکن اگر کیمبرج اور آکسفورڈ تباہ ہو گئیں اور برطانیہ بچ گیا تو جان لیں پورا برطانیہ تباہ ہو گیا“ اس معاہدے کے بعد دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانیہ کے نوے فیصد بچوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج میں جنم لیا کیونکہ برطانوی والدین سمجھتے تھے ان کے بچوں کی پیدائش کیلئے اگر اس وقت اگر کرہ ارض پر کوئی محفوظ جگہ ہے تو وہ آکسفورڈ اور کیمبرج ہیں بالکل اسی طرح اس دور میں پیدا ہونے والے زیادہ تر جرمن بچوں کی پیدائش کے خانے میں بھی ہائیڈل برگ اور گوٹن جن لکھا گیا۔

نازیوں اور اتحادیوں کا یہ معاہدہ بنیادی طور پر تعلیم اور تعلیمی اداروں کی افادیت کا اعتراف تھا۔ یہ معاہدہ ثابت کرتا تھا دنیا کا کوئی ملک اور کوئی قوم تعلیم اور وہ بھی جدید تعلیم کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی اور یہ بھی حقیقت ہے جب تک کسی قوم کی یونیورسٹیاں، کالج اور سکول آباد رہتے ہیں، ان کے لیکچر ہالوں میں علم اور ادب پر گفتگو جاری رہتی ہے اس وقت تک اس قوم پر زوال نہیں آتا۔ آج سے پانچ ہزار سال پہلے کا دور ہو یا آج سے ڈیڑھ دو سو برس بعد کا زمانہ، قوموں کے عروج و زوال کی داستان کلاس روموں میں لکھی جاتی رہی اور کلاس روموں ہی میں لکھی جائے گی، اس سلسلے میں مصر کی مثال بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ 1952ء میں جب مصر میں انقلاب آیا اور انقلابیوں نے شاہ فاروق کو ملک بدر کر دیا تو ملک میں شاہ کے 70 ملین پاؤنڈ کے اثاثے تھے۔ انقلابیوں نے یہ اثاثے اور بدقماش جاگیرداروں کی جاگیریں بیچ کر سکول بنانے شروع کر دیے۔ اس دور میں مصر میں دو دو دنوں میں تین تین سکول کھولے گئے، تاریخ بتاتی ہے مصر کے اندر صرف چھ ماہ میں اتنے سکول بنے جتنے 50 برسوں میں تعمیر نہیں ہوئے تھے۔ اس حکمت عملی کا یہ نتیجہ نکلا آج چوٹی کے عالمی اداروں میں کام کرنے والے مسلم ماہرین میں مصریوں کا حصہ 70 فیصد ہے۔ ایک طرف تو یہ صورتحال ہے اور دوسری طرف پاکستان کے 70 فیصد پرائمری سکولوں میں

آج بھی ٹوائلٹ نہیں ہیں۔ پاکستان میں ایسے 65 ہزار سکول ہیں جن میں طالبعلم اپنے ٹاٹ اپنے گھروں سے لاتے ہیں۔ صرف سندھ میں ایسے گیارہ ہزار سکول ہیں جو استاد نہ ہونے کے باعث بند پڑے ہیں۔ پاکستان دنیا کے ان ممالک میں شمار ہوتا ہے جن کے اساتذہ کا آئی کیو لیول اور تعلیمی معیار پست ترین ہے۔ پاکستان ایشیا کا وہ ملک بھی ہے جو تعلیم پر سب سے کم خرچ کرتا ہے اور جس میں استاد کی تنخواہ فیکٹری میں کام کرنے والے مزدور سے کم ہے' جس کی سب سے بڑی یونیورسٹی ایک سال میں ایشیا کی یونیورسٹیوں میں 39 ویں درجے سے 61 ویں گریڈ پر آ کر گر گئی ہے اور جسے دنیا تعلیم کے شعبے میں سب سے کم سرمایہ کاری کرنے والا ملک ڈکلیئر کرنے کی تیاری کر رہی ہے لیکن ہمارا کمال دیکھئے ہم اس صورتحال کے باوجود دنیا فتح کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں' ہم اسرائیل سے لبنان پر بمباری کا بدلہ لینے کے منصوبے بنا رہے ہیں' ہم لال قلعے پر جھنڈے لہرانے کے منصوبے بنا رہے ہیں اور ہم جاپان بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں' ذرا سوچئے ایک ایسا ملک جس میں کل 60 یونیورسٹیاں ہوں' وہ اس جاپان کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے' جس کے صرف ایک شہر ٹوکیو میں ایک ہزار یونیورسٹیاں ہیں۔

ہم جاپان بن سکتے ہیں اگر ہماری حکومت اپنا ایجنڈا مختصر کر کے صرف تعلیم اور تعلیمی اداروں کو اپنا فوکس بنا لے۔ ملک میں جدید ترین تعلیمی اداروں کا جال پھیلا دے ٹیکنالوجی کی پچاس ساٹھ نئی یونیورسٹیاں بنائے' شہروں' قصبوں اور دیہات سے چن چن کر ٹیلنٹ جمع کرے اور انہیں مفت تعلیم دے' بھاری معاوضے پر باہر سے پاکستانی ماہرین منگوائے' انہیں تعلیمی اداروں میں نوکریاں دے اور ایک ایسی نئی پود پیدا کرے جو علم' ہنر اور صلاحیت میں کسی سے کم نہ ہو' حکومت یہ کام بڑی آسانی سے کر سکتی ہے' احتساب بیورو نے ڈیفالٹروں اور لٹیروں سے 200 ارب روپے برآمد کئے تھے' یہ وہ رقم ہے' جس کی ریکوری کا کوئی امکان نہیں تھا' حکومت یہ سمجھے یہ رقم لٹیروں سے واپس نہیں ملی اور وہ مصر کی تقلید کرتے ہوئے اس رقم سے پاکستان کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں ایسے سکول' کالج اور یونیورسٹیاں کھول دے جن میں صرف سائنس کی تعلیم دی جائے تو مجھے یقین ہے اس سے ملک میں انقلاب آ جائے گا' مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک نے پاکستان کو پیشکش کی ہے اگر حکومت تعلیم اور صحت کا بجٹ بڑھا دے تو یہ ادارے اس اضافی بجٹ کے برابر پاکستان کا سود معاف کر دیں گے۔ حکومت اس آفر کا فائدہ بھی اٹھا سکتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ بنیادی سوال وہیں کھڑا ہے کہ یہ سب کچھ کون کرے گا اور کیوں کرے گا؟ ہمارے حکمرانوں کی ترجیحات میں صرف وہ اشیاء اور وہ کام شامل ہیں جن میں انہیں ذاتی فوائد نظر آتے ہیں لہٰذا یہ لوگ کسی ایسے منصوبے' کسی ایسی پالیسی کو جگہ نہیں دیتے جس سے ملک و قوم کو فائدہ پہنچ سکے' جس سے قوم کا مقدر بدل جائے۔ حکومت نے اگر نواب اکبر خان بگٹی کو موت کے گھاٹ اتارنا ہو یا تحفظ حقوق نسواں کا بل پیش کرنا ہو تو وہ دو دن لگاتی ہے لیکن اگر تعلیم' روزگار' صحت اور عوامی بہبود کا کوئی منصوبہ ہو تو دو دو سال تک فائل ہی جنم نہیں لیتی لہٰذا جس ملک' جس معاشرے میں حکومت کی ترجیحات کا یہ عالم ہو اس میں روشنی کی کرن کہاں سے جھانکے گی' اس میں لوگوں کے حالات کیسے بدلیں گے؟ لہٰذا ہم لوگ کوے کے انڈوں سے ہنس نکلنے کا انتظار کر رہے ہیں۔

کشکول

''یہ بادشاہ اور درویش کی کہانی ہے'' وہ میری طرف دیکھ رہے تھے' ان کے چہرے پر شہد میں بھیگی مسکراہٹ تھی'' بادشاہ نے درویش سے کہا مانگو کیا مانگتے ہو'' درویش نے اپنا کشکول آگے کر دیا اور عاجزی سے بولا ''حضور صرف میرا کشکول بھر دیں'' بادشاہ نے فوراً اپنے گلے کے ہار اتارے' انگوٹھیاں اتاریں' جیب سے سونے چاندی کی اشرفیاں نکالیں اور درویش کے کشکول میں ڈال دیں لیکن کشکول بڑا تھا اور مال و متاع کم' بادشاہ نے فوراً خزانے کے انچارج کو بلایا' انچارج ہیرے جواہرات کی بوری لے کر حاضر ہو گیا' بادشاہ نے بوری کشکول میں الٹ دی لیکن جوں جوں جواہرات کشکول میں گرتے گئے کشکول بڑا ہوتا گیا یہاں تک کہ تمام جواہرات غائب ہو گئے' بادشاہ کو اپنی بے عزتی کا احساس ہوا اور اس نے خزانے کا منہ کھولنے کا حکم دے دیا' مزدور خزانے میں جاتے سونے' چاندی اور جواہرات کی بوریاں اٹھاتے اور لا کر کشکول میں ڈال دیتے لیکن کشکول بھرنے کا نام نہیں لے رہا تھا' خزانے کے بعد وزراء اور درباریوں کی باری آئی' ساری کابینہ نے اپنی جیبیں' اپنی تجوریاں اور اپنے بینک بیلنس کشکول میں ڈال دیئے لیکن یہ سارا مال و متاع بھی کشکول کے پیندے میں غائب ہو گیا اور کشکول خالی کا خالی رہا' اس کے بعد شہر کی باری آئی' بادشاہ نے لشکر کو اشارہ کیا' فوج شہر میں داخل ہوئی' اس نے پورے شہر کی دولت جمع کی اور لا کر کشکول میں ڈال دی لیکن نتیجہ پچھلے نتیجے سے مختلف نہیں تھا' بادشاہ نے محل کی طرف دیکھا' لوگوں نے بادشاہ کا محل اٹھا کر کشکول میں ڈال دیا' اس کے بعد منسٹر کالونی' وزیراعظم ہاؤس اور پارلیمنٹ کی باری آئی' یہ سارے ہاؤس بھی کشکول میں ڈال دیئے گئے' شہر کے سارے کارنر پلاٹ' سارے کمرشل ایریاز' سارے ٹھیکے' سارے پرمٹ' ساری امدادی رقوم' سارے بینک' سارے پلازے اور ساری ہاؤسنگ سکیمیں کشکول میں ڈال دی گئیں لیکن کشکول خالی رہا' بادشاہ نے رعایا کی طرف دیکھا' انتظامیہ نے ایک ایک کر کے لوگوں کو بھی کشکول میں پھینکنا شروع کر دیا یہاں تک کہ سارا شہر خالی ہو گیا لیکن کشکول خالی رہا' آخر میں بادشاہ ہار گیا اور درویش جیت گیا' درویش نے کشکول بادشاہ کے سامنے الٹا' مسکرایا' سلام کیا اور واپس مڑ گیا' بادشاہ درویش کے پیچھے بھاگا اور ہاتھ باندھ کر عرض کیا ''حضور مجھے صرف اتنا بتا دیں یہ کشکول کس چیز کا بنا ہے؟!'' درویش مسکرایا

''اے نادان بادشاہ یہ خواہشات سے بنا ہوا کشکول ہے اسے صرف قبر کی مٹی بھر سکتی ہے۔''

وہ خاموش ہو گئے' میں نے عرض کیا ''جناب میں اس کہانی کا مقصد نہیں سمجھا'' وہ مسکرائے ''دنیا اور دنیا داری درویش کے کشکول کی طرح ہوتی ہے آپ اس کشکول میں جو چاہے' جتنا چاہے ڈال دیں یہ ہمیشہ خالی رہے گا' انسان کا چھوٹی گاڑی سے بڑی گاڑی تک کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا' ہماری زندگی میں ایک کمرے کی خواہش پھیلتے پھیلتے کوٹھی بنتی ہے اور اس کے بعد یہ خواہش پوری دنیا کے جزیروں اور محلوں کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہے' ایک دفتر' ایک سٹینو اور ایک چپراسی کی خواہش پھیلتے پھیلتے ایوان صدر بن جاتی ہے' ایک دن کا اقتدار حشر تک پھیل جاتا ہے اور ایک دستخط کا اختیار سکندر اعظم بن کر دنیا سے رخصت ہوتا ہے' ایک لقمہ دستر خوان بنتا ہے اور دستر خوان چالیس ایکڑ کے ڈائننگ ہالوں میں تبدیل ہو جاتا ہے' ایک کیمرہ' ایک تصویر اور ٹیلی ویژن سکرین پر اپنی ایک جھلک پھیلتے پھیلتے پوری دنیا کے ٹیلی ویژنوں اور پوری دنیا کے اخباروں تک پہنچ جاتی ہے' ایک خوبصورت' توانا اور گرم جوش عورت کی خواہش چند ماہ میں حرم بن جاتی ہے اور چند ڈالر دیکھتے ہی دیکھتے بلین اور ٹریلین بن جاتے ہیں اور اس کے بعد انسان دنیا کے تمام نوٹوں پر اپنی تصویر چھپوانے کی خواہش میں مبتلا ہو جاتا ہے' کسی ایک گستاخ کو گستاخی کی سزا سنانے کی خواہش پھیلتے پھیلتے پھانسی گھاٹ بن جاتی ہے اور انسان پورے ملک کو پھانسی لگا کر بھی مطمئن نہیں ہوتا' انسان صرف بال بنانے یا شیو کرنے کے لئے شیشے کے سامنے کھڑا ہوتا ہے لیکن پھر خود کو دیکھنے کی خواہش پوری زندگی پر محیط ہو جاتی ہے' انسان مائیک پر ایک پھونک مارتا ہے اور اس کے بعد بولنے کی خواہش کا غلام بن جاتا ہے وہ پوری زندگی مائیک سے چپک کر گزار دیتا ہے اور انسان چار دن کے لئے اقتدار میں آتا ہے لیکن وہ بابر ہو یا اورنگ زیب آخری سانس تک اقتدار سے لٹکا رہتا ہے چنانچہ خواہش ایک ایسا کشکول ہے جو کبھی نہیں بھرتا ہے' جو کبھی لبالب نہیں ہوتا'' وہ رک گئے۔

میں نے ہنس کر عرض کیا ''حضور خواہش دنیا کی سب سے بڑی طاقت بھی ہے' اگر انسان کے باطن میں خواہشیں جنم نہ لیں تو شاید دنیا میں کوئی شخص آگے نہ بڑھتا' ایک غلام صدیوں تک غلام' ایک جاہل صدیوں تک جاہل اور ایک مظلوم صدیوں تک مظلوم رہتا' یہ خواہش ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہم سوچتے ہیں' اگر ایڈیسن بلب بنا سکتا ہے تو میں کیوں نہیں بنا سکتا' اگر رائٹ برادرز جہاز بنا سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں بنا سکتا اور اگر بل گیٹس دس بائی بارہ فٹ کے ایک کمرے کی کمپنی کو دنیا کی امیر ترین کارپوریشن بنا سکتا ہے تو میں مائیکروسافٹ کیوں نہیں بنا سکتا' حضور یہ ہمارے سارے ''کیوں'' ہماری خواہش کی جڑوں میں جنم لیتے ہیں اور یہ آنے والی زندگی میں ایسی ڈرائیونگ فورس بن جاتے ہیں جو شروع میں انسان کو آگے لے جاتی ہے اور اس کے بعد پورے معاشرے کو ترقی اور خوشحالی کی شکل دے دیتی ہے' اگر انسان خواہشوں کو گناہ سمجھتا تو آج دنیا میں بلب ہوتا اور نہ ہی ریل گاڑی' اگر انسان قناعت کو زندگی کا مقصد بنا لیتا تو ہم آج تک غار میں ہوتے اور جسم پر پتے باندھ کر زندگی گزارتے'' وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہے' میں نے عرض کیا ''حضور آج ہمیں زندگی میں جو رنگ' جو خوبصورتی اور جو

خوشبوئیں نظر آتی ہیں یہ سب انسانی خواہشوں کی پیداوار ہیں اور آج ہمیں دنیا میں جتنی آزادی اور جتنے حقوق نظر آتے ہیں ان سب نے خواہشوں کی کوکھ سے جنم لیا تھا' اگر انسان اپنی غربت اور اپنی بیماری کو اپنا مقدر سمجھ لے اور خواہش کو زندگی سے خارج کر دے تو آپ یقین کیجئے وہ زندگی میں کبھی صحت مند اور خوشحال نہ ہو سکے' ایک غلام غلامی میں زندگی گزار دے اور ایک مزدور اینٹیں ڈھوتا ہوا فوت ہو جائے' یہ خواہش ہوتی ہے جو مزدور کو ٹھیکیدار اور غلام کو آزاد بناتی ہے'' وہ خاموشی سے سنتے رہے' میں نے عرض کیا ''امید ہمیشہ خواہش کے وجود سے جنم لیتی ہے' اگر خواہش نہ ہو تو دنیا سے امید ختم ہو جائے'' میں نے عرض کیا دنیا میں دو قسم کی خواہشیں ہوتی ہیں' نیک خواہشیں اور بد خواہشیں' نیک خواہشوں اور بد خواہشوں میں صرف نیت کا فرق ہوتا ہے' مثلاً ''دولت کی خواہش قارون میں بھی تھی اور حضرت رابعہ بصری بھی اللہ تعالیٰ سے خزانے طلب کرتی تھیں لیکن ان دونوں کی خواہش میں فرق تھا۔ قارون دنیا کا امیر ترین شخص کہلانے کے لئے دولت جمع کر رہا تھا جبکہ حضرت رابعہ بصری دنیا کے تمام غریبوں کو غربت سے نکالنے کے لئے دولت مانگ رہی تھیں لہٰذا ایک کی خواہش کشکول بن گئی اور دوسرے کی خواہش اسے قطب کے درجے تک لے گئی' یہ صرف نیت کا فرق تھا جس نے قارون کو قارون اور رابعہ بصری کو رابعہ بصری بنایا' دنیا میں جھولی پھیلانا معیوب سمجھا جاتا ہے لیکن جب سرسید احمد خان نے علی گڑھ یونیورسٹی کے لئے بازار حسن میں جھولی پھیلائی تو وہ معزز شخص کہلائے' اسی طرح آج جب عبدالستار ایدھی کراچی کی گلیوں میں جھولی پھیلاتا ہے تو لوگ آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ چومتے ہیں' یہ کیا ہے' یہ خواہش کی نیت کا فرق ہے''۔ میں رکا اور ان سے عرض کیا ''خواہشیں بری نہیں ہوتیں' خواہشوں کی نیتیں اچھی اور بری ہوتی ہیں' یہ ہماری نیت ہے جو ہماری خواہش کو کشکول کی شکل دیتی یا اسے عبادت بنا دیتی ہے''

میں نے ان سے عرض کیا ''خواہش امید ہوتی ہے اور امید دنیا کی سب سے بڑی عبادت ہوتی ہے۔''

ہم سب نمکین ہو جائیں

رانا اکرام ربانی صاحب پرانے سیاستدان ہیں وہ پنجاب میں وزیر رہے۔ انہوں نے 2002ء میں الیکشن لڑا، وہ یہ الیکشن جیت سکتے تھے لیکن اپنی انا کے ہاتھوں ہار گئے' وہ آج کل فراغت کے دن گزار رہے ہیں چند ماہ پہلے شادی کی ایک تقریب میں میری ان کے ساتھ ملاقات ہوگئی' میزبان نے تعارف کی کوشش کی مگر میں نے آگے بڑھ کر رانا صاحب کا ہاتھ تھام لیا اور عرض کیا' میں رانا صاحب کو نہ صرف جانتا ہوں بلکہ دل سے ان کی قدر بھی کرتا ہوں۔ ان کا تعلق ان چند سیاستدانوں سے ہے جنہوں نے اصول پر سمجھوتہ نہیں کیا' جنہوں نے ہمیشہ ایمانداری' خلوص اور نیک نیتی کو زادِ راہ بنائے رکھا' جنہوں نے ہر دور میں سیاست کو کچھ نہ کچھ دیا اس سے کبھی وصولی کی کوشش نہیں کی۔ رانا صاحب نے میرا شکریہ ادا کیا اور ہم دونوں ایک کونے میں بیٹھ گئے' رانا صاحب اپنا سیاسی اتار چڑھاؤ بتانے لگے۔ انہوں نے بتایا انہوں نے سیاست کیسے شروع کی' الیکشن کیسے لڑے' کیسے وزیر بنے' رشوت اور لوٹ کھسوٹ سے بچنے کے لئے انہیں کون کون سے پاپڑ بیلنے پڑے' انہیں الیکشن میں کیسے ہرایا گیا اور آخر میں انہوں نے پارٹی کیسے چھوڑی وغیرہ۔ میں نے ایک بار پھر ان کی ایمانداری کی تعریف کی' انہوں نے تڑپ کر میری طرف دیکھا اور ٹھنڈے ٹھار لہجے میں بولے "میں آج اپنی اس ایمانداری' اس اصول پسندی اور اس سیاسی اخلاص پر شرمندہ ہوں" میں نے انہیں حیرت سے دیکھا' وہ گویا ہوئے "تجربے اور وقت نے ثابت کیا اس ملک میں جن لوگوں نے کچھ کما لیا وہی صحیح رہے اور جنہوں نے یہ موقع کھو دیا وہ پچھتاتے رہے' مجھے دیکھ لو مجھے اس ایمانداری کا کیا صلہ ملا آج میرے ہاتھ میں سیاست ہے اور نہ ہی مال۔" ہم دیر تک اس شرمندگی' اس پچھتاوے پر گفتگو کرتے رہے' رانا صاحب نے بیسیوں مثالیں دیں' انہوں نے مجھے ایسے بیسیوں لوگوں کی مثال دی جو خالی ہاتھ سیاست میں آئے تھے لیکن انہوں نے وقت اور موقع سے فائدہ اٹھایا' وہ فرش سے عرش پر جا پہنچے اور آج عیش کر رہے ہیں۔ احتساب کے درجنوں محکمے بنے' ان کے خلاف کیس اور ریفرنس بھی دائر ہوئے لیکن ان لوگوں کو کوئی فرق نہ پڑا۔ ان میں سے کچھ نے دے دلا کر جان چھڑالی' چند ایک حضرات قانون کے مورچے میں پناہ گزین ہو گئے اور جو باقی بچ گئے انہوں نے وفاداریاں بدل کر جان اور مال دونوں بچا لئے' پیچھے رہ گئے رانا صاحب جیسے

"بے وقوف" تو ان کا دامن خالی تھا اور خالی ہے' وہ گھاٹ کے رہے اور نہ ہی انہیں گھر نصیب ہوا۔

رانا صاحب تو وہاں سے اٹھ کر چلے گئے لیکن اپنے پیچھے سوچ کی ایک سلگتی ہوئی لمبی لکیر چھوڑ گئے اور میں دیر تک ان کے تھیسس پر غور کرتا رہا۔ مجھے خواجہ صاحب یاد آ گئے' خواجہ صاحب ایک ریٹائر بیورو کریٹ تھے وہ پاکستان کے تمام کلیدی عہدوں پر فائز رہے تھے لیکن انہوں نے ایمان اور ایمانداری کو ہاتھ سے نہ جانے دیا لہٰذا جب ریٹائر ہوئے تو ان کے پاس سر چھپانے کے لئے چھت تک نہیں تھی' جو پس انداز کیا تھا وہ کو آپریٹو بینک لے اڑا لہٰذا انہوں نے باقی زندگی پنشن اور دکھ میں گزار دی، روز صبح ان کی آنکھ بیوی کے طعنوں اور اولاد کے شکوؤں سے کھلتی تھی اور حالات کے بوجھ اور ضروریات کی گرانی تلے بند ہوتی تھی' خواجہ صاحب نے بھی آخری زندگی پچھتاوے میں گزاری' وہ بھی کہا کرتے تھے "نیکی بندے کو وہاں کرنی چاہئے جہاں نیکی کی کوئی قدرت ہو' جس معاشرے میں ایمانداری کا دوسرا نام بے وقوفی ہو وہاں ایمانداری سے پرہیز لازم ہے۔" یہ رانا صاحب ہوں یا خواجہ صاحب ہمارے معاشرے میں ایسے سینکڑوں کردار بکھرے پڑے ہیں۔ ہم سب کی زندگی میں کوئی نہ کوئی خواجہ صاحب' کوئی نہ کوئی رانا صاحب موجود ہیں۔ یہ لوگ پہلے اکثریت میں ہوتے تھے لیکن اب اقلیت کی شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں' ہمارا ہر آنے والا دن ایسے لوگوں کی نعشوں پر طلوع ہو رہا ہے جو کبھی ضمیر کو عدالت سمجھتے تھے' جو یہ سوچتے تھے دنیا عارضی کھیل ہے اور اس کھیل میں سب کچھ ہار دینا بے وقوفی ہوگا اور جو یہ کہتے تھے "اطمینان سے بڑی کوئی دولت اور سچائی سے بڑی کوئی طاقت نہیں" افسوس وہ لوگ آج اس معاشرے سے سمٹتے جا رہے ہیں۔ یہ معاشرہ' یہ ملک ان لوگوں سے خالی ہوتا جا رہا ہے' میں سوچتا ہوں زندہ ملک اور تابندہ معاشرے ایسے لوگوں کی حفاظت کے لئے کتنے جتن کرتے ہیں لیکن ہماری نظروں کے سامنے ایسے لوگ معدوم ہوتے جا رہے ہیں مگر ہم خاموشی سے تماشا دیکھ رہے ہیں۔

مجھے جاپان یاد آ گیا۔ جاپان میں زمین نہیں ہے لہٰذا وہاں سبزہ اور ہریالی بھی نہیں لیکن جاپانیوں نے ایک عجیب عادت پال رکھی ہے انہیں گھر' دکان یا دفتر کا جو کونا خالی ملتا ہے وہ اس میں بیج بو دیتے ہیں وہاں پودا لگا دیتے ہیں لہٰذا جاپان دنیا کا واحد ملک ہے جس میں آپ کو گملوں میں سبزی ملتی ہے' میں نے ایک جاپانی سے وجہ دریافت کی تو اس نے ہنس کر جواب دیا "ہم جانتے ہیں ہمارے ملک میں ہریالی کم ہے لہٰذا ہم ہریالی بڑھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں ہم سبزیاں درآمد کرتے ہیں لہٰذا ہم کوشش کرتے ہیں ہم ایک ٹماٹر' ایک آلو اور مٹر کی چند پھلیاں ہی سہی لیکن کچھ تو اپنا اگائیں' کچھ تو اپنا کھائیں۔" میں نے سوچا ہمارے ملک میں بھی ایمانداری' خلوص اور وفاداری کم ہے لہٰذا ہمیں بھی جاپانیوں کی طرح گھروں' دکانوں اور دفتروں میں اس کے بیج بونے چاہئیں۔ ہمیں بھی گملوں میں اس کی پنیریاں لگانی چاہئیں تھیں۔ ہمارے سامنے جو لوگ پچھتاوے کی سڑک پر قدم رکھ رہے ہیں ہم کم از کم ان کا حوصلہ تو بڑھا سکتے ہیں' ہم ان کو عزت تو دے سکتے ہیں ہم ان کی نیکی' ان کی ایمانداری کا اعتراف تو کر سکتے ہیں۔ لوگ بجھتے چراغوں کی پھڑ پھڑاتی لو بچانے کے لئے اپنے ہاتھ جلا بیٹھتے ہیں

تھی۔ ہم کیسے لوگ ہیں ہمارے سامنے زندگی کے بھا نبڑ میں برف کاشت ہو رہی ہے لیکن ہم خاموشی سے تماشا دیکھ رہے ہیں۔

کوئی شخص درخت کاٹ رہا تھا کسی راہ گیر نے احتجاج کیا تو درخت کاٹنے والے نے کلہاڑی کندھے پر رکھ کر پوچھا "یہ سڑک، یہ درخت تمہارا ہے" راہ گیر نے جواب دیا "نہیں لیکن میں یہاں سے روز گزرتا ہوں، مجھے معلوم ہے دس سال بعد میرا بیٹا بھی یہاں سے گزرے گا۔ اگر آج میں احتجاج نہیں کروں گا، اگر میں آج اس درخت کو کٹنے سے نہیں بچاؤں گا تو کل میرے بیٹے کو تکلیف ہوگی، یہ سڑک اس کے لئے جہنم بن جائے گی۔" یقین کیجئے اگر ہم نے بھی ایمان اور نیکی کے ان چراغوں کی حفاظت نہ کی تو ہماری اولاد نیکی اور ایمان کے لفظ تک بھول جائے گی اور یہ ملک "کامیاب" "لوگوں کا ملک" اور یہ معاشرہ موقع سے فائدہ اٹھانے والے لوگوں کا معاشرہ بن کر رہ جائے گا، میرے پاس چند روز پہلے کراچی کے سابق ناظم نعمت اللہ خان صاحب تشریف لائے تھے، انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا "ہم لوگ ایماندار لوگوں کو کیسے بچا سکتے ہیں" میں نے جواب دیا "حوصلہ افزائی" وہ بولے "وہ کیسے" میں نے عرض کیا "ہم لوگ اپنے ایماندار لوگوں سے ملیں، ان کی تعریف کریں، انہیں تقریبات میں خصوصی جگہ دیں اور لوگوں سے ان کا اچھا تعارف کرائیں، ان کی آل اولاد کی حوصلہ افزائی کریں اور اگر یہ لوگ معاشی ضروریات سے مجبور ہو کر کوئی کاروبار کریں تو ہم ان سے سودا خریدیں، ہماری یہ حوصلہ افزائی نہ صرف ان لوگوں کے ارادے کو مضبوط بنائے گی بلکہ ان کی عزت افزائی کو دیکھ کر دوسرے لوگوں کو بھی حوصلہ ہوگا اور وہ بھی ایماندار ہونے کی کوشش کریں گے یوں معاشرے میں نیکی قائم رہے گی" خان صاحب نے تائید فرمائی، میں نے ان سے عرض کیا "فصلوں کو بچانے کیلئے کھیتوں کے گرد باڑ لگانا پڑتی ہے، ہماری حوصلہ افزائی برائی اور اچھائی کے درمیان باڑ ہوتی ہے اگر ہم آج یہ باڑ نہیں لگائیں گے تو کل کو ویرانے اور کھیت میں کوئی فرق نہیں رہے گا، کل کو کان کا نمک میٹھے پانیوں کو بھی کھارا بنا دے گا اور ہم سب نمکین ہو جائیں گے"۔

غلاموں کے غلام

گاڈ فادر اول دنیا کا پہلا شخص تھا جس نے جرائم کو سائنسی بنیادیں فراہم کیں' وہ ریاست کے اندر ریاست اور انڈر ورلڈ جیسی اصطلاحوں کا بھی بانی تھا' اس نے باقاعدہ ایسے ادارے بنائے جن میں مجرموں کو جرائم کی تربیت دی جاتی تھی' اس نے مجرموں کا ایک بین الاقوامی نیٹ ورک بھی تشکیل دیا' اس کے بارے میں کہا جاتا تھا وہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے سے پہلے دنیا کے ہر کونے میں پہنچ جاتا تھا' اس نے منشیات' اسلحہ اور جعلی دستاویزات کی تیاری کیلئے باقاعدہ لیبارٹریاں بنائیں اور ان لیبارٹریز کو جرائم کے نئے نئے طریقے دریافت کرنے پر لگا دیا' اس نے قاتلانہ حملوں کے چار عالمی سکواڈ بنائے اور ان سکواڈز میں ایسے ایسے سنگدل اور خوفناک لوگ بھرتی کیے گئے جو لوگوں کو قتل کرنے کے بعد ان کے خون سے ہاتھ اور منہ دھوتے تھے چنانچہ دنیا میں ایک ایسا وقت بھی آیا تھا جب دنیا کے بڑے بڑے حکمران گاڈ فادر کے نام سے گھبراتے تھے اور گاڈ فادر ایک ہوا' خوف کی ایک آندھی اور رگوں کے اندر اتر جانے والا ایک ڈر بن گیا۔

گاڈ فادر کی شروعات بہت دلچسپ تھیں' وہ ایک چھوٹا سا مجرم تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے قیادت کی بے تحاشہ صلاحیتوں سے نواز رکھا تھا' وہ گروپ اور ریکٹ بنانے کا ماہر تھا' وہ وژنری انسان تھا لہٰذا وہ ہمیشہ دس بیس برس آگے کی بات سوچتا تھا' اس نے 1934ء میں ایک دلچسپ منصوبہ بنایا' اس نے چند یونیورسٹی پروفیسرز اور ریٹائر سیاستدان کی خدمات حاصل کیں' پروفیسروں نے اٹلی کی تمام مختلف یونیورسٹیوں کا دورہ کیا اور گاڈ فادر کو تمام باصلاحیت طالب علموں کی فہرستیں بنا دیں اور بزرگ سیاستدان نے اسے ان تمام لوگوں کے نام اور پتے فراہم کر دیئے جو مستقبل قریب میں بڑے سیاستدان ثابت ہو سکتے تھے' گاڈ فادر نے ان تمام طالبعلموں اور سیاستدانوں کی مالی اور سماجی معاونت شروع کر دی' اس نے ان تمام طالب علموں کو وظائف دیئے' انہیں امریکہ اور برطانیہ کی اعلیٰ یونیورسٹیوں میں تعلیم دلائی اور اس کے بعد انہیں اٹلی کے بڑے بڑے سرکاری' نیم سرکاری اور پرائیویٹ اداروں میں بھرتی کرا دیا' اس نے چھوٹے چھوٹے سیاستدانوں کی پشت پناہی کی اور انہیں سیاست کے مرکزی دھارے میں داخل کرا دیا' اس نے قانون دان جمع کیے اور ان میں سے بے شمار وکیلوں کو جج بنوا دیا' اس نے اپنے

رکنت کے لوگوں کو سفیر' مشیر اور وزیر بنوایا' اس نے اپنے لوگوں کو صنعت کار' تاجر اور بروکر بنوایا اور اس نے اپنے لوگوں کو بینکار اور ماہر معیشت بنوایا' یہ تمام لوگ ابتدا میں اٹلی اور اس کے بعد پورے یورپ میں پھیل گئے اور انہوں نے آگے چل کر بے شمار ملکوں کی معیشت اور سیاست اپنے ہاتھ میں لے لی' گاڈ فادر دوم نے اپنے والد کے سلسلے کو امریکہ' لاطینی امریکہ اور مغربی یورپ تک پھیلا دیا اور اس نے آدھی دنیا کو اپنے دائرے میں لے لیا' ایک وقت ایسا تھا جب گاڈ فادر کے حکم سے پورے یورپ کے قوانین بدل جاتے تھے اور وہ شخص حقیقتاً دنیا پر حکومت کرتا تھا اور دنیا میں جس شخص نے گاڈ فادر کے خلاف رپٹ لکھنی ہوتی تھی وہ گاڈ فادر کا ہرکارہ نکلتا تھا' جس نے اس رپٹ پر دستخط کرنے ہوتے تھے' جس نے مہر لگانی ہوتی تھی' جس نے اس کی گرفتاری کا حکم جاری کرنا ہوتا تھا' جس نے چھاپہ مارنا ہوتا تھا' جس نے اسے عدالت میں پیش کرنا ہوتا تھا' جس وکیل نے اس کے خلاف الزامات لگانے ہوتے تھے' جس سیاست دان نے اس کے خلاف قانون بنانا ہوتا تھا اور جس وزیر' جس وزیراعظم نے اس کے خلاف پریس کانفرنس کرنی ہوتی تھی وہ بھی اس کے ''پے رول'' پر ہوتا تھا' وہ بھی اپنی ہر صبح کا آغاز گاڈ فادر کے پاؤں چھو کر کرتا تھا چنانچہ وہ دنیا کے اختیار اور اقتدار کی نسوں میں اتر گیا تھا اور وہ دنیا کا حقیقی بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔

1973ء میں امریکہ نے گاڈ فادر کے اس سسٹم کو ''اون'' کر لیا اور اسے اپنی خارجہ پالیسی بنا لیا۔ گاڈ فادر کا سسٹم امریکہ تک کیسے پہنچا' اس کیلئے ہمیں ویتنام جنگ کا مطالعہ کرنا پڑے گا' 6 مارچ 1965ء میں ویتنام کی سرزمین پر امریکہ کا پہلا فوجی اترا' یہ جنگ 8 برس جاری رہی' اس جنگ میں امریکہ نے شدید مالی' سیاسی اور فوجی نقصان اٹھایا اور 29 مارچ 1973ء کو امریکہ کا آخری فوجی پسپا ہو کر ویتنام سے نکلا' امریکہ یہ جنگ ہار گیا لیکن جنگ نے اسے گاڈ فادر بنا دیا' امریکہ نے پہلی بار محسوس کیا وہ اسلحے اور فوج کے ذریعے پوری دنیا پر حکومت نہیں کر سکتا لہٰذا اگر اس نے دنیا کی واحد سپر پاور بننا ہے تو اسے گاڈ فادر کے فارمولے پر عمل کرنا ہوگا' اسے تیسری دنیا میں یونیورسٹی کے استاد سے لے کر وزیراعظم تک ہر عہدے پر اپنے لوگ بٹھانا ہوں گے' اسے بیوروکریسی' فوج' عدلیہ' پولیس اور سیاست دنیا کا ہر بڑا شعبہ اپنے ہاتھ میں لینا ہوگا' امریکہ نے سوچا اور اس کے بعد اس پر عملدرآمد شروع کر دیا' اس نے تیسری دنیا کے اچھے طالب علم اٹھائے' انہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے وظیفے دیئے' انہیں یورپ اور امریکہ کی بہترین یونیورسٹیوں میں تعلیم دلائی اور اس کے بعد انہیں ان کے ممالک میں حساس عہدوں پر بٹھا دیا' امریکہ نے نوجوان بیوروکریٹس کو اپنے ملک میں کورس کرائے اور ان کورسز کے دوران ان کی برین واشنگ کر دی' اس نے فوجی افسروں کو اپنی عسکری اکیڈمیوں میں ٹریننگ دی اور انہیں امریکی بنا کر واپس بھجوا دیا' اس نے قانون دانوں کو امریکی فلسفے کی ٹریننگ دے کر جج بنوا دیا' اس نے ٹیکس کے شعبوں میں اپنے بندے بھرتی کرا دیئے' اس نے انڈسٹری اور بزنس میں اپنے لوگ ڈال دیئے اور اس نے سیاست میں اپنے حامیوں کو پہلی صف میں کھڑا کر دیا یوں صرف بیس برس میں امریکہ پوری تھرڈ ورلڈ اور آدھی سے زیادہ سیکنڈ اور فرسٹ ورلڈ کا گاڈ فادر بن گیا' وہ دنیا کا حقیقی بادشاہ بن گیا' اس نے نیویارک اور واشنگٹن میں وزراء اعظم کی فیکٹری لگائی اور دھڑا دھڑ وزیراعظم بنا

کر تیسری دنیا ایکسپورٹ کرنا شروع کر دیئے' یہ وزیراعظم چہرے مہرے' حرکات وسکنات اور زبان وبیان میں مقامی لوگوں جیسے ہوتے ہیں لیکن یہ اندر سے پورے امریکی ہوتے ہیں اور یہ مقامی ملکوں میں رہ کر امریکی مفادات کی حفاظت کرتے ہیں' امریکہ تیسری دنیا کو وافر مقدار میں وزراء خزانہ' وزراء تجارت اور ٹیکس کے مشیر بھی فراہم کرتا ہے' وہ مقامی تاجروں' صنعت کاروں اور رئیل سٹیٹ ٹائیکونز کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اور ان لوگوں کی مدد سے تیسری دنیا کی معیشت سے کھیلتا ہے' وہ میڈیا کو بھی اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے اور اس کے ذریعے ملکوں کی ثقافت بدل دیتا ہے' وہ تیسری دنیا کے 103 ممالک کا بجٹ بھی تیار کرتا ہے اور وہ سات سمندر پار بیٹھ کر تیسری دنیا کیلئے دالوں' چینی' گھی اور پٹرول کے نرخ بھی طے کرتا ہے۔ وہ پوری تیسری دنیا سے کھیلتا ہے۔

آپ پاکستان کی مثال لیجئے اس وقت پاکستان میں تین بڑی سیاسی جماعتیں ہیں' ان تینوں جماعتوں کے ''وزراء خزانہ'' ورلڈ بینک کے باقاعدہ ملازم ہیں' میں آپ کو آج بتا سکتا ہوں اگر ملک میں پیپلز پارٹی کی حکومت آئی تو اس کا وزیر خزانہ کون ہوگا اور مسلم لیگ ن اور ایم ایم اے برسر اقتدار آئی تو ان کا وزیر خزانہ کون ہوگا؟ یہ تمام وزراء خزانہ ماشاء اللہ عالمی بینک اور آئی ایم ایف کے ملازم ہیں اور آج مختلف سیاسی جماعتوں کے پلیٹ فارم سے قومی اسمبلی اور سینٹ میں بیٹھے ہیں' آپ سی بی آر کا جائزہ لے لیں' آپ اکنامک کوآرڈینیشن کمیٹی' وزارت خزانہ' وزیراعظم کے مشیروں اور صوبائی حکومتوں کے وزراء خزانہ کا پروفائل نکال کر دیکھ لیں' یہ کون لوگ ہیں؟ یہ سب ماشاء اللہ گاڈ فادر کے ہرکارے ہیں اور ان سب لوگوں کا فلسفہ اور ایجنڈا ایک ہے' آپ اس پس منظر کو سامنے رکھ کر اب سٹاک ایکسچینج کے موجودہ بحران کا جائزہ لیں' صرف ایک ہفتے میں پاکستان کی سٹاک ایکسچینج میں 10 کھرب کا کھیلا ہوا' یہ دس کھرب دس دن میں دس لاکھ لوگوں کی جیب سے نکل کر دس تاجروں کی جیب میں چلے گئے' کیوں؟ یہ گاڈ فادر کی مرضی تھی' دوسرا سوال' سٹاک ایکسچینج کا یہ بحران پچھلے ماہ سے متوقع تھا' اس بحران کی طرف بار بار وزیراعظم کی توجہ مبذول کرائی گئی لیکن انہوں نے فنانس کمیٹی کا اجلاس نہیں ہونے دیا' کیوں؟ کیونکہ گاڈ فادر کی مرضی تھی یہ میٹنگ نہ ہو اور گاڈ فادر اس بحران کے ذریعے کچھ لوگوں کو نوکری سے فارغ کرانا چاہتا تھا اور کچھ نئے لوگوں کو سامنے لانا اور حکومت کو مزید سال چھ مہینے فراہم کرنا چاہتا تھا' گاڈ فادر اس بحران کے ذریعے چند ''غریب'' لوگوں کو امیر بنانا اور کچھ لوگوں کی اقتصادی ہوا نکالنا چاہتا تھا چنانچہ یہ بحران پیدا ہوا اور اگلے چند دنوں میں مزید آگے بڑھے گا' پاکستان کی معیشت کو اگلے چھ ماہ تک اس قسم کے مزید جھٹکے لگتے رہیں گے۔

یہ گاڈ فادر کی مرضی ہے اور ہم سب اس کے غلاموں کے غلام ہیں۔

کاش ہم تتلیاں ہوتے

سڑک پر رنگوں کا دریا بہہ رہا تھا' ہزاروں لوگ قطار میں کھڑے ہو کر دیکھ رہے تھے اور ان کے چہروں پر سیاحوں کی حیرت اور بچوں جیسا اشتیاق تھا' یہ دنیا کا انوکھا ترین نظارہ تھا' پر پل رنگ کی لاکھوں تتلیاں زمین سے پانچ فٹ اوپر تیر رہی تھیں' انہوں نے قطاریں بنا رکھی تھیں اور وہ ایک ترتیب سے آگے بڑھتی چلی جا رہی تھیں' میں نے ٹیلی ویژن کا سوئچ بند کر دیا' سکرین بے رنگ ہو گئی۔

یہ تائیوان کا منظر تھا' تائیوان میں ملک ویڈ (Milk Weed) نام کی تتلیاں پائی جاتی ہیں' یہ تتلیاں سردیاں تائیوان کی جنوبی وادیوں میں گزارتی ہیں لیکن جونہی بہار کا آغاز ہوتا ہے یہ تتلیاں لاکھوں کی تعداد میں جنوب سے شمال کی طرف سفر شروع کر دیتی ہیں' یہ دنیا میں تتلیوں کی دوسری بڑی ہجرت ہوتی ہے اس قسم کی ایک نقل مکانی سردیوں کے شروع میں شمالی امریکہ اور کینیڈا سے میکسیکو کی طرف ہوتی ہے' کینیڈا سے میکسیکو جانے والی تتلیوں کا نام ''مونارچ'' ہے اور یہ بھی لاکھوں کے گروپ میں سفر کرتی ہیں' تائیوان کی ملک ویڈ تتلیوں کے سفر کی تین بڑی خصوصیات ہوتی ہیں' اول دس لاکھ تتلیاں روزانہ جنوب سے شمال کی طرف سفر کرتی ہیں' دوم یہ قطار میں گروہوں کی شکل میں اڑتی ہیں اور سوم ان کا یہ سفر صدیوں سے جاری ہے' تتلیوں کی یہ ہجرت معمول کے مطابق چل رہی تھی لیکن تائیوان کی حکومت نے 1970ء میں فری وے انجینئرنگ بیورو بنائی اور اس بیورو نے ملک کے شمالی حصے کو جنوب سے ملانے کیلئے ایک بڑی شاہراہ کی تعمیر شروع کر دی' یہ شاہراہ 31 اکتوبر 1978ء کو مکمل ہو گئی لیکن جب 1979ء کا اپریل آیا تو معلوم ہوا غلطی سے ''فری وے'' کی تین نمبر سڑک تتلیوں کے روٹ پر بنا دی گئی اور اس سال جب تتلیوں نے سفر شروع کیا تو وہ دھڑا دھڑ ٹریفک حادثوں کا شکار ہونے لگیں' تتلیاں اپنے نرم پروں اور کمزور سانس کی وجہ سے زیادہ بلندی پر نہیں اڑ سکتیں لہٰذا ان کی پرواز اور گاڑیوں کی اونچائی میں زیادہ فرق نہیں ہوتا لہٰذا تتلیاں جب سفر پر روانہ ہوتی ہیں تو یہ گاڑیوں سے ٹکرانے لگتی ہیں اور موقع پر ہلاک ہو جاتی ہیں چنانچہ اس سال لاکھوں تتلیاں راستے میں مر گئیں اور اس کے بعد یہ معمول بن گیا جونہی اپریل شروع ہوتا' تتلیاں سفر کیلئے نکلتیں اور مرتی چلی جاتیں' 2005ء میں تائیوان کی ایک این جی او نے نیشنل جیوگرافک چینل کے ساتھ مل

کر سروے کیا تو پتہ چلا ایک منٹ میں گیارہ ہزار پانچ سو تتلیاں اس سڑک پر سفر کرتی ہیں جبکہ پورے دن میں ایک ملین تتلیاں اس سڑک پر پہنچتی ہیں لیکن ان میں سے صرف ایک لاکھ تتلیاں شمالی وادیوں میں پہنچ پاتی ہیں' 9 لاکھ تتلیاں راستے ہی میں دم توڑ جاتی ہیں' تائیوان کے لوگوں' حکومت اور غیر سرکاری تنظیموں کیلئے یہ اعداد و شمار انتہائی افسوسناک تھے چنانچہ حکومت نے 2006ء میں اس کا بڑا دلچسپ حل نکالا' اس نے فری وے کی لین نمبر تین پر میلوں لمبا جال لگا دیا' یہ جال سڑک کے شروع میں نیچے اور آگے چل کر نسبتاً اونچا تھا' جال لگانے کا مقصد یہ تھا کہ جب تتلیاں سفر پر روانہ ہوں تو وہ جال کے اوپر چلی جائیں اور حادثے سے بچ جائیں' یہ تکنیک بڑی حد تک کامیاب ہوگئی اور 2006ء میں تتلیوں کی ہلاکت میں کمی واقع ہوگئی لیکن اس کے باوجود ہزاروں تتلیاں جال کے اندر آ جاتی تھیں اور سامنے سے آنے والی ٹریفک کا شکار ہو جاتی تھیں' 2007ء میں حکومت نے دو کام کئے' اس نے جال بھی لگا دیا اور فری وے کی لین نمبر 3 ٹریفک کیلئے بھی بند کر دی' یہ لین نمبر 3 اپریل سے 29 اپریل تک بند رہی چنانچہ پچھلے 25 برسوں میں پہلی بار تتلیوں نے ہر قسم کے خطرے سے آزاد ہو کر سفر کیا' یہ منظر دیکھنے کیلئے روزانہ ہزاروں لوگ فری وے پر جمع ہو گئے اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے زمین سے پانچ فٹ اوپر رنگوں کا دریا بہتا ہوا دیکھا' میں نے یہ منظر تائیوان کے ایک ٹیلی ویژن چینل پر دیکھا' ٹیلی ویژن کا مبصر کہہ رہا تھا ''یہ تتلیاں بھی اتنی ہی شہری ہیں جتنے تائیوان کے دوسرے لوگ' اگر ہمیں اس معاشرے میں پورے حقوق کے ساتھ زندہ رہنے کا حق ہے تو ان تتلیوں کو بھی اتنے ہی حقوق حاصل ہیں'' مبصر نے مزید کہا انسان کو دوسری مخلوقات کے ساتھ زندگی گزارنے کا فن سیکھنا چاہیے خواہ یہ مخلوق تتلیاں ہی کیوں نہ ہوں''

میں نے تائیوان کی ''ملک ویڈ'' تتلیوں کی داستان سنی تو مجھے محسوس ہوا ایک طرف تائیوان کے لوگ ہیں جو تتلیوں کیلئے بھی انسانوں سے بڑھ کر سوچتے ہیں جبکہ دوسری طرف ہم لوگ ہیں جن کے پاس انسانوں کیلئے سوچنے کا وقت نہیں' میں نے سوچا چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چودھری کا کیا قصور تھا؟ کیا وہ قانون کے دائرے میں رہ کر کام نہیں کر رہے تھے' چیف جسٹس کا کام لوگوں کو انصاف دینا ہوتا ہے اور یہ شخص کبھی سوموٹو ایکشن اور کبھی چھاپوں کے ذریعے لوگوں کو انصاف دے رہا تھا' صدر نے اس کے خلاف اپنا آئینی اختیار استعمال کیا تو یہ شخص اپنی صفائی کیلئے سپریم کورٹ جانے لگا' کیا اس ملک میں کسی شخص کو اپنی صفائی پیش کرنے کا حق نہیں؟ یہ شخص جب انصاف کیلئے نکلا تو سب سے پہلے وکلاء اس کے گرد جمع ہوئے' حکومت کو وکلاء کی یہ جرأت پسند نہ آئی' سوال یہ ہے کیا وکیلوں کو کسی شخص کا ساتھ دینے کا حق حاصل نہیں؟ یہ شخص دوروں پر روانہ ہوا تو لوگ دیوانہ وار سڑکوں پر نکل آئے' لوگوں نے اس کے ہاتھ' اس کی گاڑی اور اس کے کپڑے چومنا شروع کر دیئے' کیا اس ملک کے لوگوں کو کسی شخص کے حق میں نعرے لگانے' اس کیلئے سڑکوں پر نکلنے اور کسی شخص کے ہاتھ چومنے کا حق حاصل نہیں اور پھر اس شخص نے 12 مئی 2007ء کو کراچی بار سے خطاب کا اعلان کیا تو کراچی شہر کو ایک دن کیلئے غنڈوں' بدمعاشوں اور قاتلوں کے حوالے کر دیا گیا' یہ لوگ دن بھر رینجرز کی گاڑیوں کے پیچھے پناہ لے کر گولی چلاتے رہے اور اس

فائرنگ کے نتیجے میں 34 معصوم انسان جاں بحق اور ڈیڑھ سو زخمی ہو گئے' اس دن صورتحال یہ تھی نعشیں سڑکوں پر پڑی تھیں اور انہیں اٹھانے والا کوئی نہیں تھا' سوال یہ ہے کراچی کے لوگوں کو کس جرم کی سزا دی گئی؟ کیا اس ملک میں چیف جسٹس کا استقبال کرنا جرم ہے؟ کیا وہ تمام لوگ مجرم ہیں جو چیف جسٹس کو مظلوم اور بے گناہ سمجھتے ہیں اور ان کی بحالی کے خواہاں ہیں؟ لوگوں نے ایم کیو ایم کو اس قتل و غارت گری کا ذمہ دار قرار دیا' اخبارات کے فوٹو گرافروں اور ٹیلی ویژن چینلو کے کیمرہ مینوں کے پاس فائرنگ کرنے والوں کی تصاویر موجود تھیں' ہزاروں لاکھوں لوگوں نے اپنی نظروں سے ٹیلی ویژن سکرین پر ان لوگوں کو گولی چلاتے ہوئے بھی دیکھا لیکن حکومت نے ان لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی کی اور نہ ہی ان کے خلاف کوئی پرچہ درج ہوا' سوال یہ ہے اگر کوئی شخص حکومت کی ''محبت'' میں بے گناہ لوگوں کو قتل کر دے تو کیا یہ جرم جرم نہیں رہتا!! لوگوں نے جب با آواز بلند ایم کیو ایم کے خلاف احتساب کے مطالبے کئے تو صدر صاحب نے ایم کیو ایم ہماری اتحادی اور محب وطن ہے کا دعویٰ فرما کر یہ مطالبے مسترد کر دیئے' سوال یہ ہے کیا اتحادیوں کیلئے اس ملک میں کوئی قانون' کوئی ضابطہ اخلاق نہیں اور آخر میں میڈیا کی باری آتی ہے' میڈیا نے 12 مئی کو بڑی جرأت اور پروفیشنل ازم کا مظاہرہ کیا' میرے دوست طلعت حسین نے جان پر کھیل کر ساری صورتحال عوام کے سامنے رکھ دی' ان پر گولیاں برستی رہیں لیکن وہ کبھی بیٹھ کر اور کبھی لیٹ کر کوریج کرتے رہے لیکن حکومت نے اس پروفیشنل ازم کو تخریب کاری قرار دیا' صدر صاحب نے فرمایا ''اگر میڈیا نے اپنی منفی سرگرمیاں بند نہ کیں تو میں سختی کروں گا'' سوال پیدا ہوتا ہے' کیا اصلی خبر لوگوں تک پہنچانا منفی سرگرمی ہے اور کیا اس ملک میں پروفیشنل ازم جرم ہے؟' ہم مانیں یا نہ مانیں لیکن یہ حقیقت ہے 12 مئی اس ملک کے باشعور لوگوں کیلئے بے شمار سوال چھوڑ گیا ہے اور ان تمام سوالوں کا صرف ایک ہی جواب ہے'' طاقت'' اس ملک میں قانون' ضابطہ اور اخلاقیات صرف محروم اور کمزور لوگوں کیلئے ہے جبکہ اس ملک کا ہر طاقتور شخص اور اس طاقتور شخص کے دوست' حواری اور اتحادی ہر قسم کے قانون اور ضابطے سے مبرا ہیں' ان لوگوں کا اس ملک میں کوئی خدا نہیں۔

میں نے تائیوان کی تتلیوں کا تقابل پاکستان کے لوگوں سے کیا تو میرے دل سے آہ نکلی اور میں نے سوچا کاش ہم سولہ کروڑ لوگ تائیوان کی تتلیاں ہوتے' کاش ہم لوگ حشرات الارض ہوتے اور کسی غیر اسلامی ملک کی زمین پر رینگ رہے ہوتے تو آج دنیا میں ہمارے حقوق بھی ہوتے' ہمیں بھی زندہ رہنے' سانس لینے اور نعرہ لگانے کی آزادی ہوتی' آج ہم لوگ یوں حکومت کے اتحادیوں کے ہاتھوں سڑکوں پر نہ مارے جاتے۔

صرف حاضری لگوانے کے لیے

"مرزا صاحب ادھر کھڑے ہیں، میں حاضری لگوا کر آتا ہوں" میرا دوست مرزا صاحب کی طرف چل پڑا اور میں گردوپیش کا جائزہ لینے لگا، قبرستان میں ڈیڑھ دو ہزار لوگ تھے، میت قبر کے سرہانے پڑی تھی، مولوی صاحب مدفین کیلئے ہدایات دے رہے تھے اور لوگ مختلف ٹولیوں میں کھڑے ہو کر سگریٹ پی رہے تھے' جمائیاں لے رہے تھے یا پھر مختلف موضوعات پر گفتگو کر رہے تھے' مرزا صاحب کے گرد سب سے زیادہ رش تھا، لوگ ان کے پاس جاتے تھے، ان سے ہاتھ ملاتے تھے "بہت افسوس ہوا، اللہ تعالیٰ آپ کو صبر دے" جیسا روایتی فقرہ بولتے تھے اور آگے نکل جاتے تھے، میں تمام ٹولیوں کا جائزہ لینے لگا، زیادہ تر لوگ غیر فعال چیف جسٹس، پلاٹوں کی قیمتوں اور بینظیر بھٹو کی ڈیل پر گفتگو کر رہے تھے، ایک دو حضرات مرزا صاحب کی غیبت میں بھی مصروف تھے جبکہ چند لوگ پاکستانی قبرستانوں کا یورپی قبرستانوں سے تقابل کر رہے تھے، وہ یورپی قبرستانوں کی صفائی، خوبصورتی اور ترتیب کی تعریف کرتے تھے اور حسرت سے کہتے تھے کاش مرحوم کا نام ہنری یا فلپ ہوتا اور اس کا انتقال یورپ میں ہوتا تو وہ آج آسودہ حال مردہ ہوتا، کچھ لوگ آگے پیچھے دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے، چند زندہ دل ایک دوسرے کو تازہ ترین لطیفے سنا رہے تھے جبکہ نوے فیصد لوگوں کے موبائل بج رہے تھے۔ مرزا صاحب سوگواروں کے اس ہجوم میں کھڑے تھے اور وقفے وقفے سے اپنے مرحوم بھائی کی خوبیاں گنوا رہے تھے۔ لوگ ان کی ہر بات پر ہاں میں گردن ہلا دیتے تھے، ہجوم کے درمیان چار فوٹو گرافر بھی گھوم رہے تھے، یہ فوٹو گرافر وہاں موجود ہر نامور، مشہور اور اہم شخصیت کی تصویر کھینچ رہے تھے، بعض لوگ فوٹو گرافروں سے اہم لوگوں کے ساتھ تصویر کھنچوانے کی فرمائش کرتے تھے' وہ اپنی ڈائری میں اس کا ایڈریس اور ٹیلی فون لکھتے تھے اور اسے اہم شخصیت کے ساتھ کھڑا کر کے تصویر کھینچ دیتے تھے۔ قبرستان سے ذرا فاصلے پر شامیانے لگے تھے' باوردی ویٹر شامیانے میں کھانا لگا رہے تھے۔ کھانے کا انتظام شہر کی مشہور کیٹرنگ کمپنی نے کیا تھا جبکہ دوسرے شامیانے میں دو مدرسوں کے چار سو بچے قرآن خوانی میں مصروف تھے، قبرستان میں دعا کیلئے ساؤنڈ سسٹم لگ رہا تھا، کمپنی کے باوردی ورکر قبرستان کے چار کونوں میں سپیکر لگا رہے تھے جبکہ مرزا صاحب کے ملازموں نے قبرستان کے درمیان میں لکڑی کا ایک تخت بچھا دیا تھا' مولوی صاحب نے اس تخت پر کھڑے ہو کر دعا کرانی تھی، میں اس سارے انتظام کا جائزہ لے رہا تھا۔

میرا دوست واپس آ گیا، وہ بہت خوش تھا، مرزا صاحب کے سامنے اس کی حاضری لگ گئی تھی، مرزا صاحب اس کے والد کے جنازے میں شریک ہوئے تھے لہٰذا اس نے ان کے بھائی کی تدفین میں شریک ہو کر بدلا اتار دیا تھا، وہ بار بار ہاتھ ملتا تھا اور مسکرا کر کہتا تھا ''مرزا صاحب ایک عظیم انسان ہیں، بھائی کے انتقال کے باوجود انہیں میرا کام یاد تھا' انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا آپ فکر نہ کریں قل کے بعد آپ کا کام ہو جائے گا'' میرا دوست خوشی سے بار بار ہاتھ رگڑتا تھا، قبرستان کا چکر لگاتا تھا اور واپس آ کر مرزا صاحب کی یادداشت اور وسعت قلبی کی تعریف کرتا تھا، وہ خوشی میں اوپر تلے تین چار سگریٹ بھی پھونک گیا، اس نے قبرستان کا چوتھا چکر لگایا اور واپس آ کر خبر دی ''تدفین میں مزید آدھ گھنٹہ لگ جائے گا، مولوی صاحب کو قبر کے رخ پر اعتراض ہے' وہ اب قبر کی چھلائی کرا رہے ہیں لہٰذا ہمیں کھسک جانا چاہیے'' میں نے آہستہ آواز میں کہا ''لوگوں کے درمیان سے نکلنا اچھا نہیں لگتا'' اس نے آگے پیچھے دیکھا اور دبی آواز میں بولا ''مرزا صاحب کے سامنے حاضری لگ چکی ہے اب یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں، ہم قبرستان کی دیوار کے ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے نکل جاتے ہیں، کسی کو پتہ نہیں چلے گا، لوگ کلب میں میرا انتظار کر رہے ہیں'' میں اس دوست کے اصرار پر وہاں آیا تھا اور میں نے اس کی گاڑی میں واپس جانا تھا چنانچہ میرے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی، ہم دونوں قبرستان کی دیوار کے ساتھ لگ کر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے، وہاں ہمارے جیسے بیس پچیس مزید سمجھدار لوگ بھی موجود تھے' وہ بھی ''حاضری'' لگوا چکے تھے اور انہیں بھی مردے میں اب کوئی دلچسپی نہیں تھی' ہم بھی ان کے ساتھ شامل ہو کر قبرستان سے باہر نکل گئے، ہماری گاڑی ذرا فاصلے پر کھڑی تھی' ہم ٹوٹے ٹبوں سے ہوتے ہوئے گاڑی کی طرف چل پڑے' میرا دوست اس دوران دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ کرنے لگا' اس کا کہنا تھا ''ہمارے دلوں سے خوف خدا ختم ہو چکا ہے' ہم لوگ موت پر بھی ویسے جتنا کھانا پکاتے ہیں' تم مرزا صاحب کو دیکھو انہوں نے قبرستان میں کیٹرنگ کا بندوبست کر رکھا تھا'' میرے دوست کو قبرستان میں موجود فوٹو گرافروں پر بھی اعتراض تھا' اس کا کہنا تھا چند برس پہلے تک صرف شادی بیاہ کی تصویریں شائع ہوتی تھیں لیکن اب اخبارات میں جنازے' قل اور چالیسویں کی تصویریں بھی چھپتی ہیں' کل تک صرف شادی بیاہ کے چیف گیسٹ ہوتے تھے لیکن اب جنازوں کیلئے بھی چیف گیسٹ کا بندوبست کیا جاتا ہے' اس کا کہنا تھا ہمارے ملک میں اب کسی شخص کے والد' بھائی یا بھتیجے کے جنازے میں جتنے وزیر' مشیر' سفیر اور کاروباری لوگ شریک ہوتے ہیں وہ شخص اتنا ہی معتبر اور بااثر سمجھا جاتا ہے' میرے دوست کا کہنا تھا لوگ کل تک اپنے بچوں اور بہن بھائیوں کی شادیوں پر لوگوں کو مدعو کیا کرتے تھے لیکن اب لوگوں نے سوگواروں اور جنازے پڑھنے والوں کی فہرستیں بھی بنا رکھی ہیں جوں ہی ان کا کوئی عزیز فوت ہوتا ہے ان کا سیکرٹری یا پی اے لوگوں کو ٹیلی فون کرنا شروع کر دیتا ہے' سیکرٹری صاحب یا پی اے جنازے سے ایک آدھ گھنٹے پہلے شرکاء کو ''ری کنفرم'' بھی کرتے ہیں جبکہ اس جنازے میں اگر کسی وی وی آئی پی نے شرکت کرنی ہو تو جنازے کا وقت اس شخصیت کی مصروفیات کے مطابق ''ایڈجسٹ'' کر لیا جاتا ہے' میرے دوست نے پنجاب کے ایک سیاسی خاندان کی مثال دی' ان لوگوں کا والد فوت ہو گیا تھا' اس وقت چیف منسٹر غیر ملکی دورے پر تھے چنانچہ انہوں نے والد کا جنازہ چیف منسٹر کی واپسی

تک موخر کر دیا' وزیر اعلیٰ واپس آئے تو چیف منسٹر ہاؤس سے باقاعدہ وقت لیا گیا' جنازہ گاہ کے ساتھ ہیلی پیڈ بنایا گیا' چیف منسٹر صاحب جنازے سے لیٹ ہو گئے تو ان لوگوں نے شرکاء کو جنازہ گاہ میں دو گھنٹے انتظار کرایا' چیف منسٹر آئے' جنازہ پڑھایا گیا اور اس کے بعد ان لوگوں نے میت اپنے ملازموں کے حوالے کی اور خود چیف منسٹر کے ساتھ جلسے میں چلے گئے۔

میرے دوست نے ایک اور سیاسی شخصیت کی مثال بھی دی' یہ صاحب جب کسی جنازے میں شریک ہوتے ہیں تو فوٹو گرافر اور کیمرہ مین ساتھ لے کر جاتے ہیں' یہ صاحب تعزیت اور مردے کیلئے دعا کرتے ہوئے ہمیشہ اپنی تصویر بھی اترواتے ہیں اور فلم بھی بنواتے ہیں اور بعد ازاں یہ فلم ٹیلی ویژن پر چلائی جاتی ہے اور تصویریں اخبارات میں شائع ہوتی ہیں' میرے دوست کا کہنا تھا دعا کے لئے اب صدر' وزیراعظم' وزراء اعلیٰ اور وزراء کو بلوانا فیشن ہو چکا ہے' لوگ اب کسی کی سماجی حیثیت اور سٹیٹس کا اندازہ اس کے گھر دعا کیلئے آنے والی شخصیات سے کرتے ہیں' اگر ان کے گھر صدر یا وزیراعظم آ جائے اور ان کی آمد کی تصویر اخبارات اور ٹیلی ویژن چینلز پر آ جائے تو لوگوں پر اس کے تعلقات کی دھاک بیٹھ جاتی ہے اور لوگ بڑی مدت تک تذکرہ کرتے رہتے ہیں ''فلاں کے والد کے انتقال پر صدر صاحب آئے تھے اور فلاں کے گھر وزیراعظم آیا تھا'' میرے دوست کا کہنا تھا لوگ اب یہ بھی مانیٹر کرتے ہیں کس شخص کے گھر کون سی شخصیت کتنی دیر میں آئی تھی' اگر صدر یا وزیراعظم انتقال کے فوراً بعد اس شخص کے گھر پہنچ جائیں تو وہ انتہائی اہم شخص سمجھا جاتا ہے' اگر یہ حضرات دوسرے دن جائیں تو یہ لوگ کم اہم سمجھے جاتے ہیں اور اگر ایک آدھ ماہ گزر جائے تو وہ اہم شخصیات کی فہرست میں تیسرے درجے کا اہم شخص ہوتا ہے' میرے دوست کا کہنا تھا لوگ اب صدر اور وزیراعظم کو دعا کیلئے گھر بلانے کے لئے باقاعدہ ''لابنگ'' کرتے ہیں' وہ مقتدر شخصیات پر دباؤ ڈالنے کے لئے گروپنگ تک کرتے ہیں' وہ صدر صاحب کو بتاتے ہیں آپ نے فلاں شخص کی تعزیت کر کے ہماری ناک کاٹ دی تھی اور اگر آپ ہمارے گھر نہ آئے تو ہمارے لئے ووٹ لینا مشکل ہو جائے گا' یہ لوگ صدر' وزیراعظم اور وزیراعلیٰ سے پیشگی وعدہ بھی لے لیتے ہیں چنانچہ یہ لوگ اس وعدے کے بعد بڑی شدومد سے اپنے کسی قریبی عزیز کے انتقال کا انتظار کرتے ہیں۔ میرے دوست نے نفرت' افسوس اور بیزاری سے سر مارا اور آخر میں تاسف سے بولا ''پتہ نہیں زمانے کو کیا ہو گیا ہے لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف ہی نہیں رہا''۔

میں خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا' وہ اچانک میری طرف مڑا اور اس نے مجھ سے پوچھا ''لوگ اس طرح کیوں کرتے ہیں؟' لوگوں کو قبرستانوں' مردوں اور جنازوں میں کھڑے ہو کر بھی اللہ کا خوف کیوں نہیں آتا؟'' میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے جواب دیا ''لوگ آج کل قبرستانوں میں مردوں کیلئے نہیں جاتے' یہ جنازہ پڑھنے اور دعا کیلئے بھی نہیں جاتے' یہ فقط حاضری لگوانے اور تصویر کھنچوانے کیلئے آتے ہیں' یہ دوسروں کے دلوں میں اپنے تعلقات کی دھاک بٹھانے کیلئے آتے ہیں'' میں رکا اور دوبارہ عرض کیا ''آج کل لوگ مردوں کیلئے نہیں بلکہ زندوں کیلئے قبرستان جاتے ہیں لہٰذا ان کے دل خدا کے خوف سے خالی ہیں''

ہمارے پاس بنیاد ہی نہیں

خاتون نے عجیب سوال پوچھا' اس نے پوچھا ''پاکستان کے سینئر صحافی اور کالم نگار حکومت کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے رہتے ہیں' اخبارات میں حکومت کی کرپشن' بے حسی' اختیارات سے تجاوز اور اقربا پروری کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی' حکومت ان کالموں اور ان خبروں کی تردید تک گوارا نہیں کرتی' کیوں؟'' میں نے تھوڑی دیر سوچا اور اس کے بعد ان سے عرض کیا ''حکومت کے تمام اہم ستونوں نے آنے والی زندگی میں ووٹ مانگنے ہیں اور نہ ہی الیکشن لڑنے ہیں چنانچہ لوگ حکومت کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں' وہ حکمرانوں کو کس نظر' کس زاویے سے دیکھتے ہیں حکومت کو اس سے کوئی غرض نہیں'' میں نے عرض کیا'' حکمرانوں اور عوام کے درمیان سب سے بڑا رشتہ ووٹ اور الیکشن ہوتے ہیں' جو سیاستدان بیلٹ باکس سے ہو کر حکومت تک پہنچتے ہیں وہ اپنے امیج' وہ اپنے تاثر کے بارے میں بہت محتاط ہوتے ہیں' انہیں معلوم ہوتا ہے وہ عوام کے کندھے پر بیٹھ کر ایوان تک پہنچے ہیں اور جب تک انہیں عوامی مقبولیت حاصل رہے گی ان کے اقتدار کا سورج چمکتا رہے گا چنانچہ یہ لوگ نہ صرف خبروں اور کالموں کے معاملے میں سنجیدہ ہوتے ہیں بلکہ ان کے کانوں پر جوں بھی رینگتی ہے لیکن جو لوگ پچھلی گلی سے ہو کر اقتدار تک پہنچتے ہیں اور جنہوں نے سامنے والے دروازے سے نکل کر امریکہ واپس لوٹ جانا ہوتا ہے انہیں عوام' اخبارات اور عوامی رائے کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی' وہ عوام کے غم' غصے اور نفرت کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہیں اور ہماری حکومت بدقسمتی سے دوسرے گروہ سے تعلق رکھتی ہے''

میں نے خاتون سے عرض کیا'' آپ کی بات سو فیصد درست نہیں' اس حکومت میں بھی بے شمار ایسے لوگ ہیں جو اپنے امیج کے بارے میں فکر مند ہیں' جو تردید بھی کرتے ہیں' کالم نگاروں کو حقائق بھی بتاتے ہیں اور اپنی غلطیوں کی معافی بھی مانگتے ہیں'' خاتون نے حیران ہو کر پوچھا ''یہ کون لوگ ہیں'' میں نے عرض کیا ''یہ وہ لوگ ہیں جو 2002ء کے الیکشنوں میں باقاعدہ جیت کر اسمبلی تک پہنچے تھے اور جنہوں نے 2007ء کے الیکشنوں میں ایک بار پھر عوام کے پاس جانا ہے'' خاتون نے فرمایا ''آپ اپنے تھیسس کی وضاحت کریں'' میں نے عرض کیا '' آپ حکمران جماعت کے ایم این ایز اور سینیٹروں کے رویئے کا تجزیہ کر لیجئے' مسلم لیگ ق کے ایم این ایز ہر عوام

دشمن بل پر پس وپیش سے کام لیتے رہے ہیں جبکہ بینیٹروں کو کسی قسم کی پروانہیں' آپ تحفظ حقوق نسواں بل کو لے لیجئے' مسلم لیگ (ق) کے ایم این ایز کے دل میں اس بل کے بارے میں تحفظات پائے جاتے تھے' یہ لوگ اس بل کی پیدائش سے لے کر منظوری تک اپنی گردن بچانے کی کوشش کرتے رہے' یہ لوگ ''بیک ڈور ڈپلومیسی'' کے ذریعے مسلم لیگ (ن) اور ایم ایم اے کو اس بل کی مخالفت پر اکساتے رہے تھے' انہوں نے اس بل کے خلاف اخبارات کو بھی استعمال کیا لیکن جب حکومت نے ان ایم این ایز کو ڈنڈا دکھانا شروع کر دیا تو یہ لوگ اس ڈنڈے کے خوف سے بل منظور کرنے پر مجبور ہو گئے' چوہدری شجاعت حسین حکمران جماعت کے صدر ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اس بل کے معاملے میں اپنے امیج کے بارے میں متفکر ہیں' وہ بل منظور ہونے کے بعد بھی نہ صرف علماء کرام سے رائے لے رہے ہیں بلکہ وہ اپنے ملاقاتیوں سے بھی بہانے بہانے سے اپنے اور اپنی پارٹی کے امیج کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس آپ مسلم لیگ (ق) کے بینیٹرز کو لے لیجئے' یہ لوگ شروع دن سے اس بل کی حمایت کر رہے تھے' ان لوگوں نے آگے بڑھ بڑھ کر اس کی حمایت میں تقریریں بھی کیں اور بیانات بھی جاری کئے' اس بل کی منظوری کے بعد وزیراعظم شوکت عزیز اور ہمارے وزیر اطلاعات ونشریات جناب محمد علی درانی بل کے سب سے بڑے وکیل ہیں' آپ ان دونوں کا پس منظر بھی ملاحظہ کیجئے' یہ دونوں ایک سیاسی شارٹ کٹ کے ذریعے اقتدار تک پہنچے ہیں لہٰذا انہیں بھی اپنے عوامی امیج کی کوئی پروانہیں''

میں نے عرض کیا ''ایک ڈیموکریٹک اور ایک ڈکٹیٹر حکومت میں یہی فرق ہوتا ہے' ڈیموکریٹک حکومت اپنے امیج کے بارے میں بہت حساس ہوتی ہے جبکہ غیر جمہوری اور نیم جمہوری حکومتوں کو امیج کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی' آپ نیٹو کانفرنس کی مثال لیجئے' اس وقت ریگا میں نیٹو کانفرنس ہو رہی ہے' اس کانفرنس کا پس منظر بہت دلچسپ ہے' کینیڈا کے اڑھائی ہزار فوجی نیٹو کے پلیٹ فارم پر جنوبی افغانستان میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں' پچھلے دنوں طالبان کے ساتھ لڑائی میں کینیڈا کے 44 فوجی ہلاک ہو گئے' ان فوجیوں کے تابوت جب کینیڈا پہنچے تو عوام احتجاج کرنے لگے' اس احتجاج کے ردعمل میں کینیڈا کی حکومت اپنے فوجی واپس بلانے پر غور کرنے لگی لیکن امریکہ اور برطانیہ نے اس پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا جس سے متاثر ہو کر کینیڈا افغانستان میں اپنے فوجیوں کے قیام میں 2009ء تک توسیع پر مجبور ہو گیا' اس توسیع پر کینیڈا میں شدید احتجاج شروع ہو گیا' صدر بش اور ٹونی بلیئر نے کینیڈا کی حکومت کو دباؤ سے نکالنے کے لئے نیٹو کے رکن ممالک سے جنوبی افغانستان میں فوجی بھجوانے کی درخواست کر دی لیکن جرمنی' فرانس' اٹلی اور سپین کی جمہوری حکومتوں نے صاف انکار کر دیا چنانچہ صدر بش نیٹو کانفرنس بلانے پر مجبور ہو گئے' اب اگر آپ اس پس منظر کو سامنے رکھ کر پاکستان کو دیکھئے تو آپ کو ایک جمہوری اور ایک غیر جمہوری حکومت کا فرق معلوم ہو جائے گا' ہم نے 2001ء میں افغانستان پر یوٹرن لیا تھا' ہم نے اس یوٹرن کے نتیجے میں کیا کیا نقصان اٹھایا' ذرا سوچئے' پاکستان میں کتنے بم دھماکے ہوئے؟ پاکستان میں کتنے خودکش حملے ہوئے؟ ہم نے اب تک نعشوں کے کتنے تابوت وصول کئے اور ہمارے باجوڑ اور درگئی میں کتنے لوگ شہید

ہوئے؟ ہمارے شمالی اور جنوبی وزیرستان کے حالات کہاں جا پہنچے' بلوچستان کس حد تک آتش فشاں کی شکل اختیار کر گیا اور ہمارا پورا ملک کس قدر خوف اور دہشت گردی کا شکار ہوا؟ آپ 2001ء سے پہلے اور 2001ء کے بعد کے پاکستان کا جائزہ لیجئے' آج حالت یہ ہے ہمارا کوئی وزیر تک سیکورٹی کور کے بغیر اپنے دفتر سے باہر نہیں نکل سکتا' ہماری مسجدیں تک غیر محفوظ ہیں اور ہر نماز کے وقت مسجدوں کے سامنے پولیس کھڑی ہوتی ہے' ہمارے عوام حکومت کی روشن خیالی اور مجاہد دشمن پالیسیوں کے دل سے خلاف ہیں اور ہر صاحب دل اور صاحب ایمان شخص حکومت کو برا بھلا کہہ رہا ہے' ملک میں مہنگائی ہے اور لوگ پیٹ پر روٹی باندھ کر ٹرین کے سامنے لیٹ رہے ہیں لیکن ہماری حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی' کیوں' کیونکہ حکومت عوامی امیج سے بالاتر ہے' اس کی بلا سے اس ملک کے سارے لوگ بھوکے مر جائیں' اسے کوئی فرق نہیں پڑتا لہٰذا میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کینیڈا نے پچھلے چھ برس میں جتنے تابوت وصول کئے تھے اگر اتنے تابوت روزانہ اسلام آباد' کراچی اور لاہور میں آنا شروع ہو جائیں تو بھی ہماری حکومت کے پر تک نہیں ہوں گے' ہماری حکومت پریشان نہیں ہوگی' کیوں؟ کیونکہ اس حکومت نے بیلٹ باکس سے جنم نہیں لیا' یہ عوامی رائے کی کوکھ سے پیدا نہیں ہوئی لہٰذا یہ عوام کے امیج اور رائے سے متاثر نہیں ہوتی'' میں نے خاتون سے عرض کیا'' جمہوریت' ووٹ اور بیلٹ باکس وہ بنیادی'' کیوں'' ہوتے ہیں جن سے قوموں کا مستقبل طے ہوتا ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک کے پاس یہ بنیاد ہی نہیں''

☼……☼……☼

دس لوگ

میں نے اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور گاڑی سے فوراً باہر آ گیا' عابد ڈرائیور کے پاس رک گیا' وہ پہلے گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ گپ شپ کرتا رہا اور اس کے بعد دونوں باہر آ کر کھڑے ہو گئے' یہ میرے لئے انتہائی مشکل وقت تھا' فلائیٹ چھوٹنے میں تھوڑی سی دیر باقی تھی لیکن عابد ڈرائیور کے ساتھ مذاکرات میں مصروف ہو چکا تھا' مجھے معلوم تھا یہ مذاکرات شام تک جاری رہیں گے' عابد انسانوں کے اس گروپ سے تعلق رکھتا ہے جو بولنے پر آتے ہیں تو اس وقت تک گفتگو جاری رکھتے ہیں جب تک دوسرا ان سے اتفاق نہیں کر لیتا یا پھر انہیں سلام کر کے دائیں بائیں نہیں ہو جاتا' میں عابد جیسے لوگوں کو "سیلز مین" کہتا ہوں' آپ ان لوگوں کو بھینس کے سامنے کھڑا کر دیں تو یہ اسے رنگ گورا کرنے کی کریم بیچنا شروع کر دیں گے لیکن ہمارا ایک تیسرا دوست اس سے اتفاق نہیں کرتا' اس کا خیال ہے یہ لوگ پیدائشی خوشامدی ہوتے ہیں' یہ بلا مقصد' بلا فائدہ دوسروں کی خوشامد کرتے رہتے ہیں' ان کے سامنے اگر شیطان بھی آ بیٹھے تو یہ اس کے حسن' اس کی ذہانت اور اس کے اخلاق کی تعریف شروع کر دیں گے' مجھے نہیں معلوم میری رائے درست ہے یا ہمارے اس تیسرے دوست کی لیکن یہ حقیقت ہے عابد موقع اور وقت دیکھے بغیر غیر متعلقہ لوگوں کے ساتھ گفتگو میں الجھ پڑتا ہے' وہ اس وقت بھی اپنی عادت نبھا رہا تھا' میں کراچی ائیر پورٹ کے برآمدے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا اور وہ ہنس ہنس کر ڈرائیور سے گپ شپ کر رہا تھا' میں نے انگلی سے ہوا میں گھڑی بنائی اور اسے جلدی آنے کا اشارہ کیا' اس نے انگشت شہادت سے ایک منٹ مانگا' ڈرائیور کے ساتھ دو باتیں کیں' ڈرائیور نے قہقہہ لگایا' اس کے ساتھ بغل گیر ہوا' آنکھیں پونچھیں' دونوں ہاتھ ماتھے پر رکھ کر سلام کیا اور گاڑی میں بیٹھ گیا' عابد بھاگتا ہوا میرے پاس آ گیا' ہم ڈیپارچر لاؤنج کی طرف دوڑ پڑے۔

میں غصے سے ابل رہا تھا' میں بورڈنگ پاس لینے تک خاموش رہا' ہم لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے تو وہ مسکرایا اور مجھے خوشامدی نظروں سے دیکھنے لگا' یہ اس کی عادت تھی' وہ ہمیشہ دوسروں کی تعریف کرنے سے پہلے ایسا کرتا تھا' وہ نرم اور میٹھی آواز میں بولا "ڈرائیور شدید ٹینشن میں تھا' گاڑی کے مالک نے اسے گالیاں دی تھیں اور وہ طیش کے عالم میں گاڑی لے کر باہر آ گیا تھا شاید اسی وجہ سے وہ غیر محتاط ڈرائیونگ کر رہا تھا" میں نے گرم لہجے میں

جواب دیا ”تم نے دیکھا نہیں اس نے راستے میں کتنے سگنل توڑے‘ اس نے ٹرالر کے ساتھ ریس لگائی‘ اس نے راستے میں کتنے لوگوں سے بدتمیزی کی اور وہ ہمارے ساتھ کس لہجے میں بات کر رہا تھا لیکن تم نے اس کے ساتھ رشتے داری نکال لی‘ تم بنیادی طور پر ایک گھٹیا قسم کے خوشامدی ہو‘ تم خوشامد میں معیار تک کا خیال نہیں رکھتے“ اس نے قہقہہ لگایا اور مجھے توصیفی نظروں سے دیکھ کر بولا ”میں نے ڈرائیور کی ٹینشن بھانپ لی تھی لہٰذا میں نے اس کی ٹینشن کو دو منٹ دینے کا فیصلہ کیا‘ تم گاڑی سے اترے تو میں نے اس کی ڈرائیونگ کی تعریف کی‘ میں نے اس سے کہا‘ میں نے پوری زندگی تم جیسا کوئی دوسرا ڈرائیور نہیں دیکھا‘ تم نے انتہائی تیز رفتاری کے باوجود گاڑی کا توازن برقرار رکھا اور تم کراچی کے تمام ”شارٹ کٹس“ سے واقف ہو‘ تمہیں راستے میں جہاں بھی ٹریفک جام ملی تم فوراً کسی گلی میں گھس گئے اور چند منٹ میں کسی اچھی سڑک پر نکل آئے“ میرے غصے میں اضافہ ہو گیا‘ میں نے نفرت اور بے بسی کے ملے جلے احساس کے ساتھ اس کی طرف دیکھا ”تم اس واہیات انسان کی ڈرائیونگ کو بہترین قرار دے رہے تھے“ اس نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا ”میں اسے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اچھا ڈرائیور سمجھتا ہوں‘ اس نے غیر محتاط ڈرائیونگ کے باوجود گاڑی کو کسی سے ٹکرانے نہیں دیا‘ اس نے سارے سگنل توڑے لیکن کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ تم یقین کرو اس کی بے احتیاطی میں بھی ایک احتیاط تھی“ میں نے غصے میں پہلو بدل لیا لیکن وہ بولتا چلا گیا ”میری ہمدردی نے ڈرائیور کی ٹینشن کو آنسوؤں کی شکل دے دی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ یہاں تک کہ اس کا سارا غصہ، اس کی ساری نفرت ٹشو پیپر میں منتقل ہو گئی۔ وہ ہلکا پھلکا ہو گیا، میں نیچے اترا، اسے بھی باہر نکالا، اس نے تازہ ہوا کے چند لمبے سانس لیے۔ میرے ساتھ ہنسی مذاق کی باتیں کیں اور چلا گیا“۔ وہ چپ ہو گیا۔

میں نے گرم لہجے میں پوچھا ”لیکن تمہیں مدر ٹریسا بن کر کیا فائدہ ہوا؟“ اس نے قہقہہ لگایا اور انکار میں سر ہلا کر بولا ”میں نے کراچی جیسے ابلتے، مچلتے شہر کو امن اور سکون کا تحفہ دے دیا“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، وہ مسکرایا ”نفرت اور محبت کے جذبے متعدی امراض کی طرح ہوتے ہیں، یہ ہمیشہ ایک سے دوسرے اور دوسرے سے آٹھویں دسویں شخص کو متاثر کرتے ہیں، غصے اور ٹینشن کا شکار شخص دو گھنٹوں میں پانچ سو لوگوں کا موڈ خراب کر دیتا ہے اور یہ پانچ سو لوگ شام تک پورے شہر کو بیمار کر دیتے ہیں۔ ہماری نفرت کی ایک نظر، ہماری ایک گالی اور ہمارا پانچ سیکنڈ کا غصہ ”ملٹی پلائی“ ہوتا ہے اور یہ شام تک پورے شہر کو شدت اور غصے میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اسی طرح ایک تھینک یو، ایک شکریہ، مہربانی کا ایک لفظ، ایک تھپکی، واہ واہ کا ایک سیکنڈ، شفقت کا ایک ہاتھ، ایک مسکراہٹ اور محبت کی ایک نظر بھی ”ملٹی پلائی“ ہوتی ہے اور شام تک پورے شہر کو خوبصورت بنا دیتی ہے“ میں دلچسپی سے اس کی بات سننے لگا، وہ بولا ”انسان جذبات کا ایگزاسٹ فین ہوتا ہے، ہم اپنے جذبات اپنی ذات تک محدود نہیں رکھ سکتے، ہم ہمیشہ دوسروں کو اپنی نفرت اور اپنی محبت میں شریک کرتے ہیں، برے لوگ ہمیشہ دوسروں کو برا بناتے ہیں اور اچھے اور نیک لوگ ہمیشہ دوسروں کو اچھائی کی تبلیغ کرتے ہیں، ہم اگر ٹینشن لے کر گھر سے نکلیں تو ہم یہ ٹینشن راستے میں ملنے والے لوگوں میں تقسیم کرتے جاتے ہیں، ہم اپنی ٹینشن رکشے والے، ٹیکسی والے، پٹرول

پمپ کے چھوٹے، دفتر کے چپراسی، اپنے پی اے اور اپنے کلرک کے حوالے کرتے جاتے ہیں اور یہ لوگ اس ٹینشن کو آگے منتقل کرتے رہتے ہیں۔ یوں ٹینشن اور نفرت کا یہ سلسلہ پورے شہر میں پھیل جاتا ہے، اسی طرح جب کوئی شخص اپنے گھر سے خوش نکلتا ہے تو وہ اپنی یہ خوشی بھی راستے میں بانٹتا جاتا ہے۔'' وہ رکا اور دوبارہ بولا ''میں نے محسوس کیا یہ ڈرائیور ٹینشن کا شکار ہے لہٰذا وہ کراچی کی سڑکوں پر ٹینشن کا چھڑکاؤ کر رہا ہے چنانچہ میں نے اس کا جذباتی آپریشن کیا اور اس کا غصہ نکال کر ڈس بین میں پھینک دیا جس کے بعد وہ پرسکون ہو گیا' تم ذرا تصور کرو اب وہ جس راستے سے گزر رہا ہوگا، وہ جس جس شخص سے مل رہا ہوگا وہ اسے سکون، اطمینان، ہمدردی اور محبت کا تحفہ دے رہا ہوگا۔ وہ لوگوں میں امن اور محبت تقسیم کر رہا ہوگا'' عابد خاموش ہو گیا، میرے پاس اس کی بات جھٹلانے کیلئے کوئی دلیل، کوئی جواز نہیں تھا۔ وہ بولا ''میرا دعویٰ ہے اگر صرف دس لوگ یہ نیت لے کر گھر سے نکلیں کہ ہم نے لوگوں کی ٹینشن اور نفرت کو ہمدردی اور محبت میں تبدیل کرنا ہے اگر یہ لوگ شام تک گلیوں، بازاروں، بسوں، ویگنوں اور رکشوں میں لوگوں کے غصے کی آگ بجھاتے رہیں تو پاکستان کے تمام شہروں کے مزاج بدل جائیں۔ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ لڑنا، بھڑنا بند کر دیں اور لوگوں میں فساد کی خو اور اختلاف کی عادت ختم ہو جائے'' وہ رکا، اس نے ایک لمحہ غور کیا اور مسکرا کر بولا ''ہمارے ہر شہر کو ایسے دس رضا کاروں کی ضرورت ہے جو محبت کے ڈسٹری بیوٹر بن جائیں، جو ٹشو پیپر بن کر سارے شہر کی تلخی چوس لیں اور جو شہروں میں مسکراہٹوں کی دکانیں کھول لیں، تم یقین کرو، یہ ملک بدل جائے گا''۔
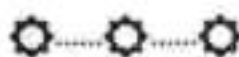
جہاں زیادہ محنت وہاں زیادہ ٹیلنٹ

نوجوان نے پانی کا گلاس چڑھایا' ایک لمبی آہ بھری اور کرسی سے ٹیک لگا دی" سر میں ناکامیوں کا مزید بوجھ برداشت نہیں کر سکتا لہٰذا میں مرجانا چاہتا ہوں' سر میں خودکشی کرلوں گا" میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور پیار سے پوچھا" تم ضرور خودکشی کر لینا' یہ آپشن دنیا کے تمام جانداروں کیلئے ہر وقت کھلا رہتا ہے" اس نے آنکھیں پونچھیں اور مضطرب لہجے میں بولا" سر میں ایک ناکام طالب علم ہوں' میں نے تین بار بی اے کے پرچے دیئے مگر میں فیل ہو گیا' میں نے چار سال نوکری تلاش کی' مجھے نہیں ملی' میں نے پچھلے تین برسوں میں آٹھ قسم کے کاروبار کئے' وہ سارے کاروبار ناکام ہوئے اور میرے گھر کے برتن تک بک گئے لہٰذا میرے لئے اب زندگی میں کوئی دلچسپی' کوئی خوبصورتی نہیں' میں مرجانا چاہتا ہوں" میں نے قہقہہ لگایا' وہ مجھے نفرت سے دیکھنے لگا' میں نے کہا" تو تم جدوجہد' کوشش اور محنت سے گھبرائے ہوئے ہو" اس نے پہلو بدل کر کہا" نہیں سر میں ناکامیوں سے گھبرایا ہوا ہوں" میں نے اس سے پوچھا" تم زندگی میں کتنی بار ناکام ہوئے ہو" اس نے تھوڑی دیر گنا اور پھر بے یقینی کے عالم میں بولا" بارہ تیرہ مرتبہ" میں نے اوپر بلب کی طرف اشارہ کیا" تم جانتے ہو یہ بلب کس نے ایجاد کیا تھا؟" نوجوان نے فوراً جواب دیا" ایڈیسن نے" میں نے کہا" ایڈیسن نے یہ بلب بنانے کیلئے 2 ہزار کوششیں کی تھیں اور اس کی ہر کوشش ناکام رہی تھی' وہ دو ہزار کوششوں کے بعد کامیاب ہوا تو کسی نے اس سے پوچھا" تمہیں 2 ہزار مرتبہ ناکام ہونا کیسا لگا" اس نے مسکرا کر جواب دیا" میں اپنی ناکامیوں کو ناکامیاں نہیں سمجھتا' میں انہیں اپنی کامیابی کی سیڑھیاں سمجھتا ہوں اور مرحلے سمجھتا ہوں' میں سمجھتا ہوں' میں نے بلب کی منزل تک پہنچنے کیلئے دو ہزار مرحلے طے کئے تھے"

میں نے انگلی نیچے کی اور اس کی طرف دیکھ کر کہا" تم بتاؤ تیرہ ناکامیاں زیادہ ہیں یا دو ہزار ناکامیاں" وہ خاموش رہا' میں نے کہا" بیٹا تم نے کبھی تتلی کی پیدائش کا عمل دیکھا ہے!" اس نے انکار میں سر ہلا دیا' میں نے کہا" قدرت تتلی کو ایک" کوکون" میں پیدا کرتی ہے جب اس کا جسم مکمل ہو جاتا ہے تو قدرت اس" کوکون" میں ایک باریک سا سوراخ کر دیتی ہے اور تتلی کو اپنے پورے جسم کا زور لگا کر اس سوراخ سے باہر آنا پڑتا ہے سوراخ چھوٹا اور تتلی کا جسم بڑا ہوتا ہے لہٰذا وہ کوکون سے باہر آنے میں کئی کئی دن لگا دیتی ہے' یہ کوشش' یہ محنت اور یہ چھوٹا سا سوراخ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی حکمت ہے' بات دراصل یہ ہے جب تتلی کے جسم میں جان ڈالی جاتی ہے تو اس کے پر بے جان ہوتے ہیں' جب وہ سوراخ سے باہر نکلنے کیلئے زور لگاتی ہے تو اس کے جسم سے ایک مواد نکل کر پروں کی رگوں میں پہنچتا ہے' یہ مواد پروں کو زندگی دیتا ہے' تتلی" کوکون" میں جتنا زور لگاتی ہے' اتنا ہی مواد اس کے پروں

میں پہنچتا ہے اور اس کے پر اتنے ہی خوبصورت اور اتنے ہی طاقتور ہو جاتے ہیں' اگر یہ سوراخ تنگ نہ ہو اور اگر تتلی اس سوراخ سے باہر آنے کیلئے زور نہ لگائے تو وہ کبھی اڑنے کے قابل نہ ہو اور اس میں اور عام کیڑے مکوڑوں میں کوئی فرق نہ رہے' یہ قدرت کا انتہائی دلچسپ نظام ہے' تم اس نظام کو سامنے رکھ کر دیکھو تو تمہیں محسوس ہوگا' قدرت جس شخص کو زیادہ ٹیلنٹ دیتی ہے اس شخص کو زندگی میں دوسروں کی نسبت زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے' وہ عام لوگوں کی نسبت زیادہ ناکام ہوتا ہے" نوجوان نے حیرت سے میری طرف دیکھا' میں نے مسکرا کر کہا" دیکھو تم انسانی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو' میں تمہیں قریب ترین تاریخ کی مثالیں دیتا ہوں' بیتھوون مغربی موسیقی کا سب سے بڑا نام ہے' اس کی سمفنیوں نے پوری دنیا میں آگ لگا دی تھی' اس کا شمار تاریخ کے چار لیجنڈ موسیقاروں میں ہوتا ہے لیکن یہ شخص اپنی موسیقی خود نہیں سن سکتا تھا' یہ بہرہ تھا لہٰذا یہ سازوں کی حرکت اور سننے والوں کی کیفیت سے اپنے فن کا اندازہ لگاتا تھا' جارج واشنگٹن امریکہ کا کامیاب ترین صدر تھا' امریکہ کا دارالحکومت واشنگٹن اس کے نام سے منسوب ہوا' وہ شخص بچپن میں فورگ کی وادی میں پھنس گیا تھا' یہ وادی برف سے اٹی ہوئی تھی اور وہاں سے اس کے بچنے کے امکانات صفر تھے' یہ اس کی زندگی کا ناقابل فراموش اور ناقابل یقین لمحہ تھا' ابراہام لنکن کی زندگی انتہائی عسرت اور غربت میں گزری' وہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتا تھا' البرٹ آئین سٹائن کو دنیا کا سب سے بڑا دماغ کہا جاتا ہے لیکن وہ بچپن میں ایک ناکام اور نالائق طالب علم تھا' اس کے استادوں کا کہنا تھا آئین سٹائن کبھی کالج کے درجے تک نہیں پہنچ سکے گا' کرسٹوفر کولمبس نے امریکہ کی تلاش میں جتنی مشکلات برداشت کیں' اس نے جتنے دھکے کھائے' تم اس کا تصور نہیں کر سکتے' جیمز ارل جونز دنیا کا مشہور ترین اداکار ہے' وہ طالب علمی کے زمانے میں بول نہیں سکتا تھا' وہ طویل عرصے تک اپنے اساتذہ اور ہم جماعتوں سے لکھ کر بات کرتا تھا' دنیا میں آئزک پرل مین سے اچھا وائلن آج تک کسی شخص نے نہیں بجایا' یہ شخص نازی کیمپ میں پیدا ہوا اور چار سال کی عمر میں اس کا نچلا دھڑ مفلوج ہو گیا' اس نے پوری زندگی ویل چیئر پر بیٹھ کر وائلن بجایا اور چیسٹر کارلسن نے 40ء کی دہائی میں ایک سسٹم "ELECTROSTATIC PAPER-COPYING PROCESS" بنایا' وہ سات برس تک یہ سسٹم اٹھا کر پھرتا رہا لیکن اسے ہر دروازے سے دھتکار دیا گیا یہاں تک کہ نیویارک کی ایک چھوٹی سی کمپنی ہیلائڈ (HALOID) نے یہ سسٹم خرید لیا اور اس کے بعد اس سسٹم کی بنا پر یہ کمپنی زیروکس کے نام سے ملٹی نیشنل بن گئی' ایسی بے شمار کہانیاں ہیں' روزویلٹ امریکہ کا چار بار صدر منتخب ہوا' اسے 39 سال کی عمر میں پولیو ہوا اور اس نے باقی زندگی تکلیف اور پریشانی میں گزار دی' وہ اسی عالم میں صدر بنا' فاتح جاپان جنرل میک آرتھر "ویسٹ پوائنٹ" کے داخلہ ٹیسٹ میں دو بار فیل ہوا تھا' مشہور ایکٹر لوسل بال کو ڈرامہ سکول کے ہیڈ ماسٹر نے پیشہ بدلنے کا مشورہ دیا تھا اور اکیڈمی ایوارڈ یافتہ رائٹر' پروڈیوسر اور ڈائریکٹر وڈی ایلن موشن پکچر پروڈکشن میں فیل ہو گیا تھا لہٰذا میرے بچے یہ مصیبتیں' یہ ناکامیاں اور یہ کوششیں تو آپ کو طاقت دیتی ہیں' یہ تو آپ کو آگے بڑھنے' ترقی کرنے کا حوصلہ دیتی ہیں اور یہ تو قدرت کی طرف سے اعلان ہوتی ہیں' اللہ نے آپ کو تتلی کی طرح زیادہ رنگوں سے نواز رکھا ہے لہٰذا آپ کو یہ رنگ دکھانے کیلئے زیادہ زور لگانا پڑے گا اور آپ کو اپنے پر پھیلانے کیلئے زندگی کے چھوٹے سوراخ سے گزرنا ہوگا"

میں خاموش ہو گیا' نوجوان کا چہرہ جذبات سے دمک رہا تھا' وہ اٹھا' اس نے مجھے سلام کیا اور نئے جذبے کے ساتھ زندگی کے دھارے میں شامل ہو گیا۔

☼.....☼.....☼

ایک زبان دو کان

بل میریٹ امریکہ کے ایک نامور بزنس مین ہیں' یہ ہوٹلز کی دنیا کی سب سے بڑی ''چین'' میریٹ کے چیئرمین اور چیف ایگزیکٹو افسر ہیں' دنیا کے 151 ممالک میں اس چین کے ہوٹل ہیں' اس چین کی کامیابی کے پیچھے بل میریٹ کی ان تھک محنت اور حیران کن ذہنی استطاعت ہے' پچھلے سال کسی صحافی نے بل میریٹ سے ان کی اس کامیابی کی وجہ دریافت کی' بل میریٹ نے بڑا انوکھا جواب دیا' اس کا کہنا تھا ''میں لوگوں کی بات بڑے غور سے سنتا ہوں'' پوچھنے والے نے حیرت کا اظہار کیا تو بل میریٹ نے وضاحت کی ''میں جب جوان تھا تو میرے والد نے مجھے ٹریننگ کیلئے نیوی میں بھرتی کرا دیا' ان دنوں آئزن ہاور امریکہ کے صدر تھے' صدر میرے والد کے بہت اچھے دوست تھے' ایک کرسمس پر صدر ہمارے گھر تشریف لائے' اس دن شدید سردی تھی اور باہر برف باری ہو رہی تھی' میرے والد اور صدر دونوں برف میں نشانہ بازی کرنا چاہتے تھے' صدر اندر بیٹھ گئے تو میرے والد نے مجھے حکم دیا' بل تم جاؤ اور صدر سے کہو سر اس موسم میں نشانہ بازی واقعی ایک دلچسپ اور مزیدار کام ہوگا' آپ پہلے آتش دان کے پاس بیٹھیں گے یا پھر فوراً نشانہ بازی پسند کریں گے' میں نے والد کی بات سنی لیکن سمجھی نہیں' میں فوراً صدر کے پاس گیا اور ان سے عرض کیا' سر باہر بہت سردی ہے' اس سردی میں نشانہ بازی اچھی نہیں رہے گی' آپ کیلئے بہتر ہے آپ آتش دان کے پاس بیٹھ جائیں' صدر نے ٹھیک ہے کہا اور آتش دان کے قریب بیٹھ گئے' جب صدر چلے گئے تو میرے والد نے مجھے بلایا اور سنجیدگی سے بولے بل ایک بات کان کھول کر سن لو جب بھی کوئی شخص بات کرے وہ بات غور سے سنو اور سننے کے ساتھ ساتھ اسے سمجھو اور جب تک تم سے تمہاری رائے نہ پوچھی جائے تم اپنی رائے نہ دو' تم زندگی میں کبھی ناکام نہیں ہو گے' میں نے اپنے والد کی بات پلے باندھ لی لہٰذا اس کے بعد میں نے پوری زندگی فیصلے کرنے سے پہلے دوسرے لوگوں کی بات غور سے سنی' اسے سمجھا اور پھر آرڈر جاری کیا' یہ میری زندگی کی کامیابی کی واحد وجہ ہے''۔

بل میریٹ کا یہ نظریہ بہت دلچسپ ہے لیکن یہ نیا نہیں' امریکہ میں ایک ادارہ ہے ''انٹرنیشنل لسننگ ایسوسی ایشن'' یہ ادارہ لوگوں کو سننے کا فن سکھاتا ہے' اس ادارے کا دعویٰ ہے' ہم لوگ روزانہ 45 فیصد وقت سننے میں

گزارتے ہیں لیکن ہم لوگ اپنی سنی ہوئی پچاس فیصد باتیں بھول جاتے ہیں' ان کا کہنا ہے انسان زندگی میں جو کچھ سیکھتا ہے اس کے 75 فیصد حصے کی بنیاد سننے کی حس ہوتی ہے' اگر انسان کی یہ حس چھن جائے یا معطل ہو جائے تو اس کی صلاحیتیں 75 فیصد کم ہو جاتی ہیں اور وہ 75 فیصد چیزیں سیکھنے کا اہل نہیں رہتا' ان کا کہنا ہے ہم لوگ جو کچھ سنتے ہیں' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں سے صرف 20 فیصد باتیں ہمارے ذہن میں رہ جاتی ہیں باقی 80 فیصد اطلاعات' علم اور باتیں ہمارے ذہن سے محو ہو جاتی ہیں لیکن کامیاب لوگ اس استطاعت کو بڑھا لیتے ہیں وہ بیس فیصد سے زیادہ باتیں یاد رکھتے ہیں' ان کے کان ان کے دماغ کے ان حصوں سے جڑے رہتے ہیں جو تمام سنی ہوئی باتیں ریکارڈ کر لیتے ہیں' اس ادارے کا دعویٰ ہے انسان ایک منٹ میں 125 سے لے کر 250 لفظ تک سنتا ہے مگر یہ الفاظ دماغ میں پہنچ کر ذہن کو ایک ہزار سے 3 ہزار الفاظ سوچنے کی تحریک دیتے ہیں' یہ تحریک بنیادی طور پر اس شخص کو عمل پر ابھارتی ہے اور جو شخص اس تحریک پر عمل کر لیتا ہے وہ زندگی میں کامیاب ہو جاتا ہے' اس ادارے نے آج تک 35 بڑے سروے کرائے' یہ سروے دنیا کی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے چیف ایگزیکٹوز' چیئرمینز' صدور اور ڈائریکٹر جنرلز کے گرد گھومتے ہیں' ان سروے کے دوران معلوم ہوا دنیا میں ترقی کرنے والے تمام لوگ سننے کے فن سے واقف ہیں' وہ اپنے وقت کا زیادہ تر حصہ لوگوں کی باتیں سننے میں صرف کرتے ہیں' وہ اپنے دونوں کان کھول کر بیٹھتے ہیں اور وہ کہنے والوں کو پوری توجہ' پوری یکسوئی دیتے ہیں' سروے میں پتہ چلا جس کمپنی میں سننے والے لوگ زیادہ ہیں اس کمپنی نے دوسری کمپنیوں کی نسبت زیادہ تیزی سے ترقی کی۔ وہ کمپنی بہت جلد بڑی کمپنی بن گئی' اس ادارے نے ناکام بزنس مینوں اور دیوالیہ کمپنیوں کے سروے بھی کئے' اس سروے میں معلوم ہوا دیوالیہ ہونے والی کمپنیاں ایسے لوگ چلا رہے تھے جو سننے کی بجائے بولنے پر یقین رکھتے تھے' جو یکسوئی سے دوسرے شخص کی بات نہیں سن سکتے تھے' یہ ادارہ امریکہ کی اعلیٰ کاروباری شخصیات' نوجوان بزنس مینوں اور پبلک ڈیلنگ کا کام کرنے والے لوگوں کو سننے کی ٹریننگ بھی دیتا ہے' یہ انہیں بتاتا ہے اگر وہ اپنے وقت کا زیادہ حصہ مخاطب کی بات سننے میں صرف کریں گے' اگر ان باتوں کو ذہن نشین کریں گے' اگر ان کا تجزیہ کریں گے اور اس تجزیے کی بنیاد پر اپنی ذمہ داریاں نبھائیں گے تو ان کی کامیابی کا گراف بہت جلد اوپر چلا جائے گا۔

میں نے جب اس ادارے کی تحقیق کے بارے میں پڑھا تو مجھے اپنے ایک دوست یاد آ گئے' ان کا تعلق چنیوٹی فیملی سے تھا اور کراچی میں ان کا بہت بڑا کاروبار تھا' ان کے ایک ملازم کا نام "نورا" تھا' یہ نورا چالیس برس تک ان کے ساتھ رہا' شیخ صاحب دنیا کے جس کونے میں جاتے تھے نورا ان کے ساتھ رہتا تھا' وہ کار میں بیٹھیں' جہاز میں ہوں' ملک کے اندر ہوں' باہر ہوں' فیکٹری جا رہے ہوں یا بیڈ روم میں نورا سائے کی طرح ان کے ساتھ رہتا تھا' شیخ صاحب کے بیڈ روم کے ساتھ نورے کا ایک چھوٹا سا بیڈ روم تھا' میں نے ایسی انوکھی وابستگی دنیا میں کسی جگہ نہیں دیکھی تھی لہٰذا میں نے ایک بار شیخ صاحب سے اس "نورے سینڈ روم" کے بارے میں پوچھ لیا' شیخ صاحب نے اس کی ایک حیران کن وجہ بتائی' انہوں نے بتایا نورا میرے ہونٹوں کی حرکت سے اندازہ لگا لیتا ہے' میں کیا کہہ رہا ہوں

اور میں کیا چاہتا ہوں میں اسے آج کہوں تم نے ٹھیک دس سال بعد مجھے یہ بات یاد کرانی ہے تو یہ ٹھیک دس برس بعد میرے کان پر جھکے گا اور آہستہ آواز میں کہے گا "بھاجی آپ نے فلاں وقت یہ کہا تھا" مجھے اس کی اس عادت' اس صلاحیت سے پیار ہے' میں اگر بات بھول جاؤں تو میں فوراً نورے سے پوچھتا ہوں "نورے تم بتاؤ میں نے فلاں جگہ یہ بات کہی تھی" نورا فوراً لفظ بہ لفظ وہ بات دہرا دیتا ہے' میں شیخ صاحب کا جواب سن کر حیران رہ گیا' مجھے اس کردار سے معلوم ہوا سننا اور سنے ہوئے کو یاد رکھنا کتنا بڑا فن ہے۔

میں واپس بل میریٹ کی طرف آتا ہوں' اس نے کہا تھا' "اگر لوگ اپنی زبان کی بجائے کانوں پر انحصار کریں تو دس ہزار گنا زیادہ کامیابی حاصل کریں میرے والد نے کہا تھا اللہ نے انسان کو زبان ایک جبکہ کان دو دیئے ہیں۔ لہٰذا انسان کو چاہیے وہ جتنا کام زبان سے لیتا ہے اس سے دوگنا کام کانوں سے لے"

سیلف ریٹائرمنٹ

ہم مارگلہ کی پہاڑی کے دامن میں پہنچے تو شیخ صاحب ٹھٹک کر رک گئے۔ یہ ایک خوبصورت دن تھا' اسلام آباد سنہری دھوپ میں نہایا ہوا تھا' ہم دونوں واک کیلئے پہاڑ پر گئے تھے' شیخ صاحب ایک بنچ پر بیٹھ کر ہانپنے لگے' میں نے ان سے اوپر جانے کیلئے کہا تو وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولے "میں ایک بوڑھا شخص ہوں' تم چلے جاؤ' میں یہاں رک کر تمہارا انتظار کرتا ہوں' میں نے اصرار کرنے کا سوچا لیکن پھر ان کی حالت دیکھ کر چپ ہو گیا ان کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی' میں انہیں وہیں چھوڑ کر ٹریک کی طرف چل پڑا۔

شیخ صاحب میرے بزرگ دوست ہیں ان کی عمر بمشکل ساٹھ برس ہے لیکن اگر ان کا حلیہ' ان کی سوچ اور سستی دیکھی جائے تو وہ اپنی عمر سے کہیں بوڑھے نظر آتے ہیں۔ وہ بات بے بات بڑھاپے کا ذکر کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس بڑھاپے کا پورا پورا کریڈٹ حاصل کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں مثلاً وہ بس میں چڑھیں گے تو ساتھ ہی کسی نوجوان سے کہیں گے "چل کاکا اٹھ بوڑھے کو جگہ دو" اور نوجوان کو اٹھا کر اس کی جگہ پر قابض ہو جائیں گے۔ بل جمع کرانے جائیں گے تو قطار میں سب سے آگے موجود شخص کے ساتھ کھڑے ہو جائیں گے اور اس سے کہیں گے "چل بھئی باؤ بوڑھے کو بھی بل جمع کرانے دو" اور جہاں بھی ذرا سی تختی' ذرا سی مشقت کا مرحلہ آئے گا تو وہ اپنے بڑھاپے کا اعلان کر کے ایک سائیڈ پر کھڑے ہو جائیں گے' میں ان کے اس رویے کا ہمیشہ شاکی رہا ہوں' میں ان سے اکثر کہتا ہوں "شیخ صاحب آپ کہاں سے بوڑھے ہیں آپ کی عمر میں تو یورپ میں لوگ اخلاقی جرائم میں پکڑے جاتے ہیں" لیکن وہ اپنی گردن کی لٹکی ہوئی جلد اور پھولے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر ہانپنا شروع کر دیتے ہیں۔ میں ان سے اکثر لڑنے کا پروگرام بناتا ہوں لیکن پھر یہ سوچ کر رہ جاتا ہوں کہ شیخ صاحب پاکستان میں اکیلے نہیں ہیں' یہ ایک سوچ ہے جو پاکستان کی ایک سرحد سے دوسری سرحد تک پھیلی ہوئی ہے۔ پاکستان کا ہر وہ شخص جس کی عمر چالیس سال کی لکیر کو چھو جاتی ہے وہ بڑھاپے کا اعلان کرتا ہے اور زندگی کے دائرے سے نکل کر ایک طرف کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ ان تمام چیزوں کو اپنے اوپر حرام قرار دے دیتا ہے جسے مذہب' معاشرہ

اور اخلاقیات موت تک حلال کہتی ہیں۔ آپ پاکستان کے کسی شہر قصبے یا گاؤں کی کسی گلی بازار یا محلے میں کھڑے ہو جائیں آپ کو وہاں ایسے ہزاروں لاکھوں بزرگ ملیں گے جو سارا سارا دن مکھیاں مارتے ہیں اور جن کی زندگی کا صرف ایک مشغلہ ہوتا ہے الف سے لے کر ی تک اخبار پڑھنا' اپنے سنہری دنوں کو یاد کرنا' موجودہ زمانے کو گالیاں دینا' پورے محلے کی غیبت کرنا اور اپنے بچوں اور بہوؤں کو برا بھلا کہنا' اس وقت پاکستان میں ایسے لوگوں کی تعداد کروڑ سے کم نہیں ہوگی' یہ لوگ مکمل طور پر بے کار ہیں اور یہ ایک ''سیلف ریٹائرمنٹ'' کے شکار ہیں جبکہ ہم جب یورپ اور امریکہ کا دورہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے وہاں لوگوں کی اصل زندگی شروع ہی ساٹھ برس سے ہوتی ہے۔

امریکہ میں پچھلے دنوں انکشاف ہوا بوڑھے لوگ جوانوں سے بہتر پرفارمنس دیتے ہیں' یہ انکشاف برگر بنانے والی دنیا کی سب سے بڑی کمپنی میکڈونلڈ نے کیا تھا۔ جم کانٹالو یو اس کمپنی کا چیف ایگزیکٹو تھا' اس کی عمر 60 برس تھی' پچھلے برس اپریل 2004ء میں اسے ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ فوت ہوگیا' اس کے انتقال کے بعد کمپنی نے سوچا ہمیں کسی جوان اور صحت مند شخص کو چیف ایگزیکٹو بنانا چاہئے' بورڈ آف ڈائریکٹرز نے بے شمار لوگوں کے انٹرویوز کئے' ان میں سے چارلس بیل کو منتخب کر لیا گیا' چارلس بیل 44 برس کا ایک صحت مند اور چست شخص تھا' اس نے کمپنی جوائن کر لی لیکن اسے ابھی دفتر میں بیٹھے ایک ہی ماہ گزرا تھا کہ اسے کینسر ہوگیا اور وہ 2004ء کے آخر میں انتقال کر گیا۔ کمپنی کیلئے چارلس بیل کی موت ایک پریشان کن صورت حال تھی' انہوں نے ماہرین سے رابطہ کیا' ماہرین نے امریکی میڈیا کو لکھا جس کے بعد امریکہ میں یہ دلچسپ بحث چھڑ گئی کہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی کا چیف ایگزیکٹو کس عمر کا شخص ہونا چاہئے' اعداد و شمار جمع کئے گئے' معلوم ہوا امریکہ کی ایک ہزار بڑی کمپنیوں میں سے 627 کمپنیوں کے چیف ایگزیکٹو 70 برس اور 70 برس سے زیادہ عمر کے لوگ ہیں۔ ان اعداد و شمار کے تجزیے کے بعد معلوم ہوا بزرگ چیف ایگزیکٹو کی مالک کمپنیاں جوان منتظمین والی کمپنیوں کے مقابلے میں زیادہ بزنس کر رہی ہیں۔ اس نئی سٹڈی کے بعد اس کمپنی نے 60 سال کے ایک بزرگ جیمز سکنر کو چیف ایگزیکٹو بنا دیا' تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق یہ میکڈونلڈ اب چارلس بیل کے دور سے کہیں بہتر بزنس کر رہی ہے۔

یہ تو تھی بزنس کی صورتحال اب آتے ہیں کھیلوں کی طرف' ہاروے مکئے (HARVEY MACKAY) امریکہ کے ایک معروف کالم نگار ہیں۔ ان کا کالم بیک وقت 52 امریکی اخبارات میں شائع ہوتا ہے' وہ ''مکئے انوالوپ کارپوریشن'' کے چیف ایگزیکٹو بھی ہیں' وہ کھیلوں کے شائق ہیں' وہ اب تک پانچ اولمپکس دیکھ چکے ہیں' پچھلے سال جب یونان میں اولمپکس ہوئیں تو وہ ایتھنز گئے وہاں انہوں نے ایک عجیب بات نوٹ کی' انہوں نے محسوس کیا 2004ء کی اولمپکس میں گولڈ میڈل حاصل کرنے والے کھلاڑی 2000ء میں طلائی تمغے جیتنے والے کھلاڑیوں سے ''بوڑھے'' تھے' انہوں نے اسی وقت انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی سے رابطہ کیا اور ان سے 2000ء اور 2004ء کے اولمپکس کے پروفائل حاصل کر لئے' پروفائل کے مطالعے سے معلوم ہوا 2004ء میں بیس بال کے مقابلوں میں کامیاب ہونے والے کھلاڑی 2000ء میں گولڈ میڈل حاصل کرنے والوں سے

ڈیڑھ سے دو سال بڑے تھے' کشتی رانی اور فٹ بال کے کھلاڑی پچھلے کھلاڑیوں کی نسبت عمر میں 3 سال بڑے تھے اور گھڑ سواری کے کھلاڑیوں کی عمروں میں 9 سال کا فرق تھا' ان اعداد و شمار نے کھیل کے دس ہزار سالہ تصورات تبدیل کر دیے۔ آج تک دنیا یہ سمجھتی آئی تھی جوں جوں انسان کی عمر بڑھتی ہے اس کے کھیلنے اور کودنے کی صلاحیتیں کم ہو جاتی ہیں لیکن کلنے کی سٹڈی نے دنیا کو حیران کر دیا' اس نے ثابت کر دیا کھیل اور کامیابی کا عمر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا' ایک بوڑھا شخص چاہے تو وہ کھیل بھی سکتا ہے اور ایوارڈ بھی حاصل کر سکتا ہے۔ کلنے کے اس انکشاف کے بعد سپورٹس کی درجنوں امریکی تنظیموں نے سٹڈی کی اور انہوں نے تسلیم کیا جو کھلاڑی مسلسل پریکٹس کرتے رہتے ہیں اور جو اپنے آپ کو توانا اور جوان سمجھتے ہیں' وہ 60 برس تک نئے اور جوان کھلاڑیوں سے اچھی پرفارمنس دیتے ہیں اور وہ زیادہ اچھے اور شاندار کھلاڑی ثابت ہوتے ہیں چنانچہ میکڈونلڈ اور ہاروے کلنے کے انکشافات نے بڑھاپے کے سارے تصورات تبدیل کر دیئے' نئی تھیوری ثابت کرتی ہے عمر آپ کو کمزور' لاچار اور کاہل نہیں بناتی بلکہ وہ آپ کی صلاحیتوں' سیکھنے اور تجربے میں اضافہ کرتی ہے اور یہ ہم لوگ ہیں جو اپنے آپ کو کاہل' لاچار' کمزور اور بوڑھا بنانے کا تمام تر کارنامہ سرانجام دیتے ہیں' ہم خود ہی اپنے آپ کو زندگی کے دائرے سے باہر نکال لیتے ہیں' ہاروے کلنے کی سٹڈی سے معلوم ہوا قدرت ہمیں ریٹائر نہیں کرتی' یہ ہم لوگ ہیں جو قدرت کی منشا اور رضا مندی کے خلاف خود ہی ریٹائرمنٹ لے لیتے ہیں' ہم قدرت سے "گولڈن شیک ہینڈ" کر لیتے ہیں اور ہم اللہ تعالیٰ کے بخشے باقی بیس تیس برس خود ترسی اور خود رحمی میں گزار دیتے ہیں اور ہم گلیوں میں کھڑے ہو کر موت کا انتظار کرتے ہیں' ہم ملک الموت کو بلاتے رہتے ہیں' ہم بہت ناشکرے اور تھوڑ دلے ہیں۔

ہم نے اور ہمارے بزرگوں نے کبھی اس موضوع پر سوچا۔
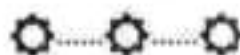
استقامت کے دس دن

میرے ایک دوست سرکاری ملازم ہیں' وہ اسلام آباد کے ایک درمیانے درجے کے سیکٹر میں رہتے ہیں' ان کی گلی خراب تھی' وہ ایک دن میرے پاس تشریف لائے اور فرمانے لگے''اگر تم ہماری گلی پر کالم لکھ دو تو یہ ٹھیک ہو سکتی ہے'' میں نے ان سے پوچھا ''کالم سے گلی کیسے ٹھیک ہو سکتی ہے؟'' انہوں نے فرمایا ''تم کالم لکھو گے' یہ کالم کسی صاحب اقتدار کی نظر سے گزرے گا' وہ چیئرمین سی ڈی اے کو حکم دے گا اور ایک ہی دن میں ہماری گلی مرمت ہو جائے گی'' میں نے قہقہہ لگایا اور ان سے پوچھا ''اگر یہ کالم کسی صاحب اقتدار کی نظر سے نہ گزرا تو؟'' انہوں نے غیر یقینی نظروں سے میری طرف دیکھا اور سنجیدگی سے بولے ''یہ کیسے ممکن ہے' تم لوگوں کے کالم نیچے سے لے کر اوپر تک پڑھے جاتے ہیں اور حکمران ان پر عملدرآمد بھی کرتے ہیں'' میں نے مسکرا کر جواب دیا ''سردار صاحب جو لوگ قرآن مجید پر عمل نہیں کرتے وہ کالم پر کیا خاک توجہ دیں گے'' وہ خاموش رہے' میں نے عرض کیا ''میں آپ کو گلی ٹھیک کرانے کا ایک تیر بہدف نسخہ بتاتا ہوں' اس نسخے کے ذریعے دنیا کا بڑے سے بڑا مسئلہ حل ہو سکتا ہے'' وہ غور سے میری طرف دیکھنے لگے' میں نے عرض کیا ''آپ دفتر کیلئے گھر سے کب نکلتے ہیں'' وہ بولے ''ساڑھے آٹھ بجے'' میں نے عرض کیا ''آپ کل آٹھ بجے نکلیں' راستے میں سی ڈی اے کے دفتر رکیں' متعلقہ ڈپٹی ڈائریکٹر اور ڈائریکٹر کو تلاش کریں' ان کے دفتر میں جائیں اور نہایت شائستگی سے ان سے عرض کریں' جناب میں فلاں سیکٹر کا رہنے والا ہوں' ہماری گلی اتنے عرصے سے خراب ہے آپ مہربانی فرما کر گلی ٹھیک کرا دیں' ان سے اتنا عرض کریں اور اٹھ کر آ جائیں'' وہ میری طرف حیرت سے دیکھ کر بولے ''کیا وہ لوگ گلی ٹھیک کرا دیں گے'' میں نے فوراً نفی میں سر ہلایا ''وہ نہیں کرائیں گے' آپ دوسرے دن دوبارہ ان کے دفتر جائیں' ان سے ملیں اور اسی شائستگی کے ساتھ اپنی عرض دہرا دیں اور اپنے دفتر چلیں جائیں' تیسرے دن ایک بار پھر جائیں' عرض کریں اور دفتر چلے جائیں اور اس کے بعد اسے اپنا معمول بنا لیں' روز دس منٹ کیلئے سی ڈی اے کے دفتر رکیں' ان لوگوں سے عرض کریں' سلام کریں اور واپس آ جائیں' مجھے یقین ہے دس پندرہ دن بعد وہ لوگ آپ کی بات پر سنجیدہ ہو جائیں گے اور آپ کی گلی پر کام شروع ہو جائے گا'' وہ مسکرائے اور شرارتی لہجے میں بولے ''اگر اس کے باوجود کام نہ ہوا تو؟'' میں نے قہقہہ لگایا ''پھر آپ اپنے ساتھ دو ہمسایوں کو شامل کر لیجئے گا' آپ آٹھ بجے سی ڈی اے جائیں' آپ کے بعد

دوسرا ہمسایہ چلا جائے' وہ مسکرا کر سلام کرے اور آپ جیسی شائستگی کے ساتھ مطالبہ دوہرا دے' وہ رخصت ہو تو تیسرا ہمسایہ ڈائریکٹر کے دفتر میں داخل ہو جائے اور نہایت عاجزی کے ساتھ اپنی گلی کا مسئلہ بیان کر دے' میں دعوے سے کہتا ہوں یہ نسخہ ضرور کامیاب ہو گا'' میرے دوست نے قہقہہ لگایا اور رخصت ہو گیا۔

میرے وہ دوست دس دن بعد تشریف لائے تو ان کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا' وہ میرے گلے لگے اور ہنس کر بولے'' آج ہماری گلی کی تعمیر شروع ہو گئی ہے'' میں نے قہقہہ لگایا اور ان سے عرض کیا'' یہ انسانی نفسیات ہے' دنیا کا کوئی شخص کسی کی بیس دن سے زیادہ درخواست رد نہیں کر سکتا لیکن اس کے لئے ضروری ہے درخواست کرتے ہوئے آپ کا لہجہ نہایت شائستہ اور عاجز ہو' اس عمل کے دوران صاحب اختیار شخص تیسرے یا چوتھے دن چڑ جاتا ہے' وہ آپ کو لعن طعن کرتا ہے' وہ آپ کو جھاڑ پلاتا ہے اور وہ بعض اوقات آپ کو گالی بھی دے دیتا ہے لیکن آپ نے اس کے رد عمل میں چڑنا نہیں' آپ نے گالی کا جواب گالی اور نفرت کا جواب نفرت سے نہیں دینا' آپ نے اپنے مطالبے کو اپنا حق ثابت کرنے کی کوشش بھی نہیں کرنی' آپ نے اس کی جھاڑ کے جواب میں بس اتنا عرض کرنا' جناب آپ کی بہت مہربانی ہو گی آپ بس ایک بار جا کر ہماری گلی دیکھ لیں' ہم آٹھ دس ہزار لوگ آپ کے ممنون ہوں گے اور دوسرے دن دوبارہ اسی شائستگی اور محبت کے ساتھ اس کے دفتر چلے جائیں' میرا دعویٰ ہے پتھر سے پتھر اور جاہل سے جاہل ترین شخص بھی دس سے پندرہ دن میں پگھل جائے گا اور آپ کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو جائے گا' اگر اس سارے عمل کے دوران کسی دن آپ ٹمپرامنٹ لوز کر گئے' آپ نے اس افسر پر چڑھائی کر دی' آپ نے اسے ڈانٹ پلا دی یا آپ نے گلی کو اپنا قانونی اور شہری حق ثابت کرنے کی کوشش کی تو آپ یہ جنگ ہار جائیں گے' وہ افسر آپ کو بدتمیز' بے وقوف اور مغرور کہے گا اور سینہ ٹھونک کر آپ کے سامنے کھڑا ہو جائے گا یوں یہ ایک جائز مسئلہ دو اشخاص کی انا کی جنگ بن جائے گا''

میرے دوست نے قہقہہ لگایا اور ہنس کر بولا'' تم نے یہ فارمولا کہاں سے سیکھا'' میں نے بھی قہقہہ لگایا'' میں نے یہ فارمولا انشورنس ایجنٹوں اور تبلیغی جماعت سے سیکھا' یہ دونوں'' شعبے'' اس فارمولے پر عمل کرتے ہیں' انشورنس ایجنٹ ایک بار آپ کے پاس آتا ہے' آپ معذرت کر لیتے ہیں لیکن وہ اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجا کر دوسرے دن پھر حاضر ہو جاتا ہے' آپ انکار کرتے ہیں لیکن وہ اپنا بروشر میز پر رکھ جاتا ہے' تیسرے اور چوتھے دن اس کا ٹیلی فون آ جاتا ہے اور اس کے بعد اس وقت تک اس کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا ہے جب تک آپ اس کے سامنے'' سرینڈر'' نہیں کرتے۔ تبلیغی جماعت کے لوگ بھی اسی سپرٹ سے کام کرتے ہیں' یہ السلام علیکم کہتے ہیں اور آپ کو نماز کی دعوت دیتے ہیں' آپ نفرت سے دروازہ بند کر دیتے ہیں لیکن یہ اگلے روز آپ کو دوبارہ '' گھیر'' لیتے ہیں' آپ ان سے بھاگتے ہیں لیکن یہ لوگ کبھی آپ کی دکان پر پہنچ جاتے ہیں اور کبھی آپ کے گھر اور آپ کے کھیل کے میدان میں' آپ ان سے معذرت کرتے ہیں' آپ ان کے ساتھ بدتمیزی کرتے ہیں' انہیں جھاڑ پلاتے ہیں اور بعض اوقات ان کے ساتھ دست و گریبان تک ہو جاتے ہیں لیکن ان لوگوں کے ماتھے پر شکن نہیں آتی' یہ اسی شائستگی اور محبت سے آپ کے ساتھ مخاطب ہوتے ہیں آپ کو دعوت دیتے رہتے ہیں یہاں تک

کہ ایک دن آپ بھی اپنا بستر باندھتے ہیں، اپنا لوٹا اٹھاتے ہیں اور ان کے ساتھ تبلیغ کیلئے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس صرف چار ہتھیار ہوتے ہیں، نیک مقصد، مقصد کے ساتھ اخلاص، شائستگی اور تسلسل لہذا میں نے یہ فارمولا ان لوگوں سے سیکھا' اگر آپ ان کے فارمولے کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں شامل کرلیں تو آپ اپنی گلی سے لے کر عدالت تک اپنے سارے مسئلے حل کرسکتے ہیں، آپ اپنے سارے نظام ٹھیک کرسکتے ہیں۔ مثلاً آپ کے تھانے کا ایس ایچ او رشوت لیتا ہے تو آپ دفتر جانے سے پہلے روز اس کے دفتر رکیں اور نہایت شائستگی سے عرض کریں "سر لوگ آپ کے بارے میں بڑے پریشان ہیں، مہربانی فرما کر اپنے پبلک امیج پر توجہ دیں" اور وہاں سے آجائیں، دوسرے دن، تیسرے دن، مجھے یقین ہے وہ جب چوتھے دن رشوت لینے لگے گا تو اس کا ہاتھ کانپے گا، وہ گھبرا کر دائیں بائیں ضرور دیکھے گا، اسی طرح اگر آپ کسی جج سے مطمئن نہیں ہیں تو آپ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے دفتر جائیں، چیف جسٹس سے ملاقات کی درخواست کریں۔ شروع شروع میں پی اے انکار کرے گا، آپ اصرار کیے بغیر واپس آجائیں، دوسرے دن دوبارہ چلے جائیں، اس کے بعد تیسرے دن' چوتھے دن اور پانچویں دن بالآخر کسی دن آپ کی ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ آپ ان سے اپنا مسئلہ بیان کردیں' وہ ہمدردانہ غور کا وعدہ کریں گے، آپ شکریہ ادا کر کے واپس آجائیں۔ اس کے بعد آپ اگلے دن دوبارہ جائیں اور پی اے سے درخواست کریں وہ چیف صاحب کو آپ کا کام یاد کرادے، آپ اتنا کہہ کر واپس آجائیں، اگلے دن، اس سے اگلے دن اور اس سے اگلے دن' آپ پی اے کے پاس جاتے رہیں اور انہیں یاد کراتے رہیں، اس دوران اگر آپ چند مزید لوگوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کرلیں تو پی اے اور چیف جسٹس کیلئے یہ نفسیاتی دباؤ برداشت کرنا ممکن نہیں رہے گا یوں آپ کا کام ہو جائے گا"۔ میرے دوست نے مسکرا کر کہا "لیکن یہ کھیل خطرناک بھی ہوسکتا ہے" میں نے قہقہہ لگایا "نیکی کا ہر کھیل خطرناک ہوتا ہے، اگر تبدیلی آسان ہوتی تو دنیا کا کوئی نبی ہجرت کرتا اور نہ ہی عسرت کی زندگی گزارتا، دنیا میں نیکی اور تبدیلی تسلسل بھی مانگتی ہے اور شائستگی بھی، یہ نبیوں کا کام ہے لہذا اس کے لیے نبیوں جیسی استقامت، اولیاء کرام جیسی نیک نیتی اور قطبوں جیسی شائستگی درکار ہوتی ہے اور یقین کیجئے اگر آپ ایک بار اس راستے پر چل پڑے تو کامیابی ضرور آپ کا مقدر بنتی ہے۔ یہ اللہ کا انسان سے وعدہ ہے اگر وہ نیک نیتی سے کسی بھلائی کے کام میں شامل ہو اور اس میں استقامت کا مظاہرہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے لہذا جس طرح آپ نے دس دن میں اپنی گلی بنوائی بالکل اسی طرح آپ جیسے چند سو لوگ دس دس پندرہ پندرہ دن میں اس ملک کے سارے مسائل حل کرسکتے ہیں' بس اس کے لئے استقامت کے دس دن چاہئیں۔"

قربانی فنڈ

یہ تیسرا ہاسٹل اور چوتھی بچی تھی' میں حاجی صاحب کے ساتھ چل چل کر تھک گیا لیکن حاجی صاحب کا دم پھولا تھا اور نہ ہی ان کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار تھے' وہ مسلسل چل رہے تھے' ہم ہاسٹل میں داخل ہو گئے' عید کی چھٹیوں کے بعد ہاسٹل آہستہ آہستہ آباد ہو رہا تھا' بچیاں بکسوں' اٹیچی کیسوں اور بیگوں کے ساتھ ٹیکسیوں سے اتر رہی تھیں' ہاسٹل کے ویٹنگ روم میں مختلف بچیوں کے والدین بیٹھے تھے' ہم دونوں بھی ایک کونے میں سکڑ کر بیٹھ گئے' حاجی صاحب نے ہاسٹل کی مائی کو چٹ پر بچی کا نام لکھ کر دیا اور ہم انتظار کرنے لگے' تھوڑی دیر بعد ایک دھان پان سی بچی آئی' اس نے ہمیں سلام کیا' حاجی صاحب نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا' فائل سے ''وو چر'' نکالا' بچی کو پکڑایا' سلام کیا اور ہم باہر آ گئے' ہم اب ہولی فیملی ہسپتال کی طرف چل پڑے' حاجی صاحب راستے میں ایک میڈیکل سٹور پر رکے' سٹور کا مالک حاجی صاحب کو دیکھ کر کاؤنٹر سے باہر آیا اور عقیدت سے ان کے ہاتھ چومنے لگا' حاجی صاحب اسے کونے میں لے گئے' وہ دونوں چند لمحوں تک سرگوشیاں کرتے رہے' اس کے بعد حاجی صاحب نے جیب سے نوٹوں کا بنڈل نکالا اور سٹور کے مالک کے حوالے کر دیا' مالک نے ایک بار پھر حاجی صاحب کے ہاتھ پر بوسا دیا اور ہم باہر آ گئے۔

میں بری طرح تھک چکا تھا' مجھے اب ''بریک'' چاہیے تھی' میں نے حاجی صاحب سے چائے کی فرمائش کر دی' حاجی صاحب مجھے ہسپتال کی کینٹین پر لے گئے' ہم دونوں دھوپ میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے' میں نے حاجی صاحب سے اس سارے گورکھ دھندے کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا' حاجی صاحب مسکرائے اور شرمیلے شرمیلے لہجے میں بولے ''میں قربانی فنڈ تقسیم کر رہا ہوں'' میں نے حیرت سے پوچھا ''یہ قربانی فنڈ کس بلا کا نام ہے'' حاجی صاحب مسکرائے ''میں نے تین سال پہلے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر سوچا تھا' ہم لوگ ہر سال عیدالاضحیٰ پر پانچ جانوروں کی قربانی دیتے ہیں' ہم بکرے' بیل اور اونٹ ذبح کرتے ہیں' ان کا گوشت کھاتے ہیں اور لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں' ہماری اس قربانی سے معاشرے کو کیا فائدہ ہوتا ہے؟ پتہ چلا یہ قربانیاں خالصتاً ہماری ذات تک محدود ہیں' ہم میں سے بے شمار لوگ قربانی کو عبادت کی بجائے اپنی امارت کا اظہار سمجھتے ہیں' ہم بڑے فخر سے لوگوں کو بتاتے ہیں' ہم نے قربانی کے لئے اتنے لاکھ کا اونٹ خریدا' ہم پانچ پانچ لاکھ روپے کا بیل خریدتے

ہیں اور اخبارات میں اس کی تصویریں چھپواتے ہیں اور ہم منڈی کا سب سے مہنگا اور اچھا بکرا خرید کر گلی میں باندھ دیتے ہیں' ہمیں اس غور و خوض کے دوران محسوس ہوا ہمارے معاشرے میں قربانی قربانی نہیں رہی وہ نمائش بن گئی ہے اور یہ اسلام کی روح کے منافی ہے' ہم نے یہ بھی محسوس کیا ہمارا معاشرہ غربت' بے بسی اور بیماری کی اس سطح تک پہنچ چکا ہے جہاں پانچ پانچ جانوروں کی قربانی عبادت کی بجائے ظلم اور زیادتی محسوس ہوتی ہیں' تم خود سوچو' ہمارے ہمسائے میں مریض دوا کی ایک گولی کو ترس رہا ہے' ایم اے کے طالب علم کے پاس فیس کے لئے پیسے نہیں ہیں' لوگوں کے گھروں میں چار چار بچیاں ہاتھ پیلے ہونے کا انتظار کر رہی ہیں' لوگوں کے دلوں کو روگ لگے ہوئے ہیں' لوگوں کے گردے فیل ہو رہے ہیں اور ہزاروں لاکھوں بچے خون کی ناقابل علاج بیماریوں کا شکار ہیں اور ہم پانچ پانچ لاکھ روپے کا بیل خرید رہے ہیں اور عید کے دن اس کی قربانی کا جشن منا رہے ہیں' کیا یہ بات اسلامی اور اخلاقی نقطہ نظر سے درست ہوگی'' وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگے' میں نے نرم آواز میں جواب دیا ''قربانی مسلمان پر واجب ہے'' حاجی صاحب نے قہقہہ لگایا اور ہنس کر بولے ''میں واجبیت سے انکار نہیں کر رہا لیکن اسلام نے قربانی دینے کا حکم دیا ہے' اس نے پانچ لاکھ کا بیل ذبح کرنے یا جانور کی نمائش کا حکم نہیں دیا' تم دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دو جن معاشروں میں مائیں اپنی بیٹیوں کو غربت کے ہاتھوں بیچ دیں اور لوگ دل کے علاج کے لئے گردہ فروخت کر دیں کیا ان معاشروں میں قربانی کو نمائش کی شکل دے دینا زیادتی نہیں'' وہ ایک لمحے کے لئے رکے اور ذرا سا ٹھہر کر بولے ''تم بتاؤ اگر تمہارے سامنے کوئی شخص جل کر مر رہا ہو اور تم نماز کی نیت کر کے کھڑے ہو جاؤ تو اسلام میں تمہاری اس نماز کی کیا حیثیت ہوگی'' میں خاموش رہا' حاجی صاحب جوش میں بولے ''دین کے ہر فرض کی قضا موجود ہے لیکن دنیا کے کسی فرض اور کسی ذمہ داری کی کوئی قضا ہے اور نہ ہی معافی' اگر ہماری ذرا سی غفلت' ذرا سی کوتاہی اور ذرا سی بے حسی سے فرات کے کنارے کوئی کتا بھوکا مر جائے تو حضرت عمر فاروقؓ جیسے جلیل القدر خلیفہ تک خود کو اس کا ذمہ دار سمجھتے ہیں' وہ تک اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جوابدہ ہوں گے''

حاجی صاحب ٹریک سے ہٹنے لگے لہٰذا میں انہیں فوراً واپس قربانی فنڈ کی طرف لے آیا' وہ چونکے اور دوبارہ بولے ''ہم دوستوں نے سوچا' ہماری قربانی قربانی کم اور نمائش زیادہ ہے لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا ہم لوگ آئندہ صرف ایک ایک جانور کی قربانی دیں گے اور یہ جانور بھی تین ہزار سے مہنگا نہیں ہوگا اور ہم لوگ قربانی کے پیسے جمع کریں گے اور یہ رقم ضرورت مند طالب علموں اور مریضوں میں تقسیم کر دیں گے۔ اس سال ہمارے پاس دو لاکھ روپے جمع ہوئے تھے' ہم نے چار طالب علم بچیاں تلاش کیں' ان بچیوں کے والدین انتہائی غریب ہیں لیکن اس کے باوجود یہ بچیاں ایم اے اور ایم ایس سی کر رہی ہیں' میں نے ان بچیوں کی فیس کے دو چیک لیے' بینکوں میں ان کی فیس جمع کرائی اور آج میں انہیں رسیدیں دینے نکلا ہوں' اسی طرح ہم نے اس میڈیکل سٹور کے مالک کے ساتھ ایک ''ارینجمنٹ'' کر رکھا ہے' اس کے ورکرز ہسپتال میں پھرتے رہتے ہیں' انہیں جوں ہی کوئی ضرورت مند مریض ملتا ہے' یہ ہمارے کھاتے سے اس مریض کو مفت ادویات دے دیتا ہے'' حاجی صاحب خاموش ہو

گئے۔ میں نے ان سے پوچھا ''کیا آپ نے اس معاملے میں کسی عالم دین سے فتویٰ لیا تھا'' حاجی صاحب مسکرائے ''عبادت اللہ اور بندے کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے، ہم نے سوچا ہمیں اس ذاتی معاملے میں کسی تیسرے کو شریک نہیں کرنا چاہیے لہٰذا ہم لوگ چپ چاپ یہ کام کر رہے ہیں اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے درخواست کر رہے ہیں یا باری تعالیٰ اگر یہ غلط ہے تو ہمیں معاف فرما دے اور اگر ہم صحیح کر رہے ہیں تو ہماری اس چھوٹی سی قربانی کو قبول فرمائے'' حاجی صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، انہوں نے رومال سے آنکھیں پونچھیں اور نرم آواز میں بولے ''ہم اپنے عمل کی مذہبی اور اسلامی پوزیشن سے ناواقف ہیں لیکن ہم اتنا جانتے ہیں تازہ ترین عیدالاضحیٰ پر پاکستان کے شہریوں نے 70 لاکھ جانوروں کی قربانی دی، لاہور شہر میں 70 ہزار جبکہ راولپنڈی اور فیصل آباد میں پچیس پچیس ہزار بڑے جانور ذبح کیے گئے اور اس سال پاکستان میں ایک لاکھ اونٹ ذبح ہوئے۔ اگر ہم ان جانوروں کی مالیت نکالیں تو یہ 90 ارب روپے بنتے ہیں۔ تم اس رقم کو طبی، تعلیمی اور فلاحی شعبے میں پھیلا کر دیکھو اور فیصلہ کرو، اس رقم سے کتنے لوگوں کی زندگیاں بدل سکتی تھیں۔ کتنے مریضوں کے دکھ، درد اور تکلیفیں ختم ہو سکتی تھیں اور کتنے طالب علم اپنی تعلیم مکمل کر سکتے ہیں۔ پاکستان میں پانچ لاکھ روپے میں ایک ڈاکٹر بنتا ہے اور یہ ڈاکٹر زندگی میں اوسطاً ایک لاکھ لوگوں کا علاج کرتا ہے، فرض کرو اگر ہم یہ رقم ایف ایس سی کے طالب علموں کو دے دیتے تو ملک کو لاکھوں نئے ڈاکٹر مل جاتے اور یہ ڈاکٹر ہر سال کروڑوں مریضوں کو فیض پہنچاتے! اس وقت شوکت خانم، ایدھی فاؤنڈیشن اور سہارا جیسے سینکڑوں ادارے قربانی کی کھالوں پر چل رہے ہیں۔ تم ذرا تصور کرو اگر ان اداروں کو کھالوں کی جگہ جانوروں کی قیمت مل جائے، لوگ انہیں بکروں، گائیوں، بیلوں اور اونٹوں کی قیمت دے دیں تو کتنے مریضوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اسی طرح اگر ہم پاکستان کے سات بڑے شہروں میں انتہائی جدید یونیورسٹیاں بنائیں اور ان شہروں کے لوگ ہر سال ان یونیورسٹیوں میں قربانی کے پیسے جمع کرا دیں تو تم سوچو ملک میں کتنا بڑا انقلاب آ جائے گا، ہم اگر پاکستان کے تمام بڑے چھوٹے شہروں، قصبوں اور دیہات میں ہسپتال اور یہ ڈسپنسریاں بنائیں اور ڈسپنسریاں اور ہسپتال قربانی کے پیسوں سے چلیں تو تم خود سوچو کیا پاکستان میں صحت کا مسئلہ رہے گا؟'' وہ رکے اور دوبارہ بولے ''اگر ہم نے قربانی پر اجتہاد نہ کیا' اگر ہم نے شہر شہر میں قربانی فنڈز قائم نہ کیے تو یقین کرو قدرت اس معاشرے کو قربان گھاٹ تک لے جائے گی اور ہم سب کی گردن پر چھری پھر جائے گی'' وہ اٹھے' انہوں نے آنکھوں پر رومال رکھا اور آہستہ آہستہ لہجے میں بولے ''میں سمجھتا ہوں پاکستان میں تین ہزار روپے سے مہنگے اور دوسرے جانور کی قربانی پر پابندی ہونی چاہیے''

اللہ کے نام پر

ان کی بات حیران کن تھی۔ میں نے انہیں ہمیشہ خیر کے کاموں سے دور دیکھا تھا، ان میں وہ تمام عیب موجود تھے جنہیں شریعت عیب سمجھتی ہے، ان کے محلے کے کسی شخص نے انہیں کبھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا تھا، وہ سال میں پانچ بار تھائی لینڈ جاتے تھے، کرکٹ کے سیزن میں جواء کھیلتے اور کھلاتے تھے اور شراب ان کیلئے پانی کی حیثیت رکھتی تھی، ان کے تمام احباب انہیں "پریکٹیکل" کہتے تھے، وہ زندگی کے تمام معاملات میں عملیت پسند انسان تھے وہ افسروں، سیاستدانوں اور ماتحتوں کے ساتھ براہ راست سودے بازی کرتے تھے اور ان کا کہنا تھا "جب تک کوئی افسر رشوت نہ لے اس وقت تک آپ اس کے وعدے پر یقین نہ کریں" وہ ہمیشہ حکومتی پارٹی میں شامل رہے ہیں، بے نظیر بھٹو کے دور میں وہ پیپلز پارٹی میں تھے، نواز شریف کے دور میں وہ پکے مسلم لیگی تھے، 12 اکتوبر کے بعد وہ فوج کے ڈسپلن اور محب الوطنی کے گن گاتے تھے 2002ء کے بعد وہ ق لیگ کے سرگرم رکن بن گئے اور آج کل وہ ایک بار پھر پیپلز پارٹی کی تعریف کر رہے ہیں، ہم سب دوست انہیں "وقت کی آواز" کہتے ہیں لیکن کل انہوں نے ایک ایسی بات کہی جس نے میرے جسم کی آخری رگیں تک ہلا دیں، وہ گزشتہ روز میرے پاس تشریف لائے اور انہوں نے سرگوشی میں کہا "میرے پاس ایک لاکھ روپے ہیں، اگر تمہاری نظر میں کوئی مستحق فیملی ہو تو میں یہ رقم اسے دینا چاہتا ہوں" میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا، وہ مسکرائے اور سر جھکا کر بولے "میں نے جوانی میں محنت کر کے ایک دکان خریدی تھی، یہ دکان میری حق حلال کی کمائی تھی، میں نے یہ دکان کرائے پر چڑھا رکھی ہے، میں اس کا کرایہ جمع کرتا رہتا ہوں اور رمضان میں یہ رقم ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتا ہوں" میری حیرت میں اضافہ ہو گیا، وہ مزید بولے "میری باقی دولت مشکوک ہے، میں دل سے اسے پاک رزق نہیں سمجھتا لہٰذا میں اسے نیکی کے کاموں میں خرچ کرتے ہوئے ڈرتا ہوں لیکن میری یہ جائیداد سو فیصد حلال اور پاک ہے چنانچہ میں نے اسے اللہ کے بندوں کیلئے وقف کر رکھا ہے، تم مہربانی فرما کر مجھے چند ضرورت مند تلاش کر دو"۔

وہ چلے گئے لیکن اپنے پیچھے سوچ کی ایک لمبی لکیر چھوڑ گئے، میں نے سوچا ہمارے ملک کے لوگوں میں خدا ترسی، انسانیت اور اللہ تعالیٰ کا خوف موجود ہے ہم میں سے ہر شخص اپنی ہمت کے مطابق اللہ کی راہ میں خرچ

کرتا رہتا ہے' یہ اس معاشرے کا ایک دوسرا پہلو ہے' پچھلے دنوں میری ملاقات ڈاکٹر امجد ثاقب سے ہوئی، ڈاکٹر امجد ثاقب آب زم زم کی طرح اُجلے اور آئینے کی طرح شفاف انسان ہیں، وہ سول سروس میں تھے، ڈی ایم جی گروپ میں تھے، جب شہباز شریف پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے تو وہ ان کے سیکرٹری تھے، سول سروس سے وہ پنجاب رورل سپورٹ پروگرام میں گئے اور وہاں انہوں نے ''اخوت'' کے نام سے ایک مجزاتی تنظیم کی بنیاد رکھ دی۔ اس تنظیم کا آغاز ایک دلچسپ واقعہ تھا، ڈاکٹر صاحب کے ایک دوست سلیم رانجھا نے انہیں دس ہزار روپے دیئے، ڈاکٹر صاحب نے یہ دس ہزار روپے لاہور کی ایک خاتون کو بطور قرض دے دیئے، اس قرض سے پاکستان کی پہلی مائیکرو فنانس تحریک کا آغاز ہوا، ڈاکٹر صاحب کی تنظیم لاہور اور اب راولپنڈی میں انتہائی ضرورت مند لوگوں کو بلاسود قرضے دیتی ہے، قرضہ لینے والی خواتین اور حضرات اس رقم سے کاروبار کرتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی قسطوں میں یہ قرضہ واپس کرتے ہیں، اس تنظیم نے لاہور اور راولپنڈی میں کمال کر دیا، اس وقت 12 ہزار سے زائد لوگ اس تنظیم سے مستفید ہو چکے ہیں جبکہ اخوت لوگوں کو 14 کروڑ روپے سے زائد رقم بطور قرض دے چکی ہے، یہ 14 کروڑ روپے اہل ثروت نے اخوت کو دیئے تھے' ڈاکٹر صاحب پاکستان میں ڈاکٹر یونس بن کر ابھر رہے ہیں جبکہ اخوت ''گرامین بینک'' کی طرح معاشرے کی جڑوں تک پہنچ رہی ہے، میں واپس ڈاکٹر امجد ثاقب کی طرف آتا ہوں۔ میری ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے عجیب بات بتائی، انہوں نے بتایا پاکستان کا شمار خیرات کرنے والے پانچ بڑے ممالک میں ہوتا ہے' اس وقت دنیا کے 140 ممالک میں خیرات کا سسٹم موجود ہے جن میں پاکستانی فی کس آمدنی کے لحاظ سے دنیا میں خیرات کرنے والے لوگوں میں پانچویں نمبر پر آتے ہیں، پاکستان میں 1998ء میں 70 ارب روپے خیرات کیے جاتے تھے جبکہ آج 2006ء میں یہ رقم 150 ارب روپے تک پہنچ چکی ہے، ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا لوگوں کا یہ جذبہ حیران کن بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ میں ان کی بات پر بھی حیران ہو گیا۔

ڈاکٹر امجد ثاقب نے مجھے پاکستانی معاشرے کا ایک نیا پہلو دکھایا، ہم روزانہ اس معاشرے کا سیاپا کرتے رہتے ہیں' ہمیں اس ملک اس معاشرے میں ہزار ہزار کیڑے نظر آتے ہیں لیکن ہم نے کبھی اس معاشرے کے ان چیتھڑوں کے پیچھے جھانک کر نہیں دیکھا، ہم نے کبھی اس معاشرہ کا صاف، شفاف اور معطر جسم نہیں دیکھا، یہ ملک تضادات کا عجیب مجموعہ ہے۔ اس ملک میں جہاں کرپشن، لاقانونیت، ہیرا پھیری اور زبردستی ہے، اس ملک میں جہاں فوج سپریم پاور ہے' اس میں جہاں ق لیگ جیسی سیاسی سوچ کی بہتات ہے' اس میں جہاں ''یوٹرن'' سب سے بڑی سفارتکاری ہے اور اس میں جہاں رچرڈ آرمیٹج جیسے لوگ حکومت کر رہے ہیں وہاں اس ملک میں خدا ترسی، رحم، خدمت اور محبت کا ایک نہ نظر آنے والا نظام بھی موجود ہے، اس ملک میں اس وقت 8100 چھوٹے بڑے دربار ہیں اور ان درباروں پر چوبیس گھنٹے لنگر چلتا ہے اور ہزاروں لاکھوں لوگ ان لنگروں سے مفت کھانا کھاتے ہیں، یہ لنگر کیسے چل رہے ہیں، ان کیلئے آٹا، دالیں، چاول، گھی، چینی اور گوشت کہاں سے آتا ہے، آج تک کسی

تو یہ سمجھ نہیں آسکا، ہمارے ملک میں دنیا کی سب سے بڑی "پاورٹی لائن" ہے، پاکستان میں اس وقت سات کروڑ لوگ خطِ غربت سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں، یہ لوگ کیسے زندہ ہیں؟ دنیا کے بڑے بڑے ماہرین آج تک اس کا اندازہ نہیں لگا سکے، یہ سات کروڑ لوگ اہل خیر اور اہل ثروت کی خدا ترسی سے زندہ ہیں، اس ملک میں ایسے لاکھوں ہاتھ ہیں جو رات کے اندھیرے میں آگے بڑھتے ہیں اور لاکھوں ضرورت مندوں کی مدد کر کے واپس چلے جاتے ہیں اور دوسرے ہاتھ تک کو اس کی خبر نہیں ہوتی، اس ملک میں ایسے سینکڑوں ہزاروں ہسپتال، سکول، مدرسے، مساجد اور یتیم خانے ہیں جو صاحبان ثروت کی امداد سے چل رہے ہیں اور اس ملک میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو بھوکا سوتا ہو اور شاید ہی کوئی ایسا مریض ہو جسے دوا نہ ملتی ہو اور اس ملک میں شاید ہی کوئی ایسا ضرورت مند ہو جس تک اللہ تعالیٰ کا غیبی ہاتھ نہ پہنچتا ہو۔

اس ملک میں کوئی ایسا خفیہ نظام موجود ہے جو لوگوں کی امید کا دھاگہ نہیں ٹوٹنے دیتا، جو ان کی زندگی کو گلوکوز دیتا رہتا ہے، ہم لوگ کتنے بدقسمت ہیں ہمیں اس ملک کو توڑنے، لوٹنے اور خراب کرنے والے تو نظر آتے ہیں لیکن اس ملک اور اس ملک کے لوگوں کو سہارا دینے اور خدمت کرنے والے دکھائی نہیں دیتے، ہم چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے لعل نہیں دیکھ سکتے۔ میرے ایک دوست کہا کرتے ہیں "جب تک ہمارے ملک میں داتا صاحب اور حضرت بری امام کے لنگر چل رہے ہیں جب تک ہم لوگ اللہ کے نام پر اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے رہیں گے اس وقت تک یہ یہ ملک قائم رہے گا"۔

عصر کی قسم

میں نے عرض کیا ''خواجہ صاحب سائنس نے کمال کر دیا ہے' قدرتی آفتیں اور بیماریاں انسان کے دو بڑے مسئلے ہیں' سائنس ان دونوں کے حل کے قریب پہنچ چکی ہے' اب وہ وقت دور نہیں جب انسان آفتوں اور عذابوں کے ہاتھ سے نکل آئے گا'' وہ مسکرا کر میری طرف دیکھتے رہے' وہ نرم آواز میں بولے ''مثلاً سائنس نے کیا کر دیا ہے'' میں نے عرض کیا ''سر زلزلے' آتش فشاں' آندھیاں' طوفان اور سیلاب پانچ بڑی آفتیں ہیں' سائنس نے ان آفتوں کی پیش گوئی کا سسٹم بنا لیا ہے' سائنس دانوں نے ایک ایسا کیمرہ بنایا ہے جو آتش فشاں کے چیندے میں چلا جاتا ہے اور وہاں آنے والی تبدیلیاں نوٹ کر لیتا ہے' ماہرین یہ تبدیلیاں دیکھ کر پیشن گوئی کر سکیں گے فلاں آتش فشاں فلاں دن اور فلاں وقت ابل پڑے گا' اس سسٹم کے بعد آتش فشاں کے قریب آباد لوگ وہاں سے بروقت نقل مکانی کر سکیں' یوں بے شمار لوگوں کی جانیں اور املاک بچ جائیں گی'' خواجہ صاحب سکون سے سنتے رہے' میں نے عرض کیا ''زلزلے کے ماہرین نے ایک ایسی سلاخ بنائی ہے جو زمین کی تہہ میں پچاس ساٹھ کلو میٹر نیچے چلی جائے گی' یہ زمین کے اندر موجود پلیٹوں کی حرکت نوٹ کرے گی اب جونہی کسی پلیٹ میں کسی قسم کی حرکت ہو گی ماہرین زلزلے سے کہیں پہلے زلزلے کی شدت' اس کے مرکز اور اس سے متاثر ہونے والے علاقے کا تخمینہ لگا لیں گے جس کے بعد ماہرین اس علاقے کے لوگوں کو بروقت مطلع کر دیں گے لہٰذا وہ لوگ زلزلے سے پہلے گھروں اور دفتروں سے باہر آ جائیں گے' یوں ہزاروں لاکھوں زندگیاں بچ جائیں گی' ماہرین نے عمارتوں کے ایسے ڈھانچے بھی بنا لئے ہیں جو ساڑھے نو درجے کی شدت سے آنے والے زلزلے میں بھی عمارت کو نقصان نہیں پہنچنے دیں گے چنانچہ وہ وقت دور نہیں جب زلزلے آئیں گے لیکن لوگ اطمینان سے اپنے معمول کے کام کرتے رہیں گے'' خواجہ صاحب بڑی توجہ سے میری بات سنتے رہے' میں نے عرض کیا ''بیماریاں انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہیں' سائنس دانوں نے اندازہ لگایا ہے ہمارے جینز میں ساڑھے چار ہزار بیماریاں ہوتی ہیں اور ہر بیماری کا ایک الگ جین ہوتا ہے' سائنس دانوں نے اڑھائی ہزار مہلک بیماریوں کے جینز تلاش کر لئے ہیں لہٰذا اب وہ وقت دور نہیں جب سائنس دان تکلیف شروع ہونے سے پہلے کسی شخص کا معائنہ کریں گے' اس میں پروان چڑھنے والے جینز

بکھیر دیں گے' ان جینز کو صحت مند جینز کے ساتھ بدل دیں گے اور مریض مرض کے حملے سے پہلے ہی صحت مند ہو جائے گا' انسانی کلوننگ کا عمل بھی شروع ہونے والا ہے' اگلے دس بیس برس میں انسان مرنے سے پہلے دوبارہ جنم لینا شروع کر دے گا'' خواجہ صاحب نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا' میں نے عرض کیا'' اس طرح سائنس دانوں نے آندھیوں' طوفانوں اور سیلابوں کی پیدائش کے مراکز بھی تلاش کر لئے ہیں' ماہرین کا کہنا ہے اگر ان آفتوں کے مراکز تباہ کر دیئے جائیں تو یہ آفتیں پیدا نہیں ہونگیں' سائنس دان ایسے آلے بنا رہے ہیں جو ان ہواؤں' ان پانیوں اور ان موجوں کو اکٹھا نہیں ہونے دیں گے جو اکٹھی ہو کر آندھی' سیلاب اور طوفان بنتی ہیں چنانچہ اگلے بارہ برسوں میں انسان ان تینوں آفتوں پر بھی قابو پا لے گا لہٰذا خواجہ صاحب آنے والا وقت انسان کے لئے بڑا آئیڈیل ہوگا' دنیا میں انسان کے لئے کوئی چیلنج نہیں ہوگا' لوگ مطمئن' آرام دہ اور سکھی زندگی گزاریں گے''

خواجہ صاحب نے قہقہہ لگایا اور مجھے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ کر بولے'' تم بڑے بے وقوف ہو' یہ قدرتی آفتیں اتنی بڑی دشمن نہیں ہیں جتنا بڑا انسان' انسان کا دشمن ہے۔ آج تک انسان نے انسان کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اتنا نقصان پچھلے دس ہزار سال میں قدرتی آفتیں مل کر نہیں پہنچا سکیں' تم یہ دیکھ لو 18 اکتوبر کے زلزلے میں جتنے لوگ مارے گئے تھے اس سے پانچ گنا زیادہ لوگ ہماری سڑکوں پر پچھلے ساٹھ برسوں میں حادثوں میں مارے گئے ہیں' ہر سال ہمسایوں کے ہاتھوں جتنے ہمسائے قتل ہوتے ہیں' جتنے بیٹے اپنے باپ قتل کرتے ہیں' آشناؤں کے ہاتھوں جتنے خاوند مارے جاتے ہیں' جتنے خاوند اپنی بیویوں کو قتل کرتے ہیں' ڈاکوؤں کے ہاتھوں جتنے راہگیر مارے جاتے ہیں اور جتنے دوست ہر سال دوستوں کو قتل کرتے ہیں' یہ ساری ہلاکتیں قدرتی آفتوں سے مرنے والوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہیں' بش جیسے لوگ اپنی انا کی تسکین کے لئے جتنے لوگ مار دیتے ہیں' دہشت گردوں کے ہاتھوں جتنے لوگ مارے جاتے ہیں' کشمیر' فلسطین' افغانستان' سری لنکا' عراق اور چیچنیا میں انسانوں کے ہاتھوں جتنے انسان مارے جاتے ہیں' گورے کے ہاتھوں جتنے کالے مارے جاتے ہیں اور سرخ رو انسان جتنے پیلے انسانوں کو قتل کرتے ہیں یہ تعداد قدرتی آفتوں کا لقمہ بننے والے انسانوں سے کہیں زیادہ ہے' ناگاساکی پر بم کس نے پھینکا تھا' ایک انسان نے' اس کا نشانہ کون بنے دوسرے انسان' دوسری اور پہلی جنگ عظیم کس نے شروع کی تھی' ایک انسان نے' اس جنگ کا لقمہ کون بنے' دوسرے انسان' کوریا کی جنگ کس نے چھیڑی تھی' ویتنام پر حملہ کس نے کیا تھا' روس افغانستان جنگ کس نے شروع کی تھی' افغانستان اور عراق پر حملہ کس نے کیا تھا؟ انسان نے' اور ان جنگوں سے کس کو نقصان پہنچا' انسان کو؟ بارہ اکتوبر کا واقعہ کس کا کمال تھا؟ انسان کا اور اس کا نقصان کس کو پہنچا؟ انسان کو؟ اس دنیا میں بھائی کے ہاتھوں بھائی اور دوست کے ہاتھوں دوست مارا جاتا ہے لہٰذا انسان کا سیلابوں' طوفانوں اور بیماریوں سے مقابلہ نہیں' انسان کا انسان سے مقابلہ ہے اور جب تک انسان کی شرست میں تبدیلی نہیں آتی' یہ دنیا دارالامن نہیں بن سکتی' اس زمین پر تخریب کا عمل جاری رہے گا''

میں خواجہ صاحب کی بات غور سے سنتا رہا' انہوں نے فرمایا'' انسان' انسان سے خائف ہے' وہ جب بھی

ذرا سا خوشحال ہوتا ہے' اسے جب بھی ذرا سا اقتدار یا اختیار ملتا ہے' وہ جب بھی ذرا سی کامیابی پاتا ہے تو وہ دوسرے انسان کو تکلیف دینا شروع کر دیتا ہے' وہ آم کھا کر گٹھلیاں ہمسائے کے گھر پھینک دے گا' وہ دو لاکھ کا کتا خریدے گا اور یہ کتا دوسرے کے دروازے پر باندھ دے گا' وہ ایٹم بم بنا کر چاہے گا ساری دنیا اس کے قدموں میں جھک جائے' وہ بادشاہ کا مصاحب بن کر چاہے گا سب لوگ اسے سلام کریں' سب لوگ اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کریں' اب دوسری طرف بھی انسان ہوتا ہے' اس کے اندر بھی وہی خون' وہی انا اور وہی ہٹ دھرمی ہوتی ہے لہٰذا انسان انسان کے ساتھ ٹکرا جاتا ہے اور آخر میں دونوں فنا ہو جاتے ہیں' انسان کی انسان کے ساتھ جنگ میں پورس بھی مارا جاتا ہے اور سکندر بھی' دونوں خسارے میں رہتے ہیں' یہ اس زمین کا قانون ہے لہٰذا انسان جب تک مقدونیہ' سمرقند اور واشنگٹن کے اقتدار تک محدود نہیں رہتا ' وہ جب تک دوسرے انسان پر حکمرانی کی خواہش ختم نہیں کرتا اور وہ جب تک دوسرے لوگوں سے چھیڑ چھاڑ بند نہیں کرتا اس وقت تک انسان کے ہاتھوں انسان مارا جاتا رہے گا' اس وقت تک اس زمین پر امن نہیں ہوگا'' میں خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا' انہوں نے فرمایا'' سائنس دانوں کو قدرتی آفتوں کی بجائے انسانی شرست کا کوئی علاج دریافت کرنا چاہئے' انہیں کوئی ایسی دوا ایجاد کرنی چاہئے جسے کھانے کے بعد صدر بش اور صدام حسین کی انا پر سکون ہو جائے اور دونوں ایک دوسرے سے ٹکرانا بند کر دیں' جسے کھانے سے صدر پرویز مشرف اور نواز شریف کے اختلافات ختم ہو جائیں اور دونوں خود کو کمزور اور چند سانسوں کے مہمان انسان سمجھ لیں' جسے کھانے سے طالبان اور امریکہ ایک دوسرے کو تسلیم کر لیں' جسے کھانے سے ایران اور امریکہ ایک دوسرے کی آزادی اور زندہ رہنے کا حق مان لیں' جسے کھانے سے انسان انسان کو معاف کر دے اور جسے کھانے سے انسان انسان سے ٹکرانا بند کر دے''

میں خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا' انہوں نے فرمایا ''یقین کرو ایک جنگل میں دو شیر سکون اور آرام سے رہ سکتے ہیں لیکن ایک چھت کے نیچے دو انسان لڑے' ٹکرائے اور مرے بغیر زندگی نہیں گزار سکتے' شاید اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا عصر کی قسم انسان خسارے میں ہے''

گھاٹے کے سوداگر

ہنری کا تعلق امریکہ کے شہر سیاٹل سے تھا' وہ مائیکروسافٹ میں ایگزیکٹو منیجر تھا' اس نے 1980ء میں جارج واشنگٹن یونیورسٹی سے کمپیوٹر سائنس میں ماسٹر کیا اور اس کے بعد مختلف کمپنیوں سے ہوتا ہوا مائیکروسافٹ پہنچ گیا' مائیکروسافٹ اس کے کیریئر میں ''ہیلی پیڈ'' ثابت ہوئی اور وہ دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتا گیا' وہ 1995ء میں کمپنی میں بھاری معاوضہ لینے والے لوگوں میں شمار ہوتا تھا اور اس کے بارے میں کہا جاتا تھا جب تک ہنری کسی سافٹ ویئر کو مسکرا کر نہ دیکھ لے مائیکروسافٹ اس وقت تک اسے مارکیٹ نہیں کرتی' ہنری نے کمپنی میں یہ پوزیشن بڑی محنت اور جدوجہد سے حاصل کی تھی' وہ دفتر میں روزانہ 16 گھنٹے کام کرتا تھا' وہ صبح 8 بجے دفتر آتا تھا اور رات بارہ بجے گھر جاتا تھا' ہنری کا ایک ہی بیٹا تھا' ہنری دفتری مصروفیات کے باعث اپنے بیٹے کو زیادہ وقت نہیں دے پاتا تھا' وہ جب صبح اٹھتا تھا تو اس کا بیٹا سکول جا چکا ہوتا تھا اور وہ جب دفتر سے لوٹتا تھا تو بیٹا سو رہا ہوتا تھا' چھٹی کے دن اس کا بیٹا کھیلنے کے لئے نکل جاتا تھا جبکہ ہنری سارا دن سوتا رہتا تھا۔ 1998ء میں سیاٹل کے ایک ٹیلی ویژن چینل نے ہنری کا انٹرویو نشر کیا' اس انٹرویو میں ٹیلی ویژن کے میزبان نے اعلان کیا ''آج ہمارے ساتھ سیاٹل میں سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی شخصیت بیٹھی ہے'' کیمرہ میزبان سے ہنری پر گیا اور ہنری نے فخر سے مسکرا کر دیکھا' اس کے بعد انٹرویو شروع ہو گیا' اس انٹرویو میں ہنری نے انکشاف کیا وہ مائیکروسافٹ سے 500 ڈالر فی گھنٹہ لیتا ہے۔

یہ انٹرویو ہنری کا بیٹا اور بیوی بھی دیکھ رہی تھی' انٹرویو ختم ہوا تو ہنری کا بیٹا اٹھا' اس نے اپنا ''منی باکس'' کھولا' اس میں سے تمام نوٹ اور سکے نکالے اور گننا شروع کر دیئے' یہ ساڑھے چار سو ڈالر تھے' ہنری کے بیٹے نے یہ رقم جیب میں ڈال لی' اس رات جب ہنری گھر واپس آیا تو اس کا بیٹا جاگ رہا تھا' بیٹے نے آگے بڑھ کر باپ کا بیگ اٹھا لیا' ہنری نے جھک کر بیٹے کو پیار کیا' بیٹے نے باپ کو صوفے پر بٹھایا اور بڑی عاجزی کے ساتھ عرض کیا ''ڈیڈی کیا آپ مجھے پچاس ڈالر ادھار دے سکتے ہیں'' باپ مسکرایا اور جیب سے پچاس ڈالر نکال کر بولا ''کیوں نہیں' میں اپنے بیٹے کو اپنی ساری دولت دے سکتا ہوں'' بیٹے نے پچاس ڈالر کا نوٹ پکڑا' جیب سے ریزگاری اور

نوٹ نکالے' پچاس کا نوٹ ان کے اوپر رکھا اور یہ ساری رقم باپ کے ہاتھ پر رکھ دی' ہنری حیرت سے بیٹے کو دیکھنے لگا' بیٹے نے باپ کی آنکھ میں آنکھ ڈالی اور مسکرا کر بولا ''یہ پانچ سو ڈالر ہیں' میں ان پانچ سو ڈالروں سے سیاٹل کے سب سے امیر ورکر سے ایک گھنٹہ خریدنا چاہتا ہوں'' ہنری خاموشی سے بیٹے کی طرف دیکھتا رہا' بیٹا بولا ''میں اپنے باپ سے صرف ایک گھنٹہ چاہتا ہوں' میں اسے جی بھر کر دیکھنا چاہتا ہوں' میں اسے چھونا چاہتا ہوں' میں اسے پیار کرنا چاہتا ہوں' میں اس کی آواز سننا چاہتا ہوں' میں اس کے ساتھ ہنسنا' کھیلنا اور بولنا چاہتا ہوں' ڈیڈی کیا آپ مجھے ایک گھنٹے دے دیں گے' میں آپ کو اس کا پورا معاوضہ دے رہا ہوں'' ہنری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' اس نے بیٹے کو گلے سے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ ہنری نے 1999ء میں ''فیملی لائف'' کے نام سے ایک آرٹیکل لکھا تھا' مجھے یہ مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا' اس مضمون میں اس نے انکشاف کیا دنیا میں سب سے قیمتی چیز خاندان ہوتا ہے' دنیا میں سب سے بڑی خوشی اور سب سے بڑا اطمینان ہماری بیوی اور بچے ہوتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ہم لوگ انہیں سب سے کم وقت دیتے ہیں' ہنری کا کہنا تھا دنیا میں سب سے بڑی بے وفا چیز ہماری نوکری' ہمارا پیشہ اور ہمارا کاروبار ہوتا ہے' ہم آج بیمار ہو جائیں یا آج ہمارا ایکسیڈنٹ ہو جائے تو ہمارا ادارہ شام سے پہلے ہماری کرسی کسی دوسرے شخص کے حوالے کر دے گا' ہم آج اپنی دکان بند کر دیں تو کل ہمارے گاہک کسی دوسرے سٹور سے خریداری کر لیں گے اور آج ہمارا انتقال ہو جائے تو کل ہمارا شعبہ' ہمارا پیشہ ہمیں فراموش کر دے گا لیکن بدقسمتی سے ہم لوگ دنیا کی سب سے بڑی بے وفا چیز کو زندگی کا سب سے قیمتی وقت دے دیتے ہیں' ہم اپنی بہترین توانائیاں اس بے وفا دنیا میں صرف کر دیتے ہیں جبکہ وہ لوگ جو ہمارے دکھ درد کے ساتھی ہیں جن سے ہماری خوشیاں اور ہماری مسرتیں وابستہ ہیں اور جو ہمارے ساتھ انتہائی وفادار ہوتے ہیں ہم انہیں فراموش کر دیتے ہیں' ہم انہیں اپنی زندگی کا انتہائی کم وقت دیتے ہیں۔''

ہنری کی کہانی نے مجھے زندگی کا ایک دوسرا پہلو دکھایا' مجھے محسوس ہوا ہماری زندگی میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں' ایک وہ لوگ جن کے لئے ہمارا وجود معمول کی چیز ہوتا ہے' یہ لوگ ہمیں مشین کی طرح سمجھتے ہیں' ان کی نظر میں ہم محض ایک کارکن ہیں اور یہ لوگ ہمیں میز' کرسی' ٹیبل لیمپ' گاڑی' قلم' کاغذ' ٹشو پیپر' کھڑکی اور دروازے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور یہ ہمارے بارے میں کہتے ہیں ''استعمال کرو' پھینکو اور بھول جاؤ'' جبکہ دوسری قسم کے لوگ ہمیں اپنے وجود' اپنی دھڑکنوں اور اپنی سانسوں کا حصہ سمجھتے ہیں' یہ ہمارے لئے تکلیف برداشت کرتے ہیں' یہ ہمارے لئے ظلم سہتے ہیں' یہ راتوں کو جاگ کر ہمارا انتظار کرتے ہیں' یہ ہمارے وعدوں کو آسمانی تحریر سمجھتے ہیں اور ان کی نظر میں ہمارا ایک ایک لفظ مقدس اور پاک ہوتا ہے اور یہ ہمارے اصل ساتھی ہوتے ہیں' میں نے سوچا بدقسمتی سے ہم لوگ پہلی قسم کے لوگوں کو اپنی زندگی کا سب سے قیمتی حصہ دیتے ہیں جبکہ ہم لوگ زندگی بھر دوسری قسم کے لوگوں کو فراموش کر کے پہلی قسم کے لوگوں کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں' ہم بے وفا لوگوں سے وفاداری نبھاتے رہتے ہیں اور وفاداروں سے بے وفائی کرتے ہیں' میں نے کسی جگہ امریکہ کے ایک ریٹائر

سرکاری افسر کے بارے میں ایک واقعہ پڑھا تھا' اس افسر کو وائٹ ہاؤس سے فون آیا کہ فلاں دن صدر آپ سے ملنا چاہتے ہیں' اس افسر نے فوراً معذرت کر لی' فون کرنے والے نے وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا "میں اس دن اپنی پوتی کے ساتھ چڑیا گھر جا رہا ہوں" یہ جواب سن کر فون کرنے والے نے ترش لہجے میں کہا "آپ چڑیا گھر کو صدر پر فوقیت دے رہے ہیں" ریٹائر افسر نے نرمی سے جواب دیا "نہیں میں اپنی پوتی کی خوشی کو صدر پر فوقیت دے رہا ہوں" فون کرنے والے نے وضاحت چاہی تو ریٹائر افسر نے کہا "مجھے یقین ہے میں جوں ہی وہائٹ ہاؤس سے باہر نکلوں گا تو صدر میرا نام اور میری شکل تک بھول جائیں گے جبکہ میری پوتی اس سیر کو پوری زندگی یاد رکھے گی لہٰذا میں گھاٹے کا سودا کیوں کروں؟ میں یہ وقت اس پوتی کو کیوں نہ دوں جو اس دن' اس وقت میری شکل اور میرے نام کو پوری زندگی یاد رکھے گی' جو مجھ سے محبت کرتی ہے اور جو اس دن کیلئے گھڑیاں گن رہی ہے" میں نے جب یہ واقعہ پڑھا تو میں نے کرسی کے ساتھ ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر کے دیر تک سوچتا رہا' ہم میں سے 99 فیصد لوگ زندگی بھر گھاٹے کا سودا کرتے ہیں' ہم لوگ ہمیشہ ان لوگوں کو اپنی زندگی کے قیمتی ترین لمحات دے دیتے ہیں جن کی نظر میں ہماری کوئی اوقات' ہماری کوئی اہمیت نہیں ہوتی' جن کیلئے ہم ہوں یا نہ ہوں کوئی فرق نہیں پڑتا اور جو ہماری غیر موجودگی میں ہمارے جیسے کسی دوسرے شخص سے کام چلا لیتے ہیں' میں نے سوچا ہم اپنے سنگدل باس کو ہمیشہ اپنی اس بیوی پر فوقیت دیتے ہیں اور جو ہمارے لئے دروازہ کھولنے' ہمیں گرم کھانا کھلانے کے لئے دو دو بجے تک جاگتی رہتی ہے' ہم اپنے بے وفا پیشے کو اپنے ان بچوں پر فوقیت دیتے ہیں جو مہینہ مہینہ ہمارے لمس' ہماری شفقت اور ہماری آواز کو ترستے رہتے ہیں' جو ہمیں صرف البموں اور تصویروں میں دیکھتے ہیں' جو ہمیں یاد کرتے کرتے بڑے ہو جاتے ہیں اور جو ہمارا انتظار کرتے کرتے جوان ہو جاتے ہیں لیکن انہیں ہمارا قرب نصیب نہیں ہوتا' ہم زندگی بھر انہیں ان کا جائز وقت نہیں دے پاتے' میں نے سوچا' ہم سب گھاٹے کے سوداگر ہیں۔

Do Not Wish For Less Problems

خواجہ صاحب نے فرمایا "یہ دعا تکنیکی لحاظ سے غلط ہے لہٰذا میں اس معاملے میں آپ لوگوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتا" سب لوگوں کے چہرے دھواں ہو گئے' کمرے میں بڑی دیر تک خاموشی رہی' میں ان تمام لوگوں میں نسبتاً منہ پھٹ تھا لہٰذا میں نے عرض کیا "حضور دعا تو دعا ہوتی ہے اس میں تکنیک کہاں سے آ گئی" خواجہ صاحب مسکرائے "ہاں تمہاری بات درست ہے لیکن اگر تم کسی شخص کو ایک ہزار سال تک زندہ رہنے کی دعا دو' اگر تم یہ دعا کرو اللہ تعالیٰ تمہارے کسی دوست کو پر لگا دے اور وہ اڑ کر لندن پہنچ جائے یا تم یہ دعا کرو تمہارے دادا دوبارہ زندہ ہو جائیں اور وہ تمہارے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے لگیں تو ان دعاؤں کا کیا نتیجہ نکلے گا' یہ دعائیں ٹیکنیکلی غلط ہیں' گو اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے' وہ اگر چاہے تو پوری دنیا کے لوگوں کی عمریں ہزار سال ہو جائیں' تمام انسانوں کے جسم پر پنکھ نکل آئیں اور پوری دنیا کے مرحوم "دادے" دوبارہ زندہ ہو جائیں لیکن اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرتا' یہ ساری باتیں اس کی ترجیحات میں شامل نہیں ہیں' اس نے ایک سسٹم بنا دیا ہے اور وہ عموماً اس سسٹم میں کوئی تبدیلی نہیں لاتا" وہ خاموش ہو گئے' ہمارے ایک ساتھی نے پوچھا "لیکن اگر کوئی بندہ اللہ سے یہ درخواست کرے یا باری تعالیٰ میرے مسائل اور مصائب میں کمی کر دے تو اس دعا میں کیا خرابی ہے' یہ دعا تکنیکی لحاظ سے کیسے غلط ہو گئی" خواجہ صاحب مسکرائے "آپ کے دوست نے فرمایا تھا آپ میرے مسائل اور مصائب کے خاتمے کیلئے دعا کریں جبکہ میں نے عرض کیا یہ خواہش ٹیکنیکلی غلط ہے' میں نے یہ دعویٰ نبیؐ رسالت کی حیات طیبہ کی بنیاد پر ہی کیا تھا' حضورؐ کا فرمان ہے دنیا مصائب کا گھر ہے' اب تم خود بتاؤ' اگر یہ دنیا مصائب کا گھر ہے تو کیا اس دنیا میں رہ کر مصائب سے چھٹکارہ ممکن ہے؟ نہیں ممکن لہٰذا ہم اگر مسائل اور مصائب سے چھٹکارے کی دعا کریں گے تو وہ سیدھی سادی موت کی دعا ہو گی" وہ خاموش ہو گئے' ہم سب پریشان ہو گئے۔

یہ ایک نیا زاویہ نظر اور زندگی کا ایک نیا پہلو تھا' ہم نے خواجہ صاحب سے پوچھا "اصل دعا کیا ہے" انہوں نے میٹھی میٹھی نظروں سے ہماری طرف دیکھا اور بولے "میرے بچو اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ دعا کرنی چاہیے وہ ہمیں زندگی کے مسائل اور مصائب سے نبٹنے کی ہمت دے' وہ ہمیں پریشانیوں کا سامنا کرنے' مشکلات کا مقابلہ کرنے اور ان پریشانیوں' ان مصائب اور ان مشکلات کو شکست دینے کی استطاعت دے اور وہ ہمارے اندر

جرأت، ہمت اور طاقت پیدا کر دے" خواجہ صاحب رکے، ذرا سا توقف کیا اور پھر اسی شیریں لہجے میں بولے" دنیا کے تمام کامیاب لوگوں کے پاس یہی طاقت، ہمت اور جرأت ہوتی ہے، ان کے پاس یہی استطاعت ہوتی ہے جس کے باعث یہ لوگ کامیابی پر کامیابی حاصل کرتے جاتے ہیں، تم انبیاء کی حیات پڑھو، اولیاء کرام کی زندگیوں کا احوال دیکھو، تم دنیا کے تمام بڑے فلسفیوں، سائنس دانوں، لیڈروں اور رہنماؤں کی بائیوگرافیاں پڑھو، تمہیں ان سب کی زندگیوں میں ان گنت مسائل اور مصائب ملیں گے لیکن ان میں سے کسی شخص نے کبھی ان مصائب اور مسائل کے خاتمے کی دعا نہیں کی، انہوں نے ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے ان مشکلوں سے نبٹنے کی ہمت مانگی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی، انہیں استقامت، استطاعت اور طاقت عطا کی اور یوں یہ لوگ کامیاب ہو گئے، حضرت آدمؑ سے لے کر نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ تک تم سب انبیاء کے احوال دیکھو، تم سقراط سے لے کر بل گیٹس تک دنیا کے تمام بڑے لوگوں کی زندگی کا تجزیہ کرو، تمہیں ان سب میں دو چیزیں مشترک نظر آئیں گی، مسائل اور ہمت، یہ لوگ مسائل کے سامنے ڈٹے رہے، انہیں ان کے گھر والوں نے فراموش کر دیا، انہیں ان کے قبیلے نے دھکے دیئے، انہیں ان کی قوم نے نکال دیا، یہ کبھی مکہ کے ریگزاروں میں مارے مارے پھرتے رہے اور کبھی شعب ابی طالب میں خشک چمڑا ابال کر کھاتے رہے، ان میں سے بے شمار لوگوں کو زمین کی گولائی ماپنے کے جرم میں سزا دی گئی، لوگوں نے کے مار کر ان کے کان پھاڑ دیئے، ان سے ان کے بچے چھین لئے گئے، یہ لوگ کوڑھی بن کر غلاظت میں پڑے رہے، یہ لوگ چالیس چالیس برس تک مچھلی کے پیٹ میں رہے، انہیں مصر سے نقل مکانی کرنی پڑی، یہ لوگ بازاروں میں سوت کی انٹی کے عوض بکے، انہیں سچ بولنے کے جرم میں قید خانوں میں ڈالا گیا، انہیں زہر کے پیالے پینے پر مجبور کیا گیا، انہیں دھوپ میں کھڑا کر کے کوڑے مارے گئے اور ان کی کھالیں کھینچی گئیں لیکن ان لوگوں نے پسپائی اختیار نہ کی، یہ لوگ مسائل، مشکلات اور مصائب سے نہ گھبرائے، یہ لوگ ڈٹے رہے لہٰذا آخری فتح ان ہی کے حصے آئی، یہی وہ لوگ تھے جو کامیاب ٹھہرے" وہ خاموش ہو گئے۔

ہم سب حیرت اور سرشاری کے عالم میں ان کا چہرہ دیکھتے رہے، انہوں نے آنکھیں بند کیں، ذرا دیر رکے اور پھر دوبارہ بولے" مجھے یہ نقطہ ایک امریکی دانشور جم رون نے سمجھایا تھا، جم رون امریکہ میں کامیابی پر لیکچر دیتا ہے، وہ لوگوں کو بتاتا ہے آپ لوگ کامیاب کیسے ہو سکتے ہیں، آپ لوگ خوشی تک کیسے پہنچ سکتے ہیں اور آپ لوگ ایک پرمسرت اور مطمئن زندگی کیسے گزار سکتے ہیں، مجھے جم رون کی ایک سی ڈی سننے کا اتفاق ہوا تھا، یہ کامیابی پر اس کا ایک لیکچر تھا، اس لیکچر کے دوران اس بدبخت نے ایک ایسا فقرہ کہہ دیا جس نے میری زندگی کا نقطہ نظر ہی تبدیل کر دیا، جس نے مجھے دنیا کے تمام بڑے لوگوں کی کامیابی کا اصل گر سمجھا دیا، میں چاہتا ہوں آپ سب لوگ یہ فقرہ لکھ کر اپنی میز پر لگا لو، اس نے کہا تھا

"Do Not Wish For Less Problems,Alwasy Wish For More Skills"

وہ رکے اور مسکرا کر بولے" اگر تم لوگ کامیاب ہونا چاہتے ہو تو اس فقرے کو اپنا پیر مان لو، اسے اپنا رہنما بنا لو تم زندگی میں کبھی ناکام نہیں ہو گے"

وائے می

''سر میرا کیا قصور ہے' وائے می سر'' اس نے منہ پر ہاتھ رکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا' کمرے کی فضا سوگوار ہو گئی' میں خاموش ہو گیا' اس کی کہانی میں دکھ اور ملال تھا' وہ مظفر آباد شہر کا رہنے والا تھا' وہ لوگ پچھلی تین نسلوں سے رئیس تھے' والد کپڑے کا کاروبار کرتے تھے' وہ تین بہنیں اور چار بھائی تھے' 8اکتوبر کو زلزلہ آیا اور اس کا سارا خاندان اس زلزلے کی نذر ہو گیا' والدین' بہن بھائی' بھتیجے اور بھانجیاں سب فوت ہو گئے' دکانیں اور گھر ملبے کا ڈھیر بن گئے' صرف وہ زندہ بچا۔ وہ پچھلے دو ماہ سے ایک امدادی کیمپ میں پڑا تھا' اس نے اپنی کہانی سنائی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا' اس کا کہنا تھا ''سر میرا کیا قصور ہے' وائے می''

میں نے اس سے کہا ''بخت زمان' تم نے آرتھر آش کا نام سنا ہے'' اس نے آنکھیں پونچھیں اور انکار میں سر ہلا دیا'' آرتھر آش ایک وقت میں دنیا کا سب سے بڑا ٹینس پلیئر تھا' وہ ورجینیا کے مشہور قصبے رچمنڈ میں پیدا ہوا' وہ افریقی امریکن تھا' اس کی ماں' اس کا باپ دونوں کالے تھے' اس نے بچپن میں اتھلیٹ بننے کی کوشش کی لیکن جسمانی کمزوری کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا' چھ سال کی عمر میں اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا' وہ اکیلا رہ گیا' جب تنہائی ستانے لگی تو اس نے فیصلہ کیا وہ دنیا میں کوئی ایسا کام کرے گا جو اس سے پہلے کسی کالے نے نہ کیا ہو' اس نے ٹینس کھیلنا شروع کر دی' وہ کورٹ میں داخل ہوا تو اس نے کمال کر دیا' وہ 1963ء میں امریکہ کا سب سے بڑا ٹینس پلیئر تھا' حکومت نے اسے ڈیوس کپ کی ٹیم میں شامل کر لیا' وہ امریکہ کی قومی ٹیم کا پہلا کالا کھلاڑی تھا' وہ ڈیوس کپ جیت گیا' یہ ایک حیران کن کامیابی تھی۔ 60ء کی دہائی میں امریکہ کے اخبارات' ریڈیو اور ٹیلی ویژن چینلز نے اسے اتنی کوریج دی کہ وہ 1969ء میں امریکہ کا سب سے زیادہ مشہور شخص تھا'' میں چند لمحوں کے لئے رک گیا۔ اس نے ٹشو سے منہ صاف کیا اور بڑے جوش سے بولا ''ویل ڈن سر یہ تو بڑی دلچسپ کہانی ہے'' میں مسکرایا ''نہیں اصل کہانی آگے آئے گی'' اس نے سر ہلا دیا' میں نے گفتگو کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا ''1969ء میں جنوبی افریقہ میں ٹینس کا میچ تھا' آش نے ساؤتھ افریقہ کے ویزے کے لئے درخواست دی' اس کی درخواست مسترد کر دی گئی' اس وقت جنوبی افریقہ میں گوروں کی حکومت تھی اور وہ کسی کالے کو ویزہ جاری نہیں کرتے تھے' آرتھر آش کے لئے یہ زندگی کا دوسرا بڑا چیلنج تھا' اس نے ٹینس چھوڑ دی اور امریکہ میں کالوں کے حقوق کی جنگ شروع کر دی'

مشہور آدمی تھا' میڈیا اور عوام اس کے ساتھ تھے' اس نے اپنے چاہنے والوں کو اپنی فوج بنا لیا' یہاں تک کہ امریکہ اور اس کی حلیف طاقتیں کالوں کے حقوق تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئیں' ساؤتھ افریقہ کے سفارتخانے نے اسے ویزہ جاری کر دیا' یہ اس کی بہت بڑی کامیابی تھی'' میں سانس لینے کے لئے رکا' نوجوان ہلکا سا مسکرایا اور پر جوش آواز میں بولا ''سر کمال ہے' یہ تو بہت بڑا شخص تھا'' میں نے ہنس کر کہا ''نہیں اصل کہانی ابھی آگے آئے گی'' وہ ہمہ تن گوش ہو گیا' میں نے کہا'' جب وہ ساؤتھ افریقہ کا ویزہ لے کر نکلا تو کسی نے کہا' آش نے ویزہ تو حاصل کر لیا لیکن وہ اب ٹینس نہیں کھیل سکے گا' اس شخص کا خیال تھا جو شخص اتنے سال ٹینس کوٹ سے باہر رہا ہو اس کیلئے دوبارہ نیشنل چیمپئن بننا آسان نہیں ہوگا' اس شخص کی بات ٹھیک تھی لیکن آش ایک بار پھر کورٹ میں داخل ہوا' اس نے کھیلنا شروع کیا اور 1975ء میں اس نے ٹینس کی دنیا کا سب سے بڑا اعزاز ومبلڈن کپ جیت لیا' وہ یہ کپ لے کر باہر نکلا تو وہ ورلڈ سٹار تھا'' میں رکا' میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا' اس نے کسمسا کر پہلو بدلا اور پھر ہموار آواز میں بولا ''ویل ڈن سر وہ تو کمال شخص تھا'' میں مسکرایا ''نہیں اصل کہانی ابھی آگے آئے گی'' وہ پوری طرح متوجہ ہو گیا'' 1980ء میں اسے دل کا دورہ پڑا' اسے ہارٹ سرجری کے لئے ہسپتال لے جایا گیا' وہاں اسے خون دیا گیا' اس خون میں ایچ آئی وی تھا' آرتھر آش ہسپتال سے نکلا تو وہ ایڈز کا مریض بن چکا تھا' ہیرو زیرو ہو گیا' وہ 1993ء تک پورے 13 سال اس مرض سے لڑتا رہا' دنیا کے 34 کاروباری اداروں' 55 بڑے ہسپتالوں اور دنیا کے 4 ہزار ڈاکٹروں نے اس کی جان بچانے کی کوشش کی لیکن دنیا کا سپر سٹار 6 فروری 1993ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گیا'' میں خاموش ہو گیا' نوجوان ایک بار پھر اداس ہو گیا اور اس نے دکھی لہجے میں کہا ''سو سیڈ' سر یہ بڑی دکھی کہانی ہے'' میں نے فوراً عرض کیا ''نہیں اصل کہانی آگے آئے گی'' وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے عرض کیا ''تم نے سوچا یہ کہانی یہاں ختم ہو گئی لیکن اصل کہانی ابھی باقی ہے' جب آرتھر آش ہسپتال میں آخری سانسیں لے رہا تھا تو اس کے ایک فین نے اسے ایک خط لکھا تھا' اس خط میں اس نے آش سے ایک عجیب سوال کیا' اس نے پوچھا' اس وقت دنیا میں 5 ارب لوگ ہیں' قدرت نے ان 5 ارب لوگوں میں سے صرف تمہیں اس موذی مرض کیلئے کیوں منتخب کیا؟ واے یو'' آرتھر آش نے اس وائے یو کا کمال جواب دیا' یہ جواب ایک پورا فلسفہ ہے۔ میں زندگی میں جب بھی مایوس ہوتا ہوں' میں جب بھی خود کو بدنصیب محسوس کرتا ہوں تو میں آش کی وہ چند لائنیں نکال کر پڑھ لیتا ہوں' یقین کرو میں ایک بار پھر اٹھ کھڑا ہوتا ہوں' میں خود کو دنیا کا خوش نصیب ترین شخص سمجھنے لگتا ہوں آرتھر آش نے اسے جواب دیا تھا' دنیا میں ہر سال 50 کروڑ بچے ٹینس کھیلنا شروع کرتے ہیں' ان میں سے صرف 5 کروڑ بچے یہ کھیل سیکھ پاتے ہیں' ان 5 کروڑ بچوں میں سے صرف 5 لاکھ نوجوان پروفیشنل ٹینس پلیئر بنتے ہیں' ان پانچ لاکھ نوجوانوں میں سے صرف 50 ہزار کھیل کے سرکٹ میں داخل ہوتے ہیں' ان 50 ہزار میں سے صرف پانچ ہزار گرینڈ سلام تک پہنچتے ہیں' ان پانچ ہزار کھلاڑیوں میں سے صرف 50 ومبلڈن کھیلنے آتے ہیں' ان پچاس میں سے صرف 4 سیمی فائنل تک پہنچتے ہیں' ان چار میں سے صرف

Kashif Azad @ OneUrdu.com

دو فائنل کھیلتے ہیں اور ان دو میں سے صرف ایک شخص کو ومبلڈن کپ ملتا ہے اور میں دنیا کے ان 5 ارب لوگوں میں سے ایک ہوں جسے ومبلڈن کپ ملا تھا' میں دنیا کے ان 50 کروڑ کھلاڑیوں میں سے واحد شخص ہوں جس نے ٹینس کھیلنا شروع کی اور وہ ومبلڈن تک پہنچ گیا' میں نے زندگی میں ٹینس کے 800 بڑے اعزاز حاصل کئے' یہ ریکارڈ تھا' مجھے اچھی طرح یاد ہے میں جب بھی ٹرافی' کپ یا ایوارڈ لینے جاتا تھا تو میں خود کو اس اعزاز کا حق دار سمجھتا تھا' میں نے کبھی اپنے اللہ سے یہ نہیں پوچھا تھا' اے اللہ تعالیٰ تم نے پوری دنیا میں صرف مجھے ہی اس اعزاز کے لئے کیوں منتخب کیا' واے ئی' آج میں تکلیف میں ہوں' مجھے جب درد ہوتا ہے اور میں اللہ سے یہ پوچھنے لگتا ہوں واے ئی تو مجھے اپنے وہ تمام اعزاز یاد آ جاتے ہیں اور میں سوچتا ہوں جب میں نے اپنی کامیابیوں پر اللہ تعالیٰ سے یہ نہیں پوچھا تھا'' کا ڈ واے ئی'' تو آج مجھے اپنی تکلیف میں بھی اس سے یہ سوال پوچھنے کا کوئی حق حاصل نہیں' جب میں نے اپنی کامیابیوں پر بھی اس کا شکر ادا نہیں کیا تو آج مجھے اپنی ناکامی پر اس سے کوئی شکوہ نہیں کرنا چاہیے'' میں خاموش ہو گیا' نوجوان کی آنکھوں میں روشنی اتر آئی' وہ بولا'' سر واقعی یہ زندگی کا ایک نیا زاویہ ہے' میں نے کبھی زندگی کو اس پہلو سے نہیں دیکھا تھا'' میں نے قہقہہ لگایا'' نہیں ابھی اصل کہانی آگے ہے' آرتھر آش نے مرنے سے چند لمحے پہلے کہا تھا'' اے دنیا کے لوگو! اللہ کو کبھی یہ نہ بتاؤ تمہاری مصیبت کتنی بڑی ہے' تم ہمیشہ اپنی مصیبت کو یہ بتاؤ تمہارا اللہ کتنا بڑا ہے' تم دکھ اور تکلیف سے رہائی پا جاؤ گے'' میں رکا اور دوبارہ بولا'' آرتھر آش نے کہا تھا جس شخص نے کامیابیوں پر شکر ادا نہیں کیا اسے ناکامیوں پر شکوہ کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں اور جو شخص اپنی مصیبت کو اپنے رب سے بڑا سمجھتا ہے اسے اللہ کا بندہ نہیں کہلانا چاہیے''